مولانا غلام رسول مہر

حیات اور کارنامے

از

ڈاکٹر شفیق احمد

○

مجلسِ ترقّیِ ادب

کلب روڈ، لاہور

طبع اول : جون ۱۹۸۸ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظم مجلس ترقی ادب ، کلب روڈ لاہور

طابع : محمد زرین خان

مطبع : زرین آرٹ پریس - ۶۱ ریلوے روڈ لاہور

فہرست

☆ ☆ ☆

پیش لفظ

مولانا غلام رسول مہر سے میرا پہلا باقاعدہ تعارف اُس وقت ہوا ، جب انھیں انتقال کیے ہوئے ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو چکا تھا ۔ اس سے قبل اگرچہ میں ان کی چند ایک کتابیں اور شاید کچھ مضامین دیکھ چکا تھا لیکن ان کے علمی کارناموں کا پہلا باقاعدہ نقش میرے ذہن پر اُس وقت ثبت ہوا جب گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان کی اُردو مجلس کے زیر اہتمام ۱۹ دسمبر ۱۹۷۲ء کو منعقدہ ایک تقریب میں مولانا مہر کے بارے میں اپنے چند اساتذہ کرام کے مضامین سنے ۔ غالباً ان مضامین ہی کا اثر تھا کہ میں نے مولانا مہر کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا ۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ مولانا مہر نے غالب ، سید احمد شہید اور مطالبِ بانگِ درا کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے ۔ لیکن مجھے اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ بزعمِ خود بہت کچھ پڑھ لینے کے باوجود مجھے مولانا مہر کی حقیقی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں تھا ۔ یہی سبب تھا کہ جب استاد محترم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب اور جناب ڈاکٹر غلام حسین صاحب ذوالفقار سے گفتگو کے بعد تحقیقی کام کے لیے مولانا مہر کا نام سامنے آیا تو میں بڑی حد تک مطمئن تھا ۔

میرے اطمینان کا سبب میری یہ خوش فہمی تھی کہ اس قدر آسان اور اتنے مختصر کام کو بہت کم عرصے میں پایۂ تکمیل تک پہنچا لوں گا ۔ لیکن کام کا آغاز کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو بقولِ اقبال ''شہادت گہِ الفت'' میں قدم رکھنے کے مترادف ہے ۔ پہلے میں ''جغرافیۂ پنجاب جدید'' میں مولانا مہر کے متعلق پیش کی گئی حسرت کی رائے کو مبالغہ آمیز تصور کرتا تھا لیکن اب اپنے تجربے کی روشنی میں اس رائے کے بارے میں اس مقام پر ہوں ، جسے تصدیق بالقلب کی منزل کہا جاتا ہے ۔ حیران ہوں کہ حسرت نے ''دریائے مہر''

کی گہرائی کا اتنا صحیح اندازہ اُس وقت کیسے کر لیا تھا جب اس دریا نے اپنا رخ بھی متعین نہیں کیا تھا ۔

یوں تو ''دریائے مہر'' میں بہت سے بھنور ایسے ہیں جو بڑے سے بڑے تیراک کا پتّا پانی کر دینے کے لیے کافی ہیں ، لیکن اس کا خطرناک ترین مقام وہ ہے جسے حسرت نے ''سکندر ماؤنٹ'' سے تعبیر کیا ہے اور جہاں دریائے مہر و سالک مل کر ''دوآبہ انقلاب'' بناتے ہیں ۔ مجھے بھی سب سے زیادہ مشکل اسی مقام پر پیش آئی ۔ اگرچہ دوآبہ انقلاب کا رخ ''خلیج لیگ'' کی طرف ہے لیکن اس کے منبع یعنی ''اتحادی سطح مرتفع'' کی تیرہ باطن مٹی نے دوآبہ انقلاب کو بھی گدلا کر دیا ہے ۔ اسی گدلاہٹ کے عطا کردہ داغوں کے سبب تحریکِ آزادی کے ہراول دستے میں شامل ہونے کے باوجود مولانا مہر تحریکِ پاکستان کے نامور مجاہدین میں اپنے لیے وہ مقام حاصل نہ کر سکے جو بصورت دیگر ان کا حصہ تھا ۔

یہ سیاست ہی تھی جس میں ناکامی نے مولانا مہر کی صحافت ، سوانح نگاری ، تاریخ ، تحقیق ، شرح اور تراجم جیسے اہم کاموں کی حقیقی قدر و قیمت پر بھی پردے ڈال دیے ، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مہر نے ہر میدان میں وہ کارنامے انجام دیے جو روایت میں اہم اضافہ قرار دیے جا سکتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ''غالب'' ، ''سید احمد شہید'' اور ''۱۸۵۷ء'' کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اگرچہ مولانا مہر نے مختلف اصناف کے حوالے سے وہ کام انجام دیا ہے جو بعض اوقات اداروں کے لیے بھی ممکن نہیں ہوتا ، لیکن یہ کتنی تلخ حقیقت ہے کہ خود مولانا مہر کے بارے میں لکھے ہوئے چند اوراقِ پریشاں کے سوا کچھ نہیں ملتا اور وہ بھی دو ایک استثنائی مضامین کے علاوہ زیادہ تر بے اصل و متضاد اور اسی بنا پر بے وقعت بھی ۔ اس صورتِ حال میں جامع تحقیقی مقالہ مرتب کرنے کے سلسلے میں پیش آمدہ دشواریوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

بہرحال تمام مشکلات اور دشواریوں کے باوجود میں اس دریا سے بخیر و عافیت نکل آیا ، جس کی طرف حسرت کے بقول بہت سے نامی غوطہ خوروں اور شناوروں کو رخ کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی ۔ لیکن یہ میرا کمال نہیں بلکہ میرے ان محترم اساتذہ کرام کا اعجاز ہے جنھوں نے ہر مرحلے پر میری دستگیری فرمائی ۔ اس کے لیے میں جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب ، جناب ڈاکٹر

افتخار احمد صدیقی صاحب اور نگران مقالہ جناب ڈاکٹر غلام حسین صاحب ذوالفقار کا ممنون و شکر گزار ہوں ۔

میں یوسف طاہر ، عبدالسلام اسلم ، شیخ نیاز احمد ، الیس جیلانی ، پروفیسر محمد ایوب قادری ، ابوسلمان شاہجہانپوری ، مشفق خواجہ ، مولانا حامد علی خان اور استاذی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا بھی ممنون ہوں ۔ ان میں سے بعض اصحاب ِ علم نے مولانا مہر کے مکتوبات کے نادر ذخیرے عطا فرمائے اور بعض نے اپنی گفتگوؤں کے ذریعے تنقید و تحقیق کی تیرہ راہوں میں میری رہنمائی کی ۔ محمد عالم مختار ِ حق کا شکریہ ادا کرنا ان کے مخلصانہ جذبات کی قدر ناشناسی کے علاوہ تکلف بھی ہوگا ۔ محمد عالم مختار ِ حق نے نہ صرف مولانا مہر کے خطوط عطا کیے اور ایک طویل انٹرویو دیا بلکہ اپنے کتب خانے میں موجود ہر ضروری کتاب میرے لیے وقف کر دی ۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے بعض نادر و کمیاب کتابیں از خود میرے پاس بھجوا دیں ۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ اگر جناب محمد عالم مختار ِ حق کا تعاون ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب ، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب اور ڈاکٹر غلام حسین صاحب ذوالفقار کی سرپرستی و رہنمائی میرے شامل ِ حال نہ ہوتی تو مجھ جیسا بے قاعدہ اور لا ابالی شخص شاید ہی یہ کام انجام دے سکتا ۔

شفیق احمد

شعبۂ اُردو و اقبالیات
اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

پہلا باب

حیات اور شخصیت

سوانح حیات :

جب قدرت کسی قوم کو زوال کی پستیوں سے آشنا کرنے کا ارادہ کر لے تو اس میں قحط الرجال کی کیفیت پیدا کرتی ہے ، جس کے باعث زندگی کے کسی بھی شعبے میں وہ شخصیات ناپید و نایاب ہو جاتی ہیں ، جو اپنی محنت و قوت اور عزم و ہمت کے باعث قوم کے ڈوبتے سفینے کو ہر طرح کے مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے غرق کر دینے والے طوفانی تھپیڑوں سے بچا کر ساحل مراد تک لے جا سکیں ۔ ایسی قوم میں کاہلی ، تن آسانی ، بزدلی اور مایوسی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کی قوت عمل ختم ہو جاتی ہے اور قوم رفتہ رفتہ زوال کی مختلف منزلیں طے کرتی ہوئی نیست و نابود ہو جاتی ہے ۔ اس کے برعکس ، اُس قوم میں جو اگرچہ دور زوال ہی سے گزر رہی ہو لیکن جس کا نصیب ابھی بیدار ہو اور جس نے صفحۂ حیات پر سنگ و خشت کے علاوہ افکار تازہ سے تعمیر کردہ جہان تازہ بھی تشکیل دینے ہوں ، ایسے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جو مشیت ایزدی کے مطابق اپنے جوہر حقیقی کو میدان تگ و تاز میں صرف عمل کرکے ایک نئی دنیا کو وجود میں لانے کا سبب بن جاتے ہیں ۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اگرچہ ہندی مسلمان محکوم ہوگئے تھے اور ان کی قسمت کا ستارہ بھی غروب ہوگیا تھا لیکن ایام ابتلا کے گزر جانے کے بعد اس کو پھر طلوع ہونا تھا ۔ اگرچہ ہندی مسلمانوں کا گلشن خزاں رسیدہ ہو گیا تھا لیکن یہ خزاں مستقل نہیں تھی بلکہ اس کے بعد اثبات بہار بھی منشائے ایزدی میں شامل تھا ۔ یہی سبب ہے کہ سرسید احمد خاں سے لے کر تحریک آزادی میں حصہ لینے والے آخری مجاہد تک ، اس ملت نے ایسے بے شمار افراد پیدا کیے جنھوں نے اپنی اپنی قدرت و ہمت کے مطابق خورشید کا

سامان سفر تازہ کرنے کی کوشش کی ۔ انھی افراد میں ایک بہت نمایاں نام مولانا غلام رسول مہر کا بھی ہے جو بھارتی شہر جالندھر کے ایک مضافاتی گاؤں پھول پور میں پیدا ہوئے ۔ جیسا کہ وہ خود الطاف حسن قریشی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

"ضلع جالندھر کے ایک چھوٹے سے گاؤں پھول پور میں پیدا ہوا ۔ یہ گاؤں جالندھر سے چار پانچ میل جنوب میں واقع تھا ۔"[۱]

اس کی تائید کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں :

". . . مولد پھول پور تحصیل جالندھر (ایک چھوٹا سا گاؤں جالندھر سے پانچ میل جانب جنوب) ۔"[۲]

مولانا محمد عالم مختار حق کے نام اپنے ایک خط میں ذرا تفصیل سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں :

"میرا وطن ضلع جالندھر میں شہر سے کوئی پانچ میل کے فاصلے پر لکودر کو جانے والی تانگہ اور موٹر روڈ سے قریب تھا ۔ میں عموماً یہاں (لاہور) سے تین ساڑھے تین گھنٹے میں گھر پہنچ جاتا تھا ۔"[۳]

مولانا غلام رسول مہر کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے ۔ پُرلطف بات یہ ہے کہ اگر یہ اختلافات مولانا مہر کے سوانح نگاروں کے ہاں ملتے تو کچھ زیادہ مضائقہ نہیں تھا لیکن مقامِ حیرت ہے کہ خود مولانا مہر کی اپنی تحریروں میں بھی یہ اختلافات بہت نمایاں ہیں ۔ انھوں نے اپنی تاریخِ پیدائش کا جب بھی ذکر کیا تو ہمیشہ کسی نئی تاریخ کا ذکر سامنے آیا ۔ ان

۱۔ مولانا غلام رسول مہر ، انٹرویو الطاف حسن قریشی ، ص ۲۱ ۔ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور ، اگست ۱۹۶۱ع ۔
۲۔ مکتوب بنام پروفیسر محمد ایوب قادری ، مرقومہ ۱۸۔ اگست ۱۹۶۷ع ، مطبوعہ روزنامہ جنگ کراچی ، ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ع ۔
۳۔ مکتوب بنام مولانا محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۲۔ اگست ۱۹۶۱ع ، غیر مطبوعہ ۔

کے بر لئے بیان نے کم و بیش ان کے اپنے تمام سابقہ دعووں کی تردید و تکذیب کی ۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ شعر و ادب اور فلسفہ و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے مولانا مہر ریاضی اور حساب کتاب کے معاملوں میں بہت کمزور تھے ۔ اپنی اسی کمزوری کے سبب منطق و فلسفہ جیسے خشک مضامین میں استی فی صد تک نمبر حاصل کرنے اور فارسی میں اول آنے والے مولانا مہر ریاضی میں فیل بھی ہوئے ۔ جیسا کہ وہ دورانِ طالب علمی میں اپنے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں :

''ایف ۔ اے میں انگریزی اور ریاضی کے علاوہ تاریخ اور فارسی بی ۔ اے میں انگریزی ، فارسی اور فلسفہ ۔ ریاضی اُس زمانے میں ایف ۔ اے تک لازمی تھی ۔ میں اس مضمون میں فیل بھی ہوا ۔''[۱]

مولانا مہر کی تاریخِ پیدائش کے ضمن میں اُن حوالوں کا تو ذکر ہی کیا جو دیگر مضمون نگاروں نے لکھے ، البتہ ان حوالوں کا ذکر ضروری ہے جو یا تو خود مولانا مہر کے قلم سے نکلے یا پھر جن کے لکھنے والوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی تحریریں مولانا مہر کی نظر سے گزری ہیں اور وہ انھیں دیکھ چکے ہیں ۔ میرا اشارہ مولانا مہر کے مکاتیب اور انٹرویوز وغیرہ کے علاوہ اُس تحقیقی و تنقیدی مقالے کی جانب بھی ہے جو مولانا مہر کی شخصیت پر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں لکھا گیا ، اور مولانا خلیل الرحمان داؤدی کے اُس مضمون کی طرف بھی جو ''نقوش'' لاہور کے 'شخصیات نمبر ۱' میں شامل ہے اور جس میں مولانا مہر کی حیات اور کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے ۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کا متذکرہ مضمون مولانا مہر کی زندگی میں چھپ کر سامنے آ گیا تھا اور مولانا مہر نے اس کے مندرجات سے کبھی اختلاف رائے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی ، جبکہ تحقیقی مقالے کے مصنف محمد یوسف طاہر نے اس سلسلے میں رابطہ قائم کرنے پر فرمایا تھا کہ میں کامل وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ مقالے کا ایک ایک لفظ مولانا مہر کی نظر سے گزر چکا ہے ۔ مزید یہ کہ

۱۔ اسلامیہ کالج کے فرزندانِ نامور ، مولانا غلام رسول مہر سے ایک انٹرویو ، سلسلہ نمبر ۵ ، ص ۴۷ ، رسالہ ''فاران'' ، اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور ۔

یہ مقالہ الٰہی کی توجہات سے مکمل ہوا تھا ۔[1]

بہرحال ان چند در چند اختلافی تاریخوں کی صورت کچھ یوں بنتی ہے کہ مولانا مہر نے پروفیسر محمد ایوب قادری کے نام اپنے ایک خط میں تحریر کیا تھا کہ ان کی تاریخِ پیدائش پندرہ اپریل ۱۸۹۵ء ہے[2] جبکہ ڈاکٹر شیر بہادر پنی کے نام اپنے ایک خط میں مولانا نے اپنی تاریخِ پیدائش ''بارہ یا پندرہ مئی ۱۸۹۴ء لکھی[3]۔ غالباً اسی کے پیشِ نظر تنیر سلطانہ نے مولانا مہر پر اپنے تحقیقی مقالے ''مولانا غلام رسول مہر بحیثیتِ غالب شناس''[4] میں مولانا کی تاریخِ پیدائش لکھتے ہوئے خود مولانا کی تحریر سے دھوکا کھا کر بلا تحقیق اسے جون کا توں قبول کر لیا ۔ مشفق خواجہ کے نام اپنے ایک خط میں مولانا غلام رسول مہر نے ایک بالکل ہی مختلف تاریخ لکھی ۔ انھوں نے لکھا :

''میری پیدائش وسط مئی ۱۸۹۵ء کی ہے ۔''[5]

مولانا مہر نے ڈاکٹر الطاف حسن قریشی کو ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' کے لیے ایک انٹرویو دیتے ہوئے بھی یہی تاریخ بتائی ، جبکہ یوسف طاہر نے اپنا تحقیقی مقالہ لکھتے ہوئے مولانا مہر سے استفسار اور استمداد کیا تو خاصے غور و فکر کے بعد جو تاریخِ پیدائش لکھی گئی وہ بظاہر خاصی مکمل تھی ۔ یوسف طاہر نے لکھا :

''مولانا مہر . . . بروز جمعرات ۱۸ - اپریل ۱۸۹۵ء / ۲۲ شوال ۱۳۱۲ھ کو پیدا ہوئے ۔''[6]

۱۔ محمد یوسف طاہر صاحب کا انٹرویو ریکارڈ ہے ۔

۲۔ مکتوب بنام پروفیسر محمد ایوب قادری ، مرقومہ ۱۸ ۔ اگست ۱۹۶۷ء ، مطبوعہ ۲۳ نومبر ۱۹۷۱ء ، روزنامہ جنگ کراچی ۔

۳۔ افاداتِ مہر ، مرتبہ ڈاکٹر شیر بہادر پنی ، ص ۲۹ ، طبع اول ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ۔

۴۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیتِ غالب شناس ، از نیر سلطانہ ، مقالہ مخزولہ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۔

۵۔ مکتوب بنام مشفق خواجہ ، مرقومہ ۱۳ جنوری ۱۹۶۳ء ، غیر مطبوعہ ۔

۶۔ مولانا غلام رسول مہر ، از محمد یوسف طاہر ، ص ۳ ، مقالہ مخزولہ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۔

اس تاریخ کی تائید میں دلائل و براہین کا انبار لگایا جا سکتا ہے ۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخ خود مولانا مہر کی لکھوائی ہوئی ہے جیسا کہ حاشیے میں مصنف نے اس کا دعویٰ بھی کیا ہے ۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دیگر تاریخیں ارتجالاً لکھی گئی ہیں ، لہذا ان میں غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے ، لیکن یہ تاریخ غور و فکر کے بعد لکھی گئی کیونکہ مولانا مہر کو یہ تاریخ لکھواتے ہوئے یقیناً یہ احساس رہا ہوگا کہ بعد ازاں یہی تاریخ بنیادی حوالے کے طور پر محققین کے سامنے رہے گی ۔ ایک دلیل یہ بھی دی جا سکتی ہے کہ یہ واحد تاریخ ہے جسے مکمل کہا جا سکتا ہے ، یعنی اس میں دیگر تمام حوالوں کے برعکس عیسوی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہجری تاریخ کے علاوہ باقاعدہ طور پر یوم پیدائش کا بھی ذکر کیا گیا ہے ۔

پہلی دلیل کے ضمن میں تو صرف اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ باقی تمام تاریخیں بھی مولانا مہر کی خود نوشت ہیں اور اس سلسلے میں ان کی بھی وہی اہمیت ہے جو مقالے میں درج تاریخ کی ۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ محض اس بنا پر دوسری تاریخوں پر اسے فوقیت نہیں دی جا سکتی ۔ دوسری دلیل کا صرف یہ جواب کافی ہے کہ ''غالب'' ایسی معرکہ آرا تصنیف ترتیب دینے والا شخص خطوط کے سوانحی پہلوؤں کی اہمیت سے یقیناً غافل نہ ہوگا اور خط لکھتے وقت بھی انہیں احساس رہا ہوگا کہ جو چیز ان سے پوچھی گئی ہے اس کا جواب ان کی زندگی کا بنیادی حوالہ بن جائے گا ۔ لہذا اس بنا پر بھی تحقیقی مقالے میں درج تاریخ کو کوئی تفوق حاصل نہیں ہوتا ۔ رہی آخری بات تو اس سلسلے میں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ یہ تاریخ جتنی مکمل ہے اتنی ہی گمراہ کن بھی ہے ، کیونکہ اس تاریخ کو مکمل کرنے میں مصنف یا خود مولانا مہر کا کوئی کمال نہیں تھا ۔ اس کے لیے تو ہمیں تقویم ہجری و عیسوی کی کتابوں کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے ۔ حاشیے میں مصنف نے تقویم ہجری و عیسوی کا حوالہ دے کر ہماری مشکل آسان بھی کر دی ہے ۔ یوں یہ بظاہر مکمل ترین تاریخ بھی ہماری صحیح رہنمائی کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے ۔ غالباً اسی وجہ سے قاضی افضل حق قرشی تک مولانا مہر کی تاریخِ پیدائش لکھتے ہوئے دھوکا کھا گئے ۔[۱]

۱۔ مولانا غلام رسول مہر ، از قاضی افضل حق قرشی ، ہفت روزہ چٹان ، ۲۳ نومبر ۱۹۷۱ع ۔

یوں تاریخِ پیدائش کے بارے میں ملنے والی باہم متضاد اور متصادم آراء مسئلے کو اُلجھانے کا سبب بن جاتی ہیں ۔ البتہ ان تمام دشواریوں کے باوجود بعض ایسے اشارے بھی ملتے ہیں جن کی مدد سے اس گتھی کو حل کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں دو ایک باتیں ذہن نشین کر لینی چاہییں ۔ مثلاً یہ کہ عام دیہاتی گھرانوں میں بچوں کی تاریخِ پیدائش یاد رکھنے کے سلسلے میں کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا البتہ گھر کی بڑی بوڑھیاں جو عموماً ہجری و عیسوی مہینوں کے نام تک نہیں جانتیں ، اپنے طور پر کچھ ایسا حساب ضرور رکھتی ہیں جس کے سبب سے ذرا سی توجہ اور محنت و کاوش کے بعد صحیح تاریخِ پیدائش معلوم ہو سکتی ہے ۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ، یہ ان پڑھ دیہاتی خواتین ہجری و عیسوی مہینوں کے نام تک نہیں جانتیں لہذا ان سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ ان کی تاریخوں کو جانیں اور پھر یاد رکھیں ۔ انھوں نے اپنا کام چلانے کے لیے اپنے پیمانے اور معیار مقرر کیے ہوتے ہیں ۔ مثلاً مہینوں کا نام ، علاقائی تہوار ، کسی بزرگ کے عرس یا کسی اور شخصیت یا اہم واقعے سے منسوب کر کے رکھ لیے جاتے ہیں اور انھی کے حساب سے بعد ازاں مہینوں اور برسوں کا حساب کر لیا جاتا ہے ۔

پنجاب اور اس سے ملحقہ علاقوں میں کیلنڈر کی صورتِ حال نسبتاً کم پیچیدہ تھی اس لیے کہ یہاں کی زیادہ تر آبادی زراعت پیشہ تھی اور یہاں کی خواتین بکرمی کیلنڈر کے حساب سے مہینوں کے نام اور کسی حد تک تاریخیں بھی یاد رکھ لیتی تھیں ۔ پھر خاص خاص دن اور تاریخیں تو بھولنے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی ۔ مثلاً پنجاب کا کون سا علاقہ ہے جہاں لوگ یکم بیساکھ کو بھول جائیں گے ، کیونکہ یہ دن پنجاب کی دیہی زندگی میں ایک تہوار کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے نمایاں بھی ہے ۔

اس بظاہر غیر متعلق گفتگو کے بعد اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کیا جاتا ہے ، یعنی مولانا مہر کی تاریخِ پیدائش اور اس کا تعین ۔ اس بارے میں ایک اہم حوالہ بھی ملتا ہے جس کا ابھی تک ذکر نہیں آیا ۔ لیکن اصل حوالے سے پہلے اس کا ذرا سا پس منظر جاننا ضروری ہوگا اور وہ یہ کہ مولانا غلام رسول مہر کے انتقال کے بعد افضل حق قرشی نے ایک مضمون لکھا تھا جو ۲۳ نومبر ۱۹۷۱ع کے ہفت روزہ 'چٹان' میں شائع ہوا ۔ اس مضمون میں افضل حق نے مولانا مہر کی جو تاریخِ پیدائش درج کی تھی اس پر ڈاکٹر شیر بہادر نے

"مکاتیبِ مہر" میں موجود تاریخ کے حوالے سے اعتراض کیا ۔ جس کی وضاحت کرتے ہوئے افضل حق قرشی نے ڈاکٹر شیر بہادر پنی کے نام اپنے خط میں ایک ایسا جملہ بھی لکھ دیا جو کلیدی حیثیت کا حامل ہونے کے باعث فیصلہ کن ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"ایک بار مہر صاحب نے ایک رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے پیدائش مئی ۱۸۹۵ع بتائی تھی اور تاریخ غالباً چودہ یا پندرہ ۔ اس ضمن میں انھوں نے بتایا تھا کہ والدہ بتایا کرتی تھیں کہ بیساکھ کی یکم تھی ۔"[۱]

ملاحظہ فرمائیے یکم بیساکھ کو افضل حق قرشی بھی نہیں بھول پائے ۔ مولانا مہر اور ان کی والدہ کے ذہن سے تو یہ تاریخ کیا اترتی ۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا اس حوالے پر کبھی توجہ نہ دے سکے اور نہ ہی اسے قابلِ اعتبار تصور کیا ورنہ ان کے بیانات اتنے متضاد نہ ہوتے ۔

معلوم ہے کہ یکم بیساکھ ہمیشہ ۱۳ ۔ اپریل کو ہوا کرتی ہے ، سوائے ان برسوں کے جو لیپ کے ہوں ۔ ایسے برسوں میں فروری کا ایک دن بڑھ جانے کے باعث یکم بیساکھ ۱۳ ۔ اپریل کی بجائے ۱۲ ۔ اپریل کو پڑتی ہے ۔ یہ بھی معلوم ہے کہ مہر صاحب کا سالِ پیدائش خواہ ۱۸۹۴ع ہو اور خواہ ۱۸۹۵ع ان میں سے لیپ کا سال کوئی نہیں ہے ۔ یعنی یہ امر تو طے پا گیا کہ مولانا غلام رسول مہر اپریل کی تیرھویں تاریخ کو پیدا ہوئے تھے ۔

رہا سال کا معاملہ تو اس سلسلے میں ایک امر پر مزید توجہ دینا ہوگی اور وہ یہ کہ عام دیہاتی گھرانوں میں تاریخِ پیدائش محفوظ نہ رکھنے کے باوجود بچوں کی عمریں ضرور یاد رکھی جاتی ہیں ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ لوگ عموماً اپنی تاریخِ پیدائش سے ناواقفیت کے باوجود اپنی عمر ٹھیک ٹھیک بتا دیتے ہیں ۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ بچوں کو یہ روایت بھی اپنے والدین ہی سے مل جاتی ہے ۔ مولانا مہر کو بھی یہ روایت ملی تھی اور وہ مختلف مواقع پر مثلاً والدین کی رحلت کے دنوں کا تعین کرنے کے لیے یہی بیان دیتے ہیں کہ میں والد اور

۱۔ افاداتِ مہر ، از شیر بہادر پنی ، ص ۲۹ ۔

والدہ کے انتقال کے وقت علی الترتیب گیارہ سال[1] اور چھیالیس سال[2] کا تھا ۔ اسی طرح ایک اور جگہ رقم طراز ہیں :

''میں حضرت علامہ اقبال کے اسمِ گرامی سے پہلے پہل ۱۹۰۷ع میں متعارف ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ اُس وقت میں اپنی عمر کے تیرھویں مرحلے میں تھا ۔''[3]

عمر ہی کو حوالہ بناتے ہوئے الیس جیلانی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''عمر کا چھہترواں سال ۔ بہ ایں ہمہ محنت و مشقت کی چکی چل رہی ہے ۔''[4]

مولانا محمد عالم مختارِ حق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

''عزیزِ مکرم ! میری طبیعت ابھی بالکل اچھی نہیں ، اور معاملہ محض بیماری کا نہیں بلکہ عمر کے ایک خاص مرحلے میں بیماری کا ہے اور میں اکہترویں سال میں ہوں ۔''[5]

اسی طرح سید قدرت نقوی کے نام اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں :

''کبھی کبھی دمے کا وسوسہ ہوتا ہے مگر اب میں اتنا اچھا ضرور ہوں جتنا اکہترویں برس کے مسافر حیات کو ہونا چاہیے ۔''[6]

اقبال پر غیر مطبوعہ مضمون کے اقتباس اور محولہ بالا خطوط کے سالِ کتابت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مولانا مہر کا سالِ پیدائش حتمی طور پر ۱۸۹۵ع

۱۔ افاداتِ مہر ، ص ۳۰ ۔
۲۔ والدہ مرحومہ پر ایک غیر مطبوعہ مضمون جس کی فوٹو سٹیٹ نقل راقم کے پاس محفوظ ہے ۔
۳۔ اقبال پر ایک غیر مطبوعہ مضمون جو راقم کے پاس فوٹو سٹیٹ نقل کی صورت میں محفوظ ہے ۔
۴۔ مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۳ اکتوبر ۱۹۷۰ع غیر مطبوعہ ۔
۵۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، مرقومہ دسمبر ۱۹۶۵ غیر مطبوعہ ۔
۶۔ مکتوب بنام سید قدرت نقوی ، مرقومہ ۱۵ جنوری ۱۹۶۶ع غیر مطبوعہ ۔

متعین ہو جاتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں غلط فہمی کے ازالے کے لیے ایک امر کی جانب اشارہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم ایس جیلانی کے نام خط کے پیش نظر مکتوب کے سنہ تحریر یعنی ۱۹۷۰ء میں سے ۷۶ نفی کریں گے تو ہم صحیح نتیجے تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ کیونکہ ابھی تک مولانا مہر کی عمر چھہتر برس نہیں ہوئی تھی۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۳ - اپریل ہے لہذا ۱۳ - اپریل ۱۹۷۰ء کو تو وہ پچھتر برس کے ہوئے تھے۔ اس طرح ان کے صحیح سال پیدائش تک پہنچنے کے لیے ہمیں یا تو ۱۹۷۰ء میں سے پچھتر نفی کرنے چاہییں یا پھر ۱۹۷۱ء میں سے چھہتر کیونکہ ۱۳- اپریل ۱۹۷۱ء کو ان کی عمر چھہتر برس ہوگی۔ مندرجہ بالا دیگر حوالوں کی بھی یہی صورت ہے۔

اس طرح گویا ہم مولانا مہر کی صحیح تاریخ پیدائش تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب بھی بعض حوالے ایسے ضرور ہیں جن کے پیش نظر حتمی طور پر کچھ کہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ مثلاً عمر ہی کے حوالے سے مولانا مہر نے شیر بہادر پنی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

"عمر کے ستتر سال بارہ یا پندرہ مئی کو پورے ہوگئے۔ اٹھترویں میں قدم ہے۔ ضعف کا جلد دور ہونا کیونکر ممکن ہے؟ تاہم بالفعل بفضل اللہ اچھا ہوں۔"[1]

اس خط کے علاوہ انھوں نے اپنے پاسپورٹ پر بھی اپنی تاریخ پیدائش اپریل ۱۸۹۴ء درج کرائی تھی اور خلیل الرحمٰن داؤدی نے بھی 'شخصیات نمبر' میں جو ماہ و سال پیدائش درج کیا تھا، وہ مئی ۱۸۹۴ء ہی ہے۔ لیکن اول تو اسے ہم ان کے حساب میں کمزوری قرار دے سکتے ہیں، دوسرے ان تین حوالوں کے بعد جتنے بھی حوالے ہیں وہ سب کے سب ۱۸۹۵ء ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ گویا ان کی زیادہ یقینی تاریخ پیدائش تیرہ اپریل ۱۸۹۵ء قرار پائے گی، اور یہ تاریخ پروفیسر محمد ایوب قادری کے نام خط اور یوسف طاہر کی تحریر کردہ تاریخ سے بھی بڑی حد تک قریب ہے۔

۱۔ مکتوب بنام شیر بہادر پنی، مرقومہ ۲۶ - جون ۱۹۷۱ء، مشمولہ و مطبوعہ 'افادات مہر' ص ۴۵۔

یہاں پر ایک اور امر کی جانب اشارہ کر دینا چاہیے اور وہ یہ کہ طاہر یوسف سے صحیح تاریخ تک پہنچنے میں اصل غلطی اسی بنا پر ہوئی کہ انھوں نے دیگر حوالوں کو نظر انداز کرکے صرف یومِ پیدائش کو سامنے رکھا اور اسی سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ کیونکہ بقول ان کے مولانا مہر اپنا یومِ پیدائش جمعرات بتایا کرتے تھے ۔ لیکن مہینے کی کون سی جمعرات ؟ کیونکہ مہینے میں تو چار اور بعض اوقات جمعرات کا دن پانچ مرتبہ بھی آ سکتا ہے ۔ یعنی اٹھارہ اپریل سے پہلے بھی گیارہ اور چار اپریل کو جمعرات ہی کا دن تھا ، جبکہ اٹھارہ اپریل کے بعد پچیس اپریل کو جمعرات ہی تھی ۔ اب مشکل یہ ہے کہ اپریل ۱۸۹۵ء کی کون سی جمعرات کو مولانا مہر کا یومِ پیدائش قرار دے کر ان کی تاریخِ پیدائش طے کی جائے ۔

بہرحال یکم بیساکھ کے نمایاں ترین حوالے کی موجودگی میں کسی اور حوالے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور ہم بڑی حد تک تیرہ اپریل ۱۸۹۵ء کو مولانا مہر کی تاریخِ پیدائش قرار دے سکتے ہیں ۔

مولانا مہر ۱۳ ۔ اپریل ۱۸۹۵ء کو پھول پور میں اعوانوں کے گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ اعوان اپنے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا تعلق سرزمین عرب سے ہے اور وہ حضرت علیؓ کی غیر فاطمی اولاد سے ہیں ۔ عرب سے وہ نامعلوم وجوہ کے باعث افغانستان آئے اور یہاں سے محمود غزنوی کی افواج کے ساتھ ہندی اعوانوں کا مورثِ اعلیٰ میر قطب شاہ علوی ہندوستان آیا اور اپنے قبیلے کے ساتھ پنجاب میں آباد ہو گیا ۔[1] دلچسپ بات یہ ہے کہ خود غلام رسول مہر اعوان قوم کے بارے میں ان دعووں کی صحت کو تسلیم نہیں کرتے ۔ ایک زمانے میں انھوں نے اعوان قوم کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس سلسلے میں بہت سی متعلقہ کتب بھی جمع کر لی تھیں ، جن کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی تاریخ علمی اور تاریخی حوالوں سے مستند معلوم نہیں ہوتی ۔ بہرحال ان کی تحقیقات کا جو نتیجہ نکلا وہ مولانا مہر نے شیر بہادر پنی کے نام اپنے ایک خط میں کچھ یوں پیش کیا ہے :

۱۔ تاریخ الاعوان ، باب الاعوان ، زاد الاعوان اور زلزاد الاعوان میں یہی دعوے دہرائے گئے ہیں ۔

''قطب شاہ یا عون قطب شاہ کے باب میں یہ کہنا کہ وہ محمود غزنوی کے ساتھ آئے تھے ، صحیح نہیں ۔ غوری کے ساتھ آنا ممکن ہے ۔ اب مدت سے میری یہ رائے ہوگئی ہے کہ قطب شاہ بھی داتا گنج بخش کی طرح داعیِ اسلام تھے ۔ باہر سے آکر شمالی و مغربی پنجاب میں تبلیغ شروع کی اور ایک اچھا گروہ معاونین کا پیدا کر لیا ۔ چونکہ بعد میں یہ لوگ فوجی خدمات انجام دینے میں پیش پیش رہے اسی لیے خدماتِ عسکری کے سلسلے میں پیوند غزنوی سے ملایا گیا ۔''[۱]

صرف یہی نہیں بلکہ مولانا غلام رسول مہر موجود معلومات اور معلوم حقائق کی بنا پر اس دعوے کی تائید و حمایت کے لیے بھی بیّن اور محکم دلائل و براہین کا فقدان پاتے ہیں ، جس کی رو سے اعوان خود کو محمد حنفیہ، یا حضرت عباس علمدار کے وسیلے سے ، حضرت علیؓ کی غیرفاطمی اولاد قرار دیتے ہیں ۔ مولانا مہر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مختلف تاریخوں اور شجرہ ہائے نسب کو سامنے رکھنے کے باوجود عون قطب شاہ یا قطب شاہ کا سلسلہ حضرت علیؓ تک مسلسل نہیں ملتا، جس کی وجہ سے تاریخی سلسلے کی ترتیب میں خاصی گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا مہر کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ بحث بالکل بے معنی قرار پاتی ہے ، کیونکہ وہ ذات پات اور اس کے توسط سے ملنے والے اعزاز و افتخار کی بجائے عظمتِ انسان کے قائل تھے ۔ وہ عظمت جو انسانی اعمال کے باعث ان کو حاصل ہوتی ہے ، جیسا کہ وہ ۲۲ جون ۱۹۶۸ء کے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں :

''بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

میری فطرت ابتدائے شعور سے اسی مسلک پر چل رہی ہے اور حضرت رسولِ کریمؐ نے جو خطبۂ عالیہ فتحِ مکہ پر ارشاد فرمایا تھا ، پھر اسے تفصیل سے حجۃ الوداع میں کئی مرتبہ دہرایا ، ہمیں یہی سبق دیتا ہے یعنی نسب کا غرور مٹ گیا ۔ اب کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر ، شرقی کو غربی پر اور غربی کو شرقی پر، عربی کو عجمی پر

۱۔ افاداتِ مہر ، از ڈاکٹر شیر بہادر پنی ، ص ۱۶۸ ۔

اور عجمی کو عربی پر کوئی شرف نہیں الا بالتقویٰ ۔ سب آدم کی اولاد ہیں ۔"۱

لیکن چونکہ قرآن کے مطابق بھی ان قبیلوں اور قومیتوں کی ایک اہمیت ہے اور یہ بہرحال معاشرے میں انسان کی شناخت و پہچان کا موجب بنتی ہیں ، لہذا مولانا غلام رسول مہر کو بھی اسی اعتبار سے اپنی قوم و قبیلے کی فلاح و بہبود سے ایک حد تک دلچسپی تھی ، جس کے باعث وہ نہ صرف اپنی قوم کے رسالے "الاعوان" کے لیے مضامین لکھتے تھے بلکہ اعوان برادری کی تنظیم سے بھی وابستہ تھے اور کئی مرتبہ اس کے عہدے دار بھی رہے ۔ بعض اوقات اعوان برادری کے اجتماعات بھی مولانا کے گھر پر ہوتے جن میں مختلف مسائل زیر بحث آیا کرتے تھے ، جیسا کہ شیر بہادر پنی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"آج میرے ہاں اعوان بھائیوں کا اجتماع تھا جو اپنی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں اور مستند تاریخ ۔"۲

مولانا مہر کو اعوان قوم کی فلاح و اصلاح اور خدمت کا یہ جذبہ ورثے میں ملا تھا ۔ ان کے دادا چودھری نظام دین اگرچہ ان پڑھ تھے ، اس کے باوجود وہ اپنے ذاتی اوصاف اور برادری کے لیے خدمات کی بنا پر جالندھر کے اعوانوں میں ایک نمایاں اور امتیازی مقام رکھتے تھے ۔ وہ اپنی قوم کی معاشرتی اصلاح کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ ان سب رسومات کو ترک کر دیا جائے جو لاحاصل بھی تھیں اور اپنے اسراف کے باعث معاشرتی و معاشی طور پر تباہ کن بھی ۔ اس کے لیے چودھری نظام دین نے اپنے علاقے کے دیگر اعوان معززین کو بھی اپنے ساتھ ملایا اور پوری برادری کے نمائندوں کے ساتھ صلاح و مشورہ کے بعد ایک پروگرام مرتب کیا ۔ پروگرام پر عمل درآمد کے لیے ان نمائندوں سے وثیقے لکھوائے گئے ۔ معاشرتی اصلاح کا جو پروگرام طے پایا تھا اس کی تفصیل یوسف طاہر نے اس طرح پیش کی ہے :

۱۔ مکتوب بنام شیر بہادر پنی ، مشمولہ و مطبوعہ افاداتِ مہر ، ص ۱۶۹ ۔
۲۔ افاداتِ مہر ، مرتبہ شیر بہادر پنی ، ص ۲۱۱ ۔

"مستورات شرعی پردہ کریں ۔ کھیتوں میں کھیتی باڑی اور بازاروں میں سودا سلف خریدنے نہ جائیں ۔ شادی بیاہ کی رسموں میں کم سے کم خرچ کیا جائے ۔ اس کے علاوہ دوسری مسرفانہ رسومات بھی ترک کر دی جائیں ۔"[1]

حیران کن بات یہ ہے کہ پوری قوم کی فلاح و بہبود کا خواہاں خود اپنے گھرانے اور خاندان کی بہتری سے غافل ہو گیا تھا ۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے چودھری محمد علی خاں کی تعلیم پر مطلق توجہ نہ دے سکے ۔ لیکن اس کی تلافی خود چودھری محمد علی خاں نے کر دی ۔ انھوں نے ورثے میں حاصل ہونے والی زرعی زمین میں اضافہ کر کے اپنے خاندان کو نمایاں مقام دلانے کی کوشش کی ۔ مولانا مہر کو جو زمین ورثے میں ملی اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

"دیہاتی زندگی میں زرعی زمین سب سے بڑی دولت ہے ۔ جو زمین مجھے میراث میں ملی وہ ہمارے گاؤں یا آس پاس کے معیاروں کے مطابق خاصی تھی ۔"[2]

اس "خاصی" زرعی اراضی کے پیش نظر مولانا مہر کا گھرانہ اپنے اردگرد کے علاقے میں معزز تصور کیا جاتا تھا ، جیسا کہ مولانا مہر اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں :

"میرا گھرانہ زمینداروں کا تھا جو اپنے دائرے میں خاصے معزز تھے ۔"[3]

اس گھرانے کو یہ اعزاز اسی مالی و معاشی استحکام سے حاصل ہوا جس کی طرف چودھری محمد علی خاں نے زرعی زمین میں اضافے کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قدم بڑھایا تھا ۔ لیکن چودھری محمد علی خاں کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر توجہ دی ۔ اس بیٹے کی تعلیم پر جو بعد ازاں اپنی ہمہ جہت صلاحیتوں کی بنا پر زندگی کے مختلف میدانوں میں نمایاں ہو کر مولانا غلام رسول مہر کے نام سے مشہور ہوئے ۔

۱۔ مولانا غلام رسول مہر ، از محمد یوسف طاہر ، ص ۲ ۔
۲۔ مکتوب بنام ابو سلمان شاہجہان پوری ، غیرمطبوعہ (خط پر تاریخ درج نہیں) ۔
۳۔ افادات مہر ، از شیر بہادر پنی ، ص ۲۹ ۔

مولانا مہر کی تعلیم پر توجہ دینے کے یوں تو بہت سے اسباب و محرکات ہو سکتے ہیں لیکن ان میں ایک بہت بڑا سبب یقینی طور پر یہ رہا ہوگا کہ چودھری محمد علی خان خود دولتِ علم سے محروم تھے اور اس محرومی کا انھیں احساس بھی تھا جس کے اظہار نے مختلف شکلیں اختیار کیں ۔ مثلاً یہ کہ اول تو دیہاتی فضا میں تعلیم و تعلم کا چرچا نہ ہونے کے باوجود انھوں نے حتی المقدرت خود شعر و ادب سے لگاؤ پیدا کیا جس کے باعث انھیں اردو اور فارسی کے بے شمار شعر یاد ہوگئے۔ دوسرے مولانا مہر کی تعلیم پر خصوصی توجہ مبذول کی ۔ لیکن چونکہ پھول پور میں ابتدائی تعلیم کے لیے بھی کوئی معقول انتظام نہیں تھا ، لہذا انھوں نے اپنے کمسن بیٹے کو اپنے سسرالی گاؤں گھانبرا[1] کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا ۔ مولانا مہر تعلم کے آغاز اور اس دیہاتی مدرسے کے علاوہ اپنے اساتذہ اور تعلیمی مشاغل سے ان کے والہانہ عشق کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں :

"تعلیم کا آغاز ایک دیہاتی مدرسے سے ہوا جو میرے گاؤں سے قریب کے ایک گاؤں میں تھا ۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ہمارے اساتذہ تعلیمی مشاغل سے والہانہ عشق رکھتے تھے ۔ اُن کی زندگی کا واحد مقصد طلبا کی شخصیت میں اپنے آپ کو جذب کر دینا تھا ۔ پرائمری درجے تک بلا مبالغہ دن میں ہمیں بارہ بارہ گھنٹے پڑھاتے تھے اور سردیوں کے موسم میں تو رات کے وقت بھی دو تین گھنٹے محنت کراتے تھے ۔ ہم سوتے بھی سکول ہی میں تھے ۔ ان اساتذہ کی صحبت میں محنت و ریاضت کی جو عادت پڑی وہ بفضلِ الٰہی آج تک قائم ہے ۔ ایسے محنتی اور فرض شناس اساتذہ اب کمیاب ہیں ۔ مجھے اسکول اور کالج میں بھی ایسے اساتذہ کے زیرِسایہ تعلیم و تربیت کا موقع ملا جن کی

۱۔ شفیق چودھری نے مولانا مہر پر اپنے مضمون ، مطبوعہ روزنامہ 'مشرق' کراچی ، ۲۳ نومبر ۱۹۷۱ع میں اس گاؤں کا نام "البرہ" بتایا ہے جبکہ مولانا مہر کے صاحبزادے عبدالسلام اسلم نے ایک انٹرویو میں اس کا نام "کھالبرا" بتایا ۔ یوسف طاہر نے بھی اپنے تحقیقی مقالے میں یہی نام دیا ہے ۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ یہ گاؤں پھول پور سے ایک میل کے فاصلے پر تھا ۔

زندگی کا نصب العین طلبا کی فلاح و بہبود تھا ۔"[۱]

لیکن مولانا غلام رسول مہر ابھی تعلیمی سفر کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر پائے تھے کہ چودھری محمد علی خان بیٹے کی تکمیلِ تعلیم کی حسرت لیے دارِ فانی سے کوچ کر گئے ۔ مولانا مہر اس حادثۂ فاجعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میرے والد کا انتقال اُس زمانے میں ہو گیا تھا جب میں گیارہ سال کا تھا اور میں ہی ان کی اولاد میں سب سے بڑا تھا ۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن تھی جو اب بھی زندہ ہے ۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی تھا جس کا انتقال ۱۹۶۸ء میں ہوا ۔[۲] اس سے چھوٹی ایک بہن

۱۔ غلام رسول مہر ، انٹرویو از الطاف حسن قریشی ، ص ۲۲ ، اردو ڈائجسٹ اگست ۱۹۶۱ء ۔

۲۔ مولانا مہر کے بھائی کا اصل نام غلام محی الدین تھا جبکہ ان کی والدہ انھیں اپنی آسانی کی خاطر امیر احمد کہنے لگی تھیں اور بعد ازاں یہی نام مشہور ہو گیا ۔ امیر احمد علوی تقسیمِ ملک سے قبل شملہ کے مضافات میں ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے ۔ قیامِ پاکستان کے بعد اوکاڑہ (مغربی پنجاب) میں آباد ہوئے ۔ امیر احمد علوی بہت اچھا شعری ذوق رکھتے تھے اور ان کی نظمیں روزنامہ "انقلاب" میں شائع ہوتی رہتی تھیں ۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اپنی تاریخِ پیدائش کی طرح امیر احمد علوی کی تاریخِ وفات لکھتے ہوئے بھی مولانا مہر سے تسامح ہوا ہے ۔ مندرجہ بالا اقتباس کے علاوہ ابو سلمان شاہجہان پوری کے نام ایک خط میں بھی مولانا مہر نے امیر احمد علوی کا یہی سالِ وفات درج کیا ہے ، جبکہ نیر سلطانہ نے مولانا مہر پر اپنے تحقیقی مقالے میں ان کا سالِ وفات ۱۹۶۹ء تحریر کیا ہے ، اور یہی درست ہے ۔ کیونکہ مولانا اپنے ایک خط میں سید قدرت نقوی کو لکھتے ہیں :

"۸ مارچ کو میرے بھائی کا انتقال ہو گیا ۔ یہ حادثہ یکایک اور اچانک پیش آ گیا ۔ اس کی وجہ سے پریشان حال تھا ۔"

مولانا نے یہ خط ۷ ۔ اپریل ۱۹۶۹ء کو لکھا جبکہ اس کے جواب میں سید قدرت نقوی نے ۱۱ ۔ اپریل ۱۹۶۹ء کو ایک تعزیتی خط مولانا مہر کو بھیجا ۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ امیر احمد علوی کی تاریخِ وفات ۸ ۔ مارچ ۱۹۶۹ء ہے ۔

تھی[1] جو بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی فوت ہو گئی تھی ۔"[2]

پس ماندگان میں ان چار بہن بھائیوں کے علاوہ مولانا مہر کی والدہ "فاطمہ بی بی" اور ان کی دادی "جیونی" بھی شامل تھیں ۔ لیکن چونکہ ان پسماندگان میں یا تو وہ عورتیں تھیں جو باہمت اور حوصلہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ موت و حیات کے اسرار و رموز اور اس سلسلے میں انسان کی مجبوری و بیچارگی سے بڑی حد تک واقف تھیں یا پھر وہ بچے جن کے نزدیک اس سانحہ کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی ۔ لہذا چودھری محمد علی خاں کے انتقال کا سب سے زیادہ اثر مولانا مہر پر ہی ہوا ، جس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مجھے اُس وقت نیک و بد کی تمیز ہی نہیں تھی ۔ صرف جذباتی دور تھا اور میں بہت رویا ۔ حتیٰ کہ گاؤں میں جدھر نکلتا تھا لوگ از راہِ ہمدردی مجھے پکڑ پکڑ کر بیٹھ جاتے اور پھر گریے کا دور شروع ہو جاتا ۔"[3]

ان حالات میں ممکن تھا کہ مولانا مہر کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا لیکن ایسے میں وہ وصیت کام آئی جو چودھری محمد علی نے بسترِ مرگ پر کی تھی۔ یہ وصیت مولانا مہر کی تعلیم سے متعلق تھی ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا کے والد نے گھر کے کسی اور معاملے و مسئلے کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کی ، البتہ اپنی پہلی بیوی اور برادرِ نسبتی چودھری خیرالدین کو مولانا مہر کی تعلیم جاری رکھنے کی تاکید کر گئے ۔ اس بارے میں خود مولانا مہر لکھتے ہیں :

"میری والدہ اور میرے ماموں کو صرف میرے متعلق وصیت کی کہ میرے اس بچے کی تعلیم میں کوئی خلل نہ آئے ۔ یہ جتنا پڑھ سکے اسے پڑھایا جائے ۔ حالانکہ وہ خود ناخواندہ تھے اور میری والدہ بھی ناخواندہ تھیں ۔"[4]

۱۔ مولانا مہر نے ابو سلمان شاہجہان پوری کے نام اپنے ایک غیر مطبوعہ خط میں اپنی چھوٹی بہن کا سالِ انتقال ۱۹۱۷ء لکھا ہے ۔ اس بہن کا نام نور بیگم تھا ، جبکہ بڑی بہن کا نام مراد بیگم تھا ۔

۲۔ افاداتِ مہر ، از شیر بہادر پنی ، ص ۳۰ ۔

۳۔ مکتوب بنام ابو سلمان شاہجہان پوری ، غیر مطبوعہ (تاریخ درج نہیں) ۔

۴۔ افاداتِ مہر ، از شیر بہادر پنی ، ص ۳۱ ۔

اسی طرح الطاف حسن قریشی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے مولانا مہر نے بتایا :

''والد صاحب کو میری تعلیم کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپی تھی ۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں اپنے بچے کو ولایت تک تعلیم دلاؤں گا . . . مرتے وقت انھوں نے صرف ایک وصیت کی جو محض میرے متعلق تھی ۔ وہ یہ کہ خواہ کوئی صورت پیش آ جائے ، میرے بچے کو ضرور اعلیٰ تعلیم دلوائی جائے اور جتنا بھی خرچ کرنا پڑے ، بے دریغ کیا جائے ۔''[۱]

مندرجہ بالا اقتباس میں ''محض میرے متعلق'' کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ابو سلمان شاہجہان پوری کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں :

''میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ وصیت چھوٹوں کے لیے خصوصاً لڑکیوں کے لیے ہونی چاہیے تھی ، تاہم قدرت کا یہ فعل کسی نہ کسی مصلحت پر مبنی تھا ۔ یہی وصیت میری تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا سب سے بڑا سبب بن گئی ۔ میری والدہ مرحومہ نے جس عزم کے ساتھ اس کی تکمیل کی وہ ایک الگ داستان ہے ۔''[۲]

والدہ کی ہمت اور اولوالعزمی نے وہ سب رکاوٹیں دور کر دیں جو مولانا کے لیے حصول علم کے مراحل میں پیش آ سکتی تھیں ۔ اس لیے کھالبرا سے پرائمری درجہ پاس کرنے کے بعد انھوں نے مشن ہائی سکول جالندھر میں داخلہ لے لیا اور ایک بورڈنگ ہاؤس میں اقامت اختیار کرلی ۔ مولانا مہر کچھ عرصہ تو مشن ہائی سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہے ، پھر اسلامیہ بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہو گئے ۔ اس سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

''میں مشن ہائی سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا ۔ پھر اسلامیہ بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہو گیا ۔ اس لیے کہ اس کا فاصلہ ہمارے سکول سے صرف ایک فرلانگ تھا ۔''[۳]

۱۔ غلام رسول مہر ، انٹرویو از الطاف حسن قریشی ، ص ۲۲ ، اردو ڈائجسٹ ، اگست ۱۹۶۱ع ۔
۲۔ مکتوب بنام ابو سلمان شاہجہان پوری ، غیر مطبوعہ (تاریخ درج نہیں ہے) ۔
۳۔ اقبال پر مولانا مہر کے ایک غیرمطبوعہ مضمون سے اقتباس ۔

اسلامیہ بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کے سپرلٹنڈلٹ مولانا مہر کے عزیز تھے ۔ غالباً اسی بنا پر مولانا کے صاحبزادے عبدالسلام اسلم کو یہ شبہ ہوا کہ مولانا مہر قیامِ جالندھر کے زمانے میں کسی بورڈنگ ہاؤس کی بجائے ایک عزیز کے ہاں اقامت گزیں ہوئے تھے ۔[1]

بہرحال یہ امر زیادہ بحث طلب نہیں ہے کہ مشن ہائی سکول جالندھر کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا مہر نے کہاں اقامت اختیار کی ؟ البتہ اس کا ذکر ضروری ہے کہ یہی زمانہ ہے جس میں مولانا مہر نے ایک فنکار کی حیثیت سے قلم و قرطاس سے رشتہ استوار کیا اور شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے ۔[2]

اگرچہ مولانا مہر نے زیادہ تر شہرت نثر نویس کی حیثیت سے پائی ، لیکن ان کے رشحاتِ فکر کے ابتدائی نمونے نظم ہی کی صورت میں ملتے ہیں ۔ شعر گوئی کی ابتدا کے بارے میں خلیل الرحمٰن داؤدی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

''شعرگوئی کا ذوق زمانۂ طالب علمی ہی میں پیدا ہوگیا تھا ۔ ابھی مہر نویں جماعت ہی میں تعلیم پا رہے تھے کہ مشغلۂ سخن طرازی اپنے شباب پر پہنچ چکا تھا ۔''[3]

شعرگوئی کے آغاز کے بارے میں مولانا مہر نے الطاف حسن قریشی کو مزید بتایا :

''شعر و شاعری سے مجھے فطری لگاؤ تھا ۔ اشعار مجھے اس وقت بھی اچھے لگتے تھے جب مجھے انھیں سمجھنے کا شعور نہیں تھا . . . مجھے سب سے پہلے ضامن کا دیوان پڑھنے کا موقع ملا ، جو غالباً تین آنے کا ملتا تھا ۔ میں اس کی غزلوں پر غزلیں کہتا تھا ۔ پھر میں نے غالب

۱۔ عبدالسلام اسلم سے ایک انٹرویو ۔

۲۔ ''غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں'' مرتبہ ڈاکٹر عبدالشکور احسن و سجاد باقر رضوی ، ص ۳۱ ، اشاعتِ اول ۱۹۶۹ع ، مطبوعات مجلس یادگارِ غالب ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۔

۳۔ غلام رسول مہر ، از خلیل الرحمٰن داؤدی ، ''نقوش'' شخصیات نمبر ۱ ، ص ۶۳۷ ۔

کے دیوان کا ایک حصہ اپنے اُستاد مولانا حکیم محمد سلیم مرحوم (ساکن بستی غزنوی[1]) سے سبقاً سبقاً پڑھا ۔ اس وقت غالب کے ساتھ جو وابستگی پیدا ہوئی اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے ۔ ایک مرتبہ ناسخ کے دونوں دیوانوں کو دس آنے میں خریدا ۔ اس طرح شاعری کا سلسلہ جاری رہا ۔ یہاں تک کہ سیاسی اور صحافتی سرگرمیاں میری زندگی کے دائرۂ مشاغل پر غالب آ گئیں ۔''[2]

مشن ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے مولانا مہر لاہور آ گئے اور یہاں انھیں اسلامیہ کالج میں داخلہ ملا ۔ اسلامیہ کالج میں داخلہ لینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں :

''میرے ایک عزیز پہلے ہی سے اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے ۔کچھ تو ان کی کشش مجھے یہاں لے آئی اور پھر یہ بات بھی تھی کہ میں نے تھرڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا ۔ گورنمنٹ کالج اور کرسچین کالج میں تھرڈ ڈویژن والے کو کون پوچھتا ؟ اس لیے اسلامیہ کالج میں داخلہ لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا ۔''[3]

مہر صاحب نے اپریل ۱۹۱۰ع میں اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور تقریباً پانچ سال بعد ۱۹۱۵ع میں یہاں سے بی ۔ اے کی ڈگری لی ۔ جیسا کہ پہلے ایک جگہ ذکر آ چکا ہے ، مولانا مہر ایف ۔ اے کے امتحان میں ریاضی کے مضمون میں ناکام ہو گئے تھے اس لیے کالج سے چار سال کی بجائے پانچ سال تک ان کا تعلق

۱۔ حکیم محمد سلیم کے گاؤں کا نام مولانا نے اپنے ایک سوانحی نوٹ میں ، جو ۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ع کے ہفت روزہ چٹان میں مولانا مہر کے انتقال کے بعد ''اپنی کہانی اپنی زبانی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا ''بستی غزاں'' بتایا ہے ۔ جبکہ ''غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں'' کے صفحہ نمبر ۱۱ میں بھی مولانا مہر نے بستی کا یہی نام لکھا ہے ۔

۲۔ غلام رسول مہر ، از الطاف حسن قریشی ، ص ۲۳ - ۲۴ ، اردو ڈائجسٹ ، اگست ۱۹۶۱ع ۔

۳۔ اسلامیہ کالج کے فرزندانِ لاہور ، مطبوعہ مجلہ ''فاران'' ، ص ۴۷ ۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور ، جنوری ۱۹۶۲ع ۔

رہا ۔ ایف ۔ اے میں ریاضی کے علاوہ انگریزی ، تاریخ اور فارسی ان کے خاص مضامین تھے ، جبکہ بی ۔ اے میں اول تو حساب سے ان کی جان چھوٹ گئی ۔ دوسرے انھوں نے اپنا پسندیدہ مضمون تاریخ بھی چھوڑ دیا ۔ گویا اب ان کے خاص مضامین انگریزی ، فارسی اور فلسفہ تھے ۔

مولانا مہر زمانۂ طالب علمی میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے ۔ ان سرگرمیوں کے ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر تو مولانا مہر کی شاعری تھی جس کی ابتدا نویں جماعت ہی سے ہو چکی تھی ۔ اسلامیہ کالج کے زمانۂ طالب علمی میں اول تو لاہور کی ادبی و شعری فضا ، دوسرے خواجہ دل محمد ایسے کہنہ مشق شاعر کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے مولانا مہر کے اس شوق کو مزید جلا دی ۔ ۱۹۱۱ع سے انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں اقبال کی نظم خوانی کا وہ سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا جو ۱۹۰۵ع میں سفرِ یورپ کے باعث معطل ہو گیا تھا ۔ انجمن کے جلسوں میں اگرچہ اور بہت سے شاعر بھی شریک ہوتے تھے لیکن اس سلسلے میں جو شہرت علامہ اقبال کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نہیں ملی ۔ اس وقت تک مولانا مہر طالب علموں کے حلقے سے باہر بھی ایک اچھے اور خوش گو طالب علم شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے ۔ غالباً اسی بنا پر ۱۹۱۲ع میں انجمن کی طرف سے مولوی نذیر احمد کی وفات پر منعقد ہونے والے تعزیتی جلسے میں مولانا مہر کو بھی نظم سنانے کا موقع دیا گیا ۔

غیر نصابی سرگرمیوں کے ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولانا مہر کالج میں ہونے والے مباحثوں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے ۔ لیکن ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا ، البتہ جس چیز سے انھیں دلچسپی تھی وہ کرکٹ کا کھیل تھا ۔ کرکٹ سے اپنی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں :

> ”مجھے کرکٹ کا شوق تھا ، میں کالج کی کرکٹ الیون میں شامل تھا ۔“[1]

ریواز ہوسٹل ، جس میں مہر صاحب اپنے زمانۂ طالب علمی کے پانچ برسوں میں اقامت گزیں رہے ، بعض اساتذہ سے کسبِ فیض کا ذریعہ بھی بنتا رہا ۔ اس

۱۔ اسلامیہ کالج کے فرزندانِ نامور ، مجلہ فاران ، اسلامیہ کالج لاہور ، ص ۵۶-۵۷ ۔

سلسلے میں مولانا مہر مولانا اصغر علی روحی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں :

''حضرت مولانا روحی صاحب . . . عربی کے پروفیسر تھے اور ایم ۔ اے وغیرہ کو پڑھاتے تھے ۔ لیکن مجھے ان سے کسبِ فیض کے بہت مواقع ملتے رہے ۔ وہ عالم نہیں ، علامہ تھے ۔ کالجوں کے شہر میں بھی ایسے جید عالم کم ہی نکلیں گے۔ مولانا حقےکا شوق فرماتے تھے ۔ ان کا معمول تھا کہ کلاس سے فارغ ہو کر ہوسٹل میں آ جاتے ۔ میں باہر صحن میں کرسی ڈال دیتا اور حقہ بھرکر رکھ دیتا ۔ مختلف علمی و ادبی مسائل پر گفتگو چھیڑ کر ان کی باتیں سنا کرتا تھا ۔ کالج کی تعلیم ختم ہونے کے بعد بھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور یہ تعلق عمر بھر قائم رہا ۔''۱

باقاعدہ طور پر پڑھانے والے اساتذہ میں ، کالج کے پرنسپل مسٹر ہنری مارٹن، پروفیسر ایم ۔ اے غنی ، خواجہ دل محمد اور مولانا محمد عمر خاں سے مولانا مہر خاص طور پر متاثر ہوئے ۔ پروفیسر ہنری مارٹن انگریزی اور اکنامکس، ایم ۔ اے غنی انگریزی ، خواجہ دل محمد ریاضی اور مولانا محمد عمر خاں فارسی پڑھایا کرتے تھے ، جبکہ مولانا مہر نے فلسفہ مسٹر ماتھر سے پڑھا ۔ مولانا مہر اپنے فارسی کے استاد مولانا محمد عمر خاں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مجھے عرفی کے قصائد سے بہت دل بستگی تھی ، اس کے دیوان سے نہیں۔ دیوان کی طرف توجہ میرے مکرم استادِ فارسی مولانا محمد عمر خاں نے منعطف کرائی ، جن سے میں نے ایف ۔ اے میں فارسی پڑھی تھی ۔ ان کا وطن ٹونک تھا ۔ معلوم نہیں اب زندہ ہیں یا نہیں بلکہ اس سلسلے میں عرفی کا جو شعر سنا کر مجھے دیوان دیکھنے کی تاکید کی تھی وہ اب تک یاد ہے :

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی
تو از قبیلۂ عشقی ، وظیفہ ات غزل است''۲

۱۔ اسلامیہ کالج کے فرزندانِ نامور ، ''فاران'' لاہور ، ص ۵۱ - ۵۲ ۔
۲۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، غیر مطبوعہ ، محررہ ۲۸ جنوری ۱۹۶۶ء ۔

مولانا محمد عمر خاں وہی مشفق استاد ہیں جنھوں نے فارسی میں مہر صاحب کی علمیت و لیاقت دیکھتے ہوئے ان پر سے کلاس میں حاضر رہنے کی پابندی اٹھالی تھی[1] - یہی ریواز ہوسٹل کے انچارج بھی تھے جہاں ایک دفعہ انھوں نے مولانا مہر کی تند و تیز گفتگو پر انھیں ڈانٹا ، لیکن اگلے روز وسعتِ ظرف سے کام لیتے ہوئے اپنے طالب علم سے خود ہی معافی مانگ لی - ان کی یہی شفقت تھی جو طالب علموں کو متاثر کرتی تھی اور جس کی وجہ سے ندامت کے باعث خود مولانا مہر کی آنکھیں بھی پُرنم ہو گئی تھیں -[2]

اسلامیہ کالج لاہور کا زمانۂ طالب علمی اگرچہ صرف پانچ برسوں پر محیط ہے لیکن یہ مہر صاحب کی زندگی میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے - اس دور میں مولانا مہر بعض ایسے ذہنی انقلابات سے دو چار ہوئے جنھوں نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا - یہ تمام عرصہ اس شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کام آیا جو آگے چل کر ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' کے مدیر کی حیثیت سے مشہور ہوئی اور جس نے علامہ اقبال کے تصورِ پاکستان کے شارح کی حیثیت حاصل کی -

یہ بات قابلِ غور ہے کہ آخر وہ کون سے عناصر و عوامل تھے جنھوں نے ایک دیہاتی اور ان پڑھ گھرانے سے تعلق رکھنے والے شخص کو بہت جلد ممتاز افراد کی صف میں لا کھڑا کیا - اس کا ذکر آ چکا ہے کہ بی - اے میں مولانا مہر نے اپنے پسندیدہ اور حسبِ ذوق مضمون یعنی تاریخ کو نظر انداز کرکے فلسفے کا مضمون پسند کیا تھا - اس معمولی سی تبدیلی کا جو اثر تھوڑے ہی عرصے بعد سامنے آیا وہ یہ تھا کہ فلسفے نے اپنے اقتضا کے عین مطابق مولانا مہر سے یقینِ محکم کی وہ دولت چھین لی جو انھیں آباء و اجداد سے ورثے میں ملی تھی- فلسفہ شک سے شروع ہوتا ہے اور شک ہی اس کا انجام بھی ہے - مولانا مہر پر بھی اس کا اثر ہوا اور وہ بھی دیگر بہت سے ''فلسفیوں'' کی طرح ایمان و ایقان کی اس دولت سے محروم ہو گئے ، جس کے بغیر انسان خدا کے تصور تک سے باغی و برگشتہ ہو جاتا ہے - ہوش سنبھالنے کے بعد مولانا مہر کی زندگی کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب انھوں نے نماز سے بھی قطع تعلق کر لیا - لیکن

۱- غلام رسول مہر ، انٹرویو الطاف حسین قریشی ، ص ۲۳ ، اردو ڈائجسٹ لاہور -

۲- مجلہ فاران ، ص ۵۳ -

تشکیک کا یہ دور بہت جلد گزر گیا - اس سلسلے میں مولانا مہر اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں :

''ابتدا میں خوش عقیدہ اور تنگ نظر مسلمان تھا اور جو عقائد و اعمال مجھے ورثے میں ملے تھے ، حق الٰہی میں محصور سمجھتا تھا - کالج میں پہنچا اور فلسفہ پڑھا تو خیالات میں ''آزادی'' پیدا ہوئی جس پر اب غور کرتا ہوں تو وہ ''آوارگی'' نظر آتی ہے اور کچھ مدت کے لیے نماز سے بھی محروم رہا -

فروری ۱۹۱۵ع میں بی - اے کے امتحان میں تین مہینے باقی تھے ، بیٹھے بیٹھے یکایک خیال آیا کہ میں سخت گناہ گار ہوں اور نماز شروع کر دی - خدا کا شکر ہے کہ اب تک اس میں خلل نہیں آیا - ممکن ہے کہ بے وقت بھی نمازیں پڑھی ہوں - بعض اوقات جمع بھی کیں - مگر اپنی یاد کی حد تک قضا کوئی نہیں کی - صرف آٹھ روز کی مدت ایسی ہے کہ میں سخت بیمار ہو گیا تھا اور بڑی حد تک بے ہوش رہا - یہ یاد نہیں کہ ان دنوں میں بھی نماز پابندی سے پڑھی گئی یا نہیں -''[1]

دراصل بعض شخصیات کی تعلیم و تربیت کا اہتمام فطرت خود کرتی ہے اور جب یہ لوگ بھٹکنے لگتے ہیں تو ان کو راہ پر لانے کا فریضہ بھی یہ خود ہی انجام دیتی ہے - یہی صورت مولانا مہر کے ساتھ پیش آئی - مولانا نے ریواز ہوسٹل کے صحن میں چند طالب علموں کو نماز کے لیے صف آراء دیکھا تو ان کے ذہن میں خیال آیا کہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ میں اپنی فلسفہ زدگی کے باعث اس خوبصورت عمل سے محروم ہو گیا ہوں - غالباً یہ لمحہ ہدایت کا لمحہ تھا اور خیال محض لمحاتی نہیں تھا لہٰذا وضو کرکے جماعت میں شامل ہو گئے اور وہ سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا جس کا آغاز پھول پور میں ہوا تھا - گویا مولانا مہر طالب علمی کے دور ہی میں تشکیک و تکفیر کے دائروں سے دامن بچا کر اس راہ پر آ گئے جسے ''صراطِ مستقیم'' کا نام دیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مولانا مہر کی زندگی کا ایک نہایت اہم موڑ تھا جس سے وہ اپنی سلامتیِ طبع کے ساتھ بہ آسانی گزر گئے -

---

۱- مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، مرقومہ ۲۰ مارچ ۱۹۶۲ع ، غیر مطبوعہ -

مولانا مہر کی آئندہ زندگی کے خطوط متعین کرنے والا دوسرا اہم واقعہ مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا تعلق ہے ۔ دراصل یہ پورا عہد ہی چار پانچ مسلمانوں کا دور کہلانے کا مستحق ہے ۔ سرسید ، حالی ، شبلی ، نذیر اور اکبر زمین شعر و سیاست میں جو بیج بو گئے تھے وہ اب گلستان کی شکل اختیار کر چکے تھے جس کے مہکتے ہوئے پھولوں میں حضرت علامہ اقبال ، مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا محمد علی جوہر ، حسرت موہانی اور ظفر علی خان کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ، جنھوں نے خیبر پاس سے راس کماری تک ملتِ اسلامیہ کے ایک ایک فرد کے دل میں اپنی تحریر و تقریر اور شعر و شاعری سے ایک آگ سی لگا دی تھی ۔ مولانا مہر بھی ان لوگوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ ان بزرگوں کے اثرات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''دراصل وہ ہماری قومی زندگی کا بڑا ہنگامہ آفریں دور تھا ۔ طرابلس کی جنگ چھڑ گئی تھی ۔ مولانا ظفر علی خان نے 'زمیندار' کو ہفت روزہ سے روزنامہ بنایا اور اس کے ذریعے بیداری کا صور پھونکا ۔ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار 'کامریڈ' اور مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' نے قومی جذبات میں ایک تلاطم کی کیفیت پیدا کر دی ۔ ہماری ذہنی تربیت میں ان اخبارات کا بڑا حصہ ہے ۔ مولانا ظفر علی خان کی پرجوش تحریروں اور شعلہ بار تقریروں نے عوام میں بڑی زندگی پیدا کی ۔ درحقیقت مولانا کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کا کوئی جواب نہیں ۔''[1]

اسی طرح حضرت علامہ اقبال کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''کالج کا زمانہ تھا ، ہوسٹل کی زندگی تھی ۔ ڈاکٹر اقبال ہر سال انجمن کے جلسے میں قومی نظم پڑھا کرتے تھے ۔ ہوسٹل کی فضا زمین سے آسمان تک اقبال کے ترنم اور اقبالی روح سے معمور نظر آیا کرتی ۔ کوئی وقت نہ ہوگا جب کوئی نہ کوئی شکوہ ، جوابِ شکوہ یا شمع و شاعر گاتا سنائی نہ دیتا ہو ۔''[2]

۱۔ مجلہ فاران ، ص ۵۵ ۔

۲۔ لاہور عجم نمبر ، روزنامہ انقلاب لاہور ، ۱۷ جولائی ۱۹۲۷ء ۔

علامہ اقبال اور ظفر علی خان کے بعد مولانا مہر جس تیسری عظیم شخصیت سے متاثر ہوئے وہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے ، جنھوں نے اس دور میں 'الہلال' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تو شہرت حاصل کی ہی تھی ، اس کے علاوہ "حزب اللہ" اور "تحریک نظم جماعت" کے قائد کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات یادگار ہیں ۔ 'الہلال' سے مولانا مہر کا تعلق اتفاقاً قائم ہوا تھا ۔ ہوا یہ کہ ایف ۔ اے کے امتحان میں دوسری بار شرکت کے بعد مولانا گھر جا رہے تھے تو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ گاؤں میں بیکاری کا زمانہ کیسے گزرے گا ؟ دوستوں سے مشورے کے بعد 'زمیندار' اور 'الہلال' جاری کرانے کا فیصلہ کر لیا گیا ۔ لیکن دقت یہ پیش آئی کہ 'الہلال' اس زمانے میں ٹائپ میں چھپتا تھا اور مولانا مہر اس تحریر کے عادی نہیں تھے ، لہذا 'الہلال' پڑھے بغیر جمع کرتے چلے لگے ۔ وہ تو اتفاقاً ایک شمارے میں "حزب اللہ" کے اغراض و مقاصد کے بارے میں ایک مضمون نظر آیا ۔ بس یہیں سے انھوں نے 'الہلال' کا مطالعہ شروع کیا ۔ اس تمام واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں :

> "اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رخ موڑ دیا ۔ جب میں دوسری مرتبہ ایف ۔ اے کے امتحان سے فارغ ہو کر گھر جانے لگا تو اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ گاؤں میں طویل تعطیلات کا زمانہ کیسے گزارا جائے ۔ دوستوں نے 'زمیندار' اور 'الہلال' جاری کرانے کی تجویز پیش کی ۔ میں نے دونوں پرچے بذریعہ وی ۔ پی منگوا لیے اور گھر چلا گیا ۔ چند روز بعد پھر لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو میں گھر والوں سے کہہ آیا کہ اگر کوئی وی ۔ پی آئے تو وصول کر لیا جائے ۔ واپسی پر مجھے بتایا گیا کہ ڈاکیہ آٹھ روپے لے کر کاغذات کا ایک پلندہ سا دے گیا ہے ۔ میں نے اسے کھولا تو 'الہلال' تھا جو ٹائپ میں چھپتا تھا اور ٹائپ کی تحریر پڑھنے کی اس وقت عادت نہیں تھی ۔ ادھر اُدھر سرسری نظر ڈال کر رکھ دیا اور افسوس کرنے لگا کہ آٹھ روپے پانی میں ڈوب گئے ۔ اس کے بعد دوسرا شمارہ آیا ، پھر تیسرا ۔ چوتھا پرچہ آیا تو اس میں "حزب اللہ کے اغراض و مقاصد" کی سرخی نظر آئی ۔ "حزب اللہ" کے نام سے ایک جماعت مولانا نے قائم کی تھی ۔ کچھ عرصہ پہلے میں اس جماعت کا رکن بن چکا تھا ، اس لیے میں نے خاص توجہ سے اس مضمون کو پڑھنا شروع کیا . . . اس مضمون کے بعد سارا اخبار شروع سے آخر تک پڑھ

ڈالا - اسے ختم کر کے پرانے پرچے اٹھا لایا اور انہیں بھی یکے بعد دیگرے اسی ذوق و شوق سے پڑھا۔ پھر تو یہ حالت ہوگئی کہ 'الہلال' کے انتظار میں ایک ایک دن گننے لگا - جس روز گاؤں میں ڈاکیے کی آمد ہوتی ، میں اس کے راستے میں ایک میل دور نکل جایا کرتا تھا اور اخبار لے کر وہیں سے پڑھتا ہوا چلا آتا ۔''[1]

مندرجہ بالا طویل اقتباس میں کئی پہلو قابلِ غور ہیں - مثلاً نہ صرف "الہلال'' کا جاری کرانا ایک اتفاقی امر تھا بلکہ اس کے مطالعے کی رغبت بھی محض اتفاق ہی کا نتیجہ تھی - اس کے ساتھ ہی اس اقتباس سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ مولانا مہر ''الہلال'' کے اسیرِ زلف ہونے اور ''حزب اللہ'' کے اغراض و مقاصد سے واقف ہونے سے قبل ہی اس کی رکنیت اختیار کر چکے تھے۔ ممکن ہے یہ بھی محض کسی اتفاق ہی کا نتیجہ ہو - یعنی محض دیکھا دیکھی ''حزب اللہ'' کے ممبر بن گئے ہوں - لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس جماعت سے وابستگی کا حق جیسا مولانا مہر نے ادا کیا ویسا ان کے کسی دوسرے ہم جماعت نے شاید ہی ادا کیا ہو -

محولہ بالا اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مہر دوسری مرتبہ ایف - اے کا امتحان دینے سے قبل ہی اس کی رکنیت اختیار کر چکے تھے - لیکن اس سلسلے میں مولانا مہر کسی متعین تاریخ کا ذکر نہیں کرتے اور یوسف طاہر صاحب نے بھی اپنے تحقیقی مقالے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ مولانا نے یہ رکنیت کب اختیار کی - البتہ ابوسلمان شاہجہانپوری لکھتے ہیں :

"اقبال اور غالب کے علاوہ عہدِ جدید کی شخصیتوں میں مولانا ابوالکلام آزاد سے مہر صاحب بہت متاثر ہیں - مولانا سے ان کا پہلا باقاعدہ تعارف ۱۹۱۳ع میں ہوا - اس سے پیشتر ۱۹۱۲ع میں مہر صاحب ''حزب اللہ" کے ممبر بن چکے تھے ۔''[2]

ظاہر ہے کہ یہ انٹرمیڈیٹ کے دونوں امتحانوں کے درمیان کا زمانہ ہے - مولانا مہر نے بھی غالباً اسی جانب اشارہ کیا ہے - لیکن یہاں پر ''حزب اللہ''

۱- مجلہ فاران ، ص ۵۵ - ۵۶ -

۲- تحریک نظم جماعت مؤلفہ ابوسلمان شاہجہانپوری ، ص ۲۲۴ - ۲۲۵ - اشاعت اول ۱۹۷۷ع ، مطبوعہ الطاف رحیم پرنٹرز لاہور -

کا مختصر سا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ ایسا تعارف جس سے نہ صرف تحریک کے نمایاں خد و خال سامنے آ جائیں بلکہ خود مولانا مہر کے انداز فکر کا اندازہ بھی کیا جا سکے ۔

ہندوستان پر انگریزوں کی عملداری قائم ہوتے ہی انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کے خلاف مزاحمت بھی شروع ہو گئی تھی ، البتہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اس مزاحمت نے مختلف اوقات میں مختلف شکلیں اختیار کیں۔ جنگِ پلاسی اور سرلنگاپٹم کی لڑائی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک یہ تحریکِ مزاحمت جن مختلف مراحل سے گزری ان میں سید احمد شہید اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی خصوصیت سے لائقِ ذکر ہیں ۔ اگرچہ سرسید تحریک بھی ایک اعتبار سے تحریکِ مزاحمت ہی کا ایک حصہ تھی اور اپنے اغراض و مقاصد اور نتائج کے اعتبار سے غالباً یہی تحریک دیگر تمام تحریکوں سے زیادہ فعال اور موثر بھی رہی ، لیکن اپنے مخصوص طریق کار اور انگریزوں کے سامنے معذرت خواہانہ لہجہ اپنانے کی وجہ سے یہ درجۂ عزیمت پر فائز نظر نہیں آتی ۔ ہمہ پہلو اصلاحی نعرے کے باوجود انگریز دوستی اس تحریک کی سب سے بڑی کمزوری تھی ، جبکہ سید احمد شہید اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اول تا آخر انگریز دشمنی پر مبنی تھی ۔ یہی انگریز دشمنی کا جذبہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاں مختلف طرز ہائے اظہار پاتا رہا ۔ کبھی اس نے تحریک جہاد کی شکل اختیار کی اور کبھی تحریکِ ہجرت و تحریکِ ریشمی رومال کی ۔ لیکن چونکہ اس نوعیت کی اکثر تحریکیں اعلیٰ و ارفع مقاصد پیش نظر رکھنے کے باوجود اپنے بطن میں خرابی کی ایک صورت بھی رکھتی تھیں ، جس کے اثر سے پورا معاشرتی ، سیاسی اور مذہبی ڈھانچہ بکھر کر رہ جاتا ہے ، لہذا اس امر کی ضرورت پیش آتی ہے کہ تسبیح کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو پرونے کے لیے کسی رشتے کی تلاش بھی کی جائے تا کہ کسی بھی صورت قوم کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے ۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے دو تحریکیں یعنی ''تحریکِ نظمِ جماعت'' اور ''حزب اللہ'' جاری کیں ۔ بنیادی طور پر ''حزب اللہ'' کے اغراض و مقاصد بھی دیگر تحریکاتِ جہاد سے مختلف نہیں تھے لیکن اس کا ایک خاص مقصد اوراقِ ملت کی شیرازہ بندی تھا ۔ جیسا کہ ابوسلمان شاہجہانپوری ''حزب اللہ'' کا دوسری تحریکوں سے تقابل و موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"تحریکِ حزب اللہ ، تحریکِ جہاد، تحریکِ ہجرت ، تحریکِ نظمِ جماعت اور سب سے بڑھ کر تحریکِ الہلال ، جو ادب ، صحافت ، احیائے اسلام ، تجدیدِ علومِ دین ، قیامِ ملت اور استقلالِ وطن کی تحریکات کا جامع تھی ۔ یہ تحریکات فی الحقیقت ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں یا ایک ہی اصل کے فروع اور ایک ہی نخلِ تمنا کے برگ و بار تھے ۔ مقصود و مطلوب ان سب کا ایک تھا ـــ احیائے اسلام اور قیامِ ملتِ اسلامیہ ۔"[۱]

مولانا ابوالکلام کے جذبۂ حب الوطنی اور انگریز دشمنی کے رویے سے مولانا مہر پہلے ہی سے متاثر تھے اور حزب اللہ کی رکنیت بھی اختیار کر چکے تھے ۔ خط وکتابت شروع کی تو مولانا آزاد ان کے بہتر مستقبل کی پیش گوئیاں بھی فرمانے لگے ۔ ان سب عناصر نے مل کر وہ صورت پیدا کی جس کے نتیجے میں آخرکار مولانا مہر نے آزاد سے بیعت کر لی اور ان کے مریدین مخلصین میں شامل ہوگئے ۔ اپنی بیعت سے متعلق واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ایک مجلس کا ذکر آپ نے میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء کی کوٹھی میں منعقد ہونے کا کیا ۔ یہ کوٹھی دہلی دروازے سے باہر کوتوالی کے ساتھ سرکلر روڈ پر واقع ہے ۔ اس زمانے میں مولانا وہیں قیام پذیر ہوتے تھے اور اسی کوٹھی میں مجھے بیعتِ امامت کا شرف حاصل ہوا تھا ۔ اگر حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہ ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے ۔"[۲]

بیعت کرتے وقت مولانا مہر نے بھی دوسرے مریدانِ آزاد کی طرح جن باتوں کا عہد کیا تھا وہ مولانا آزاد کی ایک تحریر سے عیاں ہیں ۔ مندرجہ ذیل تحریر ۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد کی طرف سے نوجوانانِ پنجاب کے لیے ایک پیام کی صورت میں شائع ہوئی تھی ۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں :

"الحمدللہ وحدہ ، جن عزیزوں نے گزشتہ سال یا امسال یا اس سے پہلے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے ، ان سب کی اطلاع کے لیے میں یہ سطریں شائع کرتا ہوں ۔ انھوں نے میرے ہاتھ پر پانچ باتوں کا عہد کیا ہے ۔

۱۔ تحریکِ نظمِ جماعت ، از ابو سلمان شاہجہان پوری ، ص ٦ ۔

۲۔ افاداتِ مہر ، از شیر بہادر پنی ، ص ۱۵۲-۱۵۳ ، مکتوب محررہ یکم مارچ ۱۹٦۸ء ۔

اول : امر بالمعروف ، نہی عن المنکر اور توصیۂ صبر کا یعنی ہمیشہ نیکی کا حکم دیں گے ۔ برائی کو روکیں گے ، صبر کی وصیت کریں گے ۔

ثانیاً : الحب فی اللہ و البغض فی اللہ کا ۔ یعنی اس میں ان کی دوستی ہوگی تو اللہ کے لیے اور دشمنی ہوگی تو اللہ کے لیے ۔

ثالثاً : لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم کا ۔ یعنی سچائی کے راستے میں وہ کسی کی پرواہ نہیں کریں گے اور خدا کے سوا وہ کسی اور سے نہیں ڈریں گے ۔

رابعاً : اس بات کا کہ وہ اللہ اور اس کی شریعت کو دنیا کے سارے رشتوں ، ساری نعمتوں اور ساری لذتوں سے زیادہ محبوب رکھیں گے ۔

خامساً : اطاعت فی المعروف کا ۔ یعنی شریعت کے ہرحکم کی اطاعت بجا لائیں گے جو ان تک پہنچایا جائے گا ۔"[۱]

مندرجہ بالا عہد بیعت کے علاوہ ، ابو سلمان شاہجہان پوری نے اپنی کتاب "تحریک نظم جماعت" میں عبدالرزاق ملیح آبادی کے حوالے سے ایک اور عہد بیعت کا بھی ذکر کیا ہے ۔ لیکن ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے ۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ آخری نقطے کے حوالے سے مولانا آزاد اپنے مریدوں کو وقتاً فوقتاً ہدایات بھی جاری کرتے رہتے تھے ۔ مثلاً ۱۹۲۱ء کے ایک اعلان میں انھوں نے مندرجہ ذیل ہدایات دیں :

۱۔ ولایتی کپڑوں کا خریدنا ، بیچنا ، پہننا ، پہنانا یک قلم ترک کر دیں اور دیسی کھدر کا لباس اختیار کریں ۔

۲۔ اسلامی خلافت اور بلاد اسلامیہ کی حفاظت ہندوستان کی آزادی پر موقوف ہے ۔ پس جہاں تک ان کے امکان میں ہو ، اپنے دل

۱۔ نقش آزاد ، مرتبہ غلام رسول مہر ، ص ۳۲۹ ۔ اشاعت سوم ۱۹۶۸ء ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔

سے ، اپنی زبان سے ، اپنے مال سے اور اپنے عمل سے اس کام میں مدد کریں ۔

۳۔ کسی مسلمان کی طرف سے اپنے دل میں کینہ و عداوت نہ رکھیں ، اگرچہ وہ ان کا کیسا ہی دشمن ہو ۔ تمام مسلمانوں سے صلح و محبت کا برتاؤ کریں اور اپنی جانب سے کسی مسلمان کے خلاف قدم نہ اٹھائیں ۔ دوسرا اٹھائے تو جہاں تک بھی ان کے امکان میں ہو ، بخش دیں ۔ کسی طرح بھی اپنے وجودکو تفریقِ جماعت کا سبب نہ بنائیں ۔

۴۔ احکام و مصالحِ شرعیہ کے مطابق ہندوؤں سے ہمارا اتحاد ہے ۔ اس کامل اتفاق اور سازگاری کے ساتھ رہیں اور ان کی جانب سے اپنے دل میں کسی طرح کا کھوٹ نہ رکھیں اورکوئی بات لڑائی جھگڑے کی ایسی نہ کریں جس سے اتحاد کو نقصان پہنچے ۔"[1]

یہ تحریر ۱۹۲۱ع میں شائع ہوئی ۔ ساتھ ہی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے یہ وضاحت بھی تھی کہ جو مسلمان مجھ سے اپنی بیعت کا رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے اس کا فرض ہے کہ ان باتوں پر کاربند ہو اور جس نے ان پر عمل نہ کیا اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں ۔

مولانا غلام رسول مہر نے ۱۹۲۳ع میں آزاد سے بیعت کی تھی ، جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ ان تمام امور و احکام سے متفق تھے ۔ لیکن بعد ازاں آزاد و مہر کے تعلقات میں نشیب و فراز آنے لگے ۔ اس کی ابتدا غالباً نہرو رپورٹ سے ہوئی تھی ۔ تعلقات کی خرابی کا یہ سلسلہ بظاہر ۱۹۴۷ع تک، چلتا رہا ۔ اگرچہ اس دوران میں مولانا مہر اور ابوالکلام آزاد کے درمیان ہمیشہ خط و کتابت بھی رہی اور اظہارِ مؤدت بھی ہوتا رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزاد اور کانگرس کے باہمی تعلق نے مولانا مہر کو ان سے بہت دور کر دیا تھا ۔ اور چونکہ مولانا مہر مندرجہ بالا اعلان کے آخری نقطے سے نہ صرف متفق نہ تھے بلکہ تصفیۂ حقوق کے بغیر ہندو مسلم اتحاد کی بھی سر توڑ مخالفت کیا کرتے

۱۔ نقشِ آزاد ، مرتبہ غلام رسول مہر ، ص ۲۳۰ ۔

تھے ، لہذا ابوالکلام آزاد کی تصریح و وضاحت کے مطابق ان کا رشتۂ بیعت بھی فسخ ہوگیا تھا ۔ اس کے باوجود مولانا مہر اپنی زندگی کے ہر دور میں اس فیضان کا ذکر کرتے رہے جس نے اس عہد کے بیشتر مسلم نوجوانوں کو ''آدابِ فرزندی'' سے روشناس کرایا تھا ۔ مثلاً مولانا مہر مخالفت کے شدید دور میں بھی اپنے ایک اداریے میں ابوالکلام آزاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''تیسرے بزرگ[1] کی نسبت بلاشائبۂ مبالغہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ نوجوانوں کے طبقے میں عام دینی و مذہبی بیداری انہی کی مساعی سے پیدا ہوئی اور تحریکِ موالات کے دوران میں ان کے لیے امام الہند کا لقب تجویز کیا گیا ۔''[2]

دینی و مذہبی بیداری کی وہ نعمتِ عظمیٰ جس نے پھول پور میں پیدا ہونے والے ایک عام بچے کو مولانا مہر بنا دیا ، زمانۂ طالب علمی ہی میں اس شخصیت کا جز بن گئی تھی کہ انہوں نے دورانِ تعلیم ہی میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ خواہ کوئی بھی صورت پیش آئے وہ سرکارِ برطانیہ کی ملازمت نہیں کریں گے ۔ اسی لیے ۱۹۱۵ع میں بی ۔ اے کر لینے کے باوجود انہوں نے ملازمت کے لیے کوئی تگ و دو نہیں کی ۔ دراصل ان کا ارادہ تھا کہ اگر ہو سکے تو اپنا کوئی اخبار جاری کریں یا کسی اخبار کے عملۂ ادارت میں شامل ہو کر وہ قومی خدمت بجا لائیں جس کا جذبہ اقبال کی نظموں اور آزاد کی تحریروں نے ان کے دل میں موجزن کر دیا تھا ۔ صحافت کو بطور پیشہ اپنانے کے ارادے کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں :

''یہ مولانا آزاد ہی کا اثر تھا کہ میں نے طالب علمی کے زمانے میں صحافت کا پیشہ اپنے لیے منتخب کر لیا ۔''[3]

لیکن اس ارادے کو عملی جامہ پہنانا اس قدر آسان بھی نہیں تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مہر کو اس کشمکش کے باعث بہت سا وقت بیکار گزارنا پڑا ۔ اگرچہ بیکاری کا یہ زمانہ مولانا مہر کے لیے تو زیادہ تکلیف دہ نہیں تھا البتہ

۱۔ ابوالکلام آزاد مراد ہیں ۔

۲۔ روزنامہ انقلاب لاہور ، مورخہ ۱۷۔ اپریل ۱۹۳۱ع ۔

۳۔ فاران ، ص ۵۶ ، جنوری ۱۹۶۲ع ۔

ان کی والدہ اس صورتِ حال سے خاصی پریشان تھیں ۔ اگرچہ گزارے کے لائق جائیداد اور اس کے معقول و مناسب انتظام کے باعث انھیں کوئی خاص فکر بھی لاحق نہیں تھی لیکن کون ماں ہے جو اعلیٰ تعلیم دلا کر بیٹے کی بیکاری کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گی ؟ غالباً ماں کے انھی احساسات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"مجھے خوب یاد ہے کہ جس زمانے میں میں بی ۔ اے کرنے کے بعد اپنے افکار و مقاصد کی اضطراب افزائیوں کے باعث گھر میں بیکار بیٹھا تھا اور ابھی اخبار نویسی بھی شروع نہیں کی تھی ، تو میری یہ حالت والدہ مرحومہ کے لیے سخت اذیتِ قلب کا باعث تھی ۔ وہ میری کمائی کی محتاج نہیں تھیں لیکن یہ ضرور چاہتی تھیں کہ میں بڑا آدمی بن جاؤں ، بڑے عہدے پر فائز ہو جاؤں ، بہت سی دولت کماؤں اور انھی خوابوں کی تعبیر کے لیے انھوں نے میرے لیے اعلیٰ تعلیم کا اہتمام فرمایا تھا ۔ وہ تمام خواب پریشان ہو چکے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کا دل زخمی ہے اگرچہ زبان پر کوئی بات نہیں آتی ۔ اسی زمانے میں کسی گاؤں کے چند آدمی مجھ سے ملنے کے لیے آئے . . . وہ ایک گھنٹہ میرے پاس بیٹھے ہوں گے ۔ میری باتیں سنیں ۔ اٹھے تو ان کے دل پر میرا بہت زیادہ اثر پڑ چکا تھا ۔ چنانچہ وہ گھر سے نکلے تو جاتے ہوئے خاصی دیر تک میری ہی مدح و ستائش کے گیت گاتے رہے ۔ والدہ باہر سے آ رہی تھیں ۔ انھوں نے یہ باتیں سنیں تو اپنے فرزند کی ظاہری نالائقی کے باوجود اس درجہ مفتخر تھیں کہ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے دل کے تمام زخم اور مایوسیوں کے تمام چرکے مندمل ہو چکے ہیں ۔"[1]

لیکن ظاہر ہے کہ یہ اعزاز و افتخار اور اس کے باعث حاصل ہونے والی لمحاتی مسرت اُن چرکوں اور زخموں کے کامل اندمال کا سبب نہیں ہو سکتی تھی جو بیٹے کی بیکاری کے باعث دل پر لگے تھے ۔ غالباً اسی لیے صحافتی میدان کے دروازے بند پا کر مولانا مہر کو ملازمت کی جستجو ہوئی ہوگی ۔ اسی زمانے میں مولانا مہر کو سرکاری ملازمت مل بھی رہی تھی لیکن اپنے نظریات و خیالات

۱۔ مکتوب بنام عبدالسلام اسلم ، غیر مطبوعہ (تاریخ درج نہیں) ۔

اور حکومتِ برطانیہ کی ملازمت سے گریز و نفرت کے باعث انھوں نے یہ ملازمت قبول کرنے سے انکار کردیا ، جیسا کہ اپنے صاحبزادے کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میں نے بی - اے پاس کیا تھا تو کوآپریشن ڈیپارٹمنٹ میں سو روپے ماہوار کی انسپکٹری ملتی تھی اور سو روپے ماہوار ۱۹۱۶ء میں آجکل کے ایک ہزار روپے سے زائد تھے - میں نے قبول نہ کی -''[1]

اسی لیے آپ کو کسی ایسی ریاست کی طرف متوجہ ہونا پڑا جس میں انگریز بہادر کا حکم نہ چلتا ہو - اس سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں :

''بی - اے پاس کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کیا جائے - انگریزی ملازمت میرے مزاج اور ضمیر کے خلاف تھی - میں مسلم ریاستوں میں ملازمت اختیار کرنے کو اس وقت زیادہ اچھا سمجھتا تھا - (مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ان ریاستوں کی حالت انگریزوں کے ماتحت علاقوں سے بھی زیادہ خراب ہے) - چنانچہ یہی خیال ہم دو تین آدمیوں کو حیدرآباد (دکن) لے گیا اور میں وہاں وقارالدولہ[2] کے محکمۂ تعلیم کا انچارج بن گیا -''[3]

محولہ بالا اقتباس میں جن دو تین لوگوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک کا ذکر کرتے ہوئے یوسف طاہر لکھتے ہیں کہ حکیم شاہ محمد بغرضِ سیاحت دکن جا رہے تھے ، لہٰذا مولانا مہر نے بھی انھی کی ہمراہی اختیار کی - دکن میں انھیں ان کے ایک اور دوست غلام محی الدین کی وساطت سے ملازمت ملی اور مولانا کو وقارالامراء کی پائیگاہ کے محکمۂ تعلیم کا انچارج بنا دیا گیا -[4]

مولانا مہر ملازمت کے حصول کی تقریب کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے

۱- مکتوب بنام عبدالسلام اسلم ، غیر مطبوعہ ، تاریخ درج نہیں -

۲- دیگر تمام حوالوں میں یہ نام ''وقار الامراء'' ملتا ہے اور غالباً یہی درست ہے -

۳- غلام رسول مہر ، از الطاف حسن قریشی ، ص ۴۲ ، اردو ڈائجسٹ -

۴- مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۱۴ -

لکھتے ہیں :

''انگریزوں کی ملازمت سے نفرت تھی اور عقل کی کوتاہی کا یہ عالم تھا کہ ہر اسلامی ریاست کو آزاد سمجھتا تھا ۔ فیصلہ کیا کہ حیدرآباد میں ملازمت اختیار کرنی چاہیے ۔ چنانچہ ایک دوست کے ساتھ حیدرآباد چلا گیا ، اگرچہ یہ ملازمت بھی میں نے بادلِ نخواستہ کی تھی ۔ فیصلہ یہی تھا کہ اخبار جاری کروں مگر جنگِ یورپ چھڑی ہوئی تھی اور یہاں حالات بہت نازک تھے ۔

بہرحال میں حیدرآباد پہنچا . . . ہم منماڑ کے مسافر خانے میں حیدرآباد جانے والی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے ۔ وہاں ایک اور صاحب مل گئے ۔ وہ بھی حیدرآباد جا رہے تھے ۔ ان کے وہاں کچھ روابط تھے، چنانچہ میں ان کے دوست کی وساطت سے مہاراجہ کشن پرشاد کے پاس پہنچ گیا ۔ میں نے ایک پُرزور نظم کہی تھی ، مگر اس نظم کو سنانے کے لیے خاصا وقت درکار تھا ۔ اس تقریب کے لیے فارسی میں پندرہ بیس شعر بطور مثنوی کہہ لیے تھے جن میں کچھ اپنا حال اور اپنے افکار واضح کیے تھے ۔ میں نے شعر سنائے تو اس مہاراجہ کے ایک مصاحبِ خاص ترک علی شاہ ترکی قلندر[1] بھی موجود تھے ۔ وہ میرے شعروں کی بہت تعریف فرماتے رہے ۔ یہاں تک کہ مہاراجہ سے کہا کہ دیکھیے حضور ! میرے پنجاب سے جو بھی آئے گا ہیرا آئے گا ۔

میرے لیے یہ تعریف بہت زیادہ تھی ۔ پھر میں وہاں کے آداب سے بالکل ناواقف تھا ۔ مہاراجہ میرے شعر کی تعریف کرتے اور میں خاموش رہتا یا معمولی سلام کرتا ۔ وہاں کا دستور یہ تھا کہ ہر تعریف پر اٹھ کر تین مرتبہ سلام کرو ۔ غرض یہ مثنوی میں نے سنائی ۔ قصیدہ

۱- یہ بھی ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے اور بعد ازاں ان سے مولانا مہر کے گہرے تعلقات پیدا ہوگئے تھے۔ بقول مہر دوستی کا باعث ایک مخاصمت تھی اور وہ یہ کہ ترکی غالب شکن تھے اور مہر غالب پرست ۔

سنانے کی نوبت ہی نہ آئی ۔ میں پائیگاہ میں ملازم ہو گیا ۔''[۱]

حیدرآباد میں ملازمت کی وجہ ، کام کی نوعیت اور عرصۂ ملازمت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر شیر بہادر پنی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میرے دماغ میں سرکاری ملازمت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی ۔ اپنے خیال کے مطابق یہ طے کیا کہ عارضی طور پر کیونکہ وہ جنگ کا زمانہ تھا ، کسی ریاست میں ملازمت کر لوں ، چنانچہ حیدرآباد دکن جا کر پائیگاہ وقارالامرا میں انسپکٹر مدارس مقرر ہوا ۔ چار سال وہاں گزارے ۔''[۲]

شیر بہادر پنی نے مدتِ ملازمت اور قیامِ حیدرآباد کے زمانے کا تعین کرتے ہوئے مندرجہ بالا اقتباس کے بعد اپنی طرف سے بریکٹ میں ''۱۹۱۴ع—۱۹۱۸ع کے دوران'' لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا مہر نے ۱۹۱۴ع میں حیدرآباد میں ملازمت کی اور ۱۹۱۸ع میں اسے ترک کرکے واپس پنجاب تشریف لے آئے ۔ نیر سلطانہ نے بھی مولانا مہر پر اپنے مقالے میں اس بات کو بلاتحقیق قبول کر لیا ہے ، حالانکہ یہ بات قرائن سے درست ثابت نہیں ہوتی ۔ اس مفروضے کے خلاف پہلی اہم دلیل تو یہی ہے کہ مولانا مہر نے بی ۔ اے ۱۹۱۵ع میں کیا تھا ۔ اور چونکہ انھوں نے بی ۔ اے کے بعد فراغت اور بے کاری کا بھی کچھ زمانہ اپنے گاؤں میں گزارا اس لیے یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ وہ ۱۹۱۴ع ہی میں ملازمت کے لیے دکن چلے گئے تھے ۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مولانا مہر ڈاکٹر شیر بہادر پنی کے نام اپنے محولہ بالا مکتوب میں جنگ کا ذکر کرتے ہیں جس کا آغاز اگست ۱۹۱۴ع میں ہوا تھا ۔ ظاہر ہے کہ خواہ جنگ کتنی ہی شدید ہوتی اس کے باوجود یہ ناممکن تھا کہ ۱۹۱۴ع ہی میں ہندوستان کا ایک پڑھا لکھا نوجوان جنگ کے باعث پیدا ہونے والی ابتر صورتِ حال کے پیشِ نظر ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ۔

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، محررہ ۱۲ فروری ۱۹۶۳ع ، غیر مطبوعہ ۔
۲۔ افاداتِ مہر ، مرتبہ شیر بہادر پنی ، ص ۲۹ - ۳۰ ۔

اسی سلسلے کی آخری اور پُرلطف بات یہ ہے کہ شیر بہادر پنی ہی کے نام اپنے ایک خط میں مولانا مہر ترکِ ملازمت کے بعد وطن واپسی کے سلسلے میں رقم طراز ہیں :

''جب ترک موالات کا دور شروع ہو رہا تھا (۲۰ - ۱۹۲۱ء مرتب) وطن چلا آیا ۔''[۱]

گویا مرتب یعنی شیر بہادر پنی نے مولانا مہر کی دکن سے واپسی کا سال ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء قرار دیا ہے ۔ اور جبکہ یہ بات طے ہے کہ انھوں نے حیدرآباد میں چار ہی سال ملازمت کی تو پھر ۱۹۱۳ء کو کسی صورت بھی آغاز ملازمت کا سال قرار نہیں دیا سکتا ۔ دراصل یہ ہے بھی نہیں ۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ مولانا مہر ۱۹۱۶ء کے اواخر یا اوائل ۱۹۱۷ء میں دکن تشریف لے گئے تھے اور ان کی واپسی ۱۹۲۰ء میں ہوئی ، جیسا کہ انھوں نے خود اپنے محولہ بالا خط میں وضاحت بھی کر دی ہے کہ یہ ترکِ موالات کا زمانہ تھا ۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ اس تحریک کی ابتدا اگرچہ ۱۹۱۹ء ہی میں ہوگئی تھی لیکن اس کا زور ۱۹۲۰ء ہی میں بندھا جب اس نے ایک ملک گیر تحریک کی شکل اختیار کی ۔

شفیق چودھری نے رحلتِ مہر کے بعد شائع ہونے والے ایک مضمون میں قیامِ حیدرآباد کا زمانہ متعین کرتے ہوئے لکھا ہے :

''۱۹۱۷ء میں حیدرآباد چلے گئے تھے ۔ وقارالامراء کی پائیگاہ میں انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے . . . ۱۹۲۰ء میں پھول پور واپس آ گئے ۔''[۲]

مولانا مہر کا حیدرآباد دکن میں چار سالہ قیام کئی وجوہ کی بنا پر قابلِ ذکر ہے ۔ خاص طور پر اس لیے کہ قدرت نے مولانا مہر کو حقیقی معنوں میں مولانا مہر بنانے کا انتظام یہاں بھی کر رکھا تھا ۔ جس طرح زمانہ طالب علمی کے دوران میں بالکل اتفاق طور پر مولانا آزاد کے قریب آنے کا موقع ملا اسی

۱۔ افاداتِ مہر ، مرتبہ شیر بہادر پنی ، ص ۳۰ ۔
۲۔ مولانا غلام رسول مہر ، از شفیق چودھری ، روزنامہ مشرق کراچی ، ۲۴ نومبر ۱۹۷۱ء ۔

طرح حیدرآباد میں بھی ان کی ملاقات ایک جیّد اور متبحّر عالم مولانا عبدالسلام سے ہوئی ۔ جیسا کہ یوسف طاہر نے اپنے مقالے میں لکھا اور بعد ازاں ایک انٹرویو میں وضاحت سے بتایا کہ حیدرآباد میں مولانا مہر جس محلے میں اقامت گزیں ہوئے ، اس میں ایک بزرگ مولانا عبدالسلام بھی رہتے تھے جو اپنے مذہبی معتقدات میں عام اکثریت سے قدرے مختلف اور غالباً اسی لیے راسخ و پختہ بھی تھے ۔ عقاید کی یہ سخت گیری و پختگی ان کے عمل میں بھی نمایاں تھی ۔ اس بنا پر ان کی شخصیت تقویٰ ، بے نیازی اور پرہیزگاری کا مرقع دکھائی دیتی تھی ۔ مزید یہ کہ قدرت نے انھیں گفتگو کا بھی وہ سلیقہ عطا کیا تھا کہ مشکل سے مشکل مسئلہ چند جملوں میں سمجھا اور سلجھا دیتے تھے ۔ ایک دوست کے مکان پر مولانا عبدالسلام اور مہر کا تعارف ہوا ۔ خیالات کی یک رنگی و ہم آہنگی دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی ۔ مولانا مہر انھی دنوں ''الہلال'' کی لگائی ہوئی چیٹک اور اس کے نتیجے میں امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کا مطالعہ کر رہے تھے لیکن دقت یہ تھی کہ حیدرآباد سے امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی کتب مل جانے کے باوجود عربی پر عبور حاصل نہ ہونے کی وجہ سے مولانا مہر ان سے کامل طور پر استفادہ نہیں کر سکتے تھے ۔ ابتدا میں تو ایک عزیز دوست مولانا عبدالقدیر کی مدد سے مطالعہ شروع ہوا ۔ بعد ازاں مولانا عبدالسلام سے تعارف ہو جانے کے باعث اس معاملے میں مزید سہولت پیدا ہوگئی ۔ مولانا کا اشتیاق دیکھ کر مولانا عبدالسلام نے بھی خود کو ان کے لیے وقف کر دیا اور یہ معمول بنا لیا کہ مہر صاحب کی دفتری مصروفیات کے اوقات میں وہ خود مطالعہ کیا کرتے اور ان کی واپسی پر کتابوں کے اہم حصے انھیں سناتے اور ان کی تشریح و وضاحت بھی کرتے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے طور پر مہر کو شرعی احکامات کی پابندی کا حکم بھی دیا کرتے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر اپنی زندگی میں جن دو ہم عصر مذہبی شخصیات سے متاثر ہوئے وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالسلام ہیں ۔ یوں تو مولانا مہر زندگی بھر مختلف مواقع پر مولانا عبدالسلام سے استفادے اور اپنی شخصیت پر ان کے اثرات کا اعتراف کرتے رہے لیکن ان کا سب سے بڑا اعتراف اس صورت میں ظاہر ہوا کہ مولانا مہر نے اپنے بڑے صاحب زادے کا نام ''عبدالسلام'' انھی مولانا عبدالسلام کے نام کی رعایت سے تجویز کیا ۔[1]

۱۔ یہ بات خود مولانا مہر کے صاحبزادے نے ایک انٹرویو میں بتائی ۔

قیامِ حیدر آباد کا زمانہ اس وجہ سے بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ مولانا مہر کی ذات میں چھپے ہوئے عظیم صحافی نے یہاں بھی ملازمت کی زنجیروں کے باوجود اخبار جاری کرنے کی کوشش کی ، جیسا کہ وہ مشفق خواجہ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''تقریباً چار سال حیدر آباد (دکن) میں گزارے ۔ وہاں وقار الامراء کی پائیگاہ میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا ۔ طالب علمی کے زمانے سے اخبار نویسی کا جنون سر پر سوار تھا ۔ پہلے ایک دوست کی معیت میں حیدر آباد سے ''سلطنت'' نام ایک اخبار جاری کرنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہوئی ۔''۱

یوسف طاہر اپنے مقالے میں اس ناکام کوشش کا ذکر کرتے ہوئے اس کا زمانہ بھی متعین کرتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

''۱۹۱۸ع میں مہر صاحب نے اپنے دوستوں کے اشتراک سے ایک روزنامہ نکالنے کا فیصلہ کیا ۔ ''سلطنت'' نام تجویز ہوا ۔ منظوری کے لیے درخواست دے دی گئی مگر ایک ایسا ناخوش گوار واقعہ پیش آیا کہ اخبار جاری کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا ۔''۲

اس ناخوش گوار واقعے کے باعث نہ صرف اخبار جاری نہ کیا جا سکا بلکہ اسی کی وجہ سے مولانا مہر کو حیدر آباد کی ملازمت بھی ترک کرنا پڑی ۔ وجہ یہ تھی کہ حیدرآباد میں وہاں کی مخصوص سیاسی فضا کے باعث ایسے لوگوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی جو نظام دکن یا انگریز سرکار کے علاوہ کسی اور تنظیم کو اپنی وفاداری کا مرکز و محور تصور کرتے ہوں ، جبکہ مولانا مہر کے بارے میں حکومت کو کچھ ایسے شواہد مل گئے تھے جن کی بنا پر انھیں بہ‌آسانی ''خطرناک'' سمجھا جا سکتا تھا ۔ اسی لیے نہ تو مولانا مہر کو اخبار جاری کرنے کی اجازت دی گئی اور نہ ملازمت کا سلسلہ جاری رکھنے کی ۔ چنانچہ انھیں استعفاء دے کر واپس پنجاب آنا پڑا ۔ اس سارے واقعے کی جانب اشارہ

۱- مکتوب بنام مشفق خواجہ ، مرقومہ ۱۴ جنوری ۱۹۶۳ع ۔
۲- مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۱۴ - ۱۵ ۔

کرتے ہوئے مولانا مہر رقم طراز ہیں :

''پہلی جنگِ یورپ کے دوران میں مولانا[۱] کو صوبہ بنگال سے اخراج کا حکم ملا تھا (۲۳ - مارچ ۱۹۱۶ع) اور وہ کلکتہ چھوڑ کر رانچی (صوبہ بہار) چلے گئے - وہاں انھیں نظربند کر دیا گیا ، جس سے اواخر دسمبر ۱۹۱۹ع میں رہائی ملی - ان کے بیشتر کاغذات قبضے میں لے لیے گئے تھے - انھی کاغذات میں جماعت ''حزب اللہ'' کا رجسٹر بھی تھا جس میں تمام ارکان کے نام اور پتے درج تھے - چنانچہ ہر صوبے کی خفیہ پولیس نے اپنے اپنے ہاں ارکان کا تعاقب شروع کر دیا - میں بھی ''حزب اللہ'' کا رکن تھا - پولیس نے میرے متعلق بھی چھان بین شروع کر دی -''[۲]

مولانا مہر ، الطاف حسن قریشی کو انٹرویو دیتے ہوئے اس واقعے کی مزید تفصیلات یوں واضح کرتے ہیں :

''مولانا[۳] نے ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھی تھی . . . میں بھی اس جماعت کا ممبر بن چکا تھا - ۱۹۱۶ع میں مولانا کو بنگال سے اخراج کا حکم ملا اور وہ رانچی چلے گئے تو ان کے مکان کی تلاشی میں جن کاغذات پر حکومت نے قبضہ کیا ان میں ''حزب اللہ'' کے ممبروں کا رجسٹر بھی تھا - جن لوگوں کے پتے اس رجسٹر میں درج تھے ان سب کے متعلق چھان بین اور تفتیش کے احکام متعلقہ اضلاع میں بھیج دیے گئے - ہم نے انھی دنوں یہ فیصلہ کیا تھا کہ کوئی اخبار یا رسالہ نکالا جائے لیکن ان احکام کی بنا پر ہمیں اجازت نامہ نہ مل سکا -''[۴]

۱- ابوالکلام آزاد مراد ہیں -

۲- نقشِ آزاد ، مرتبہ غلام رسول مہر ص ۳ ، اشاعت سوم ، مئی ۱۹۶۸ع ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور -

۳- ابوالکلام آزاد مراد ہیں -

۴- غلام رسول مہر ، از الطاف حسن قریشی ، اردو ڈائجسٹ ، اگست ۱۹۶۱ع ، ص ۲۵ -

"حزب اللہ" کی رکنیت حکومت کی نظروں میں اتنا سنگین جرم تھا کہ اس کے بعد مولانا مہر کا حیدر آباد میں مزید قیام ناممکن تھا ، لہذا انھیں ملازمت ترک کرکے واپس آنا پڑا ۔ ان کی واپسی کا ایک اور سبب بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ حیدر آباد میں دیگر علاقوں سے آنے والے لوگوں کے بارے میں ایک تعصب پایا جاتا تھا ۔ ممکن ہے کہ مولانا مہر اس کا شکار بھی ہوئے ہوں ، جیسا کہ خلیل الرحمٰن داؤدی نے نقوش کے شخصیات نمبر میں اس جانب اشارہ بھی کیا ہے ۔

بہرحال حیدر آباد چھوڑنے کی وجوہات کچھ بھی رہی ہوں لیکن حاصل یہ ہے کہ مولانا مہر ۱۹۲۰ء میں واپس پھول پور آ گئے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں تحریکِ خلافت اپنے عروج پر تھی اور پورا ہندوستان اس تند اور منہ زور تحریک کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہا چلا جا رہا تھا ۔ مہر صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے جالندھر میں تحریک کے سیکرٹری کا منصب سنبھال لیا اور تنظیمی نوعیت کے کام کی طرف توجہ دی ۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک مرتبہ انھیں لاہور آنا پڑا جہاں یہ اپنے دیرینہ دوست پروفیسر عبدالقادر شاہ سے بھی ملے ۔ پروفیسر صاحب نے مشورہ دیا کہ اگر اخبار جاری کرنے کا ارادہ ہے تو پہلے کسی موقر اخبار میں رہ کر کچھ تجربہ حاصل کر لو[1] ۔ لیکن مہر جالندھر چلے آئے ۔ ابھی انہیں لاہور سے آئے بمشکل ایک ہی ماہ ہوا تھا کہ عبدالقادر شاہ نے انھیں لاہور بلا بھیجا ۔ مولانا لاہور پہنچے تو پتہ چلا کہ مولانا ظفر علی خاں ، مولانا اختر علی خاں اور مولانا سالک کے گرفتار ہو جانے کے باعث روزنامہ "زمیندار" میں ایڈیٹر کی جگہ خالی ہے ۔ ان دنوں "زمیندار" کے منیجر شفاعت اللہ خاں تھے ۔ دفتر "زمیندار" میں ان سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے ایڈیٹر کی حیثیت سے مولانا کو منتخب کر لیا ۔ مولانا مہر کو سول نافرمانی کے موضوع پر مقالۂ افتتاحیہ لکھنے کے لیے کہا گیا جو انھوں نے "طلوعِ صبحِ امید" کے عنوان سے تحریر کیا اور یہ زمیندار میں قسط وار چار دن شائع ہوتا رہا[2] ۔ یہ مقالۂ افتتاحیہ مولانا مہر کی پہلی نثری تحریر تھی جو زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ، جیسا کہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

۱۔ مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۱۹ ۔
۲۔ ایضاً ۔

''میری جس تحریر نے پہلے پہلے اشاعت پائی (اور اس سے پیشتر کوئی لکڑا بھی کہیں نہیں چھپا تھا) وہ زمیندار اخبار کا افتتاحیہ تھا ۔ یعنی لیڈنگ آرٹیکل ۔''[1]

''طلوعِ صبحِ امید'' کی پہلی قسط ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ع بمطابق ۱۷ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ کے اخبار میں شائع ہوئی ۔ گویا مولانا مہر کی اخبار نویسی کا آغاز ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ع سے ہوا ۔ اس امر کا تعین مولانا مہر کی ایک اور تحریر سے بھی ہوتا ہے ۔ وہ شیر بہادر پنی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''بریڈ لاء ہال والی مجلس (جلسہٗ جمعیتہ العلماء ہند) اس روز منعقد ہوئی جو میری اخبار نویسی کا پہلا دن تھا ۔ نومبر ۱۹۲۱ع کی کوئی تاریخ تھی ۔ میں اس جلسے میں اول سے آخر تک رہا ۔''[2]

گویا بریڈ لاء ہال میں ہونے والے جلسہٗ جمعیت العلماء ہند کا پہلا دن ، مولانا مہر کی اخبار نویسی کا بھی پہلا دن تھا ۔ اس دور کے اخبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمعیت العلماء کا یہ اجلاس جو بریڈ لاء ہال میں منعقد ہوا تھا ، تین دن تک جاری رہا ۔ ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ع کو اس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا ۔ جیسا کہ روزنامہ زمیندار میں اس جلسے کی کاروائی اور جلسے سے قبل اخبارات میں جمعیت العلماء کی طرف سے جلسے کی تشہیر کے لیے شائع کرائے جانے والے اعلانات سے ظاہر ہوتا ہے ۔ مثلاً ۹ نومبر ۱۹۲۱ع کے اخبار میں جلسے کا اعلان کرتے ہوئے لکھا گیا کہ یہ جلسہ ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ع کو بریڈ لاء ہال لاہور میں منعقد ہوگا ۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مولانا مہر کی اخبار نویسی کا آغاز ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ع سے ہوا ۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ع کو روزنامہ زمیندار میں کام شروع کرنے کے چند ہی دن بعد مولانا مہر کو سامان لانے کی غرض سے واپس پھول پور جانا پڑا ۔ اس اثناء میں والدۂ مہر کو کسی نے اخبار نویسی کے ممکنہ بھیانک نتائج کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا ، لہذا مہر پھول پور پہنچے تو والدہ نے انھیں اخبار نویسی سے وابستگی کی اجازت نہ دی اور انھیں مجبوراً

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، مرقومہ ۱۲ فروری ۱۹۶۳ع غیر مطبوعہ ۔
۲۔ بنام شیر بہادر پنی ، مشمولہ افاداتِ مہر ، ص ۱۵۲ ۔

مستعفی ہونا پڑا ۔ لیکن اس اثنا میں خود زمیندار بھی ضمانت ضبط ہونے کے باعث بند ہو چکا تھا ۔ فروری ۱۹۲۲ء میں اخبار دوبارہ جاری ہونے سے پہلے زمیندار کے منیجر پھول پور پہنچے اور والدۂ مہر کو اطمینان دلا کر مہر صاحب کو لاہور لے آئے ۔ ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن داؤدی لکھتے ہیں :

”نومبر ۱۹۲۱ء میں مہر صاحب ”زمیندار“ میں چلے آئے جہاں افتتاحیہ (ایڈیٹوریل) لکھنے کی خدمت مہر صاحب سے متعلق ہوئی ۔ لیکن یہ تعلق چار چھ روز[1] سے زیادہ نہ رہا ۔ کیونکہ اس پُر آشوب زمانے میں جب کہ آئے دن گرفتاریاں ہو رہی تھیں ، مہر صاحب کے بعض عزیزوں نے انھیں اخبار نویسی کی اجازت نہ دی ۔ چند روز بعد زمیندار بھی ضمانت ضبط ہونے کے باعث عارضی طور پر بند ہو گیا ۔

فروری ۱۹۲۲ء میں زمیندار پھر جاری ہوا ۔ مولوی شفاعت اللہ خان اور مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش . . . خود مہر صاحب کے وطن پہنچے اور ان کے عزیزوں کو رضامند کر کے انھیں پھر زمیندار میں لے آئے ۔“[2]

ان بیانات کی تائید مزید اور بعض دیگر تفصیلات کے لیے ڈاکٹر شیر بہادر پنی کے نام مولانا غلام رسول مہر کے ایک خط کا مندرجہ ذیل اقتباس بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے ۔ مولانا مہر لکھتے ہیں :

”میں نومبر ۱۹۲۱ء میں آ گیا تھا ۔ میری والدہ مرحومہ کو کچھ معلوم نہ تھا کہ میں لاہور کیوں آیا ہوں ۔ میری غیر حاضری میں کسی نے میرے متعلق ایک بھیانک تصویر ان کے سامنے پیش کر دی اور وہ سخت پریشان ہو گئیں ۔ میں سامان لانے کے لیے گھر پہنچا تو

۱۔ اس مدت کے تعین کے سلسلے میں بھی مولانا مہر کے بیانات متضاد ہیں ۔ مثلاً اردو ڈائجسٹ کے لیے الطاف حسن قریشی کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے یہ مدت ”چار پانچ روز“ بتائی جبکہ ہفت روزہ چٹان میں اپنے ایک سوانحی نوٹ میں اس مدت کو بڑھا کر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ کر دیا ۔

۲۔ مولانا غلام رسول مہر ، از خلیل الرحمٰن داؤدی ، نقوش شخصیات نمبر ۱ ، ص ۶۳۸ ۔

ان کی ناراضی دیکھ کر حیرت زدہ ہوگیا . . . بہرحال والدہ کی دلداری میں مجھے اخبار نویسی ترک کرنی پڑی ۔ میں نے دفتر زمیندار میں لکھ بھیجا کہ حاضر ہونے سے معذور ہوں ۔ ضبطی ضمانت کے باعث اخبار بند تھا ۔ جب نئی ضمانت داخل کرکے اس کا اجرا ہوا تو منیجر صاحب خود میرے گاؤں آئے ۔ والدہ کو یقین دلایا کہ مہر کا اخبار سے بظاہر کوئی تعلق نہ ہوگا ۔ یہ صرف مضمون لکھا کرے گا ، اس طرح اطمینان دلا کر مجھے فروری ۱۹۲۲ع میں لاہور لے آئے ۔''[1]

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ مولانا نے روزنامہ زمیندار کی ایڈیٹری صرف تجربہ حاصل کرنے کے لیے قبول کی تھی اور ان کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی حالات نے اجازت دی وہ روزنامہ زمیندار سے علیحدگی اختیار کرکے اپنا اخبار جاری کر لیں گے ۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں ، اختر علی خاں اور عبدالمجید سالک کے طویل زمانۂ اسارت کے باعث علیحدگی ممکن نہ رہی ۔ اور مخصوص سیاسی حالات کی بنا پر مولانا مہر بھی زمیندار کو اخبار سے زیادہ قومی و ملکی خدمت کا ایک ادارہ تصور کرنے لگے تھے ، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں :

''شروع میں اس وابستگی کا مقصد یہ تھا کہ اخبار نویسی کا تجربہ حاصل کر لوں ۔ اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم ، ان کے صاحبزادے مولانا اختر علی خاں مرحوم اور مولانا سالک مرحوم ، جو میری علمی و عملی زندگی کے عزیز ترین رفیق بنے ، یکے بعد دیگرے بالترتیب ۵ سال ، تین سال اور ایک سال کے لیے قید ہو چکے تھے ۔ اور زمیندار محض ایک روزنامہ اخبار ہی نہیں تھا بلکہ ملک و ملت کی خدمت کے ایسے ادارے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا ، جسے دعوتِ حق و انصاف کے لیے قائم رکھنا بجائے خود ایک اہم قومی و ملی فریضہ بن گیا تھا ۔ اس وجہ سے میں نے مستقل وابستگی کا فیصلہ کر لیا ۔''[2]

۱۔ مکتوب بنام ڈاکٹر شیر بہادر پنی ، مرقومہ ۱۵ ۔ اگست ۱۹۷۱ع ، مشمولہ افادات مہر ، ص ۲۵۵ - ۲۵۶ ۔

۲۔ ''اپنی کہانی اپنی زبانی'' از غلام رسول مہر ، ص ۱۳ ، ہفت روزہ چٹان ، ۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ع ۔

اگرچہ دعوت حق و انصاف کے لیے قائم اس عظیم الشان ادارے سے مولانا مہر زیادہ عرصے تک اپنا تعلق برقرار نہ رکھ سکے اور ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ انھیں تقریباً ساڑھے پانچ سال بعد زمیندار سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی ، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان ساڑھے پانچ برسوں میں اسلامیان ِ ہند ، زمیندار اور خود مولانا مہر کو بہت کچھ فائدہ پہنچا ۔ تحریک ِ خلافت ، ترک ِ موالات اور اس کے بعد کے کٹھن اور مایوس دور میں روزنامہ زمیندار نے آزادی ہند اور ہندی مسلمانوں کے عام مفادات کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہر مرحلے پر عامۃ المسلمین کی رہنمائی کا حق ادا کیا ۔ کہنا چاہیے کہ اس پُر آشوب دور میں زمیندار مسلمانوں کا ایک اہم اخبار تھا ، جو بےجھجک اور مدلل انداز میں سامراج کے خلاف آوازۂ حق بلند کر رہا تھا ۔ دوسرے اخبارات کے مقابلے میں ''زمیندار'' کی ذمہ داریاں دو گونہ تھیں ۔ اول ہندوستان میں روح آزادی کا احیا ، دوم مسلم حقوق و مفادات کا تحفظ ۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ''زمیندار'' نے دونوں ذمہ داریاں بخوبی انجام دیں ۔ انھی اسباب کی بنا پر زمیندار نہ صرف پنجاب بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہر دلعزیز اخبار بن چکا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اول اس کی تعداد اشاعت میں اضافہ ہوا ، دوسرے اس کی بڑھتی ہوئی مالگ اور عام دلچسپی کے پیش ِ نظر اس میں بعض انقلاب آفریں تبدیلیاں بھی کی گئیں ۔ مثلاً ۱۹۲۳ء تک روزنامہ زمیندار ۲۲" × ۱۸" کی تقطیع میں چھپتا تھا ۔ ۱۹۲۳ء میں اسے ناکافی خیال کرتے ہوئے ۲۲" × ۲۹" کی تقطیع میں شائع کیا جانے لگا[1] ۔ اسی طرح اس کا دوسرا صفحہ ادارتی مقالات کے لیے مخصوص کر دیا گیا ، جس کے تین کالم تو متین و سنجیدہ صحافت کے لیے وقف رکھے گئے جبکہ ایک مزاحیہ کالم ''افکار و حوادث'' کے نام سے مستقل طور پر شائع کیا جانے لگا ۔[2]

۱۔ سرگزشت ، از سالک میں زمیندار میں ان تبدیلیوں کا ذکر ۱۹۲۲ء میں کیا گیا ہے ، جبکہ مولانا مہر ''نقش ِ آزاد'' کے صفحہ نمبر ۸ کے حاشیے میں یہ واقعات ۱۹۲۳ء سے متعلق بتاتے ہیں اور یہی سال درست بھی ہے ، کیونکہ مولانا مہر نے یہ حاشیہ اس تحریر پر دیا ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے زمیندار کی جدید ترقی پر ارکان عملہ کو مبارک باد کے طور پر بھیجی تھی اور اخبار میں شائع ہوئی تھی ۔

۲۔ سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۱۸۵ ، بار اول جنوری ۱۹۵۵ء ، مطبوعہ قومی کتب خانہ ، ریلوے روڈ ، لاہور ۔

''زمیندار'' سے وابستگی کی بنا پر مولانا مہر کو یہ فائدہ ہوا کہ اب وہ نہ صرف ذاتی اخبار جاری کرنے کے لیے کافی تجربہ حاصل کر چکے تھے بلکہ ان کا نام ایک ایسے صحافی کے طور پر شہرت پا چکا تھا، جو کسی بھی اخبار کی کامیابی کی ضمانت بن سکتا تھا۔ گویا زمیندار نے مولانا مہر کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنے ذاتی جوہر نمایاں کر سکیں۔ یہ درست ہے کہ ایک معروف صحافی بننے کے لیے مولانا مہر کو خود بھی شبانہ روز محنت کرنا پڑی لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی اس حیثیت کی تعمیر میں روز نامہ ''زمیندار'' کا بڑا دخل ہے۔ اس صحافتی ادارے سے منسلک ہونے کی بنا پر انھوں نے تین سال ہی میں وہ مقام حاصل کر لیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر جیسے عظیم صحافی اپنے اخبارات کے لیے ان کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ مولانا محمد علی جوہر نے تو روزنامہ ''ہمدرد'' کی ادارت کی پیش کش مولوی محمد عرفان کے ذریعے کی تھی جبکہ ابوالکلام آزاد کا اس سلسلے میں ایک خط 'نقشِ آزاد' میں محفوظ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اخبار خلافت روزانہ جو مرکزی خلافت کمیٹی کی جانب سے بمبئی میں جاری ہے، آج کل سخت بدنظمی کی حالت میں ہے۔ بدنظمی انتظام اور پریس کی نہیں ہے، تحریر اور ایڈیٹری کی ہے۔ اس وقت تک چودھری عبدالغنی ایڈیٹر رہے۔ ان پر مقدمہ چلا ہے اور اب کوئی شخص موجود نہیں۔ تنخواہ نہایت معقول ہے۔ اتنی جتنی شاید اردو اخبارات میں نہ دی جاتی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بالفعل اس کی ایڈیٹری کا چارج لے لیں۔''[۱]

لیکن مولانا مہر کو غیر معمولی تنخواہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی پیشکش بھی 'زمیندار' سے تعلق منقطع کرنے پر راغب نہ کر سکی اور وہ دعوتِ حق و انصاف کے اسی ادارے سے منسلک رہے۔

'زمیندار' سے تعلق ہی کے زمانے میں مولانا مہر کو عبدالمجید سالک کی وہ رفاقت بھی میسر آئی جس پر طرفین ہمیشہ اظہارِ مسرت کرتے رہے۔ جیسا کہ عبدالمجید سالک رہائی کے بعد مہر صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے

۱۔ نقشِ آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۴ - ۵۔

ہوئے لکھتے ہیں :

''. . . واپس لاہور آیا تو سب سے پہلے دفتر زمیندار میں گیا ، جہاں ان صاحب سے ملاقات ہوئی جن کو غلام رسول مہر کہتے ہیں اور جن کی رفاقت و محبت ۱۰ - نومبر ۱۹۲۲ع سے لی الی‌الآن شاملِ حال ہے اور جس کو میں ان نعمتوں میں سے سمجھتا ہوں جن کی وجہ سے یہ دکھ بھری زندگی قابلِ برداشت رہی - دیکھتا کیا ہوں کہ ایک زمیندار قسم کا آدمی کھدر کا کرتہ پاجامہ اور صدری پہنے اور کھردرا سا چار خانہ کمبل اوڑھے بینچ پر بیٹھا ہے - بھائی شفاعت اللہ خاں نے جو 'زمیندار' کے منیجر و نگران تھے ، مہر صاحب سے میرا تعارف کرایا - ہم بہت جلد بے تکلف ہو گئے اور چند ہی ملاقاتوں میں مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ 'زمیندار' قسم کا آدمی فارسی اور عربی سے بدرجہٗ اتم واقف ہے - فلسفہ ، تاریخ اور دینیات کے مطالعے میں بے حد شغف رکھتا ہے اور ادب و شعر میں بھی مذاقِ سلیم کا سرمایہ دار ہے -''[1]

اظہارِ مودت کا یہ سلسلہ یک طرفہ نہیں تھا بلکہ مولانا مہر نے بھی جہاں کہیں سالک صاحب کا ذکر کیا وہاں ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا ہے - مثال کے لیے صرف ایک اقتباس کافی ہوگا جس میں وہ سالک صاحب کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

''نومبر ۱۹۲۲ع میں سالک مرحوم قید کی مدت پوری کرکے ''زمیندار'' میں واپس آ گئے اور اُس وقت سے مرحوم کے ساتھ گہری برادرانہ رفاقت کا وہ دور شروع ہوا جو ان کی حیاتِ گراں مایہ کے آخری سانس تک برابر قائم و استوار رہا - فکر و نظر کی یکسانی ، ادبی ذوق اور افتاد طبع کی یک جہتی کے باعث یہ رفاقت میری زندگی کا بیش بہا سرمایہ ہے -''[2]

بعض طبعی اختلافات کے باوجود یہ رفاقت مثالی نوعیت اختیار کر گئی - یہاں تک کہ آپ دونوں کے مکانات بھی مسلم ٹاؤن لاہور میں ایک ہی جگہ

۱- سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۱۸۳ -

۲- اپنی کہانی اپنی زبانی ، ہفت روزہ چٹان ، ص ۱۳ ، ۲۴ دسمبر ۱۹۷۳ع -

اور ایک ہی زمانے میں بنے ۔ آپ کی دوستی اور رفاقت کا ذکر بعض شعرا کی نظموں اور بعض اکابر کے ملفوظات تک میں ہوا ۔ اس کے باعث ایسی صورتیں بھی پیش آئیں جو خود لطیفے کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ مولانا عبدالمجید سالک کے انتقال نے اس مثالی رفاقت اور اس کی دلچسپیوں کو ختم کر دیا ۔ سالک کے انتقال پر مولانا مہر ایک خط میں اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سالک صاحب کی وفات کا سانحہ بڑا ہی دردناک ، غم انگیز اور دل دوز ہے اور ابھی یہ سانحہ تازہ ہے ۔ ہمیں تو نقصان کا صحیح اندازہ کرنے کا بھی موقع تاحال نہیں مل سکا ۔ وہ بڑی نادر خوبیوں کا مجموعہ تھے اور ان سب میں سے ایک خوبی بھی کسی انسان کو زیادہ سے زیادہ محبوب بنانے کے لیے کافی ہے ۔ پھر سب سے بڑھ کر الم افزا حقیقت یہ ہے کہ اب وہ آغوش ہی باقی نہیں رہی ، جس میں سالک کے نادر جوہروں نے تربیت پائی تھی ۔ وہ دور ہی گزر گیا۔ وہ زمانہ ہی نہ رہا ۔ اب ایسے انسان کہاں پیدا ہوں گے ۔ لیکن مشیتِ ایزدی کا کارخانہ ہمارے مطلوبات و مرغوبات کا پابند نہیں اور ہمارے لیے راضی بہ رضا رہنے کے سوا چارہ کیا ہے ۔"[۲]

روزنامہ 'زمیندار' سے مستقل وابستگی کا ارادہ رکھنے کے باوجود مولانا مہر کو ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اس انقطاعِ تعلق کے یوں تو بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں ، مثلاً ایک سبب مولانا ظفر علی خاں اور سالک و مہر میں اخبار کی پالیسی کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے جس کا اظہار روزنامہ 'انقلاب' میں شائع ہونے والے ایک مضمون سے ہوتا ہے ۔[۳] اس کے علاوہ سالک و مہر اور دیگر ارکانِ عملہ سے مولانا اختر علی خاں کا نامناسب رویہ بھی آزردگی کا سبب ہو سکتا ہے ۔ لیکن ایک سبب ایسا بھی ہے جس کا ذکر مہر و سالک کی تحریروں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ ''زمیندار'' کے عملے کو بے جا طور پر مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔ مہر اور سالک کو

۱۔ افاداتِ مہر ، مرتبہ شیر بہادر پنی ، ص ۷۱ - ۷۲ ۔
۲۔ مکتوب بنام انیس جیلانی ، مرقومہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۹ء ۔
۳۔ روزنامہ انقلاب ، ۶ مارچ ۱۹۲۸ء ۔

تو ہر ماہ کی تنخواہ متعدد قسطوں میں ادا کر دی جایا کرتی تھی جبکہ باقی عملے کو بعض اوقات مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ شدید مصروفیات کے بعد اگر کوئی ملازم رخصت چاہتا تو اول تو رخصت ہی نہیں دی جاتی تھی ۔ اگر چھٹی دی بھی جاتی تو چھٹیوں کے دنوں کی پوری تنخواہ نہیں دی جاتی تھی ۔ عبدالمجید سالک اس قسم کے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''آخر ناچار مولوی[1] صاحب کو میری رخصت منظور کرنی پڑی ۔ تھوڑی دیر میں ان کا ایک رقعہ آیا جس میں لکھا تھا کہ ''زمیندار'' کی مالی حالت آپ سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ اگر حالات اچھے ہوتے تو آپ کو ایامِ رخصت کی پوری تنخواہ پیش کی جاتی لیکن اب ایک تہائی تنخواہ ایصال ہوا کرے گی ۔ آپ اسے قبول کیجیے ۔ مجھے اس کی بھی توقع نہ تھی اور میں اپنے ذہن میں روزِ اول ہی سے اس رخصت کو بلا تنخواہ سمجھتا تھا ۔''[2]

لیکن مندرجہ بالا اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ یہ صورتِ حال مولانا ظفر علی خاں کے باعث پیش آتی تھی یا وہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے نادہند تھے ۔ خود سالک نے بھی مولانا کی فیاضی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

''اب میں روزانہ اخبار کی ایڈیٹری میں چل نکلا تھا ۔ مولانا دو دو تین تین ہفتے باہر رہ کر بیچ میں کبھی کبھی دو چار دن کے لیے آتے میرے مضامین جمع کرکے پڑھتے ، داد و تحسین سے حوصلہ افزائی فرماتے ۔ دس بیس روپے انعام کے طور پر مٹھائی کے لیے دیتے اور لاہور سے روانہ ہو جاتے ۔''[3]

درحقیقت صورت یہ تھی کہ مولانا ظفر علی خاں کی سیاسی مشغولیتوں ، سیاسی دوروں پر اُٹھنے والے اخراجات اور انتظامی امور کی طرف سے بے توجہی روزنامہ زمیندار کی معیشت پر بری طرح اثر انداز ہو رہی تھی ۔ اس پر اختر علی

۱۔ مولانا ظفر علی خاں مراد ہیں ۔
۲۔ سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۲۱۵ ۔
۳۔ سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۱۱۴ ۔

خاں کی عاقبت نا اندیشیاں اور غلط طرزِ عمل 'زمیندار' اور اس کے عملے کے لیے مستزاد تھیں ۔ بعض اوقات یہ محض اپنی ذاتی انا کی تسکین کی خاطر ارکانِ عملہ کو تنگ کرتے تھے ۔ تنخواہ کی عدم ادائیگی اور اختر علی خاں کے رویے سے تنگ آکر 'زمیندار' کے عملے نے ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو ہڑتال کا فیصلہ کر لیا ۔ ابتدا میں مہر و سالک کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن بعد ازاں ان کو بھی اس ہڑتال میں شامل ہونا پڑا ۔ کیونکہ اول تو وہ کارکنوں کے مطالبات کو جائز تصور کرتے تھے ۔ دوسرے ان کا خیال تھا کہ شاید اس طرح وہ اخبار کے مالکوں اور کارکنوں کے درمیان واسطہ بن کر معاملے کو جلد سلجھانے کا باعث بن جائیں ۔ لیکن سالک و مہر کا یہ عمل بعض غلط فہمیوں کی بنیاد بن گیا ، جن کا نتیجہ 'زمیندار' سے مہر و سالک کی علیحدگی کی صورت میں نکلا ۔ باقی ارکانِ عملہ نے بھی مہر و سالک کا ساتھ دیا اور وہ بھی اخبار سے الگ ہو گئے ۔

بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اچانک اور غیر متوقع طور پر پیش آیا لیکن ایسے شواہد بھی ملتے ہیں جن کے باعث یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس واقعے کے لیے بہت پہلے سے فضا تیار ہو رہی تھی ۔ اس سلسلے میں سب سے اہم تحریر مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ طویل مکتوب ہے جو انہوں نے ۱۹ جنوری ۱۹۲۷ء کو مولانا مہر کے نام لکھا ۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں :

"ایک عرصے سے شفاعت اللہ خاں صاحب کہہ رہے ہیں کہ ان میں ، آپ میں اور سالک صاحب میں کوئی مشورہ ہوا ہے اور مصمم قصد ہے کہ لاہور یا دہلی سے ایک روزانہ اخبار مشترکہ کوشش سے جاری کیا جائے ۔ جب پچھلے دنوں میں نے دہلی جانے کا قصد کیا تھا تو میں نے ان سے کہا تھا ، میں خود تو اس کی ذمہ داری نہیں لوں گا لیکن جس قدر مدد دے سکتا ہوں ، دوں گا ۔ لیکن وہ وقت مع اپنے ارادوں کے نکل گیا ۔ اس مرتبہ جب دہلی میں وہ ملے تو انہوں نے کہا کہ اس بارے میں وہ بہت کچھ طیاریاں کر چکے ہیں اور آپ اور سالک صاحب دونوں تیار ہیں . . . آپ کو یاد ہوگا ستمبر میں جب آپ دہلی میں ملے تھے تو آپ نے مولوی عبدالقادر صاحب کی زبانی مجھ سے مشورہ چاہا تھا اور میں نے یہی رائے دی تھی کہ سر دست زمیندار میں مشغولیت جاری رکھی جائے تا آنکہ کوئی بہتر صورت نکل آئے ۔"[1]

۱۔ مکتوب بنام مولانا مہر ، مشمولہ نقشِ آزاد ، ص ۱۴ - ۱۵ ۔

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف جنوری ۱۹۲۷ء بلکہ ستمبر ۱۹۲۶ء سے بھی قبل شفاعت اللہ خان، مولانا مہر اور عبدالمجید سالک 'زمیندار' سے علیحدگی اور نئے اخبار کے اجرا کا پروگرام بنا چکے تھے۔ لیکن پھر ضروری رقم کا بندوبست نہ ہونے کے باعث مہر و سالک نے 'زمیندار' سے قطع تعلق کا پروگرام تو برقرار رکھا البتہ نئے اخبار کے اجرا کا خیال ترک کر دیا، جیسا کہ مولانا مہر لکھتے ہیں :

"ابتدا میں 'زمیندار' سے علیحدگی کا خیال بھی نہ تھا اس لیے کہ مقصود خدمت تھا اور اس کے لیے 'زمیندار' میں مناسب ذرائع موجود تھے۔ پھر آہستہ آہستہ حالات نے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ایسی صورت اختیار کر لی کہ ہمارے لیے 'زمیندار' سے تعلق قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ . . . مولانا ظفر علی خاں کو ہماری علیحدگی منظور نہ تھی لیکن وہ خواہش و عزم کے باوجود حالات کی درستی پر بھی قادر نہ تھے۔ میں نے اور سالک صاحب نے تو آخر میں فیصلہ کر لیا تھا کہ نیا اخبار جاری کرنے کی ضرورت نہیں اور ہمیں 'زمیندار' چھوڑ کر علمی و ادبی مشاغل اختیار کر لینے چاہئیں۔"[1]

مولانا مہر نے الطاف حسن قریشی کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی تقریباً اسی نوعیت کے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے بتایا :

". . . میں نے اور سالک مرحوم نے بعض حالات کی بنا پر 'زمیندار' سے استعفیٰ دے دیا۔ ترکِ ملازمت کے وقت یہ ارادہ پختہ ہو چکا تھا کہ اب یکسوئی کے ساتھ کوئی علمی کام کریں گے۔ لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہمارے سارے پروگرام کو بدل کر رکھ دیا۔"[2]

وہ خاص واقعہ یہ تھا کہ ارکانِ عملہ کی طرف سے نوٹس دیا گیا کہ اگر ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کی شام تک تنخواہیں ادا نہ کی گئیں تو ۲۱ مارچ کو ہڑتال ہو جائے گی۔ اگرچہ اس نوٹس کی اطلاع پاتے ہی مولانا ظفر علی خاں اور اختر علی خاں لاہور پہنچ گئے لیکن کارکنوں اور مہر و سالک سے گفتگو کرنے

۱۔ حاشیہ نقشِ آزاد، ص ۱۶۔

۲۔ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، ص ۲۵، اگست ۱۹۶۱ء۔

کی بجائے ہر کارکن کو الگ الگ بلا کر پوچھنے لگے کہ تم مولانا ظفر علی خاں اور مہر و سالک میں سے کس کے ساتھ ہو ؟ اس کی اطلاع مہر و سالک کو ہوئی تو انھوں نے یہ خیال کرتے ہوئے استعفا دے دیا[1] کہ اب مولانا ظفر علی خاں ان کو 'زمیندار' کا حریف و مخالف تصور کرنے لگے ہیں ۔ استعفاء منظور کر لیا گیا جس کے نتیجے میں سالک و مہر 'زمیندار' سے الگ ہو گئے ۔ یہاں تک تو خیریت تھی ۔ مشکل اُس وقت پیش آئی جب ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ع کی شام کو 'زمیندار' کے کارکن دفتر جانے کی بجائے سالک و مہر کے گھر پہنچ گئے اور سمجھانے بجھانے کے باوجود انھوں نے کام پر جانے سے انکار کر دیا ۔[2] مہر و سالک ادبی و علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ یقیناً کوئی ایسا کام بھی تلاش کر لیتے جو معاش کی ضرورتیں بھی پوری کرسکے ۔ لیکن اتنے لوگوں کا بندوبست ان کے امکان میں نہ تھا ۔ لہٰذا سوچا گیا کہ کیوں نہ کوئی اخبار جاری کر لیا جائے ۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ ضروری رقم کا بندوبست ناممکن تھا۔ آخر عبدالمجید سالک کے ذہنِ رسا نے تجویز پیش کی کہ بعض دوستوں سے چندۂ تاحینِ حیات کی صورت میں مالی مدد طلب کی جائے ۔ ایسے سو دوستوں کے نام پیش کیے گئے جو ایک ایک سو روپیہ دے سکتے تھے ۔[3] اس سلسلے میں سید عبدالقادر شاہ نے خصوصیت سے تعاون کیا ۔[4] اس کے باوجود توقع کے مطابق رقم جمع نہ ہو سکی ۔ البتہ اتنی رقم اکٹھی ہو گئی کہ ایک اخبار جاری کیا جا سکے ۔ چنانچہ روزنامہ 'انقلاب' کا اجرا عمل میں لایا گیا جس کا نام علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم ''انقلاب اے انقلاب'' سے لیا گیا ۔ اور یہ نظم اخبار کی پہلی اشاعت کے صفحہ اول پر شائع کی

۱۔ استعفاء کے طور پر لکھی جانے والی تحریر کی نقل محمد یوسف طاہر نے اپنے مقالے کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کی ہے ۔

۲۔ 'سرگزشت' میں واقعات کی تفصیل کے علاوہ ارکانِ عملہ کے نام بھی دیے گئے ہیں ۔

۳۔ 'سرگزشت' کے صفحہ ۲۳۴ - ۲۳۵ پر ان دوستوں میں سے بعض کے نام بھی دیے گئے ہیں ۔

۴۔ یہ وہی عبدالقادر شاہ ہیں جنھوں نے مولانا مہر کو روزنامہ 'زمیندار' میں کام کرنے کا مشورہ دیا تھا ۔ ان کے تفصیلی حالات کے لیے ''وے صورتیں الٰہی'' از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید دیکھیے ۔

گئی ۔ ان تمام حالات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر بتاتے ہیں :

"جس روز ہم 'زمیندار' سے مستعفی ہوئے اسی شام کو اخبار کا پورا عملہ کام چھوڑ کر ہمارے پاس آ گیا ۔ ہم نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ وہ کام جاری رکھیں لیکن وہ تیار نہ ہوئے ۔ ہمارے لیے پندرہ بیس آدمیوں کا خرچ برداشت کرنا ممکن نہ تھا ۔ میں نے سالک صاحب سے اس سنگین صورت حال کا اضطرابی کیفیت کے ساتھ ذکر کیا ۔ انہوں نے فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے گزارے کا بندوبست اخبار جاری کیے بغیر نہیں ہو سکتا ۔ انہوں نے اخبار جاری کرنے کی تجویز بھی پیش کر دی ، یعنی احبابِ خاص سے استمداد ۔ احباب نے ایسی فراخ حوصلگی سے امداد کی کہ ایک ہی دن میں نئے اخبار کے اجراء کا اشتہار تیار ہوگیا ۔ ابھی اخبار کا کوئی نام تجویز نہیں ہوا تھا کہ معمول کے مطابق حضرت علامہ اقبال سے ملنے کے لیے گئے ۔ انہوں نے از راہ نوازش ہمیں اپنی مشہور نظم "انقلاب اے انقلاب" سنائی ۔ اس نظم کی بنا پر اخبار کا نام "انقلاب" تجویز ہوا اور یہ نظم پہلی مرتبہ "انقلاب" کی پہلی اشاعت کے صفحۂ اول پر شائع ہوئی ۔"[1]

رقم کی فراہمی کے بندوبست کے ساتھ ساتھ مہر و سالک ایسے کہنہ مشق صحافیوں نے 'زمیندار' کے باقی ہڑتالی عملے کے تعاون سے ایسے اقدامات بھی شروع کر دیے جن کی مدد سے نیا اخبار جاری کرنے کی راہ ہموار ہو سکتی تھی ۔ مثلاً پہلے ایک اشتہار شائع کیا گیا جس میں 'زمیندار' سے مہر و سالک سمیت سارے عملے کی علیحدگی کی خبر شائع کی گئی ۔ اگلے دن ایک اور اشتہار شائع کیا گیا جس میں اجرائے 'انقلاب' سے متعلق خبر دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ عید کے دن یعنی ۲ ۔ اپریل ۱۹۲۷ء کو ایک روزنامہ جاری کیا جائے گا ۔ اس کے بعد بہ عجلت تمام ضروری تیاریاں کی گئیں اور روزِ موعودہ کو 'انقلاب' منظر عام پر آ گیا ۔ مولانا سالک اجرائے انقلاب کی تاریخ کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ غلام رسول مہر کے ساتھ ایک شام ، انٹرویو الطاف حسن قریشی ، اردو ڈائجسٹ ، ص ۲۵ - ۲۶ ، اگست ۱۹۶۱ء ۔

''یہ سب کچھ اس قدر سرعت کے ساتھ عمل میں آیا کہ ۲۱ مارچ کو 'زمیندار' سے نکلے تھے اور ۲ اپریل کو ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ ایک عظیم الشان روزنامہ جاری ہوگیا۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'انقلاب' پہلی مرتبہ دو اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع ہو کر منظر عام پر آیا ، جبکہ دو اپریل کو پہلے شائع کیے جانے والے اشتہار کے مطابق عید کا دن تھا ۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ہمارے بعض نامور محققین نے اپنی تحقیقی کاوشوں میں اجرائے انقلاب کی تاریخ کو دو اپریل سے چار اپریل بنا دیا ۔ جیسا کہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں :

''یہ لوگ[2] ، ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو 'زمیندار' سے نکلے تھے اور ۴۔ اپریل ۱۹۲۷ء کو 'انقلاب' پورے سازوسامان سے آراستہ ہو کر اُفقِ صحافت پر رونق افروز ہوگیا ۔''[3]

اسی طرح احمد سعید اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

''روزنامہ انقلاب ۴۔ اپریل ۱۹۲۷ء کو غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک نے لاہور سے جاری کیا ۔''[4]

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان تحقیقی لغزشوں اور فروگزاشتوں کے معاملے میں محققین کی بھی کچھ زیادہ کوتاہی نہیں ہے ۔ ایسا صرف اس لیے ہوا کہ انھوں نے 'انقلاب' اور دیگر معاصر اخبارات کا مطالعہ کرنے اور تعمقِ فکر سے کام لینے کی بجائے روشِ تقلید کو اختیار کر لیا ۔ اور چونکہ اس نوعیت

۱۔ سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۲۳۵ ۔
۲۔ سالک و مہر اور عملے کے دوسرے ارکان مراد ہیں ۔
۳۔ صحافت ــ پاکستان و ہند میں ، از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، ص ۲۲۹ ۔ مکتبۂ کارواں لاہور۔
۴۔ مسلم صحافت اور جدوجہدِ آزادی ، از احمد سعید ، صفحہ ۹۹ ۔ مطبوعہ جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ، جنوری ۱۹۸۱ء ۔

کی فروگزاشتیں خود مولانا مہر کی تحریروں میں بھی موجود تھیں لہٰذا یہ محقق بھی غلطی پر غلطی کرتے چلے گئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج چند ایک ماخذ کے علاوہ مولانا مہر پر تحقیقی مقالوں سے لے کر عام مضامین تک میں تضادات کی یہی صورت پائی جاتی ہے ۔ حیران کن بات یہ ہے کہ مولانا مہر نے جہاں بھی اجرائے 'انقلاب' کی تاریخ لکھی وہیں ۲ اپریل ۱۹۲۷ع کی بجائے ۴ ۔ اپریل ۱۹۲۷ع تحریر کی ۔ مثال کے لیے چند ایک اقتباس قابل ملاحظہ ہیں :

انھوں نے 'نقش آزاد' کے حاشیے میں لکھا :

''آٹھ روز کے اندر اندر ہم نے اجرائے انقلاب کا بندوبست کر لیا جس کا پہلا پرچہ ۴ ۔ اپریل ۱۹۲۷ع کو شائع ہوا ۔''[1]

اس اقتباس سے 'انقلاب' کی تاریخ اجرا کے علاوہ ایک اور غلط فہمی بھی جنم لیتی ہے اور وہ یہ کہ شاید مہر و سالک 'زمیندار' سے بھی ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ع کی بجائے ۲۷ مارچ کو الگ ہوئے تھے ۔ اس شبہے کی وجہ وہ قید ہے جو مندرجہ بالا اقتباس میں "آٹھ روز" سے لگائی گئی ہے ۔ اس شبہے کو اس وقت مزید تقویت ملتی ہے جب ہم مولانا مہر کی یہ تحریر دیکھتے ہیں :

''ہم ۲۷ مارچ ۱۹۲۷ع کو 'زمیندار' سے الگ ہوئے تھے اور ۴ ۔ اپریل ۱۹۲۷ع کو 'انقلاب' کا پہلا پرچہ منظر عام پر آ گیا ۔''[2]

یہاں پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ مولانا مہر کی دونوں محولہ بالا تحریریں اُس وقت کی ہیں جب انقلاب بند ہو چکا تھا ۔ جبکہ وہ انقلاب کے صفحات پر بھی تقریباً یہی کچھ لکھتے رہے ۔ مثلاً انھوں نے ایک اداریے میں لکھا :

''انقلاب چار اپریل ۱۹۲۷ع کو معرض وجود میں آیا تھا ۔ آج اس پر کچھ کم پانچ سال کے لیل و نہار گزر چکے ہیں ۔''[3]

۱۔ نقش آزاد ، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ، ص ۱۶ ۔
۲۔ میری کہانی میری زبانی ، از غلام رسول مہر ، ص ۱۴ ۔ ہفت روزہ چٹان ، ۲۴ دسمبر ۱۹۷۳ع ۔
۳۔ روزنامہ انقلاب ، ۲۹ فروری ۱۹۳۲ع ۔

لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ روزنامہ 'زمیندار' سے علیحدگی کی صحیح تاریخ ۲۷ مارچ کی بجائے ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء ہے اور یہ مولانا مہر کی تحریروں سے بھی ثابت ہے۔[۱] اسی طرح یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ 'انقلاب' کے اجرا کی تاریخ بھی چار اپریل کی بجائے دو اپریل ۱۹۲۷ء ہی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی دلیل تو وہ اقتباس ہے جو عبدالمجید سالک کی خود نوشت سوانح عمری سے پیش کیا جا چکا ہے، جبکہ دوسری لیکن برہانِ قاطع کی حیثیت رکھنے والی دلیل جاننے سے قبل تھوڑا سا پس منظر سامنے لانا ضروری ہے۔ جیسا کہ اجرائے 'انقلاب' سے متعلق اشتہار میں درج تھا اور بعد ازاں عبدالمجید سالک کی تحریر سے بھی اس کی تصدیق ہوئی، انقلاب کا پہلا پرچہ ۱۳۴۵ھ میں عین عید کے دن شائع ہوا تھا، لہذا ہر سال اس کا سالگرہ نمبر عیسوی تاریخ کی بجائے سنہ ہجری کی تاریخ کے مطابق یکم شوال ہی کو شائع کیا جاتا رہا۔ لیکن بعد ازاں اس سے کچھ انتظامی نوعیت کی دشواریاں پیش آنے لگیں، لہذا فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ سالگرہ نمبر یکم شوال کی بجائے عیسوی تاریخ کے اعتبار سے نکالا جائے گا۔ اس سلسلے میں فروری ۱۹۳۰ء بمطابق رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ میں اخبار کی متعدد اشاعتوں میں ایک اشتہار شائع ہوتا رہا جس میں اخبار کی انتظامیہ نے 'انقلاب' کے قارئین کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں اٹھارہ فروری ۱۹۳۰ء کے اشتہار کے متن کا کچھ حصہ پیش ہے:

"بعض وجوہ سے یہ قرار پایا ہے کہ آئندہ روزنامہ 'انقلاب' کا سالگرہ نمبر عیدالفطر کی بجائے ہر سال ۲- اپریل کو شائع ہوا کرے گا کیونکہ انقلاب اسی تاریخ سے جاری ہوا تھا ۔ ۔ ۔ ۔"[۲]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'انقلاب' کی تاریخِ اجرا ۲ - اپریل ۱۹۲۷ء ہے۔ اس امر کا یقین اس بنا پر بھی ہے کہ اول تو اشتہار اور پھر اس کی تحریر خاصی

۱- مولانا مہر ۱۵ مئی ۱۹۲۷ء کے ایک اداریے میں لکھتے ہیں کہ "۲۱ مارچ کو اس حالت میں 'زمیندار' سے نکلے تھے کہ چند روز کی قوتِ لایموت کا سامان بھی موجود نہ تھا مگر انقلاب ڈیڑھ ماہ سے جاری ہے اور حی و قیوم کو منظور ہوا تو جاری رہے گا"۔

۲- روزنامہ انقلاب، ۱۸ فروری ۱۹۳۰ء -

نمایاں ہوتی تھی ۔ اس کے علاوہ یہ ایک دو نہیں بلکہ متعدد اشاعتوں میں شائع کیا جاتا رہا ۔ اور چونکہ ابھی اخبار کو جاری ہوئے صرف تین ہی سال ہوئے تھے لہذا یہ ممکن نہیں کہ اس کے غلط ہونے کے باوجود اس کی تصحیح نہ کی جاتی ۔ عام قارئین نہیں تو خود اخبار کا عملہ یقیناً اس غلطی سے مطلع ہوتا ۔ چنانچہ اس نوعیت کی کوئی مثال نہ ہونے کی صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ 'انقلاب' کی اشاعت اول کی تاریخ دو اپریل ۱۹۲۷ء ہی ہے ۔

'انقلاب' دو اپریل ۱۹۲۷ء سے جاری ہوا اور پھر اواخر ۱۹۴۹ء تک اُفقِ صحافت پر ایک روشن ستارے کی طرح چمکتا رہا ۔ اس کی تقریباً ساڑھے بائیس سالہ زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے ۔ ملک کے مختلف حصوں میں اس کا داخلہ بند کیا گیا ۔ حق پرستانہ مؤقف کی بنا پر اس کے پرچے اور ضمانتیں ضبط ہوئیں ۔ برعظیم کے ہندو مسلم فسادات کے باعث اگست ۱۹۴۷ء میں عارضی طور پر بند بھی ہوا ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ایک طویل عرصے تک ہندوستان کے طول و عرض میں انقلاب ہی کو مسلم اکثریت کا واحد ترجمان اخبار قرار دیا گیا ۔ اور یہ بھی ہوا کہ اس پر زوال و عتاب کے مختلف ادوار آئے اور غالباً اسی لیے ''روزنامہ انقلاب'' کی سیاسی پالیسیاں آج تک متنازعہ حیثیت رکھتی ہیں ۔ لیکن یہاں پر ان سب امور کو زیرِ بحث لانا شاید نامناسب ہوگا ۔ البتہ اجرائے 'انقلاب' کے بعد مولانا مہر کی زندگی میں پیش آنے والے اہم واقعات کا تذکرہ ضروری ہے ۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ 'انقلاب' کے اجراء کے بعد اس کی بندش تک کے درمیانی وقفے میں بہت کم واقعات ایسے ہیں جن کا کسی نہ کسی طور 'انقلاب' سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ دراصل مولانا مہر نے انقلاب کے لیے اپنی ذات کو کچھ اس انداز میں وقف کر دیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی پہچان بن گئے تھے ۔ آج انقلاب کے مداح جن چیزوں کو انقلاب کی خوبیاں تصور کرتے ہیں وہ سب مہر صاحب کا عطیہ ہیں ۔ جبکہ مہر صاحب کے براق دامن پر ان کے معترضین کو جو دھبے نظر آتے ہیں وہ دراصل 'انقلاب' کے اوراق ہی کی سیاہی ہے ۔

اس کے باوجود مولانا مہر کی زندگی کے کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جو بظاہر 'انقلاب' کے دائرۂ کار میں نہیں آتے ، البتہ بہت سے واقعات کے بنیادی اسباب و محرکات میں انقلاب کا دخل ضرور ہے اور اس روزنامہ کے بغیر ان واقعات کا وجود ناممکن ہی ہوتا ۔ اس سلسلے کی سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ مولانا

مہر 'انقلاب' کے مدیر ہی کی حیثیت سے عملی سیاست کے میدان میں آ سکے اور انھوں نے وہ کردار ادا کرنا شروع کیا ، جس کو وہ تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں اور مسلمانانِ پنجاب کے لیے مفید و سود مند سمجھتے تھے۔ ابتدا میں کانگرس سے تعاون کیا اور بعد ازاں اتحاد پارٹی اور مسلم لیگ کی دامے درمے ، قدمے اور سخنے مدد کرتے رہے ۔ انھوں نے مختلف سیاسی جماعتوں کی کانفرنسوں میں شرکت کی بلکہ بہت سے نازک مواقع پر اہم کردار ادا کیا ۔ مثلاً شفیع لیگ اور جناح لیگ کے ادغام کے سلسلے میں مدیر 'انقلاب' نے جو کاوش کی تھی اس کا ذکر معاصر تاریخوں کے اوراق میں محفوظ ہے ۔ اسی طرح سکندر جناح پیکٹ کے سلسلے میں مولانا مہر کی خدمات لائقِ ستائش ہیں ۔ تقسیمِ ہند کا منصوبہ اور سکیم تیار کرنے والی کمیٹی میں ان کا نام بہت نمایاں رہا ۔ یہ اور اس طرح کے سینکڑوں مواقع پر مولانا مہر مسلمانوں کے صفِ اول کے لیڈروں میں شامل نظر آتے ہیں ۔

اگرچہ مولانا مہر 'زمیندار' سے وابستگی کے زمانے میں مدیر 'زمیندار' کی حیثیت سے بیرون ملک سفر کر چکے تھے لیکن 'انقلاب' کے مدیر کی حیثیت سے بھی انھوں نے کئی بیرونی ممالک کا سفر کیا ۔ اگرچہ مولانا محقق ، مصنف اور مؤرخ کی حیثیت سے بھی معروف مقام کے حامل ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ برعظیم کے بیشتر ناموروں سے آپ کی واقفیت اور دوستانہ مراسم صرف مدیر 'انقلاب' ہی کی حیثیت میں پیدا ہوئے ۔ مولانا محمد علی جوہر ، مولانا شوکت علی ، مفتی کفایت اللہ ، مولانا احمد سعید ، مولانا حسین احمد مدنی ، مہاراجہ محمود آباد ، مہاراجہ سلیم پور ، میاں فضلِ حسین ، حسین شہید سہروردی ، شعیب صدیقی ، حکیم اجمل خاں ، سر شفیع ، ڈاکٹر انصاری ، سر عبدالقادر ، حسرت موہانی اور علامہ اقبال وغیرہ میں سے کتنی شخصیات ہیں جن سے مولانا مہر کا تعارف اور خط و کتابت 'انقلاب' سے وابستگی کے بغیر بھی ہو سکتی تھی ۔ کہنا چاہیے کہ یہ سب کچھ 'انقلاب' ہی کا فیضان ہے ۔

سیاسی و معاشرتی مقام و مرتبہ میں اس انقلاب کے علاوہ آپ کی مالی و اقتصادی حالت میں بھی روزنامہ انقلاب ہی کے باعث تغیر آیا ۔ انقلاب کا اجراء ایک اہم قومی اور ملکی خدمت تو تھی ہی لیکن یہ اچھا کاروبار بھی تھا ۔ اور چونکہ مہر و سالک اس کاروبار کا سلیقہ رکھتے تھے لہذا دیکھتے ہی دیکھتے 'انقلاب' ان کے لیے خاصا منافع بخش ثابت ہوا ۔ اسی لیے 'انقلاب' کے اجراء کے

چند ہی سال بعد مدیران انقلاب کی مالی حیثیت اتنی مستحکم ہوگئی کہ وہ کرائے کے مکانوں کو چھوڑ کر اپنی کوٹھیاں تعمیر کروا سکیں ۔

مولانا مہر فروری ۱۹۲۲ع میں مستقل طور پر لاہور آئے تو ابتدا میں 'زمیندار' کے دفتر ہی میں رہائش اختیار کی ۔ بعد ازاں فلیمنگ روڈ پر مکان کرائے پر حاصل کیا اور یہاں رہنے لگے ۔ مولانا نے فلیمنگ روڈ پر اپنی رہائش کا تذکرہ اپنے کئی مکاتیب میں کیا ہے ۔ مثلاً اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"حضرت علامہ کے ساتھ عقیدت کیشی کے سولہ سال گزرے جن میں سے تیرہ سال ایسے تھے کہ ان سے انتہائی مکانی قرب بھی حاصل رہا ۔ میں شہر میں رہتا تھا اور میرا مکان حضرت کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے بہت قریب تھا ۔ خود بھی قریباً روزانہ جاتا تھا اور اکثر وہ بلا بھی لیتے تھے ۔ پھر دو دو چار چار گھنٹے تنہائی میں باتیں ہوتیں ۔"[1]

مولانا مہر نے محولہ بالا خط میں حضرت علامہ اقبال سے مکانی قرب کا عرصہ تیرہ سال لکھا ہے جو قرائن و شواہد سے درست معلوم نہیں ہوتا ، کیونکہ 'سرگزشت' اور دیگر معاصر شہادتوں سے یہ ثابت ہے کہ مہر و سالک دونوں اواخر ۱۹۳۲ع میں شہر کی رہائش ترک کرکے مسلم ٹاؤن آ گئے تھے جس کا مطلب ہے کہ مولانا مہر نے ۱۹۱۹ع میں شہر میں رہائش اختیار کی تھی ۔ حالانکہ اس زمانے میں تو وہ حیدر آباد دکن میں تھے اور یوں بھی وہ فروری ۱۹۲۲ع میں بحیثیت ایڈیٹر 'زمیندار' لاہور آئے اور کچھ عرصہ وہ دفتر 'زمیندار' میں بھی رہے[2]۔ ماہ و سال کی یہ فروگزاشت غالباً خود مولانا مہر نے بھی محسوس کر لی تھی اس لیے اپنے ایک اور خط میں رقم طراز ہیں :

"اقبال کے ساتھ گہرا تعلق ۱۹۲۲ع میں ہوا جب میں اخبار نویسی کے لیے لاہور آیا تھا ۔ پھر سولہ سال ان کے ساتھ براہ راست عقیدت میں گزرے ۔ ان میں سے دس سال ایسے ہیں (۱۹۲۲ — ۱۹۳۲ع) جب میں روزانہ اور بعض اوقات دن میں دو مرتبہ ان کے ہاں جاتا تھا ۔"[3]

۱- مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۲۵- اپریل ۱۹۶۵ع ، غیر مطبوعہ ۔
۲- مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۲۲ ۔
۳- مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۲۵ اپریل ۱۹۶۹ع غیر مطبوعہ ۔

مندرجہ بالا اقتباس مکتوب سے شہر میں رہائش کے تقریباً درست سنہ و سال متعین ہو جاتے ہیں ۔ لیکن یہ امر تا حال واضح نہیں ہے کہ مولانا میکلوڈ روڈ یا اس سے قریب کس جگہ رہتے تھے ۔ اس کے لیے ان کا ایک اور مکتوب راہ نمائی کرتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''میں ۱۹۲۵ع میں فلیمنگ روڈ پر (چوک اور پرانی میوہ منڈی کے درمیان) رہتا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب اُس زمانے میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں آ رہے تھے ۔ اب شاہ ابوالمعالی کے آس پاس بے شمار عمارتیں بن گئی ہیں ۔ اُس زمانے میں یہ جگہ زیادہ تر خالی تھی اور میں پانچ سات منٹ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ جاتا تھا ۔ وہ خود بھی اکثر علی بخش کو بھیج کر بلا لیتے تھے ۔''[1]

علامہ اقبال کی قربت کے باوجود مولانا مہر زیادہ عرصے تک فلیمنگ روڈ والے مکان میں نہ رہ سکے ۔ یوں بھی آخر کرائے کے مکان پر کب تک انحصار کیا جا سکتا تھا ۔ لہٰذا مہر و سالک نے شہر سے باہر کوئی مناسب قطعۂ زمین خریدنے اور مکان تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا ۔ ابتداء میں اس منصوبے میں علامہ اقبال اور چودھری محمد حسین بھی شامل تھے ۔ جیسا کہ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں :

''مہر صاحب ابھی دوسری گول میز کانفرنس کے لیے ڈاکٹر اقبال کے ہمراہ روانہ نہیں ہوئے تھے کہ ہم دونوں نے لاہور میں مکان بنانے کا ارادہ کیا ۔ ڈاکٹر صاحب بھی چاہتے تھے کہ لاہور میں اپنا گھر بنا لیں ۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ شہر کے مضافات میں کوئی ایسا قطعۂ زمین تلاش کیا جائے جس پر اقبال ، سالک ، مہر اور چودھری محمد حسین چاروں اپنی کوٹھیاں تعمیر کر لیں اور یہ ''چار یاری'' قلبی و روحانی قرب کے ساتھ ہی ساتھ جسمانی قرب سے بھی بہرہ ور ہو جائے ۔''[2]

اسی مقصد کے پیش نظر لاہور کے مختلف علاقوں میں قطعات اراضی کا جائزہ لیا گیا ، لیکن کوئی مناسب جگہ نہ مل سکی اور جب مسلم ٹاؤن میں قطعات ملے ،

۱- مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۲۸ جنوری ۱۹۶۶ع غیر مطبوعہ ۔
۲- سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۳۰۸ ۔

تو وہ جگہ علامہ اقبال کو پسند نہ آئی جس کی بنا پر "چار یاری" کو جسمانی قرب سے بہرہ ور کرنے کی خواہش کو نظر انداز کر دیا گیا۔ مسلم ٹاؤن میں عبدالمجید سالک اور مولانا مہر نے اپنی کوٹھیوں کے لیے زمین حاصل کر لی جس کی رجسٹری اس زمانے میں ہوئی جب مولانا مہر دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن گئے ہوئے تھے۔ بہرحال ۱۹۳۲ء میں کوٹھیاں تعمیر ہونے کے بعد مہر و سالک لاہور کی اس دور افتادہ بستی میں آ بسے۔ جیسا کہ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"۱۹۳۲ء کے اواخر میں دونوں کوٹھیاں بن کر تیار ہو گئیں اور ہم مُبل روڈ اور فلیمنگ روڈ سے اٹھ کر ان میں منتقل ہو گئے۔[۱]"

۱۹۳۲ء کے اواخر میں مہر و سالک اپنی نئی کوٹھیوں میں منتقل ہوئے اور ۱۹۳۴ء کے اوائل میں 'انقلاب' کا دفتر بھی ایک نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ پہلے انقلاب کا دفتر مُبل روڈ پر تھا،[۲] جبکہ انقلاب کا مطبع یعنی مسلم پرنٹنگ پریس اکبری دروازے کے باہر ایک عمارت میں تھا۔ دونوں عمارات کرائے پر حاصل کی گئی تھیں۔ لہذا منصوبہ بنایا گیا کہ اخبار کے دفتر اور مطبع کے لیے اپنی عمارت تعمیر کی جائے۔ لیکن اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شہر میں حسبِ آرزو جگہ نہ مل سکی۔ لہذا مجبوراً خالصہ سٹریٹ ریلوے روڈ پر دو کنال زمین پندرہ برس کے لیے لیز پر حاصل کی گئی جس پر بقول سالک ایک سو فٹ لمبا اور چوبیس فٹ چوڑا ہال تعمیر کرایا گیا جس

۱۔ سرگزشت، از عبدالمجید سالک، ص ۳۰۹۔

۲۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ 'انقلاب' کا دفتر ابتداء ہی سے مُبل روڈ پر تھا بلکہ اس سے قبل بھی اس کے مقامات بدلتے رہے تھے۔ اس امر کا اندازہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس تحریر سے ہوتا ہے جو ۱۹ نومبر ۱۹۷۱ء کے "جاوداں" میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے لکھا کہ "مہر و سالک سے میرے تعلقات کی ابتداء ۱۹۲۷ء میں ہوئی جب انھوں نے روزنامہ انقلاب کا اجراء کیا اور اس کے ابتدائی دفتر سبزی منڈی کے قرب و جوار میں قائم ہوئے۔ گوال منڈی، ریلوے روڈ، پھر مُبل روڈ پھر ریلوے روڈ امرت دھارا بلڈنگ کے سامنے"۔ ڈاکٹر صاحب نے ماہنامہ فنون جولائی۔ اگست ۱۹۷۵ء کے ایک مضمون میں بھی اپنے انھی خیالات کا اظہار کیا۔

میں مطبع کی مشینیں منتقل ہو گئیں ۔ اسی ہال کے باقی حصے میں دفتر کے لیے کمرے بنا لیے گئے اور یوں دفتر اور مطبع دونوں خالصہ سٹریٹ ریلوے روڈ منتقل ہو گئے ۔ دفتر اور مطبع کی نئی جگہ منتقلی کا اعلان روزنامہ انقلاب میں شائع ہوا ۔ اس کے مندرجات یہ تھے :

''نہایت مسرت سے اطلاع دی جاتی ہے کہ آج سے روزنامہ 'انقلاب' کا دفتر اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو گیا ہے ۔ اب دفتر ہل روڈ پر نہیں بلکہ امرت دھارا کی عمارت کے سامنے خالصہ سٹریٹ میں چلا گیا ہے ۔ انشاء اللہ عنقریب مسلم پرنٹنگ پریس بھی اس میں منتقل ہو جائے گا ۔''۱

اس کے علاوہ اس دور کے بعض ایسے واقعات بھی ہیں جو مولانا مہر کی زندگی میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کا 'انقلاب' سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ، اگرچہ انقلاب ان واقعات سے متاثر ضرور ہوا ۔ ایسے واقعات کے ضمن میں مولانا مہر کا طویل آشوبِ چشم خاص طور پر قابلِ ذکر ہے ۔

آشوبِ چشم ایک معمولی سی تکلیف ہوتی ہے لیکن ۱۹۳۳ء میں مولانا مہر کچھ اس طور سے اس تکلیف میں مبتلا ہوئے کہ مہینوں بلکہ برسوں اس ابتلاء کا شکار رہے ۔ ان کی اس عجیب و غریب بیماری کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں :

''موسمِ گرما میں مہر صاحب کو آشوبِ چشم کا عارضہ لاحق ہوا . . . یہ آشوب عجیب تھا کہ ہر پانچ چھ روز کے بعد اس کا دورہ ہوتا اور سات آٹھ دن تک سخت تکلیف رہتی ۔ اس کے بعد خود بخود افاقہ ہو جاتا لیکن وہ افاقہ محض چند روزہ ہوتا تھا ۔''۲

اس اقتباس سے مرض کی کیفیت تو سامنے آ جاتی ہے لیکن یہ واضح نہیں ہوتا کہ آخر یہ تکلیف کب شروع ہوئی اور کب تک جاری رہی ۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مہر ''نقشِ آزاد'' کے حاشیے میں لکھتے ہیں :

۱۔ روزنامہ انقلاب ، مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۳۴ء ۔
۲۔ سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۳۴۴ - ۳۴۵ ۔

"مجھے ۱۹۳۴ع میں آشوبِ چشم کا عارضہ ہوا تھا جس نے مدت مدید
تک مجھے پریشان رکھا - ۱۹۳۵ع میں کم و بیش چھ مہینے میں نے
پہاڑ پر بسر کیے -"[۱]

تکلیف کی شدت کے باعث ۱۹۳۴ع میں بھی مولانا مہر کو اپنے چھوٹے بھائی امیر احمد کے پاس سناور (شملہ) جانا پڑا تھا اور ان کا علاج بھی وہیں ہوتا رہا تھا ، جیسا کہ روزنامہ 'انقلاب' کی ایک خبر سے معلوم ہوتا ہے - اخبار میں "مولانا مہر کی صحت" کی نمایاں سرخی کے ساتھ مندرجہ ذیل خبر شائع کی گئی :

"۱۰ جولائی کی صبح کو مشہور معالجِ چشم ڈاکٹر نندلال صاحب
پنڈت رام ناتھ منیجر اشتہارات روزنامہ انقلاب کے ہمراہ سناور پہنچے -
. . . ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ آنکھ اچھے رنگ میں روبہ اصلاح
ہے لیکن ابھی کارنا کے کنارے زخم کو مندمل ہونے میں کم از کم
پندرہ روز لگیں گے . . . مولانا مہر صاحب غالباً ایک ماہ تک صحیح
طور پر لکھنے پڑھنے کے قابل ہو سکیں گے -"[۲]

اگرچہ مولانا مہر تقریباً ایک ماہ بعد سناور سے لاہور آ گئے ، لیکن یہاں آ کر پھر تکلیف شروع ہو گئی جس کے باعث لکھنا پڑھنا اور کام کرنا سخت دشوار ہو گیا - اس سلسلے میں روزنامہ انقلاب میں ایک اور تحریر مولانا مہر کے خط کی صورت میں شائع ہوئی - مولانا مہر نے لکھا :

"میں آشوبِ چشم کی شدید تکلیف کے باعث ۲۱ جون کو پہاڑ پر گیا
تھا - دو ماہ کی مدت میں سخت تکلیف اٹھائی - پرسوں رات بظاہر تندرست
ہو کر واپس آیا لیکن کل صبح سے پھر اس مصیبت میں مبتلا ہوں -
پہلے بائیں آنکھ ہدفِ آشوب تھی ، اب دائیں آنکھ میں تکلیف شروع
ہو گئی ہے اور ایک دن میں اتنی تیزی سے بڑھ گئی ہے کہ میں
حد درجہ پریشان ہو گیا ہوں - اس وجہ سے میرا لاہور آنا حقیقتاً نہ آنے
کے برابر ہو گیا - کیونکہ میں گھر سے باہر نہیں نکل سکتا - حسبِ دل خواہ

۱- نقشِ آزاد ، مرتبہ مولانا مہر ، ص ۳۸ -
۲- روزنامہ انقلاب ، مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۴ع -

کام نہیں کر سکتا ۔ اگرچہ ناچیز خدمت گزاری کا سلسلہ جاری ہے جو میری ہر تکلیف میں حتی الامکان جاری رہا ۔''[1]

ڈاکٹروں کے علاج سے مایوسی ہوئی تو شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی کا علاج شروع کیا گیا جس سے خاطر خواہ فائدہ ہوا ۔ لیکن زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ تکلیف پھر شروع ہوگئی ۔ اس دفعہ تکلیف کی شدت پہلے سے بھی زیادہ تھی ۔ جیسا کہ مولانا مہر کے بارے میں روزنامہ 'انقلاب' میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے :

''مولانا غلام رسول مہر کی آنکھوں میں آغاز مارچ ہی سے تکلیف شروع ہو گئی تھی ۔ دو مہینے کے قریب آپ الدھیری کوٹھڑی میں پڑے رہے اور علاج ہوتا رہا ۔ آخر ڈاکٹروں نے آپ کو پہاڑ پر چلے جانے کا مشورہ دیا ۔ آپ سناور چلے گئے ۔ چند روز وہاں رہ کر کسولی میں مقیم ہو گئے ۔ اب تک وہیں ہیں . . . . ۔''[2]

بعد ازاں یہ تکلیف کچھ ایسی بگڑی کہ کئی اور امراض عود کر آئے ۔ ان میں ضعفِ قلب ، چہرے پر ورم اور دانتوں کی تکلیف بھی شامل تھی جس کے باعث چار دانت بھی اکلوانے پڑے ۔ آخرکار مولانا ۸۔اکتوبر ۱۹۳۵ع کو تقریباً چھ ماہ بعد واپس لاہور آئے ۔[3] اور اس مرتبہ پورا موسمِ سرما بھی آنکھوں کی تکلیف میں گزرا ، یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۳۵ع میں بھی مولانا کے آشوبِ چشم کے بارے میں روزنامہ انقلاب میں اعلانات و اطلاعات شائع ہوتی رہیں ۔ آخر شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کے علاج سے اس طویل آشوبِ چشم کا مکمل طور پر خاتمہ ہوا ۔

یہ آشوبِ چشم اس لیے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اول اس کی وجہ سے ایک ایسا دور بھی آیا جب مولانا مہر نے اخبار نویسی ترک کرنے کا ارادہ کرلیا ۔[4] دوسرے اس لیے بھی کہ اس کی عطا کردہ فراغتوں کے باعث مولانا مہر

۱۔ روزنامہ انقلاب ، مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۳۴ع ۔
۲۔ روزنامہ انقلاب ، مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۵ع ۔
۳۔ روزنامہ انقلاب ، مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ع ۔
۴۔ افاداتِ مہر ، مرتبہ شیر بہادر پنی ، ص ۷۷ ۔

پہلی مرتبہ ایک محقق کی حیثیت سے سامنے آئے اور اسی زمانے میں ادارت کی کٹھن ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب جانے والے شعری محرکات نے بھی نئے سرے سے اپنا اظہار کیا اور آپ نے اُردو کی چند اچھی نظمیں کہیں جو 'انقلاب' میں شائع ہوئیں ۔

اگرچہ اس سے قبل بھی مولانا مہر کی ایک کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ چکی تھی ، لیکن ''سیرت امام ابنِ تیمیہ'' کے مقابلے میں ''غالب'' کی حیثیت بالکل دوسری ہے ۔ بعض ایسے شواہد موجود ہیں جن کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ آشوبِ چشم کے عارضے کے دلوں میں مولانا مہر کو مکتوباتِ غالب کی اس انداز میں تدوین کا خیال آیا تھا کہ خود مکتوبات سے غالب کی مفصل سوانح عمری تیار ہو جائے ۔ اس سلسلے کا ابتدائی کام بھی مولانا مہر نے سناور میں قیام کے زمانے میں انجام دیا ۔ جیسا کہ عبدالمجید سالک مہر صاحب کے آشوبِ چشم اور ان کے سناور جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''مہر صاحب افاقے کے وقفوں میں کبھی نظمیں لکھتے اور کبھی مرزا غالب کی سوانح عمری کے متعلق کام کرتے ۔ چنانچہ اس علالت کے دوران میں ایک تو ان کی مشہور کتاب ''غالب'' مکمل ہوگئی اور اس کے علاوہ بیس پچیس اچھی نظمیں بھی لکھی گئیں ۔''[۱]

''غالب'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۶ء کے اواخر میں شائع ہو کر سامنے آیا ۔ ساتھ ہی مولانا مہر کا شمار صحافیوں اور وقتی مسائل پر قلم اٹھانے والوں کے ساتھ ساتھ محققین میں ہونے لگا ۔ ''غالب'' کی اشاعت ایک ایسا واقعہ تھا جس نے مولانا مہر کے لیے تحقیقی و تصنیفی میدان میں کامیابیوں کے دروازے کھول دیے ۔ لیکن بدقسمتی سے چند ہی سال بعد والدۂ مہر کی رحلت کا وہ روح فرسا واقعہ پیش آیا جس نے گویا ان کی زندگی سے کامیابیوں اور کامرانیوں کے دور کا خاتمہ کر دیا ۔ والدہ کا انتقال کوئی انوکھا واقعہ نہیں اور کسی نہ کسی مرحلۂ عمر میں ہر شخص کو پیش آتا ہے ۔ لیکن مولانا مہر کے سلسلے میں اس کا ایک تعجب انگیز پہلو یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد ان کا دورِ زوال شروع ہوگیا ۔ اس کا احساس خود مولانا مہر کو بھی تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ والدہ کے انتقال کے بعد

۱- سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۳۴۵ ۔

وہ مخلص اور بے لوث ترین دعاؤں سے محروم ہو گئے ۔ ابوسلمان شاہجہانپوری کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میرا احساس عرصہٗ دراز سے یہ ہے کہ جس شخص کی والدہ دنیا سے رخصت ہو جائے اس کے سر پر سے خدا کی رحمت کا قدوسی سائبان الگ ہو جاتا ہے ۔ اس کائنات میں والدہ سے بڑھ کر خلوص و بے غرضی کی دعائیں کسی کے قلب سے نہیں اُٹھتیں ۔ والد بھی والدہ کے بعد آتا ہے ۔''[۱]

پھر والدہ بھی وہ جس نے عالمِ بیوگی میں بچوں کو پالا اور بغیر کسی سہارے کے مرحوم شوہر کی وصیت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی ۔ والدۂ مہر کے اس کارنامے کی اہمیت اُس وقت نمایاں ہوتی ہے جب یہ امر بھی پیشِ نظر ہو کہ ان کا تعلق ایک عام دیہاتی گھرانے سے تھا ۔ ان کے والد چودھری شہاب دین اور شوہر چودھری محمد علی خاں دونوں ان پڑھ تھے ۔ اس کے علاوہ بھی گھر میں تعلیم و تعلم کا کوئی چرچا نہیں تھا ۔ اور صرف گھر ہی کیا ، اردگرد کے تمام اعوالوں میں مولانا مہر پہلے شخص تھے جو حصولِ علم کے لیے لاہور آئے اور بی ۔ اے تک تعلیم حاصل کی ۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف عظیم بیوہ ماں کے عزمِ مصمم کا نتیجہ تھا اور یہ انھی کی بے غرض دعائیں تھیں کہ مولانا مہر دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچے ۔ لیکن آخر کار انھیں ان دعاؤں سے محروم ہونا پڑا ۔ اس سانحے کا ذکر کرتے ہوئے ابوسلمان شاہجہانپوری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

''اگست ۱۹۴۱ء میں ان کا انتقال ہوا ۔ وہ دن ، وہ وقت اور اس کا ایک ایک جزئیہ اب تک میرے ذہن میں اسی طرح تازہ ہے جس طرح ابھی پیش آیا ہو ۔ اسی روز سے میں سمجھے بیٹھا ہوں کہ بے غرض ترین دعائیں اس دنیا سے میرے لیے ختم ہو گئیں ۔''[۲]

محولہ بالا عبارت سے بڑی حد تک ''فاطمہ بی بی'' کی رحلت کا زمانہ متعین ہو جاتا ہے ۔ لیکن مولانا نے اپنے ایک اور خط میں زیادہ صراحت سے کام لیتے

۱۔ مکتوب بنام ابوسلمان شاہجہانپوری ، تاریخ درج نہیں ہے ۔ (غیر مطبوعہ) ۔
۲۔ مکتوب بنام ابوسلمان شاہجہانپوری ، تاریخ درج نہیں ۔ (غیر مطبوعہ) ۔

ہوئے ماہ و سال کے علاوہ حتمی طور پر ایک تاریخ کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"میری والدہ کا انتقال ۱۱۔ اگست ۱۹۴۱ع کو ہوا تھا۔ آج اس غم انگیز واقعے پر ربع صدی گزر چکی ہے اور آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کن کن مراحل میں کائنات کی اس نعمتِ عظمیٰ سے محرومی نے مجھے پریشانیوں میں مبتلا کیا۔"[1]

اگر ۱۹۴۱ع سے ۱۹۴۷ع تک کے زمانے اور اس میں پیش آنے والے واقعات کو پیشِ نظر رکھا جائے اور یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ ان واقعات نے خود مولانا مہر کی زندگی کو کس طرح متاثر کیا، تو مولانا مہر کی پریشانیوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ع میں پاکستان قائم ہوا تو گردشِ لیل و نہار نے اس شخصیت کو پاکستان کے مخالفوں کی صفوں میں کھڑا کر دیا جو حصولِ پاکستان کی جد و جہد میں ہراول دستے کے راہنماؤں میں شامل تھی۔ اس نے نازک سے نازک دور میں بے خوف و خطر روزنامہ ''انقلاب'' کے توسط سے نہ صرف علامہ کے تصورِ پاکستان کو واضح کیا تھا، بلکہ اس دور میں ہزاروں لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں اس تصور کو اجاگر بھی کیا جب لوگ پاکستان کو محض شاعر کا خواب کہہ کر اس کا مضحکہ اڑاتے تھے۔

بہرحال پاکستان بنا تو مولانا مہر نے بھی اپنے آبائی گاؤں پھول پور سے ترکِ سکونت کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاکستان میں رہنا قبول کیا اور پھول پور میں اپنی جائیداد بھی چھوڑ دی۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ اگرچہ بڑے پیمانے پر بدعنوانیاں بھی ہوئیں، اس کے باوجود مہاجرین کو تقسیمِ ملک کے چند ہی سال بعد حکومت کے طے کردہ طریقِ کار کے مطابق پاکستان میں متبادل جائیداد مل گئی۔ جبکہ مولانا مہر کو اس سلسلے میں بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"جو تھوڑی بہت جائیداد تھی وہ تقسیم کی نذر ہو گئی۔ اس کے بدلے میں زرعی زمین ملی، مگر پوری نہیں اور اس کا ایک ٹکڑا ایک ضلع

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق، مرقومہ ۱۷ مئی ۱۹۶۶ع، غیر مطبوعہ۔

میں ہے ، دوسرا دوسرے ضلع میں ۔ دو چار مکان تھے جن کا ساڑھے تین ہزار روپے سالانہ کرایہ تھا ۔ ان کے بدلے میں گیارہ بارہ سال سے کچھ نہیں ملا ۔ اب ۲ مارچ کو کلیم کے بارے میں ابتدائی پیشی ہے ۔ جو کچھ طے ہوگا مقررہ اصل کے مطابق اس کا صرف ۴۰ فیصد ملے گا ۔ اس لیے کہ حکومت نے طے یہی کیا ہے ۔ اربابِ اختیار کی نگاہوں میں اعتبار تو رہا ایک طرف ، یا تو کسی کی توجہ ہی نہیں ۔ ہے تو بہرحال حق میں نہ ہوگی ۔ ایک حد تک خلاف ہی ہوگی ۔''۱

اربابِ اختیار کی توجہ کے بارے میں مولانا مہر کے احساسات حقیقت پر مبنی تھے اور اس مخالفانہ و مخاصمانہ توجہ کا انھیں بہت کچھ اندازہ اُس وقت ہو چکا تھا جب ۱۹۴۹ع میں روزنامہ ''انقلاب'' بند کرنا پڑا تھا ۔ اگرچہ روزنامہ ''انقلاب'' کی حتمی بندش ۱۹۴۹ع میں ہوئی ، لیکن یہ اخبار ۱۹۴۷ع کے فسادات کے باعث بھی چند روز بند رہا تھا ۔ جیسا کہ مولانا مہر لکھتے ہیں :

''۱۹۴۷ع میں لاہور خوفناک فسادات کا مرکز بن گیا تو اخبار چند روز کے لیے بند کر دینا پڑا ۔ ہنگاموں کا یہ حال تھا کہ گھر سے باہر نکلنا بھی مشکل ہوگیا ۔''۲

۱۹۴۷ع کے فسادات میں تو اخبار چند روز کے لیے بند ہوا تھا ، لیکن ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ع کو روزنامہ 'انقلاب' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ۔ روزنامہ انقلاب تو بند ہو گیا ، لیکن اس کی بندش کی داستان بھی بہت دلچسپ اور عبرت خیز ہے ۔ یوں تو اس کی بندش میں بہت سے اسباب و محرکات نے اپنا اپنا کردار ادا کیا ، لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم اسباب پاکستان کے ارباب اختیار و اقتدار کے پیدا کردہ تھے ۔ اگر روزنامہ 'انقلاب' کی ۱۹۴۷ع کے بعد کی اشاعتوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس روزنامے نے ایک ایسے اخبار کی حیثیت اختیار کر لی تھی جو اربابِ بست و کشاد کی بداعمالیوں کا پردہ پوش ہونے کی بجائے ان کا محاسب تھا ۔ ظاہر ہے کہ اربابِ حکومت کے لیے یہ

۱۔ مکتوب بنام انیس جیلانی ، مرقومہ ۲۷ فروری ۱۹۵۹ع ، غیر مطبوعہ ۔

۲۔ پیش لفظ جوزیفین ، مصنفہ مولانا غلام رسول مہر ، صفحہ ج ، بارِ اول ، ۱۹۵۰ع ، مطبوعہ کتاب منزل لاہور ۔

صورتِ حال کسی پہلو سے بھی اطمینان بخش نہ تھی ، لہذا افسر شاہی نے اخبار کی زبان بند کرنے کے لیے وہ طریقہ اختیار کیا جو اس کے بس میں تھا ۔ مثلاً ابتدا میں روزنامہ 'انقلاب' کو اشتہارات کی فراہمی روک دی گئی ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کر دیا گیا ۔ پنجاب میں تو یہ صورتِ حال تھی جبکہ حکومتِ سرحد نے اپنی صوبائی حدود میں ''انقلاب'' کے داخلے پر پابندی عائد کر دی لطف کی بات یہ ہے کہ تقسیم ملک سے قبل ''انقلاب'' کے ساتھ یہی سلوک ہندوستان کی مختلف غیر مسلم ریاستوں کی طرف سے روا رکھا جاتا تھا ۔ مثلاً ۱۹۳۱ء میں تحریکِ آزادی کشمیر کے دوران میں کشمیر میں ''انقلاب'' کا داخلہ بند کر دیا گیا تھا ۔ قصور صرف یہ تھا کہ 'انقلاب' کشمیری حکام سے مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے کہتا تھا ۔ لیکن اس بندش کا مقابلہ کرنے کے لیے 'انقلاب' کے کارکنوں نے یکے بعد دیگر ''کشمیری مسلمان'' ، ''مظلوم کشمیر'' اور ''مکتوبِ کشمیر'' کے نام سے ہفت روزہ پرچے شائع کر دیے تا کہ اس کی آواز دبنے نہ پائے ۔ یوں 'انقلاب' نے بڑی پامردی کے ساتھ مخالفانہ حالات کے باوجود تحریکِ کشمیر کے سلسلے میں کشمیری مسلمانوں کی تائید و حمایت کی ۔ لیکن پاکستان میں مولانا مہر یہ بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ لہذا حکومت کے احکام کو ماننا پڑا ۔ حکومت کے اخبارات نے بھی 'انقلاب' کی بندش میں اپنا کردار ادا کیا ۔ کاروباری رقابت میں بعض لوگ اس حد تک گئے کہ انھوں نے اخبار فروشوں تک پر دباؤ ڈالا کہ وہ 'انقلاب' کی فروخت بند کر دیں ۔ اس صورتِ حال سے کارکنانِ انقلاب کی دشواریوں میں مزید اضافہ ہوا ۔ اس کے علاوہ بھارتی حکومت نے بھی ہندوستان میں 'انقلاب' کے داخلے پر پابندی عائد کر دی ، حالانکہ 'انقلاب' مغربی پاکستان میں شامل علاقوں سے زیادہ مشرقی پنجاب میں مقبول تھا ۔ گویا یہ بھی 'انقلاب' کے لیے ایک کاری ضرب تھی جو اس سے برداشت نہ ہو سکی ۔ انھی تمام حالات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں :

> ''ایک طرف ہندوستان نے داخلہ بند کر دیا ۔ دوسری طرف قیوم وزارت نے صوبہ سرحد میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا ۔ حکومتِ پنجاب نے نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کر دیا ۔ حکومت نواز اخبارات نے اخبار فروشوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ ''انقلاب'' کی فروخت بند کر دیں ۔''[۱]

۱۔ وے صورتیں الٰہی ، از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، ص ۱۸۱ ، بارِ اول ، دسمبر ۱۹۷۶ء ، مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور ۔

عین ممکن تھا کہ انقلاب ان تمام نامساعد حالات کے باوجود جاری رہتا ، لیکن اس کی خراب مالی حالت نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ۔ یوں تو ادارۂ انقلاب کی مالی حالت کبھی بھی قابلِ رشک نہیں رہی تھی ، لیکن فسادات اور تقسیم ملک کے باعث بھارتی علاقے کے خریداروں کی طرف واجب الادا بقایاجات کی عدم ادائیگی نے اسے اور خراب کر دیا ۔[۱]

جبکہ سرحد میں داخلے پر پابندی اور پنجاب میں نیوز پرنٹ کے کوٹے کی عدمِ فراہمی اور اشتہارات کی بندش نے 'انقلاب' کا گلا گھونٹ دیا ، اس نوعیت کی شہادتیں بھی ملتی ہیں کہ اسی زمانے میں ادارۂ انقلاب میں ایک غبن بھی ہوا جس کے باعث روزنامے کے لیے جاں بر ہونا ناممکن ہو گیا ۔[۲] انقلاب کی بندش کے سلسلے میں جن محرکات و عوامل کا ذکر آیا ہے ، وہ سب کے سب بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر مولانا مہر اور عبدالمجید سالک کے بیان کردہ ہیں ۔ اگرچہ یہ محرکات بھی درست ہو سکتے ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انقلاب کی بندش کا سب سے بڑا محرک پاکستانی عوام کا جذبۂ نفرت تھا جس کے باعث اخبار شائع کرنا ممکن نہ رہا ۔

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے ، روزنامہ 'زمیندار' سے علیحدگی کے وقت مہر و سالک فیصلہ کر چکے تھے کہ اب صحافتی دنیا سے کنارہ کش ہو کر علمی و ادبی نوعیت کے مشاغل اختیار کریں گے ۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں روزنامہ انقلاب کی حتمی بندش کے بعد مولانا مہر نے خود کو علمی و ادبی مشاغل میں مصروف کر لیا اور پھر تا دمِ مرگ اسی مشغلے کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا ۔ البتہ ان بائیس برسوں میں صرف چند ماہ ایسے آئے جب وہ ایک مرتبہ پھر وادیِ صحافت میں گامزن نظر آئے ۔ لیکن چونکہ اب اپنا اخبار نہیں تھا اور بعض اوقات پالیسی طے کرنے کے معاملے میں کامل آزادی کے باوجود بعض ایسی مشکلات پیدا ہو جاتی تھیں جن کا تجربہ 'زمیندار' سے وابستگی کے دور میں بھی ہو چکا تھا لہٰذا مولانا مہر نے دو تین ماہ بعد ہی روزنامہ ''آفاق'' سے علیحدگی اختیار کر لی ۔ روزنامہ ''آفاق'' سے وابستگی و علیحدگی کا ذکر کرتے ہوئے نادم سیتاپوری کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

۱۔ سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۵۳۳ ۔

۲۔ انٹرویو از محمد عالم مختارِ حق ۔

"۔ ۔ ۔ انقلاب اکتوبر ۱۹۴۹ع میں بند ہو گیا اور اس کے بعد میں تصنیف و تالیف ہی میں مصروف رہا ۔ صرف دو تین مہینے کے لیے "آفاق" سے وابستہ ہوا ۔ یہاں میں نو بجے سے بارہ بجے تک رہتا تھا اور صرف ایڈیٹوریل لکھتا تھا ، کیونکہ اپنا کام چھوڑ نہیں سکتا تھا ۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے ۔ اس وجہ سے میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی ۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اخبار نویسی صرف اپنے اخبار میں ہو سکتی ہے۔ دوسرے کے اخبار میں ہو ہی نہیں سکتی ۔ اگرچہ 'آفاق' میں کسی نے میری پالیسی پر اعتراض نہیں کیا تھا ، لیکن میں خود اپنے آپ کو ہر اعتبار سے آزاد نہیں سمجھتا تھا ۔"[1]

وجوہات کچھ بھی رہی ہوں ، حاصل یہ ہے کہ انھوں نے روزنامہ آفاق سے علیحدگی اختیار کر لی اور تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے ۔ اور تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک مہر ِ حیات شام ِ اجل کے ہاتھوں شکست نہیں کھا گیا ۔

مولانا مہر کی عام صحت قابل ِ رشک حد تک اچھی تھی ۔ اگرچہ وہ گزشتہ کئی برس سے مختلف النوع عوارض میں مبتلا تھے ، جن میں آزار قلب ، ذیابیطس اور پھیپھڑوں میں بلغم کی تکلیف خاص طور پر تکلیف دہ تھی ۔اور بعد ازاں یہی عوارض ان کی موت کا باعث بھی بنے ، جیسا کہ شیر بہادر پنی لکھتے ہیں :

"ان کا حساس دماغ اور نازک قلب ، کثرت ِ سگریٹ نوشی سے ابتداءً مجروح ہوا اور آخری دو تین سالوں میں پے در پے سخت سردی اور انفلوئنزا نے ان کے قلب کو مزید مضمحل کر دیا اور آزار ِ قلب کے آثار شروع ہوگئے ۔ آخرکار یہ صاحب ِ دل ، دل کے ہاتھوں چل بسا ۔"[2]

۱۔ مکتوب بنام نادم سیتاپوری ، مرقومہ ۷ جولائی ۱۹۷۱ع ، مطبوعہ ہفت روزہ چٹان ، ص ۲۰ ، ۲۹ مئی ۱۹۷۲ع ماخوذ از "العلم" کراچی ۔

۲۔ افادات ِ مہر ، مرتبہ شیر بہادر پنی ، ص ۳۶ - ۳۵ ۔

بہت عرصے سے معمول تھا کہ مولانا صبح دم بیدار ہوتے غسل کرتے۔ تہجد کے بعد مقررہ تعداد میں نوافل ادا کرتے۔ یہ تعداد عموماً سو سے زیادہ ہوتی تھی اور حسب موقع بڑھتی بھی رہتی تھی۔ مولانا مہر اپنے اسی معمول کے مطابق پندرہ اور سولہ نومبر ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب کو بیدار ہوئے۔ غسل کے لیے غسل خانے گئے۔ اس کے بعد مولانا مہر کی چھوٹی صاحبزادی نے ان کی پکارنے کی آواز سنی۔ وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف گئیں تو دیکھا کہ مولانا کی زبان پر ان کے آخری لفظ تھے۔ ''اچھا بیٹی خدا حافظ'' اس کے بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگرچہ ملکی اخبارات و رسائل نے اس سانحہ فاجعہ کو وہ اہمیت نہیں دی جو اس کا حق تھا اس کے باوجود ریڈیو پاکستان سے مولانا کے انتقال کی خبر نشر ہوئی اور بیشتر قومی اخبارات نے ماتمی سرخیوں کے ساتھ اس روح فرسا خبر کو شائع کیا۔ چند روز بعد ہفت روزہ چٹان نے سیاہ حاشیے میں ''علم و قلم کا مہر درخشاں غروب ہو گیا'' کی جلی سرخی کے ساتھ مندرجہ ذیل عبارت شائع کی:

''سولہ نومبر کو ڈیڑھ دو بجے شب مولانا غلام رسول مہر اپنے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مرحوم کہ انھیں متوفی کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، کوئی ڈیڑھ دو بجے شب کے درمیان بستر سے اٹھ کر غسل خانے میں گئے۔ معاً دل کا دورہ پڑا۔ بچوں کو آوازیں دیں۔ پورا گھر سو رہا تھا۔ چھوٹی بیٹی ناصرہ اُٹھ کر باپ کی طرف آئیں تو ان کو دیکھ کر ''اچھا بیٹی خدا حافظ'' کہا اور جان شیریں جان آفرین کے حوالے کر دی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون . . .

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے''[1]

مولانا مہر کے انتقال پر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہوئے عاشق حسین بٹالوی نے لکھا:

''ہر بڑے آدمی کے مرنے کے بعد ہم رسمی طور سے یہ کہنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کی جگہ پر نہیں ہوگی۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر کے بارے میں تو بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کرسی

۱- ہفت روزہ چٹان، ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء، ص ۵-

انھوں نے خالی کی ہے اس پر بیٹھنے والا پوری قوم میں کوئی شخص نظر نہیں آتا ۔“[1]

لیکن موت ان باتوں کی پروا کب کرتی ہے ۔ اس ستمگر کا انصاف مصلحت بینی سے ماورا اور ہر ذی روح کے لیے یکساں ہے ۔ مولانا مہر کے لیے بھی قانون قدرت سے استثناء کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی ۔

مولانا کا انتقال ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ع کو ہوا ۔ منگل کا دن تھا ۔ اس روز بعد از دوپہر ان کو مسلم ٹاؤن کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا اور یوں تاریخ و تحقیق کے میدان کا یہ شہسوار اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوا ۔

بیرون ملک سفر

اردو کی علمی و ادبی اور تحقیقی و صحافتی تاریخ کے حوالے سے مولانا مہر کی جن مختلف حیثیتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے ، ان کے علاوہ بھی مہر صاحب کی شخصیت بعض قابل توجہ پہلو رکھتی ہے ۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک بڑے سیاح بھی تھے ۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بے شمار ملکی و غیر ملکی سفر کیے ، جیسا کہ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں :

”عجیب بات یہ ہے کہ جب تک ’انقلاب‘ جاری رہا ، سالک صاحب لاہور سے نہیں نکلے اور مہر صاحب اکثر باہر گھومتے رہتے تھے ۔ دو تین مرتبہ افغانستان تشریف لے گئے ، لندن گئے ، فلسطین گئے ، فرانس گئے ، حجاز گئے اور جب ۱۹۵۱ع میں انقلاب بند ہو گیا تو مہر صاحب ایسے خانہ نشین ہوئے کہ گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا اور سالک صاحب نے سیر و سیاحت شروع کر دی ۔“[2]

۱۔ یاد رفتگاں ، از عاشق حسین بٹالوی ، مطبوعہ ہفت روزہ چٹان ، ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ع ۔

۲۔ مولانا غلام رسول مہر ، از عاشق حسین بٹالوی ، ص ۱۷ ، ہفت روزہ چٹان ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ع ۔

اگرچہ عاشق حسین بٹالوی کے بیان کے بعض حصے ناقابلِ قبول ہیں ، اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا مہر کے اکثر بیرونی سفر 'زمیندار' اور 'انقلاب' سے وابستگی ہی کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ان تمام اسفار کے حالات اور مہر کے تجربات و مشاہدات ان اخبارات کے صفحات کی زینت بنتے رہے ، جیسا کہ مولانا مہر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" . . . ان سفروں کے واقعاتی حالات اسی زمانے کے جرائد میں بتفصیل چھپ چکے تھے انھیں، جمع کیا جائے تو کم و بیش چار چار سو صفحے کی چار پانچ جلدیں تو ضرور بن جائیں ۔"[1]

ایک زمانے میں مولانا مہر نے ان حالات کی اشاعت کا بھی ارادہ کیا تھا ۔ لیکن دوسرے ضروری امور کی انجام دہی اور عدیم الفرصتی کے باعث مفصل سفر ناموں کی اشاعت نہ ہو سکی ۔ اس کا اندازہ ان کے ایک خط سے ہوتا ہے ۔ مولانا لکھتے ہیں :

"تمام اسفار کے مفصل حالات اخباررون میں شائع ہو گئے تھے ۔ میں نے ایک مرتبہ یہ تمام حالات الگ الگ تین جلدوں میں نقل کرائے تھے ۔ خیال یہ تھا کہ تھوڑی سی فرصت پاؤں گا تو ان پر نظر ثانی کروں گا اور جو باتیں اس وقت لکھ نہ سکا ، ان کا اضافہ کرکے تین جلدوں میں چھپوا دوں گا ۔"[2]

اندرونِ ہند اسفار میں تو مولانا مہر کا پہلا نمایاں سفر غالباً حیدر آباد دکن ہی کا تھا ، جبکہ ان کا بیرونِ ملک پہلا سفر ارض حجاز کے لیے تھا ۔ خلیل الرحمن داؤدی نے اپنے ایک مضمون میں اس سفر کو اجرائے 'انقلاب' یعنی اپریل ۱۹۲۷ع کے بعد کا واقعہ بتایا ہے ، جیسا کہ وہ ملکی سیاست کے بعض اہم مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ان تمام مسائل میں انقلاب نے ہندوستان کے تمام اخباروں سے بڑھ کر سرگرمی سے حصہ لیا ۔ اسی زمانے میں مہر صاحب کو حجاز کا پہلا

۱- مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۱۱ جولائی ۱۹۶۵ع ، غیر مطبوعہ ۔
۲- مکتوب بنام حمزہ فاروقی ، مرقومہ ۸ ۔ اکتوبر ۱۹۶۸ع ، غیر مطبوعہ ۔

سفر پیش آیا۔''[1]

حجاز کے پہلے سفر کا زمانہ متعین کرنے میں خلیل الرحمٰن داؤدی کو سہو ہوا ہے کیونکہ یہ زمانہ اجرائے انقلاب کے واقعے سے کم و بیش دو سال پہلے کا ہے - یعنی ۱۹۲۵ء کا جب مولانا روزنامہ زمیندار سے وابستہ تھے - جیسا کہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میں نے دو مرتبہ حجاز کا سفر کیا - ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۰ء دونوں مرتبہ کے مفصل سفرنامے لکھے . . . پہلا 'زمیندار' میں چھپا ، دوسرا 'انقلاب' میں ۔''[2]

یہ وہ دور ہے جب سلطان ابن مسعود نے حجاز پر قبضہ کیا اور ان کے بعض مبینہ اقدامات کے نتیجے میں ہندی مسلمانوں کے بعض حلقے سلطان ابن سعود کے مخالف ہو گئے تھے ۔ واقعہ یہ تھا کہ سلطان ابن سعود نے شریف حسین والیِ مکہ اور بعد ازاں اس کے بیٹے کے خلاف عسکری فتوحات حاصل کرکے حجاز پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی ۔ اس تمام کشمکش کے دوران میں ہندی مسلمانوں کی ہمدردیاں سلطان ابن سعود سے وابستہ تھیں ۔ کیونکہ ترکوں سے غداری کرکے حکومت پر قابض ہونا ہندی مسلمانوں کے نزدیک کسی طور بھی پسندیدہ فعل نہیں تھا ۔ لیکن شریف حسین اور اس کے بیٹے کی شکست کے ساتھ ساتھ اس نوعیت کی خبریں بھی مشہور ہونے لگیں کہ نجدیوں یعنی سلطان ابن سعود کے حامیوں نے حجاز پر قبضہ کرتے ہی طائف میں بعض بزرگوں کی قبروں کے قبے توڑ دیے ہیں ۔ ان خبروں سے عام مسلمانوں کے جذبات بے حد مجروح ہوئے ، جس کے نتیجے میں سلطان ابن سعود کی مخالفت شروع ہو گئی ۔ مخالفانہ جوش کے منظم اظہار کے لیے ''خدام الحرمین'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی ، جس نے جابجا جلسے کیے ۔ لاہور میں اس کی معاونت کے لیے انجمن حزب الاحناف پہلے ہی سے موجود تھی ، جبکہ روزنامہ 'سیاست' لاہور ان انجمنوں کی ترجمانی کرنے لگا ۔ لاہور کے اخبارات میں 'زمیندار' واحد اخبار تھا جو

۱۔ غلام رسول مہر ، از خلیل الرحمٰن داؤدی ، ص ۶۳۸ ، نقوش شخصیات نمبر ۱ ۔

۲۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، مرقومہ ۳۱ جنوری ۱۹۶۷ء ۔

سلطان ابن سعود کی حمایت کا حق ادا کر رہا تھا ۔ ممکن تھا کہ یہ جوش و خروش کچھ عرصے بعد ٹھنڈا پڑ جاتا ، لیکن اسی اثناء میں افواہ پھیلی کہ ابن سعود کی فوجوں نے آنحضرت ؐ کے روضہ اطہر پر گولہ باری کی ہے ۔ اگرچہ سعودی حکومت کی طرف سے اس افواہ کی تردید بھی کی گئی لیکن اس وقت تک افواہ اپنا کام کر چکی تھی اور ''خدام الحرمین'' کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے جلسوں کی وجہ سے ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا ۔ آخرکار مرکزی مجلس خلافت نے ایک وفد مرتب کیا تاکہ وہ حجاز جا کر حالات کا جائزہ لے سکے ۔ مولانا سالک وفد میں شامل ارکان کے نام لکھتے ہیں :

''آخر مجلس خلافت مرکزیہ نے ایک وفد ، جو مولانا محمد عرفان ، مولانا ظفر علی خاں ، مولانا سید سلیمان ندوی اور شعیب قریشی پر مشتمل تھا ، مرتب کرکے حجاز بھیجا[1] ۔ برادرم مہر بھی اس کے ساتھ گئے ۔ . . . ان حضرات نے مدینہ منورہ جا کر نہایت احتیاط سے مسجد نبوی اور گنبد خضرا کا معائنہ کیا اور اس نامبارک خبر کی تردید کی ۔''[2]

یہ وفد ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۵ع کو ہندوستان سے روانہ ہوا ۔[3] پہلے ارکان وفد عدن سے ہوتے ہوئے لحج گئے ۔ بعد ازاں مکہ معظمہ پہنچے جہاں عمرہ ادا کیا اور سلطان ابن سعود سے ملاقات کی ۔ یہاں سے مدینہ منورہ آئے ۔ یہ فخر مولانا مہر کو حاصل ہوا کہ روضہ اطہر کے اوپر تک پہنچ کر اس امر کا جائزہ لیا کہ اس سلسلے میں ہندوستان پہنچنے والی خبروں میں کہاں تک صداقت موجود ہے ۔ الحمدللہ کہ یہ خبر غلط ثابت ہوئی کیونکہ تلاش بسیار کے باوجود روضہ اقدس پر ایک معمولی خراش کے نشان کے علاوہ گولہ باری کے کچھ آثار نہیں پائے گئے اور یہ خراش بھی زیادہ سے زیادہ کسی چھچھلتی

۱۔ سالک نے وفد میں شامل ارکان کی تعداد چار بتائی ہے ، جبکہ یوسف طاہر نے اپنے مقالے کے صفحہ نمبر ۳۲ کے حاشیے میں مولانا مہر کے حوالے سے یہ تعداد چھ لکھی ہے ۔ مزید لکھا ہے کہ صرف تین بزرگ یعنی عرفان احمد انصاری ، مولانا ظفر علی خاں اور شعیب قریشی جا سکے تھے ۔ البتہ مولانا ظفر علی خاں نے مولانا مہر کو ساتھ لے لیا تھا ۔

۲۔ سرگزشت ، از سالک ، ص ۲۱۳ ۔

۳۔ روزنامہ زمیندار ، ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۵ع ۔

ہوئی گولی کے باعث آ سکتی تھی ۔ بہرحال وفد اپنی تحقیقات کے اس نتیجے کے ساتھ سعودی عرب سے ہندوستان روانہ ہوا اور مولانا مہر ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو واپس لاہور پہنچ گئے ۔[1]

مولانا مہر نے سرزمین حجاز کا دوسرا سفر ۱۹۳۰ء میں فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے کیا ۔ مولانا مہر اس سفر کے لیے لاہور سے ۲۰ اپریل ۱۹۳۰ء کو روانہ ہوئے ۔ انقلاب نے روانگی کی خبر ان الفاظ میں شائع کی :

''آج کراچی میل سے مولانا غلام رسول مہر ، مولانا محمد اسماعیل غزنوی اور متعدد دیگر احباب فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے عازمِ حجاز ہوئے ۔''[2]

فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد مولانا مہر ۹ جون ۱۹۳۰ء کو واپس لاہور پہنچے تو روزنامہ 'انقلاب' نے ان کی مراجعت کی خبر دیتے ہوئے لکھا :

''۹ جون ۱۹۳۰ء کو سوا چھ بجے شام کی گاڑی میں مولانا غلام رسول مہر بخیر و عافیت حج سے واپس تشریف لے آئے ۔''[3]

پہلے سفر حجاز کی طرح اس مرتبہ بھی سفرنامہ لکھا گیا جو روزنامہ انقلاب کی بہت سی اشاعتوں میں قسط وار شائع ہوا ۔ اس سلسلے میں عبدالمجید سالک رقم طراز ہیں :

''غالباً مئی ۱۹۳۰ء میں مہر صاحب حج کو چلے گئے اور ایک ماہ کے بعد واپس آ گئے ۔ یہ گویا مہر صاحب کا حجاز کا دوسرا پھیرا تھا ۔ پہلی دفعہ وفدِ خلافت میں مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ گئے تھے ۔ واپسی پر مہر صاحب نے حجاز کا جو سفرنامہ لکھا اور بالاقساط ''انقلاب'' میں شائع کیا وہ اپنی تفصیلات میں اس قدر مکمل تھا کہ میرے نزدیک محض اسی کو پڑھ کر انسان حاجی ہو جاتا ہے ، گو دنیا اسے حاجی نہ کہے ۔''[4]

۱۔ روزنامہ زمیندار ، ۱۳ فروری ۱۹۲۶ء ۔
۲۔ روزنامہ انقلاب ، ۲۲ اپریل ۱۹۳۰ء ۔
۳۔ روزنامہ انقلاب ، ۱۱ جون ۱۹۳۰ء ۔
۴۔ سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۲۷۷ ۔

محولہ بالا اقتباس میں مولانا سالک نے جس انداز میں مولانا مہر کے سفرنامے پر رائے دی ہے وہ ان کے انداز اور صرف ان کی اپنی حد تک بہت درست ہے ۔ لیکن یہ امر قابلِ تسلیم نہیں کہ مولانا مہر نے واپسی پر سفر نامہ لکھا ۔ کیونکہ اس سفرنامے کی چند قسطیں 'انقلاب' کی اُن دنوں کی اشاعتوں کی بھی زینت بنیں جب مولانا مہر سفر میں تھے ۔ مثلاً پہلی قسط مولانا کی لاہور سے روانگی کے صرف نو دن بعد یعنی ۲۹ اپریل ۱۹۳۰ع کے انقلاب میں بعنوان ''مولانا غلام رسول مہر کراچی میں'' شائع ہوئی ۔ اسی طرح کراچی سے جدہ تک کے سفر کے حالات بھی دو قسطوں میں شائع ہوئے ۔ انھی قسطوں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مولانا مہر نے کراچی سے جدہ تک کا سفر ''خسرو'' نامی جہاز میں کیا تھا اور وہ ۲۳ اپریل کی شام کو سات بجے کے قریب کراچی سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے تھے ۔

ارضِ حجاز کے دو سفروں کے بعد ان کا تیسرا غیرملکی سفر یورپ و برطانیہ کا ہے ۔ یہ سفر برطانیہ میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے کیا گیا ۔ واضح رہے کہ مولانا مہر کانفرنس کے باقاعدہ شرکاء میں شامل نہیں تھے اور نہ ہی کانفرنس سے ان کا کوئی تعلق تھا ۔ مولانا مہر نے کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ ذاتی طور پر کیا تھا ۔ اس فیصلے کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں :

''بقولِ سالک یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا ۔ اول علامہ کے لیے ایک مخلص رفیقِ سفر اور ہم خیال دوست کی ہمراہی موجبِ آسائش ہوگی ۔ دوم ، مہر صاحب اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے پرائیوٹ طور پر علامہ اقبال اور دوسرے ارکان کانفرنس کے لیے موجبِ تقویت رہیں گے۔ سوم وہ روزنامہ ''انقلاب'' کے لیے گول میز کانفرنس کی روداد قلم بند کرکے بھیجا کریں گے ۔''[1]

اگرچہ مولانا مہر علامہ اقبال کے لیے دورانِ سفر میں موجبِ تقویت بھی رہے اور موجبِ آسائش بھی لیکن کہنا چاہیے کہ ان کے سفر کا اولین مقصد انقلاب کے لیے گول میز کانفرنس کی روداد قلم‌بند کرکے بھیجنا تھا ، کیونکہ

۱۔ سرگزشت اقبال ، از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، ص ۳۵۵، طبع اول ۱۹۷۷ع - مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور ۔

مولانا کے مصارفِ سفر بھی روزنامہ انقلاب ہی نے برداشت کیے تھے۔[1] اس سلسلے میں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ کہا جاتا ہے کہ مولانا مہر در اصل سر شفیع کے ساتھ یا ان کی وجہ سے لندن گئے تھے، حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ اس سلسلے میں پہلی قابلِ ذکر بات تو یہی ہے کہ اس سفر کے اخراجات ادارۂ انقلاب نے برداشت کیے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ سفر کسی اور شخصیت کے ایماء پر اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس غلط فہمی کی تصریح کرتے ہوئے مولانا مہر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں سر شفیع مرحوم کے ساتھ یا ان کی وجہ سے لندن نہیں گیا تھا۔ سر شفیع میرے دوست تھے لیکن انھیں میرے سفرِ انگلستان سے نہ صرف کوئی تعلق نہ تھا بلکہ میرے لندن پہنچنے تک انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں لندن جا رہا ہوں۔''[2]

اگرچہ ہندوستان سے روانگی کسی بڑی شخصیت کے ایماء پر نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی مولانا مہر کا باقاعدہ طور پر کانفرنس سے کوئی تعلق تھا لیکن جیسا کہ یوسف طاہر نے مولانا مہر کے حوالے سے لکھا ہے، لندن جا کر انھوں نے مسلم وفد کے سیکرٹری کی حیثیت اختیار کر لی اور اسی حیثیت سے کانفرنس میں شریک ہوئے۔[3]

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ مولانا مہر کے مقاصدِ سفر میں ایک مقصد یہ بھی شامل تھا کہ علامہ اقبال کے لیے ان کی ہمراہی موجبِ آسائش و تقویت ہوگی، اسی لیے لاہور اور بمبئی سے ایک ہی گاڑی اور جہاز میں سوار ہونے کا ارادہ تھا۔ لیکن سوءِ اتفاق سے مولانا مہر کا پاسپورٹ بروقت نہ بن سکا[4] اور مولانا مہر یکم ستمبر کی بجائے پانچ ستمبر کو بمبئی کے لیے لاہور سے بذریعہ فرنٹیئر میل روانہ ہوئے۔[5] لیکن اقبال بھی علیل ہونے کے سبب لاہور سے روانہ

۱- روزنامہ انقلاب، ۹ اکتوبر ۱۹۳۱ء۔
۲- مکتوب بنام الیس جیلانی، مرقومہ ۱۱ جولائی ۱۹۶۵ء، غیر مطبوعہ۔
۳- مولانا غلام رسول مہر، از یوسف طاہر، ص ۵۰۔
۴- روزنامہ انقلاب، ۲ ستمبر ۱۹۳۱ء۔
۵- روزنامہ انقلاب، ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء۔

نہ ہو سکے تھے اور انھیں آٹھ ستمبر تک لاہور میں رکنا پڑا ۔ اسی بنا پر جس روز یعنی آٹھ ستمبر کو علامہ اقبال بمبئی کے لیے روانہ ہو رہے تھے ، اسی روز مولانا مہر بمبئی سے اٹیلین کمپنی کے جہاز ''جنیوا'' میں سوار ہوئے ۔[1] یوں اتفاق موانعات کے سبب کم از کم ہندوستان سے انگلستان تک کے سفر میں مولانا مہر علامہ اقبال کا ساتھ نہ دے سکے ۔

روزنامہ انقلاب میں اس سفر کی جو روداد سفرنامے کی صورت میں شائع ہوئی یا اس سلسلے میں مولانا مہر کے جو خطوط سالک کے نام آئے اور وہ انقلاب میں شائع ہوئے ، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سفر کے اولین مرحلے میں پورٹ سعید پہنچے اور ۱۹ ستمبر ۱۹۳۱ع کو یہاں سے اٹلی کے لیے روانہ ہوئے ۔[2] نیپلز ، روما اور فلارنس کے قابلِ دید مقامات کی سیر کرتے ہوئے پیرس آئے ، جہاں سے یکم اکتوبر کو لندن پہنچے ۔[3] لندن میں مولانا کا قیام ۲۱ نومبر تک رہا ۔[4] زمانۂ قیام میں جو کچھ مصروفیات رہیں ، ان کی تفصیلات اس سفرنامے میں ملتی ہیں ، جو روزنامہ انقلاب میں بالا قساط شائع ہوتا رہا ۔ ممکن تھا کہ مولانا مہر لندن میں مزید رکتے ، لیکن ۱۹ نومبر ۱۹۳۱ع کو کانفرنس میں شریک مسلم وفد سے علامہ اقبال کی علیحدگی اور سفر میں ان کی ہمراہی کی خواہش کے سبب ان کو بھی لندن سے رخصت ہونا پڑا ۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ انگلستان سے سپین کا سفر اختیار کریں ، لیکن علامہ اقبال کے ارشاد کی تعمیل میں انھیں اپنا یہ ارادہ ترک کرنا پڑا ۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک خط میں روزگارِ فقیر کی فروگذاشتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''۱۹۳۱ع میں حضرت علامہ کو ہسپانیہ پہنچایا گیا ، حالانکہ اس سفر میں میرا ان کا ساتھ تھا ۔ میں ہسپانیہ جانا چاہتا تھا مگر ان کے ارشاد پر اپنا مقصد چھوڑ کر روما ساتھ آیا اور وہاں سے ہندوستان پہنچے ۔''[5]

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ع ۔
۲۔ ایضاً ، ۲۲ ستمبر ۱۹۳۱ع ۔
۳۔ ایضاً ، ۲۹ ستمبر ۔ ۹ اکتوبر ۱۹۳۱ع ۔
۴۔ ایضاً ، ۲۴ نومبر ۱۹۳۱ع ۔
۵۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، تاریخ ندارد ، غیر مطبوعہ ۔

واپسی کے سفر میں علامہ اقبال اور مولانا مہر کے ساتھ مولانا محمد شفیع داؤدی بھی تھے ۔ ان سب کی پہلی منزل روم تھی جہاں کی رائل اکیڈیمی نے علامہ اقبال کو مدعو کیا تھا ۔ یہاں پر اقبال اور مولانا مہر کی ملاقات امان اللہ شاہ افغانستان سے ہوئی ۔[1] روم سے مصر کے لیے سفر اختیار کیا گیا اور قاہرہ پہنچے ۔ قاہرہ میں مولانا مہر یہاں کے بعض اخبارات کے دفاتر گئے اور صحافیوں سے ملاقات کی ، جیسا کہ روزنامہ انقلاب ''مولانا مہر مصر میں'' کے عنوان سے لکھتا ہے :

''مصر کا معزز اخبار ''البلاغ'' لکھتا ہے کہ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب لاہور ، دفتر البلاغ میں آئے اور ایڈیٹر سے ملاقات کی ۔ ہم نے انھیں مہذب ، محب علم ، محب اسلام ، محب وطن پایا ۔ ہم ان کے شکرگزار ہوئے کہ وہ ہمارے دفتر میں آئے اور اس بات کی آرزو ظاہر کی کہ ہندوستان اور مصر کے تعلقات زیادہ سے زیادہ دوستانہ و مستحکم رہیں ۔''[2]

قاہرہ میں ان کا قیام صرف چار روز رہا ، جہاں دوسرے بہت سے اکابر علم سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور ان حضرات نے آثار قدیمہ کی سیر بھی کی ۔[3] قاہرہ سے یہ سب لوگ بیت المقدس پہنچے جہاں مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی کی دعوت پر مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کی ۔ مولانا مہر ، مؤتمر عالم اسلامی اور اس میں اپنی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''آخر ۱۹۳۱ع میں مؤتمر اسلامی منعقد کی گئی تاکہ ایک زبردست مظاہرہ کرکے عالمی پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا جائے ۔ دعوت ہر اسلامی ملک کے ممتاز افراد کو دی گئی ۔ علامہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن گئے ہوئے تھے ۔ مولانا شوکت علی مرحوم نے انھیں دعوت دی ۔ میں بھی وہاں تھا ۔ مجھے بھی مدعو کیا گیا اور مولانا محمد شفیع داؤدی مرحوم کو بھی جو لندن میں تھے ۔ مصر ،

۱۔ مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۵۰ ۔

۲۔ روزنامہ انقلاب ، ۲۷ دسمبر ۱۹۳۱ع ۔

۳۔ انقلاب ، ۱۱ ، ۱۳ ، ۱۴ جنوری ۱۹۳۲ع ۔

یمن ، ٹیونس ، ترکستان ، آذربائیجان اور ایران وغیرہ سے نمائندے آئے۔"[1]

یروشلم سے شاہ اردن کی دعوت پر چند روز کے لیے علامہ کے ساتھ اردن بھی گئے۔[2] پھر یروشلم واپس آئے جہاں سے ہندوستان کا سفر اختیار کیا گیا اور ۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح فرنٹیر میل سے لاہور پہنچ گئے،[3] اور یوں مولانا مہر کی زندگی کا یہ طویل سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔ اگرچہ عمر کے آخری حصے میں بھی مولانا مہر نے کئی بار یورپ جانے کا قصد کیا ، لیکن بعض موانعات کے باعث اس کی نوبت نہ آ سکی۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"میں کئی سال سے یورپ جانے کا قصد کیے بیٹھا ہوں لیکن اتفاق سے کوئی نہ کوئی مانع اچانک پیش آتا رہا۔"[4]

بیرونی ممالک کے اسفار میں مولانا مہر کا چوتھا سفر افغانستان کے لیے تھا لیکن ابتداء ہی میں یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ وہ افغانستان علامہ اقبال کے ساتھ گئے تھے ، جیسا کہ بعض حلقوں کی طرف سے کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں :

"میں حضرت علامہ اقبال کے ساتھ افغانستان نہیں گیا تھا۔ حضرت علامہ مرحوم ۱۹۳۳ء میں گئے تھے جب نادر شاہ مرحوم زندہ تھے اور کابل یونیورسٹی کے لیے مشورۂ نصاب کی غرض سے بلائے گئے تھے۔ وہ راس مسعود مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم۔ میں ۱۹۳۴ء میں افغانستان گیا تھا جب نادر شاہ مرحوم کی شہادت پر تقریباً ایک سال گزر چکا تھا۔ حضرت علامہ کے ساتھ میرے ایک ہم نام بہ طور سیکرٹری ضرور گئے تھے یعنی خان غلام رسول بیرسٹر ایٹ لاء مرحوم۔"[5]

۱۔ مکتوب بنام حمزہ فاروقی ، مرقومہ ۷ نومبر ۱۹۶۸ء ، غیر مطبوعہ۔
۲۔ غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۵۱۔
۳۔ روزنامہ انقلاب ، یکم جنوری ۱۹۳۲ء۔
۴۔ مکتوب بنام شیر بہادر پنی ، مرقومہ ۱۶۔ اپریل ۱۹۶۷ء ، مشمولہ افادات مہر ، ص ۱۰۰۔
۵۔ مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۱۱ جولائی ۱۹۶۵ء ، غیر مطبوعہ۔

سفرِ افغانستان کے مقاصد کے سلسلے میں متضاد و متصادم شہادتیں ملتی ہیں جن کے پیشِ نظر حتمی طور پر کچھ طے کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ عبدالمجید سالک نے اپنی سوانح عمری میں اس سفر کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا مہر کسی دعوت کے بغیر از خود افغانستان بغرضِ سیر و سیاحت گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

''انھی دنوں مہر صاحب کو دفعتاً سیرِ افغانستان کی سوجھی۔ چنانچہ آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور رختِ سفر باندھ کر روانہ ہوگئے۔ پاسپورٹ ان کے پاس پہلے ہی سے موجود تھا۔ حکامِ افغانستان نے مہر صاحب کی بہت آؤ بھگت کی۔''[۱]

جبکہ یوسف طاہر نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہر صاحب کو افغانستان آنے کی دعوت حکومتِ افغانستان نے دی تھی۔ وہ لکھتے ہیں :

''۱۹۳۴ء میں حکومت افغانستان نے مولانا مہر کو افغانستان آنے کی دعوت دی اور اسی ملک کے سفارت خانے نے پاسپورٹ کا انتظام بھی کرایا۔''[۲]

حکومت افغانستان یا ہندوستان میں افغانستان کے سفارت خانے کا بھی اس سفر سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ لیکن یہ تعلق کس قسم کا تھا، اس کا کچھ سراغ نہیں ملتا اور یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ آیا واقعی مولانا مہر کسی باقاعدہ دعوت کے جواب میں افغانستان گئے تھے یا پھر افغان سفیر نے محض اپنے تعلقات کی بنا پر اس سفر کے سلسلے میں مولانا مہر کو ضروری سہولتیں بہم پہنچائی تھیں۔ مہر کی افغانستان کے لیے روانگی سے متعلق جو خبر روزنامہ انقلاب نے شائع کی تھی، اس نقطۂ نظر سے وہ بھی کسی طرح کی راہ نمائی نہیں کرتی۔ اخبار نے لکھا :

''مولانا غلام رسول مہر ۱۴ ستمبر کی رات کو بمبئی ایکسپریس سے افغانستان کی طرف روانہ ہوگئے۔ کیونکہ وہاں کے اکابر و احباب کا

۱۔ سرگزشت، از عبدالمجید سالک، ص ۳۵۱ - ۳۵۰۔
۲۔ مولانا غلام رسول مہر، از یوسف طاہر، ص ۵۴۔

مدت سے تقاضا تھا کہ مدیرانِ 'انقلاب' میں سے کوئی صاحب ضرور تشریف لائیں ۔ کیونکہ مولانا مہر کوئی اڑھائی تین مہینے آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا رہے اور ابھی صحت ہوئی تھی اس لیے انھوں نے لاہور میں رہ کر آرام کرنے کی بجائے افغانستان کی سیر کرنا مناسب سمجھا ۔ ۱۵ ستمبر کو آپ گیارہ بجے قبل دوپہر پشاور پہنچے ۔"[1]

محولہ بالا اقتباس سے مقصدِ سفر کے بارے میں تو حتمی طور پر کچھ طے نہیں ہوتا ، البتہ ایک مزید پیچیدگی ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا مہر ۱۳ ستمبر کو لاہور سے روانہ ہوئے اور ۱۵ ستمبر کو پشاور پہنچے جہاں سے انھیں افغانستان جانا تھا ، جبکہ مولانا مہر اپنے ایک مکتوب میں افغانستان کے لیے روانگی کی تاریخ اور اس سے پہلے آشوبِ چشم اور اس کے علاج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مجھے افغانستان جانا تھا اور سفیرِ افغانستان کے ساتھ سفر کے لیے گیارہ ستمبر کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی ۔ ۔ ۔ ۱۱ کو تندرست سفر پر روانہ ہو گیا ۔"[2]

روزنامہ انقلاب میں درج تاریخ اس لیے قابلِ ترجیح ہے کہ انقلاب نے صرف لاہور سے روانگی ہی کی تاریخ نہیں دی ، بلکہ بعد ازاں پشاور اور کابل پہنچنے کی اطلاعات کے ساتھ ساتھ ان مقامات پر ورود کی تاریخیں بھی شائع کیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا مہر پندرہ ستمبر کو پشاور اور سترہ ستمبر کو کابل پہنچے ۔[3] ابتداء میں صرف دس بارہ روز قیام کرنے کا ارادہ تھا ،[4] لیکن مولانا مہر غزنی ، قندھار اور چمن سے ہوتے ہوئے ۱۹-۱۰ اکتوبر ۱۹۳۴ع کو واپس لاہور پہنچے ۔[5] کابل میں مولانا مہر کا قیام کابل ہوٹل میں رہا[6] اور یہاں پر

۱- روزنامہ انقلاب ، مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۴ع ۔

۲- خط بنام سید قدرت نقوی ، مرقومہ ۱۵ جنوری ۱۹۶۶ع ، غیر مطبوعہ ۔

۳- روزنامہ انقلاب ، ۱۸ ستمبر ۱۹۳۴ع ۔

۴- روزنامہ انقلاب ، ۱۸ ، ۲۱ ستمبر ۱۹۳۴ع ۔

۵- روزنامہ انقلاب ، ۲۰ ، ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ع ۔

۶- روزنامہ انقلاب ، ۲۱ ستمبر ۱۹۳۴ع ۔

دیگر عمائدین کے علاوہ شاہ افغانستان محمد ظاہر شاہ سے بھی ملاقات کی جن کے لیے مولانا مہر ایک طویل فارسی قصیدہ لکھ کر لے گئے تھے۔

مولانا مہر کے ایک اور سفر کے ذکر سے پہلے پس منظر کے طور پر کچھ واقعات کے ذکر کی ضرورت ہے، جس کا اجمال یہ ہے کہ چودھری خلیق الزمان نے ملتِ اسلامیہ کے مختلف ممالک کو متحد کرنے کے لیے ایک تحریک شروع کی تھی، جس کا نام تحریکِ شعوبِ اسلامیہ رکھا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے مصر کے شاہ فاروق پاکستان اور یہاں سے اٹھنے والی ہر تحریک کے مخالف تھے۔ شاہ فاروق کا خیال تھا کہ اس قسم کی ہر تحریک عالمِ اسلام کی قیادت کے سلسلے میں مصر اور خود ان کی حریف ثابت ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب چودھری خلیق الزمان نے کراچی میں شعوبِ اسلامیہ کی کانفرنس بلائی تو اندیشہ محسوس کیا گیا کہ شاید مصر سے کوئی وفد اس کانفرنس میں شرکت نہیں کرے گا۔ لہذا خلیق الزمان نے مولانا غلام رسول مہر کو مجبور کیا کہ وہ یہاں سے ایک وفد کے ہمراہ مصر جائیں اور وہاں کے عمائدین سے گفتگو کرکے انہیں اس امر پر رضا مند کریں کہ دیگر ممالکِ اسلامیہ کی طرح وہ بھی شعوبِ اسلامیہ کی کانفرنس میں شریک ہوں۔ پاکستان سے جانے والے وفد میں مولانا غلام رسول مہر کے علاوہ علی محمد راشدی، مولانا عبدالحامد بدایونی اور سردار ظفر اللہ خان بھی شامل تھے۔[1] وفد اپریل ۱۹۵۲ء میں پاکستان سے روانہ ہوا اور مصر کے علاوہ لبنان، اردن اور شام سے ہوتا ہوا مئی ۱۹۵۲ء میں واپس پاکستان پہنچا۔[2]

بیرونی ممالک کے سفر میں ہندوستان کے ان سفروں کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو مولانا مہر نے قیامِ پاکستان کے بعد کیے۔ تقسیمِ ہند کے بعد مولانا مہر کو تین مرتبہ ہندوستان جانے کا موقع بھی ملا، اگرچہ اس کے لیے وہ پروگرام تو بہت پہلے سے بنا رہے تھے۔ ادھر مولانا ابوالکلام آزاد کا تقاضا بھی تھا کہ اگر ممکن ہو تو مولانا مہر دہلی آئیں۔ اس سلسلے میں مہر صاحب نے مولانا آزاد کے نام خط لکھ کر ان کا پروگرام بھی معلوم کیا تھا،

۱۔ مولانا غلام رسول مہر، از علی محمد راشدی، روزنامہ جنگ کراچی، ۲۹ مئی ۱۹۷۲ء۔

۲۔ مولانا غلام رسول مہر، از یوسف طاہر، ص ۷۰۔

جیسا کہ وہ ابوالکلام آزاد کے ایک خط پر حاشیے میں لکھتے ہیں ۔

''میں نے پروگرام دریافت کیا تھا ، اس لیے کہ دہلی جانے کا قصد کر رہا تھا ۔''[۱]

اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت اُس وقت آئی جب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اخبارات کے تبادلے کے متعلق طے پانے والے ایک معاہدے کے سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں کو رفع کرنے کے لیے علی محمد راشدی اور مولانا مہر کو پہلے کلکتہ اور پھر ڈھاکہ جانا پڑا ۔ جاتے ہوئے تو بدرجۂ مجبوری مولانا مہر بذریعۂ ہوائی جہاز گئے ، لیکن واپسی پر ریل گاڑی کو وسیلۂ سفر بنایا ، کیونکہ وہ ہوائی جہاز میں سفر کرنے سے بہت گھبراتے تھے۔[۲] مولانا مہر واپس آتے ہوئے دہلی بھی ٹھہرے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی ۔ جیسا کہ نقش آزاد کے ایک حاشیے میں مولانا کے مضروب ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میں اس سے پیشتر ایک مرتبہ ڈھاکہ سے واپس آتے ہوئے دہلی میں ٹھہر کر انہیں دیکھ چکا تھا ۔''[۳]

مولانا مہر کے اس سفر سے متعلق زیادہ شواہد سامنے نہیں ہیں ، اسی لیے حتمی طور پر یہ بھی طے نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا نے یہ سفر کب اختیار کیا۔ البتہ بعض قرائن سے کچھ اندازے ضرور کیے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً محولہ بالا اقتباس مہر کے نام مولانا آزاد کے اس خط کے حاشیے سے لیا گیا ہے جو ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو لکھا گیا ۔ گویا مولانا مہر اس سے قبل ہی ڈھاکہ ، کلکتہ اور دہلی ہو آئے تھے ۔ جبکہ ابوالکلام آزاد کے خط ہی میں بعض ایسے شواہد موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مہر مئی ۱۹۵۰ء تک ہندوستان نہیں جا سکے تھے ۔[۴]

۱۔ نقش آزاد ، مرتبہ غلام رسول مہر ، ص ۲۰۹ ۔
۲۔ مولانا غلام رسول مہر ، از علی محمد راشدی ، روزنامہ جنگ ، کراچی ، ۵ جون ۱۹۷۲ء ۔
۳۔ نقش آزاد ، ص ۲۱۱ ۔
۴۔ نقش آزاد ، ص ۲۱۰ ۔

ہندوستان کا دوسرا سفر ۱۹۵۶ء میں اختیار کیا گیا ، جیسا کہ مولانا آزاد کی خدمت میں اپنی کتاب ''جماعت مجاہدین'' کا نسخہ پیش کرنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مجھے اتفاقیہ تین چار دن کے لیے دہلی جانے کا موقع مل گیا تھا اور مولانا کی خدمت میں خود ایک نسخہ پیش کر آیا تھا ۔''[۱]

اس کے بعد مولانا مہر جولائی ۱۹۵۹ء میں بھی دہلی گئے ، جیسا کہ قدرت نقوی کے نام ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے ۔ مولانا مہر لکھتے ہیں :

''مکرمی ! میں دہلی گیا ہوا تھا ، کل واپس آیا ۔''[۲]

بیرون ملک مولانا مہر کا یہ آخری سفر تھا ۔ اس کے بعد ارادے اور قصد کے باوجود وہ پاکستان سے باہر نہیں جا سکے ۔

ازواج و اولاد

دسمبر ۱۹۷۲ء کی سولھویں تاریخ تھی ۔ مولانا غلام رسول مہر کو دارفانی سے رخصت ہوئے پورے تیرہ ماہ گزر چکے تھے کہ گورنمنٹ ڈگری کالج بوسن روڈ ملتان میں مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی یاد میں ایک خصوصی جلسے کا اہتمام کیا گیا ۔[۳] اگرچہ اس تقریب میں پڑھے جانے والے بعض مقالات و مضامین بھی قابل ذکر ہیں ، لیکن اس تقریب کی ایک اہم بات یہ تھی کہ اس کے مہمان خصوصی مولانا مہر کے چھوٹے پوتے ندیم اسلم تھے جو اُس وقت بمشکل گیارہ بارہ برس کے تھے ۔ یہ بات تقریب کے اکثر ناواقف حال شرکاء کے لیے باعث تعجب تھی ۔ لیکن اس وقت اس تعجب کی کوئی حقیقت نہ رہی جب اولاً ندیم اسلم کی تقریر اور بعد ازاں دوران گفتگو میں بعض وضاحتوں سے یہ بات کھلی کہ مولانا مہر کے اخلاف میں ندیم اسلم ہی وہ واحد فرد ہیں جن

۱۔ نقش آزاد ، حاشیہ ص ۲۴۱ ۔
۲۔ مکتوب بنام سید قدرت نقوی ، مرقومہ ۲۹ جولائی ۱۹۵۹ء ، مطبوعہ اُردو نامہ کراچی ، ص ۱۴۸ ، شمارہ نمبر ۵۱ ۔
۳۔ ان دنوں راقم اس ادارے میں زیر تعلیم تھا ۔

کو مولانا اپنی علمی و ادبی روایت کا امین اور اپنی وراثت کا صحیح حقدار سمجھتے تھے ۔ ندیم اسلم کی اس منفرد صلاحیت کا اظہار یوں تو کئی مواقع پر ہوا لیکن ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے ، اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ ندیم اسلم نے مولانا مہر سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شاہجہان کی زیادہ تر عظمت اس کے وزیر سعداللہ خاں کی بدولت تھی ، کیونکہ ان کے انتقال کے بعد شاہجہان معاملات کو سنبھال نہ سکے ۔ کم عمر پوتے کی زبان سے یہ لفظ سنتے ہی مولانا مہر نے ان کا ماتھا چوما اور دو رکعت نفل بطور شکرانہ ادا کیے ۔[۱] غالباً اسی لیے مولانا مہر وقتاً فوقتاً ندیم اسلم کو اپنی کتب کا خصوصی مطالعہ کرنے کا حکم دیا کرتے تھے ۔ ۱۰ نومبر ۱۹۷۱ع یعنی انتقال سے چند روز پہلے آخری ملاقات میں بھی ندیم اسلم کو ''رسولِ رحمت'' پڑھنے کی تاکید کی تھی جو اُس وقت اشاعت کے مراحل سے گزر رہی تھی ۔

ندیم اسلم ، عبدالسلام اسلم کے چھوٹے صاحبزادے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح پوتوں میں مولانا مہر کو ندیم اسلم سب سے زیادہ عزیز تھے ، اسی طرح اپنے بچوں میں وہ عبدالسلام اسلم پر حد سے زیادہ شفقت فرمایا کرتے تھے ۔ اس امر کا اندازہ مولانا مہر کے ان بہت سے خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے مختلف لوگوں کے نام تحریر کیے اور جن میں عبدالسلام اسلم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان خطوط سے بھی جو مولانا مہر نے عبدالسلام اسلم کے نام لکھے اور جن کی تعداد چار سو سے بھی متجاوز ہے ۔

عبدالسلام اسلم سے مولانا مہر کے اس خصوصی تعلق کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ عبدالسلام اسلم مولانا مہر کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے اور بیوی کے انتقال کے بعد عبدالسلام اسلم اور ان کی حقیقی بہن امۃ السلام کی پرورش میں خود مولانا مہر کو بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ مولانا مہر اپنی پہلی بیوی کے سانحۂ ارتحال کو تمام عمر نہیں بھول سکے ۔ اور چونکہ یہ دونوں بچے اسی مرحومہ کی نشانی تھے لہذا ان سے خود بخود ایک جذباتی نوعیت کا تعلق پیدا ہو گیا تھا ۔

۱۔ نخلستان ، ادبی مجلہ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان ۱۹۷۳ع - ۱۹۷۲ع ، ص ۱۸۳ ۔

مولانا مہر کی پہلی شادی ۱۹۱۴ء[1] میں اُس وقت ہوئی جب ابھی مولانا بی - اے کے طالب علم تھے ، جیسا کہ ابوسلمان شاہجہانپوری کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

''آپ کو غالباً معلوم نہیں کہ میری پہلی شادی اُس وقت ہوئی تھی جب میں بی - اے میں تھا - اس بیوی کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہو گیا - اس کے دو بچے تھے - بڑا بیٹا اڑھائی سال کا - چھوٹی بیٹی صرف اُلیس دن کی - ان کی وجہ سے کچھ مدت تجرد ہی میں بسر کی -''[2]

مولانا کی پہلی بیوی کا نام تو امیر بیگم تھا ،[3] لیکن عموماً ان کو ''جیونی'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا -[4] ان کا تعلق بھی اعوان برادری سے تھا اور وہ چودھری غلام نبی کی صاحبزادی تھیں ، جو مولانا مہر کے آبائی گاؤں سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں قادیاں والی میں رہائش پذیر تھے - چودھری غلام نبی ڈاکٹر تھے اور انھوں نے زندگی کا زیادہ عرصہ بہ سلسلہ ملازمت ملتان اور دہلی میں گزارا تھا - ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد قادیاں والی آ گئے اور یہاں کے نادار و غریب لوگوں کا علاج معالجہ کرنے لگے - ان کا انتقال تین جون ۱۹۳۷ء کو قادیاں والی ہی میں ہوا -[5]

اگرچہ مولانا مہر اور امیر بیگم کا زمانۂ رفاقت تقریباً نو برس پر محیط ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سالہا سال گزر جانے کے باوجود اس عہد کی خوشگوار یادیں مولانا مہر کو تڑپاتی رہیں - محبوب بیوی کو پھر سے پا لینے کی آرزو اتنی شدید تھی کہ مولانا مہر ہمہ وقت موت کو گلے لگانے کے لیے تیار رہتے تھے ، جیسا کہ اپنے صاحبزادے عبدالسلام اسلم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

۱- مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۷۰ -
۲- مکتوب بنام ابوسلمان شاہجہانپوری ، مرقومہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۸ء ، غیرمطبوعہ -
۳- مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۷۰ -
۴- انٹرویو از عبدالسلام اسلم -
۵- روزنامہ انقلاب ، مورخہ ۱۱ جون ۱۹۳۷ء -

''اگر مشیتِ ایزدی سے آج بھی بلاوا آ جائے تو اس کے خیر مقدم میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جانتا ہوں کہ اس دنیا میں جس سراپا محبت وجود کو سب سے بڑھ کر عزیز سمجھا، وہ میرے لیے دوسری دنیا میں بائیس برس سے چشم براہ ہے اور اس کی صحبت کا شوق اس زندگی کی ہر محبت پر فائق ہے۔''۱

اسی خط میں ایک اور مقام پر مرحومہ کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے دل میں صفائی، پاکیزگی، ترتیبِ اشیاء کا جو غیر معمولی عشق ہے وہ اس مرحومہ کی محبت میں پیدا شدہ خصائل کا ایک کرشمہ ہے۔ میں نے راست بازی میں اس جیسی عورت آج تک نہیں دیکھی۔ آپ کو معلوم نہیں لیکن یہ اس کی ہمت تھی کہ بارہا اپنی والدہ کے خلاف بھی سچائی کی صاف صاف شہادت دے دیا کرتی تھی۔ آپ کو غالباً معلوم نہیں کہ اگر گھر میں آج بھی کسی چیز کو بے ترتیب یا ناصاف پاتا ہوں تو وہ مرحومہ مجھے فوراً یاد آ جاتی ہے۔ آہ غالب کیا کہہ گیا ہے:

آئندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است
یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم''۲

لیکن موت کسی کے اوصاف حمیدہ اور خصائل مرغوب و پسندیدہ کا لحاظ کب کرتی ہے؟ چنانچہ چند روز کی مختصر علالت کے بعد امیر بیگم بھی قادیان والی میں انتقال کر گئیں، جہاں ان کے والد ان کی بگڑتی ہوئی صحت کے پیشِ نظر انہیں بغرض علاج لے گئے تھے۔ مولانا مہر نے ایک مرتبہ اپنے صاحبزادے کے استفسار پر امیر بیگم کی تاریخِ وفات کے ساتھ ساتھ انتقال کے وقت کا بھی تعین کر دیا تھا۔ انہوں نے لکھا:

''جانم! تعجب ہے کہ آپ کو اپنی والدہ کی تاریخِ وفات صحیح یاد

۱۔ مکتوب بنام عبدالسلام اسلم، مرقومہ اکتوبر ۱۹۶۵ء (غیر مطبوعہ)۔
۲۔ ایضاً۔

نہیں رہی ۔ آٹھ اکتوبر کو ساڑھے آٹھ بجے صبح اس کی وفات ہوئی تھی یعنی آفتاب نکل رہا تھا کہ میری اُمیدوں اور آرزوؤں کے آفتاب نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریکی کی آغوش قبول کی تھی ۔''۱

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد تقریباً چھ برس تک مولانا مہر نے تجرد کی زندگی بسر کی ۔ ان کی دوسری شادی ۱۹۲۹ء میں عبدالعزیز لدھیانوی کی صاحبزادی امۃ الحفیظ سے ہوئی ۔ لیکن ان کا انتقال بھی ۱۹۵۷ء میں ہو گیا ، جیسا کہ مولانا ، ابوسلمان شاہجہانپوری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

''۱۹۲۹ء میں دوسری شادی کی ۔ اس بیوی کا انتقال ۱۹۵۷ء میں ہو گیا ۔''۲

اگرچہ مولانا مہر نے ''نقش آزاد'' کے ایک حاشیے میں اپنے بیان کردہ سنہ وفات سے سہواً اختلاف کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''میں بھی ولایت جا رہا تھا لیکن بیوی کی شدید علالت کے باعث رک گیا اور یہ علالت تین سال تک عناں گیر رہی اور ۱۱ اگست ۱۹۵۵ء کو اس کی وفات ہوئی ۔''۳

لیکن ''نقش آزاد'' ہی میں ایک اور مقام پر مولانا نے پھر درست تاریخ درج کر دی ہے ۔ وہ ایک واقعے کی صراحت کرتے ہوئے حاشیے میں لکھتے ہیں :

''میری بیوی کی وفات کا ذکر ہے جو ۱۱-اگست ۱۹۵۷ء کو ہوئی ۔''۴

اس سنہ وفات کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ستمبر ۱۹۵۷ء ہی کے ایک مکتوب میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بیوی کی رحلت کے سلسلے میں مولانا مہر سے اظہار تعزیت کیا ۔۵

۱- مکتوب بنام عبدالسلام اسلم ، مرقومہ اکتوبر ۱۹۳۵ء ، غیر مطبوعہ ۔
۲- مکتوب بنام ابوسلمان شاہجہانپوری ، مرقومہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۸ء، غیرمطبوعہ ۔
۳- نقش آزاد ، مرتبہ غلام رسول مہر ، ص ۲۳۳ ۔
۴- نقش آزاد ، مرتبہ مہر ، ص ۲۴۴ ۔
۵- یہ ابوالکلام آزاد کی طرف سے مولانا مہر کے نام آخری خط ہے اور یہ مولانا آزاد کے سیکرٹری محمد اجمل کا تحریر کردہ ہے ۔

مولانا مہر کی پہلی بیوی یعنی امیر بیگم عرف "جیونی" کے بطن سے دو بچے پیدا ہوئے ۔ ایک لڑکا عبدالسلام اسلم اور دوسری صاحبزادی امۃ السلام ۔ عبدالسلام اسلم کا نام مولانا عبدالسلام حیدر آبادی کے اثرات کے اعتراف کے طور پر رکھا گیا تھا ۔[۱] عبدالسلام اسلم سات جولائی ۱۹۲۱ع کو اپنے ننھیالی گاؤں قادیاں والی میں پیدا ہوئے ۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ایف ۔ اے کا امتحان پاس کیا ، جبکہ بی ۔ اے اور ایم ۔ اے کی ڈگریاں گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کیں ۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد پہلے رائل انڈین ایئرفورس میں پائیلٹ آفیسر ہوئے پھر محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن میں ملازم ہو گئے ۔ ۲۳ فروری ۱۹۴۷ع میں ان کی شادی عم زاد بہن سے ہوئی اور آج کل لاہور میں مقیم ہیں ۔

ہندوستانی معاشرت کا یہ پہلو بڑا ہی افسوس ناک ہے کہ عموماً لڑکیوں کی پیدائش اہل خانہ بلکہ خود والدین کے لیے بھی بار خاطر ہوتی ہے ۔ اگرچہ پہلی لڑکی کی پیدائش پر سرد مہری کا زیادہ مظاہرہ نہیں کیا جاتا ، لیکن امۃ السلام کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ پہلی لڑکی ہونے کے باوجود پیدا ہوتے ہی ان کو والدین کے ماتھے پر "بل دیکھنا پڑے ۔ ان کا جس انداز میں استقبال کیا گیا اس کا اندازہ مولانا مہر کے ایک خط سے بخوبی ہو جاتا ہے ۔ دہلی سے واپس آتے ہوئے جالندھر کے اسٹیشن پر اترتے ہی گھر میں بچی پیدا ہونے کی خبر ملنے پر اپنے احساسات و جذبات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"اُس زمانے میں میرے خیالات بڑے عجیب تھے ۔ دعائیں مانگا کرتا تھا کہ خدایا میرے گھر میں لڑکی نہ ہو ۔ اب آپ میری حالت کا اندازہ کریں ، چھہتر روپے دہلی میں گنوائے ۔ انٹر کلاس میں رات بھر سفر کیا ۔ نیند پوری نہ ہوئی ۔ منہ اندھیرے جالندھر کے اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی سنا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے ۔ دل بجھ گیا ۔ سوچا کہ اب گھر کیا جاؤں ، لاہور ہی کیوں نہ چلا جاؤں ۔ لیکن اسی شش و پنج میں کھڑے کھڑے ٹرین روانہ ہو گئی ۔ میرے پاؤں گھر کی طرف

۱۔ بعض لوگ اسے مہر و سالک کی گہری دوستی کا نتیجہ سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے ایک صاحبزادے کا نام بھی "عبدالسلام خورشید" ہے ۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں ۔ کیونکہ عبدالسلام اسلم کی پیدائش کے وقت مہر و سالک ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے ۔

اٹھتے نہیں تھے ۔ بمشکل لکوڈر کے اڈے پہنچا ۔ تانگہ لے کر گھر گیا تو آپ کی والدہ مجھ سے بدرجہا بڑھ کر افسردہ تھیں ۔ اسے خود بھی لڑکی کا غم تھا ۔ نیز میرے خیالات اچھی طرح معلوم تھے ۔ اسی لیے وہ بے حد پریشان تھیں اور میرے پہنچنے سے پیشتر کئی مرتبہ آرزو کر چکی تھی کہ لڑکی مر جائے ۔[۱]

امۃ السلام کی بدقسمتی کا یہ ایک پہلو تھا ۔ لیکن دوسرا پہلو اس سے زیادہ تاریک تھا ۔ وہ یہ کہ والدین کی بددعاؤں کے باوجود یہ بے چاری تو زندہ رہی ، لیکن آٹھ اکتوبر ۱۹۲۳ع کو ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا ۔ جبکہ امۃ السلام کی تاریخ پیدائش ۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ع تھی ۔ یعنی صرف انیس دن کی تھیں کہ ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ۔ ماں کے انتقال کے بعد دونوں بچوں کی پرورش اور نگہداشت کی ذمہ داری والدۂ مہر اور بچوں کی ایک خالہ فاطمہ نے قبول کی ۔ اگرچہ مولانا مہر نے بھی اپنے حصے کے فرائض انجام دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ۔ خاص طور پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان بچوں کے لیے تقریباً چھ سال کا عرصہ مجرد رہ کر گزارا ۔

یہ اسی حادثۂ فاجعہ کا اثر تھا کہ بعد ازاں مولانا مہر کا رجحان طبع بالکل بدل گیا اور لڑکی کی پیدائش کی خبر سن کر افسردہ ہو جانے والا دل اب اسی لڑکی کی ذرا ذرا سی تکلیف پر بے تاب و بے قرار ہونے لگا ۔ اس امر کا اندازہ بھی عبدالسلام اسلم ہی کے نام مولانا کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"ملاحظہ فرمائیے کہ مجھے لڑکی کا باپ بننے سے نفرت تھی لیکن سلامت کی زندگی کے لیے میں نے بے انتہا دعائیں مانگیں ۔ جب اسے ٹائیفائیڈ ہوا تو دعا کی تھی کہ یا اللہ اسے شفا ہو جائے تو ہر سال سو نفل محض شکرانہ میں اضافی طور پر پڑھا کروں گا ۔ وہ میں آج تک کر رہا ہوں ۔"[۲]

جنوری ۱۹۴۲ع میں امۃ السلام کی شادی ان کے ایک ماموں زاد چودھری عبدالستار خاں سے ہوئی ۔ اس شادی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سالک

۱۔ مکتوب بنام عبدالسلام ، مرقومہ اکتوبر ۱۹۴۵ع ، غیر مطبوعہ ۔
۲۔ مکتوب بنام عبدالسلام ، مرقومہ اکتوبر ۱۹۴۵ع ، غیر مطبوعہ ۔

لکھتے ہیں :

''۵ جنوری ۱۹۴۲ع کو موضع پھول پور (ضلع جالندھر) میں مہر صاحب کی بڑی صاحبزادی کی شادی چودھری عبدالستار خاں . . . کے ساتھ بخیر و خوبی (انجام) کو پہنچی ۔''[1]

مولانا مہر کی دوسری بیوی کے بطن سے کل گیارہ بچے پیدا ہوئے جن میں سے پانچ لڑکیاں اور چھ لڑکے ہیں ۔ سب سے بڑی لڑکی بلقیس کشور ۲۸ مئی ۱۹۳۰ع کو پیدا ہوئی اور ۲۸ دسمبر ۱۹۷۹ع کو ان کا انتقال ہوگیا ۔ اس کے بعد سات نومبر ۱۹۳۲ع کو دوسری لڑکی رضیہ سلطانہ پیدا ہوئی اور ان کا انتقال ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۳ ع کو ہوا ۔ رضیہ سلطانہ کے انتقال کے صدمے نے مولانا مہر کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ۔ اس کے علاوہ انھیں بڑھاپے میں رضیہ سلطانہ کے چار بچوں کی پرورش کی بھاری ذمہ داری بھی اٹھانا پڑی ۔[2] رضیہ سلطانہ کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے ایوب قادری کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''آپ کو میرے حالات کا علم نہیں ۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۳ع کو میری ایک نوجوان بیٹی چار چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر اچانک فوت ہو گئی۔ بیان نہیں کر سکتا کہ یہ لیل و نہار مجھ پر کس عالم میں گزرے اور اب میں کتنا پریشان ہوں ۔''[3]

۹ نومبر ۱۹۶۳ع کو سید قدرت نقوی کے نام اپنے ایک خط میں زیادہ تفصیل سے لکھتے ہیں :

''میری ایک بیٹی کا انتقال ۲۲ اکتوبر کو یکایک سرگودھا میں ہوا ۔ وہ میرے بھتیجے کے نکاح میں تھی جو سرگودھا میں فلائٹ لفٹننٹ تھا ۔ تین بجے کے قریب فون کیا کہ اس کے بچہ ہوا ، ملٹری ہسپتال میں داخل تھی ۔ غالباً کمزوری دور کرنے کے خیال سے خون دیا گیا ۔

۱۔ سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۴۷۰ ۔

۲۔ مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، حاشیہ ص ۷۱ ۔

۳۔ مکتوب بنام پروفیسر ایوب قادری ، مرقومہ ۷ جنوری ۱۹۶۳ع، غیرمطبوعہ

شاید قسم کا ٹھیک اندازہ نہ کیا گیا اور تین گھنٹے میں اطلاع آئی کہ انتقال ہوگیا ۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ۔ چھوٹا تو فقط تین گھنٹے کا تھا جب انتقال ہوا ۔''۱

رضیہ سلطانہ کی چھوٹی بہن کا نام خالدہ نسیم ہے جو آٹھ جنوری ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئیں اور آج کل فیصل آباد میں مقیم ہیں ۔ نیرہ پروین کی تاریخِ پیدائش ۳۱ دسمبر ۱۹۳۶ء ہے اور ان کا قیام لاہور ہی میں ہے ۔

نیرہ پروین کے بعد مولانا مہر کے ہاں یکے بعد دیگرے پانچ فرزند پیدا ہوئے جن کے نام اور تاریخہائے پیدائش درج ذیل ہیں :

۱-	فاروق ارشد	۵ ستمبر ۱۹۳۹ء
۲-	جاوید سلطان	۳۰ اکتوبر ۱۹۴۱ء
۳-	سعید اکرم	۱۷ دسمبر ۱۹۴۳ء
۴-	مسعود طارق	۷ دسمبر ۱۹۴۵ء

مولانا مہر کے اکثر سوانح نگاروں کے ہاں مسعود طارق نامی مولانا مہر کے اس صاحبزادے کا ذکر نہیں ملتا جو سات دسمبر ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوا اور چند ماہ کی عمر میں ۲۲ اپریل ۱۹۴۶ء کو انتقال کر گیا ۔ مسعود طارق کے انتقال پر روزنامہ انقلاب میں یہ خبر شائع ہوئی تھی :

''آج گیارہ بجے قبل دوپہر مولانا غلام رسول مہر مدیر انقلاب کا سب سے چھوٹا بچہ طارق ، جس کی عمر دوڈھائی مہینے کے قریب تھی . . . فوت ہو گیا ۔''۲

مولانا مہر کے مذکورہ صاحبزادے مسعود طارق کا ذکر نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ بعد ازاں ۱۹ اپریل ۱۹۴۷ء کو پیدا ہونے والے ایک اور صاحبزادے کا نام بھی مسعود طارق رکھ دیا گیا تھا جو آج کل لاہور ہی میں مقیم ہیں اور پاسپورٹ ایجنٹ کے طور پر کام کرتے ہیں ۔

۱- مکتوب بنام سید قدرت نقوی ، مرقومہ ۹ نومبر ۱۹۶۳ء ، غیر مطبوعہ ۔
۲- روزنامہ انقلاب ، ۲۴ اپریل ۱۹۴۶ء ۔

مسعود طارق کی چھوٹی بہن کا نام ناصرہ پروین ہے جو یکم اکتوبر ۱۹۴۸ع کو پیدا ہوئیں اور جن کی شادی اپنے خالہ زاد بھائی سے ہوئی - یہ ناصرہ پروین ہی تھیں جنھوں نے مولانا مہر کی آخری زندگی میں ان کی دیکھ بھال اور خدمت کی۔ مولانا مہر کی زبان سے آخری الفاظ بھی اپنی اسی صاحبزادی کے لیے نکلے : ''اچھا بیٹی خدا حافظ'' سلیم امجد مولانا مہر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں ۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۲ جنوری ۱۹۵۱ع ہے -

شخصیت

بعض لوگ کوئی اہم کارنامہ انجام دے کر غیر معمولی شہرت حاصل کر لیتے ہیں ، جبکہ کچھ لوگ بہت چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر توجہ دے کر بڑے لوگوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں - مولانا مہر کا شمار دوسری طرح کے افراد میں ہوتا ہے - اگر ان کی عام زندگی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اگرچہ کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہیں دیا لیکن اپنے شب و روز اس انداز میں گزارے جس میں بجائے خود ایک عظمت کا پہلو موجود تھا - وہ گھر میں ہوتے یا گھر سے باہر ان باتوں کا ہمیشہ خیال رکھتے جو خوشگوار تعلقات اور خوشگوار زندگی کا لازمہ ہیں اور جن کے بغیر کوئی بھی شخص کامیاب زندگی نہیں گزار سکتا۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ عام اخلاقی رویوں کی پابندی بھی اس کا مطمح نظر ہو -

ان کی گھریلو زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتے تھے اور اپنے گھر میں ایک عام آدمی کی طرح رہتے اور زندگی گزارتے تھے - ان کے جذباتی رشتے اور تعلقات بھی عام آدمی ہی کی طرح محکم و استوار تھے - یعنی ان میں اپنائیت ، خلوص اور محبت و مروت کے وہ جذبات فراواں تھے جو کسی بھی خاندان کی خوشگوار زندگی کے لیے ضروری ہیں - مولانا مہر کے والدین ہوں یا اولاد ، ان کا تعلق سب سے مخلصانہ تھا - اس کا ذکر آ چکا ہے کہ کس طرح مولانا نے محض والدہ کی دلداری کی خاطر روزنامہ ''زمیندار'' سے اس وقت استعفاء دے دیا تھا جب ان کی اخبار نویسی کی شدید خواہش پوری ہونے کی صورت پیدا ہوئی تھی - ماں کے علاوہ خاندان کے دوسرے افراد سے بھی ان کے تعلقات کی یہی نوعیت تھی - مثلاً پہلی

بیوی امیر بیگم کو وہ ساری عمر نہ بھول سکے اور اس کی مفارقت میں زمانہ رفاقت کی خوشیوں کو یاد کر کرکے ساری عمر تڑپتے رہے ، جیسا کہ ان کے ایک خط سے واضح ہوتا ہے ۔ پہلی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

''اس کے ریشم جیسے بالوں کو چھوئے ہوئے بائیس برس گزر چکے ہیں ، لیکن اللہ گواہ ہے کہ میرے ہاتھوں میں وہ لمس اب تک تازہ ہے ۔ جب آنکھیں بند کرتا ہوں وہ کیفیت اس طرح سامنے آ جاتی ہے کہ گویا بال میرے ہاتھوں سے لگے ہوئے ہیں ۔ میں نے زندگی میں سیکڑوں اور ہزاروں عورتیں دیکھی لیکن اتنی شریف ، ہمدرد ، باحیا ، نیک دل ، نیک طبیعت ، سراپا محبت اور اتنے محبوب خصائل کی جامع عورت آج تک نہیں دیکھی ۔ انسان کو زندگی گزارنا پڑتی ہے :

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

لیکن جانی آٹھ اکتوبر ۱۹۲۳ء کی صبح کو جو خوشی مجھ سے چھنی تھی ، وہ اس دنیا میں دوبارہ نصیب ہونے کی کوئی صورت نہیں ۔ وہ دور پھر واپس نہیں آ سکتا ۔ اللہ کے فضل سے امید ہے کہ زندگی کے دن پورے کرکے اس مرحومہ سے پھر اتصال پیدا ہوگا ۔ مجھے یقین ہے کہ اب مفارقت کا زمانہ زیادہ طویل نہیں رہا ۔''[1]

اولاد کے سلسلے میں بھی مولانا مہر کا یہی رویہ تھا ۔ انھوں نے بچوں پر کبھی ناروا سختی نہیں کی اور کبھی ایسا انداز اختیار نہیں کیا کہ اولاد کی اصلاح سرے سے ناممکن ہو جائے ۔ اس سلسلے میں یوسف طاہر لکھتے ہیں :

''آپ بچوں سے مروت کے ساتھ پیش آتے ہیں ۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو ٹوکتے بہت کم ہیں ۔ مناسب طریقے سے سمجھا دیتے ہیں ۔ نواسوں سے بڑی محبت ہے ۔ کھانا تناول فرماتے ہیں تو سب کو پاس بیٹھا کر کھلاتے ہیں ۔''[2]

۱۔ مکتوب بنام عبدالسلام اسلم ، اکتوبر ۱۹۴۵ء ، غیر مطبوعہ ۔
۲۔ مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۴۲ ۔

مندرجہ بالا اقتباس میں مولانا مہر کے نواسوں کا ذکر آیا ہے ، یہ مولانا کی صاحب زادی رضیہ سلطانہ کے بچے ہیں جن کا انتقال ۲۲ - اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ہوا تھا ۔ مولانا کو صاحبزادی اور نواسوں سے جو محبت تھی اس کا اظہار ان کے ایک خط سے ہوتا ہے جس میں بیٹی کے سانحہٗ ارتحال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس حادثہٗ وفات نے غم کا جو پہاڑ مجھ پر الٹ دیا ہے ، اس کے باب میں فی الحال کچھ کرنے کا ہوش نہیں ۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری زندگی ، جو پہلے بھی کچھ زیادہ اطمینان بخش حالت میں نہ تھی ، اس فاجعہٗ عظیم نے اسے بالکل تاریک بنا دیا ہے ۔ مرحومہ کے چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ۔ ان پر نظر پڑتے ہی آنسوؤں کا تار بندھ جاتا ہے ۔"[1]

اولاد کے بارے میں یہی انداز فکر اُس وقت بھی سامنے آتا ہے جب مولانا مہر اپنی پہلی بیوی کے بطن سے صاحبزادی امۃ السلام کی شفایابی کے لیے سو نفل سالانہ پڑھنے کی منت مانتے ہیں اور پھر تمام عمر اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے ۔

مولانا مہر ایک اچھے اور مثالی باپ کی طرح ٹوکنے اور ڈانٹنے سے احتراز کرنے کے باوجود اولاد کی تربیت سے بھی حتی المقدور غافل نہیں ہوئے ۔ ان کے بڑے صاحبزادے ملازمت کے باعث ان سے ہمیشہ دور رہے اور اسی سبب سے خط و کتابت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ۔ مولانا مہر اپنے خطوط میں انھیں اوصاف حمیدہ اپنانے پر مائل کرتے نظر آتے ہیں ۔ مثلاً اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"آپ جیسے قابلِ فخر مسلمان نوجوان کی شان یہی ہے کہ اگر حالات امید اور آرزو کے مطابق نہ ہوں تو اللہ کی بارگاہ میں بار بار استغفار کرے ، بار بار دعائیں مانگے . . . آپ کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ آپ کی محنت، لیاقت ، صلاحیت اور دیانت کا صلہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی آپ کو دے گا اور اگلی دنیا میں بھی . . . برکت اور استقامت

۱۔ مکتوب بنام سید الیس جیلانی ، مرقومہ یکم نومبر ۱۹۶۳ء ، غیر مطبوعہ۔

صرف محنت اور دیانت پر موقوف ہیں ۔ ''والعاقبة للمتقین'' کا مطلب آخرت کے سلسلے میں تو واضح ہی ہے ، لیکن دنیوی سلسلے میں بھی مجھے یقین ہے کہ اسی قانون پر عمل ہوتا ہے ۔''[1]

اولاد اور اہل خانہ کے علاوہ مولانا مہر کی شفقتوں اور عنایات میں وہ سب لوگ بھی حصہ دار تھے جو کسی نہ کسی حیثیت میں ان کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے ۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام ان کے ملازم ''لنکو'' کا ہے جس کے بارے میں شریف خان بنی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''یہ ایک ہندو پوربیا تھا جو قیامِ پاکستان کے بعد آج سے کوئی سات آٹھ سال پہلے (یعنی ۶۴ - ۱۹۶۳ء تک ، مرتب) ان کے ہاں موجود تھا ۔ اندر باہر کے سب کام وہی کرتا تھا اور الٹی دھوتی باندھتا تھا ۔ قد و قامت کا اچھا تھا ۔ مولانا ذاتی طور پر سب کام اسی سے لیتے تھے ۔ کوٹھی پر آنے جانے والوں کے لیے وہی ان کا نمائندہ تھا . . . گھر کے اندر اور باہر ، مولانا کے بعد اسی کی شخصیت نمایاں تھی ۔ یہاں تک کہ مولانا کا حقہ بھی وہی بھرا کرتا تھا ۔''[2]

مولانا مہر کی شفقت نے لنکو رام کو تمام رشتے ناطے بھول جانے پر مجبور کر دیا تھا ۔ لنکو کی بیوی اور لڑکا تقسیم ملک کے بعد ہندوستان چلے گئے تھے لیکن وہ مولانا کے پاس لاہور ہی میں رہا ۔ البتہ مولانا کے انتقال کے بعد مستقل طور پر ہندوستان چلا گیا ۔[3] لنکو کے ساتھ ہی پنڈت رام ناتھ کا ذکر بھی ضروری ہے جو تقسیمِ ملک تک روزنامہ ''انقلاب'' کے منیجر اشتہارات رہے اور سالک کے بقول انقلاب اپنی محدود تعداد اشاعت کے باوجود پنڈت رام ناتھ ہی کی کوششوں کی وجہ سے مالی پریشانیوں کا شکار ہونے سے بچا رہا ۔ رام ناتھ کے ساتھ بھی مولانا مہر کا برتاؤ انتہائی مشفقانہ تھا ۔ رام ناتھ کے ساتھ مہر کچھ ایسے بے تکلف تھے کہ اکثر انھیں پنڈت رام ناتھ کی بجائے مولانا رام ناتھ کہہ کر پکارتے تھے ۔[4] مولانا مہر کی بے تکلفی کا ذکر آیا تو کہنا چاہیے کہ مولانا

۱۔ مکتوب بنام عبدالسلام اسلم ، مرقومہ ۱۹۶۵ء ، غیر مطبوعہ ۔

۲۔ مکتوب بنام ڈاکٹر شیر بہادر بنی ، مشمولہ افادات مہر ، ص ۷۰ ۔

۳۔ انٹرویو از مولانا محمد عالم مختارِ حق ۔

۴۔ ایضاً ۔

مہر حقیقی معنوں میں جس واحد شخص سے بے تکلف تھے وہ شیخ مبارک علی ہیں جو لاہور میں کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں ۔

مولانا کے بارے میں عموماً یہ رائے پائی جاتی ہے کہ وہ سالک کی ہنسوڑی طبیعت کے برعکس خاصے خشک مزاج آدمی تھے ، جیسا کہ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں :

''مہر صاحب کسی قدر خشک مزاج اور سالک صاحب تو گویا باغ و بہار آدمی تھے ۔ ان کے کمرے میں ہر وقت محفل لگی رہتی تھی اور جب قہقہے بلند ہوتے تو مہر صاحب برابر کے کمرے میں بیٹھے چیں بجبیں ہوتے تھے ۔''[۱]

لیکن دیرینہ دوستی کے باعث شیخ مبارک علی کے سامنے مولانا مہر کی تمام تر خشک مزاجی غائب ہو جاتی اور ایسے ایسے لطیفے اور چٹکلے چھوڑے جاتے کہ باید و شاید[۲] ۔ آخر کیوں نہ ہوتا ، شیخ مبارک علی وہ فرد واحد ہیں جن کے ساتھ زمانہ طالب علمی سے عمر کے آخری لمحے تک دوستانہ اور برادرانہ تعلقات رہے ۔ شیخ مبارک علی سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

''شیخ مبارک علی سے میرے تعلقات اُس وقت قائم ہوئے تھے جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور یہ یقین بھی نہ تھا کہ آگے زندگی کا ایسا دور بھی موجود ہے جس میں چند مخلص احباب کے نزدیک میری شخصیت بھی ایک حد تک قابل توجہ بن جائے گی اور اس پوری مدت میں مبارک علی سے مراسم ویسے ہی مخلصانہ رہے جیسے پہلے دن قائم ہوئے تھے ۔ اُس وقت مبارک علی ریلوے کے دفتر میں تیس روپے کا ملازم تھا ۔ پھر اس نے ملازمت چھوڑ کر تجارت شروع کی ۔ خدا نے اس کے حسنِ نیت میں اور محنت میں برکت دی ۔ آج وہ لاکھوں کا

۱۔ مولانا غلام رسول مہر ، از عاشق حسین بٹالوی، ص ۳ ، ہفت روزہ چٹان ۔ مشمولہ افاداتِ مہر ۔

۲۔ انٹرویو از شیخ نیاز احمد ۔

مالک ہے اور ایسا عجیب و غریب دوست کہ پاکستان بن جانے کے بعد میرا چھوٹا بھائی تباہ حال یہاں پہنچا تو کاروبار کی فکر میں تھا۔ مبارک علی مجھ سے ملنے کے لیے آیا اور پوچھا تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو، سبب کیا ہے؟ میں نے کہا کچھ نہیں، امیر احمد خاں آیا تھا اور کہتا تھا کسی کارخانے میں ۲۵ ہزار کا حصہ ملتا ہے۔ مبارک علی نے جاتے وقت میرے بیٹے عبدالسلام اسلم سے کہہ دیا اپنے چچا کو خط لکھنا، وہ مجھے مل جائے۔ امیر احمد خاں ملتا ہوا آیا تو اس کے پاس مبارک علی کا پچیس ہزار کا چیک موجود تھا۔ میں نے وہ بہ منت واپس کر دیا۔

وہ ابتدا سے مذہباً شیعہ ہے لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ برسوں ہمارے ساتھ شاہی مسجد میں نماز عید پڑھتا رہا۔ اس کے ہم مذہب پوچھتے تو کہتا عید کی نماز دوستوں کے ساتھ میل ملاپ کی تقریب ہے۔ میرے دوست جہاں جاتے ہیں، وہیں میں جاتا ہوں۔ ایسے دوست آج کہاں ملتے ہیں۔"[1]

مولانا مہر بھی اس دوستانہ تعلق کو نبھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ ہجوم مصروفیات و مشاغل اور مسلم ٹاؤن ایسی دور افتادہ بستی میں رہائش پذیر ہونے کے باعث مولانا مہر کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ ہر روز شہر آ سکتے، اس کے لیے انھوں نے ہفتے کے دن مقرر کر رکھا تھا اور تقریباً سبھی ضروری کام اسی دن پر اٹھا رکھتے تھے۔ اپنی زندگی کے دیگر معمولات کی طرح وہ اس معمول کی بھی بڑی سختی سے پابندی کیا کرتے تھے، جیسا کہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

"آج ہفتہ تھا اور میں ہفتے کو کوئی کام نہیں کرتا۔ شہر جاتا ہوں اور دوستوں سے باتیں کرتا ہوں یا چند ضروری کام انجام پا جاتے ہیں۔"[2]

ہفتے کے اس معمول کے بارے میں یوں تو انھوں نے اپنے خطوط میں جابجا لکھا ہے، لیکن ایک جگہ اس کا ذکر بہت پرلطف انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق، مرقومہ ۸۔ اگست ۱۹۶۳ع۔ غیر مطبوعہ۔
۲۔ مکتوب بنام سید انیس جیلانی، مرقومہ ۲۵ جون ۱۹۶۷ع، غیر مطبوعہ۔

''آج ہفتہ ہے اور میرے شہر جانے کا دن ہے ۔ گویا یہ میرے لیے یوم سبعت ہے ۔ اگرچہ میں یہودی نہیں ، تاہم میرا یوم تعطیل ہفتے ہی کا دن ہے ۔''[1]

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ، مولانا مہر دیگر ضروری کام بھی ہفتے ہی کو انجام دیا کرتے تھے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دن انھوں نے صرف شیخ مبارک علی سے ملاقات کے لیے وقف کر رکھا تھا اور شہر جانے کا اولین مقصد بھی یہی ہوتا تھا ۔ جیسا کہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

''ہفتے کو میرے شہر جانے کا اولین مقصد مبارک علی ہی ہوتے ہیں ۔''[2]

ایک مدت سے یہی معمول چلا آتا تھا کہ ہفتے کی صبح کو عموماً شیخ نیاز احمد مولانا مہر کے ہاں آ جاتے جہاں سے یہ دونوں حسب ضرورت کسی نہ کسی ادارے مثلاً مطبوعات فرینکلن، مجلس ترقی ادب یا پنجاب یونیورسٹی آ جاتے ۔[3] یہاں سے فراغت پانے کے بعد ان کی اگلی منزل پبلشرز یونائیٹڈ واقع ۱۷۶ - انارکلی ہوتی تھی ، جہاں باقی احباب بھی جمع ہو جاتے تھے ۔ حاضرین میں عموماً دو طرح کے لوگ ہوتے تھے ۔ وہ جو باقاعدہ اس مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ مثلاً مولانا مہر ، شیخ مبارک علی ، شیخ نیاز احمد ، شیخ محمد امین ، شیخ بشیر احمد ، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ، صادق علی دلاوری ، حکیم مشہدی ، مرزا ہادی علی بیگ اور میاں سلطان محمد وغیرہ[4] ۔ دوسرے وہ لوگ جو کبھی کبھار اس مجلس میں شریک ہوتے تھے ۔ دوپہر کا کھانا شیخ بشیر احمد کے گھر سے آتا اور تمام حاضرین مجلس اس میں شریک ہوتے ۔ یہ محفل شام تک جمی رہتی ۔ اس کے بعد مولانا مہر سودا سلف خریدتے اور واپس گھر چلے جاتے یا پھر شیخ نیاز احمد کی معیت میں کسی سینما ہاؤس کا رخ کرتے ۔[5]

۱- مکتوب بنام ابوسلمان شاہجہانپوری ، مرقومہ ۳ دسمبر ۱۹۶۶ء غیرمطبوعہ ۔
۲- مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۲۷ اپریل ۱۹۶۵ء ، غیر مطبوعہ۔
۳- انٹرویو از مولانا حامد علی خاں اور شیخ نیاز احمد ۔
۴- افادات مہر ، مرتبہ شیر بہادر پنی ، ص ۸۷ - ۸۸ و انٹرویو از شیخ نیاز احمد ۔
۵- انٹرویو از شیخ نیاز احمد ۔

ہفتے کے اس ایک دن کے علاوہ مولانا مہر کے روز و شب کا ایک ایک لمحہ ہجومِ مشاغل سے زیربار تھا اور یہ تمام وقت تصنیف و تالیف کی مشغولیت میں گزرتا ۔ صبح سے رات گئے تک پڑھنے لکھنے میں مصروف رہنے کے باعث ہی یہ ممکن ہوا کہ وہ بعض ایسے کام کر گئے جن کے لیے اکثر اوقات اداروں کا قیام عمل میں آتا ہے ۔ علم اور علمی کاموں سے ان کے شغف کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف خود زندگی کے آخری لمحے تک قرطاس و قلم سے رشتہ استوار رکھا بلکہ بہت سے ضرورت مندوں کو بھی اپنے مصروف اوقات میں سے حسبِ ضرورت وقت دیتے رہے ۔ پڑھنے لکھنے سے مولانا مہر کے شغف کا اعتراف کرتے ہوئے مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں :

> ''ذاتی طور پر راقم نے متعدد اربابِ علم سے مشورے کی درخواست کی لیکن کامیابی نہ ہوئی ۔ ان میں اگر کوئی مثال مستثنیٰ ہے تو وہ جناب غلام رسول مہر صاحب مدیر انقلاب کی ۔ موصوف نے بلا کسی درخواست کے کتاب دیکھتے ہی بعض کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی اور پھر میری درخواست پر مفصل نوٹ لکھ کر مرحمت فرمایا ۔ پھر یہی نہیں بلکہ ''دارالعروبہ'' تشریف لا کر مزید بحث و تمحیص کا موقع عنایت کیا ۔''[۱]

یوں تو تصنیف و تحقیق کے میدان میں مولانا مہر کی طرف سے تعاون کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ، لیکن اس سلسلے میں مسعود عالم ندوی کی مندرجہ بالا تحریر خصوصی اہمیت رکھتی ہے ۔ اس سے مولانا مہر کی طبیعت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں ۔ اول یہ کہ اپنی زندگی کی طرح تنقید و تحقیق کے میدان میں بھی انھوں نے دیانت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا ۔ دراصل وہ عام کتاب سازوں کے برعکس علم کے سچے شیدائی تھے ۔ اسی لیے مسعود عالم ندوی کی درخواست کے بغیر انھیں از خود کتاب کی کوتاہیوں کی طرف متوجہ کیا اور خود ''دارالعروبہ'' گئے ۔ یہ بات اُس وقت زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے جب یہ حقیقت بھی پیشِ نظر ہو کہ مولانا مہر خود ۱۹۳۴ء سے سید احمد شہید اور ان کی تحریکِ احیائے دین پر کام کر رہے تھے ۔ لیکن اس کے باوجود انہوں

۱۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ، از مسعود عالم ندوی ، ص ۷ - ۸ ، طبع دوم اگست ۱۹۴۷ء ، مطبوعہ انوار الاسلام پریس لاہور ۔

نے مسعود عالم ندوی سے تعاون کیا ۔ صرف مسعود عالم ندوی ہی کیا ، اس سلسلے میں مولانا مہر کو ایک ایسا دریا قرار دیا جا سکتا ہے جو بلاتامل خشک اور بے آب و گیاہ صحراؤں کو سیراب کرکے سرسبز و شاداب نخلستان میں بدل دیتا ہے ۔ اس امر کا ہلکا سا اندازہ ڈاکٹر سید عبداللہ ، پیر حسام الدین راشدی ، پیر علی محمد راشدی ، عاشق حسین بٹالوی ، کامل القادری ، سید قدرت نقوی ، مشفق خواجہ ، ایوب قادری ، ابوسلمان شاہجہانپوری ، امیر حمزہ شنواری، لطیف عارف ، بشیر احمد ڈار ، حمزہ فاروقی ، محمد حیات خان سیال ، مولانا محمد عالم مختار حق ، نادم سیتاپوری ، ایس جیلانی اور ڈاکٹر شیر بہادر پنی کے نام ان ہزاروں خطوط سے ہوتا ہے جن کا سب سے بڑا موضوع تحقیق و تنقید کے پیچیدہ مسائل ہیں اور جن میں مولانا مہر نے مختلف میدانوں میں محققین کی راہ نمائی اور ان سے علمی تعاون کیا ہے ۔ چراغ حسن حسرت نے مولانا مہر کو ایک ایسا دریا قرار دیا تھا جس کی گہرائی کا کچھ اندازہ نہیں اور اسی بنا پر کوئی تیراک اس میں اترنے کی ہمت نہیں کرتا ۔ لیکن مولانا مہر کی زندگی اور ان کے خطوط کے مختلف مجامیع کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دریائے مہر نے بے شمار لوگوں کو فیض یاب کیا ۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ، مہر و سالک سے استفادے کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ایک طویل زمانے تک ان صاحبوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا ۔ میں نے اپنی اختیار کردہ قومی و علمی مہمات میں ان سے مدد بھی لی اور انھوں نے بصدقِ دل میرے لیے کام کیا ۔"[1]

مولانا مہر کے اس علمی شغف کے باعث محض بی ۔ اے ہونے کے باوجود بعض بڑے بڑے علمی اداروں نے اپنے امور کی انجام دہی کے لیے مولانا مہر کی خدمات حاصل کیں ۔ ایسے اداروں میں پنجاب یونیورسٹی لاہور خاص طور پر قابلِ ذکر ہے ، جس نے مجلس یادگار غالب اور ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے لیے مولانا مہر کی خدمات حاصل کیں اور وہ طویل عرصے تک ان اداروں کے لیے کام کرتے رہے ۔ مولانا مہر ریسرچ سوسائٹی میں اپنی مصروفیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مصنف ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، ص ۲۰ ؛ ماہنامہ فنون ، جولائی ۔ اگست ۱۹۷۵ع ۔

''پچھلے دو مہینے سے میں بری طرح ریسرچ سوسائٹی کے کام میں الجھا ہوا ہوں - میں نے معذرت کی تھی اور کہا تھا کہ میرے لیے گھر سے باہر نکل کر کسی ادارے میں بیٹھنا ممکن نہیں - ارباب اختیار نے کہا ہمیں آپ کا گھر پر بیٹھنا منظور، صرف مسودات دیکھ دیا کرو اور ہدایات دیتے جاؤ . . . دفتر میں جاتا تو چار پانچ گھنٹے وہاں گزارتا - اب سات سات آٹھ آٹھ گھنٹے اس کام میں گزر جاتے ہیں - میرے اپنے ضروری کاموں کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا -''[۱]

مولانا مہر کے پاس بے شک بڑی بڑی ڈگریاں نہیں تھیں، اس کے باوجود وہ اپنے بنیادی کام کی نوعیت اور اہمیت کے باعث ایسے علما اور اکابرین میں شامل تھے جنھیں اپنا قد بڑھانے کے لیے کاغذی ڈگریوں کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ ان سے بالا تر ہوتے ہیں - اس کے باوجود غرور و تکبر مولانا مہر کو چھو کر نہیں گزرا تھا - انھوں نے اپنی زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے فعل کو گوارا نہیں کیا جو غیر ضروری طور پر ان کی تشہیر کا سبب بنتا - دراصل مولانا کا یہ مزاج ہی نہیں تھا - وہ اپنی زندگی میں ہمیشہ محنت کرنے کی طرف مائل رہے اور اس کے صلے کی کبھی توقع نہیں رکھی - اس سلسلے میں اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میرا نقطہ نگاہ ہمیشہ سے یہ رہا کہ ہر کام صرف فرض سمجھ کر کیا جائے، نہ اس لیے کہ اس سے دولت یا شہرت یا عزت مقصود ہے - نظر ثوابِ آخرت پر رکھنی چاہیے - یہاں کا قبول کیا ہے - آج ہے کل نہیں - قبول تو وہی ہے جس کا تعلق عالمِ آخرت سے ہے - حقیقی اور پائیدار زندگی وہی ہے -''[۲]

مولانا مہر کا یہ نقطہ نظر صرف اُخروی زندگی ہی کے متعلق نہ تھا بلکہ عام دنیاوی زندگی کے بارے میں بھی ان کے خیالات ایسے ہی تھے - لیکن یہاں پر اس کی وضاحت ہو جانی چاہیے کہ مولاناِ مہر ان لوگوں میں سے نہیں تھے جن کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے - وہ اپنی رائے سوچ سمجھ کر قائم

۱- افادات مہر، ص ۱۲۸، ۱۲۹ -

۲- مکتوب بنام الیس جیلانی، مرقومہ ۶ ستمبر ۱۹۶۲ع، غیر مطبوعہ -

کرتے تھے اور پھر اس پر ثابت قدم بھی رہتے تھے ۔ لہذا شہرت و مقبولیت سے متعلق ان کا نقطۂ نظر ان کی عملی زندگی میں نظر آتا ہے ۔ ان کے اس رویے کا بہترین اظہار اس وقت ہوا جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں حکومت نے مولانا مہر کو "تمغۂ خدمت" (Pride of performance) مع دس ہزار روپیہ دینا چاہا ، لیکن مولانا نے یہ اعزاز قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ حالانکہ بہت سے ادیب و شاعر ہزارہا سفارشوں کے جلو میں ایسے اعزازات کے حصول کی کوشش کیا کرتے ہیں ۔ حکومت کی طرف سے اعزاز کی پیش کش کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میں نے ایسے افعال کو اپنے لیے کبھی جائز نہیں سمجھا، نہ اخبارنویسی میں اور نہ تصنیف و تالیف میں ۔ اپنا ڈھول بجانے کا مرتکب بھی الحمدللہ کبھی نہ ہوا ۔ کسی سے لڑائی چھیڑنے کی کوشش بھی کبھی نہیں کی ۔ کبھی کسی سے کچھ نہ لیا ۔ التجا تو رہی ایک طرف ، ایک مرتبہ حکومت نے بطور خود ایک بڑی رقم کے ساتھ اعزاز دینا چاہا تو میں نے انکار کر دیا کہ میں کوئی اعزاز لینا اپنے لیے ناقابلِ تصور سمجھتا ہوں ۔ انسان کو اپنے خیال کے مطابق مناسب کام کرتے رہنا چاہیے ۔ ان کی تکمیل پر شکر واجب ہے ۔ اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ انجام بخیر ہو ۔ باقی رہی شہرت تو بھائی میں نے اپنی آنکھوں سے بڑی بڑی شخصیتوں کے سلسلے بنتے اور بگڑتے دیکھے ہیں ۔ یقین رکھیں کہ شہرت میرے نزدیک پرِکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی - یہی وجہ ہے کہ میں اس کے لیے خفیف سی کوشش بھی انسانیت کی پستی سمجھتا ہوں ۔''[۱]

زندگی کے بارے میں اس نقطۂ نظر نے مولانا مہر کو رد و قبول سے بے پروا کر دیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ تعریف و توصیف پر خوش ہوتے تھے اور نہ ہی طنز و تعریض پر خفا ۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید مولانا کی شخصیت کے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱- مکتوب بنام الیس جیلانی ، ۳۰ ستمبر ۱۹۶۵ء ، غیر مطبوعہ ۔

"مہر صاحب کی ایک ادا ہمیں بہت مرغوب تھی کہ حمایت یا مخالفت ، دونوں سے کوئی تاثر قبول نہیں کرتے تھے ۔ تعریف پر خوش نہیں ہوتے تھے ۔ ہم نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ فلاں اخبار نویس پہلے آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا ، اب طعن و تشنیع پر اتر آیا ہے ۔ تو کہنے لگے جانم ! اس پر پریشانی کا کون سا مقام ہے ۔ ہمارا حال تو یہ ہے :

از رد و از قبول تو فارغ اشستہ ایم
اے آں کہ خوب ما نہ شناسی ز زشت ما"[۱]

شبلی کے اس شعر کے علاوہ مولانا مہر کے مکاتیب میں ایسے مواقع کے لیے غالب کا بھی ایک شعر با لعموم ملتا ہے جسے وہ لوگوں کے طنز و تعریض کے جواب میں پیش کیا کرتے تھے :

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

دراصل مولانا مہر اپنے انکسار کے باعث خود کو معصوم اور گناہوں سے پاک تصور ہی نہیں کرتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ دوسروں کو بھی اختلاف رائے اور اس کے اظہار کا حق حاصل ہے اور اپنے اسی حق کی بنا پر اگر مولانا مہر کے خلاف لکھتے ہیں تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ۔ اس طرح کی ایک صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

"میں نے کم و بیش تیس سال اخبار نویسی میں گزارے ۔ سینکڑوں کے خلاف لکھا اور سینکڑوں کی مخالفانہ تحریریں پڑھیں ۔ انسان پبلک میں آتا ہے تو اسے جہاں اپنے اختلاف رائے کا حق منوانے کی ضرورت ہے وہاں دوسروں کے لیے بھی اختلافِ رائے کا حق تسلیم کرنا چاہیے ۔ . . . کیوں یہ فرض کر لوں کہ میں دنیا میں معصوم ہوں اور کسی کو میرے خلاف کچھ نہ لکھنا چاہیے ۔"[۲]

۱۔ افکار و حوادث ، از عبدالسلام خورشید ، سنڈے ایڈیشن ، نومبر ۱۹۷۱ع ۔ روزنامہ مشرق ، لاہور ۔

۲۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۱ع ، غیرمطبوعہ ۔

مولانا مہر کی شخصیت کا یہ رویہ ان کی طبیعت میں انکسار کے باعث پیدا ہوا۔ انہوں نے عام زندگی کے مختلف شعبوں اور اپنے دائرۂ کار میں بعض بہت اہم کارنامے انجام دیے۔ اس کے باوجود کبھی اپنی اہمیت منوانے کی کوشش نہیں کی۔ 'غالب' اور 'سید احمد شہید' ایسی بلندپایہ تصالیف کا مصنف خود کو ہمیشہ ایک معمولی طالب علم لکھتا رہا۔ جس طرح انھیں کسی سے کچھ پوچھنے میں عار نہیں تھی، اسی طرح کچھ بتاتے ہوئے بھی کبھی غرور و تکبر کا مظاہرہ نہیں کیا۔ عام لوگوں کے ساتھ ان کا جو سلوک ہوتا تھا اس کا اظہار ان کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں :

"مکرمی ! ان تکلفات کی کیا ضرورت تھی۔ میں خود ایک معمولی طالب علم ہوں اور جو کچھ مجھے معلوم ہے، اپنے ہمسروں اور رفیقوں کی خدمات عالیہ میں پیش کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے۔ عالم‌الکل اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں۔ اپنی حالت کو یہ سمجھتا ہوں کہ شوق علم میں ابتدائے سن شعور سے دامن پھیلا رکھا ہے۔ جہاں سے کوئی متاع مل جاتی ہے، اسے اللہ تعالیٰ کا فضل خاص سمجھتا ہوں۔"[1]

یہی سبب تھا کہ سینکڑوں اہلِ علم مولانا مہر سے خط و کتابت کے ذریعے استفادہ کرتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے مصروف اوقات اور کبھی کبھی خط و کتابت کے اس لامتناہی سلسلے سے عاجز آ جانے کے باوجود انھوں نے اسے کامل طور پر نبھایا اور کسی کو بھی مایوس نہیں کیا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات مولانا مہر سے ایسے سوالات پوچھ لیے جاتے جن کا جواب قرین مصلحت نہ ہوتا یا پھر کوئی ایسا سوال جس سے مولانا مہر کی واقفیت نہ ہوتی تو صاف طور پر معذرت کر لیتے۔ جیسا کہ اپنے ایک خط میں معذرت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آپ ناراض نہ ہوں۔ اگر آپ نجار کو نبض دکھائیں گے اور طبی مشورہ لیں گے یا طبیب کے پاس جا کر فنِ تعمیر کے متعلق گفتگو فرمائیں گے تو اس کے لیے صحیح راہ عمل یہی ہوگی کہ بہ ادب

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق، مرقومہ ۱۷ جنوری ۱۹۶۱ء، غیر مطبوعہ۔

عذر خواہی کو دستاویز بنا لے ۔ میں ناچیز جو خدمت انجام دے سکتا ہوں ، اس میں کبھی عذر نہ ہوگا ۔ مگر جو فن مجھے نہیں آتا اس کے متعلق آپ کو کیا رائے دے سکتا ہوں ۔''[1]

ہفتے کے دن کے سوا مولانا مہر کے صبح و شام تصنیف و تالیف کی مشغولیتوں میں گزرتے تھے ۔ صبح سے رات نو بجے تک ، دوپہر کے کھانے کے مختصر وقفے کے سوا ان کا تمام وقت اسی شغل کی نذر ہو جاتا تھا ۔ اس کے باوجود حسبِ منشا کام کی تکمیل نہیں ہو پاتی تھی جس کی بنا پر انھوں نے مختلف اوقات میں کئی اہلِ علم کو اپنا ادبی معاون و مددگار بنایا ۔ ایسے لوگوں میں نشتر جالندھری کا نام نمایاں تر ہے ۔ دراصل مولانا مہر نشتر جالندھری کے علم و فضل خاص طور پر ان کی شعر فہمی سے بہت متاثر تھے ۔ اکثر متنازعہ مباحث میں نشتر سے تبادلہ خیال کرتے اور پھر رائے قائم کرنے کی کوشش کرتے ۔ یوں تو اس امر کی شہادت مولانا حامد علی خاں نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں دی ،[2] لیکن اس کے شواہد مولانا مہر کے بہت سے مکاتیب میں بھی بکھرے پڑے ہیں ۔

خیال کیا جاتا ہے کہ نشتر جالندھری نے مولانا مہر کے ساتھ شراکتِ کار معاشی مجبوریوں کے ہاتھوں تنگ آ کر کی ۔ لیکن مولانا مہر نے اس خیال کی بارہا تردید کی ۔ انھوں نے اپنے ایک خط پر انیس جیلانی کے تاثرات پر حاشیہ لکھتے ہوئے نشتر جالندھری کے متعلق تحریر کیا :

''ان کو تنخواہ نہیں ، میرے ساتھ دوستانہ روابط نے امداد کے لیے کھینچا ۔ میرا تعلق ان کے ساتھ اس وقت سے ہے جب میں آٹھویں میں پڑھتا تھا اور مجھ سے ایک سال پیچھے تھے ۔''[3]

مولانا مہر نے اپنے ایک اور خط میں نشتر جالندھری سے اپنے ایسے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا ، جس میں ہوسِ مال و زر کا عنصر زیادہ دخیل نظر

۱۔ مکتوب بنام انیس جیلانی ، مرقومہ ۱۶ نومبر ۱۹۶۱ع ، غیر مطبوعہ ۔
۲۔ انٹرویو از مولانا حامد علی خاں ۔
۳۔ مکتوب بنام انیس جیلانی ، غیر مطبوعہ ۔

نہیں آتا ۔ لکھتے ہیں :

”نشتر صاحب زیادہ دیر تک میرے ساتھ وابستہ رہے ۔ وہ میرے ہم وطن تھے ۔ سکول کے زمانے سے دوستانہ تعلقات تھے ۔“[۱]

معاملاتِ مال و زر کا ذکر آیا تو کہنا چاہیے کہ مولانا مہر اس معاملے میں بھی ان بزرگوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں جو اکل حلال کھاتے اور اسے خدا کی عطا سمجھ کر خدا ہی کے احکام کے مطابق صرف کرتے ہیں ۔ یعنی کھانے پینے کے معاملے میں فراخ دست لیکن فضول خرچی سے نفور ۔ اس سلسلے میں تو مولانا مہر کو یہ بھی قبول نہ تھا کہ وہ بلا وجہ مکتوب نویس کی غفلت کے باعث بیرنگ پر بیرنگ وصول کرتے جائیں اور یوں ہر خط کے آنے پر چند پیسے ناجائز طور پر خرچ کرنے پڑیں ۔ ایک بیرنگ کی وصولیابی کے بعد مولانا مہر لکھتے ہیں :

”آج پھر وہی معاملہ پیش آیا جو پہلے تین یا دو مرتبہ پیش آیا تھا ۔ . . . یہ ضیاع از روئے حدیث ممنوع ہے ۔ چالیس پیسے نہیں چالیس روپے بھی خرچ کیے جا سکتے ہیں بہ شرطیکہ مصرف صحیح ہو ۔ تاہم اگر آپ کو یہ طریقہ پسند ہو تو خیر ۔“[۲]

مہر صاحب معاملے کے نہایت کھرے تھے ۔ دوستانہ روابط کے باوجود کسی سے کچھ قبول کرنے کے روادار نہ تھے ۔ دراصل یہ ان کے لیے چند سکوں کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ انسان کی روشن ضمیری کا مسئلہ تھا ۔ اس سلسلے کی روشن مثال وہ دلچسپ واقعہ ہے جب انیس جیلانی نے رسالہ ’معارف‘ کا زر سالانہ ادا کرکے رسالہ مہر صاحب کے نام جاری کرانا چاہا ۔ اگرچہ رسالہ تو کارکنان معارف کی ”معاملہ فہمی“ کے باعث مہر صاحب کو ملنے کی بجائے انیس جیلانی ہی کو ملتا رہا ، لیکن مولانا مہر اس سلسلے میں ادا کی گئی رقم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ مکتوب بنام ابو سلمان شاہجہانپوری ، مرقومہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ع ، غیر مطبوعہ ۔

۲۔ مکتوب بنام انیس جیلانی ، مرقومہ ۱۸ اپریل ۱۹۷۰ع ، غیر مطبوعہ ۔

"رقم ادا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس طرح رفتہ رفتہ انسان کو حرام خوری کی عادت پڑ جاتی ہے ۔ ضمیر میں تازگیٔ احساس و نورانیت باقی نہیں رہتی ۔ نظریں دوسروں کے کیسوں اور جیبوں سے وابستہ ہو جاتی ہیں . . . اصل معاملہ روپے کا نہیں جس کی کمی یا زیادتی کا سوال سامنے آئے ۔ اصل معاملہ اپنے ضمیر کی تازگیٔ احساس کا ہے ۔"[۱]

ضمیر کی یہ تازگیٔ احساس مولانا مہر کے مذہبی معتقدات اور مذہبی احکام کی سختی سے پابندی کا عطیہ تھی ۔ اہلِ حدیث یوں بھی عام مسلمانوں کی نسبت شعائر اسلام کی کہیں زیادہ سختی سے پابندی کرتے ہیں ۔ یہی چیز مولانا مہر کی طبیعت کا خاصہ بھی بن گئی ۔ اس کے علاوہ یہ مولانا عبدالسلام کے اثرات کا نتیجہ بھی تھا جن سے مولانا مہر کو حیدر آباد دکن میں کسب فیض کا موقع میسر آیا تھا اور انھوں نے مولانا عبدالسلام سے امام ابن تیمیہ اور حافظ ابنِ قیم کی تحریروں کے مطالعے میں مدد لی تھی ۔ مولانا مہر کی زندگی میں اس کے اثرات اس انداز میں ظاہر ہوئے کہ ان کی پہلی تصنیف بھی سیرت امام ابن تیمیہ ہے اور غالب کے بعد ان کی سب سے بڑی تحقیقی تصنیف میں بھی اس شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے ، جس کا مذہبی مسلک اہلِ حدیث تھا ، یعنی سید احمد شہید ۔ مولانا مہر اہلِ حدیث بورڈ کے رکن بھی تھے لیکن یہ ان کے توازن فکر کی دلیل ہے کہ انھوں نے اپنے معتقدات میں سخت گیر رویہ رکھنے کے باوجود تمام عمر تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا اور ضرورت پیش آنے پر اپنے ہم مسلکوں کی مخالفت بھی کی ۔ مثلاً ۱۹۳۴ع میں جب اہلِ حدیث بورڈ نے مسلمانوں کے عام مفادات کے خلاف مخلوط انتخابات کا مطالبہ کیا تو مولانا مہر نے بورڈ کے اس فیصلے کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے لکھا :

". . . کیا واقعہ یہ نہیں ہے کہ اہلِ حدیث کا یہی مطالبہ جس پر بحث ہو رہی ہے ، ہندوؤں کے نزدیک اہلِ حدیث کی محبوبیت کی دلیل ہے ؟ اس لیے کہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوگا ۔ وہ جماعت جماعت اور گروہ گروہ بن کر اپنی حقیقی قوت کو فنا کر دیں گے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جنون میں اپنی ملت کے مفاد کو قربان کرکے ہندوؤں کے تسلط . . . کا راستہ صاف کر دیں گے ۔"[۲]

۱- مکتوب بنام ایس جیلانی ، مرقومہ ۱۵ مئی ۱۹۶۴ع ، غیر مطبوعہ ۔
۲- روزنامہ انقلاب ، ۱۱ مئی ۱۹۳۴ع ۔

اہلِ حدیث ہونے کے باوجود مولانا مہر اسلام کو ایک ایسا مذہب تصور کرتے تھے جو انسان پر اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ۔ اس خیال کے پیشِ نظر انھوں نے عمر کے آخری حصے میں روزہ رکھنا ترک کر دیا تھا ۔ غالباً اسی بنا پر احباب نے یہ لطیفہ اڑا رکھا تھا کہ سالک و مہر صوم و صلواۃ کے بڑے پابند ہیں ۔ لطف یہ تھا کہ مولانا سالک روزہ پابندی سے رکھتے تھے اور نماز نہیں پڑھتے تھے جبکہ مولانا مہر روزہ نہیں رکھتے تھے لیکن نماز ادا کرنے کا پورا اہتمام کیا کرتے تھے ۔ اسلامیہ کالج کے زمانہ طالب علمی کے دوران میں چند ماہ کے علاوہ ان کی زندگی میں کوئی دن ایسا نہیں آیا جب انھوں نے نماز چھوڑ دی ہو یہاں تک کہ وہ سینما ہال میں بھی نماز ادا کر لیتے تھے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس انداز میں نماز پڑھ لیتے تھے کہ سجدے سامنے میز پر ہوتے رہیں ۔ دن بھر کی قلمی مشقت کے باعث کبھی کبھار یہ بھی ہوتا کہ مولانا نماز ادا کرتے کرتے سو جاتے لیکن چند منٹ بعد جیسے ہی آنکھ کھلتی اور نماز کا خیال آتا تو نماز وہیں سے شروع کر دی جاتی جہاں سے اس کا سلسلہ منقطع ہوا تھا ۔۱

نماز کے علاوہ فلم بینی بھی مولانا مہر کی زندگی کا معمول بنی رہی ۔ خاص طور پر اس دور میں جب وہ اخباری دنیا سے وابستہ تھے ۔ صحافت سے علیحدگی کے بعد فلم صرف ہفتے کے دن دیکھی جاتی تھی ۔ دراصل مولانا فلم بینی کو تفریح کا ایک اچھا ذریعہ تصور کرتے تھے ۔ اس لیے ہفتہ بھر تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول رہنے کے بعد شہر آ کر فلم دیکھنا ان کا عام معمول تھا ۔۲ لیکن ایک زمانے میں فلم بینی مولانا مہر کی مجبوری بھی بن گئی تھی ۔ اپنی اس مجبوری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''میں نے جب اخبار نویسی شروع کی تھی تو کچھ مدت کے بعد ایک عجیب مصیبت کی دلدل سامنے آ گئی ۔ سیاست پڑھنا اور سیاست لکھنا کام تھا ہی ، جس میں آٹھ دس گھنٹے ضرور صرف ہوتے تھے ۔ اس سے فارغ ہو کر تفریح کے لیے نکلتا تو جو دوست یا شناسا مل جاتا پوچھتا کہو حالات کیسے ہیں ؟ بس اس کے ان چار لفظوں کے بعد مجھے مشین

۱۔ انٹرویو از مولانا محمد عالم مختارِ حق ۔
۲۔ انٹرویو از شیخ نیاز احمد ۔

کی طرح اول سے آخر تک تمام حالات بیان کرنا پڑ جاتے ۔ سوچا کہ اس مصیبت سے بچاؤ کی کیا صورت بنے ؟ خیال آیا سینما دیکھنا چاہیے ۔ چنانچہ کئی سال تک یہ دستور رہا کہ اخبار کے کام سے فراغت پاتا تو اٹھ کر سینما چلا جاتا ۔''[۱]

مولانا مہر کے بارے میں عام طور پر یہ رائے پائی جاتی ہے کہ وہ بہت غور و فکر کے بعد کوئی رائے قائم کرتے لیکن جب یہ رائے قائم کر لیتے تھے تو پھر اس میں کسی تغیر وتبدل کی گنجائش نہیں ہوتی تھی ۔ یہی حال ان کے معمولات کا بھی تھا ۔ جو معمول ایک دفعہ بن گیا عمر بھر اسے نبھایا ۔ اگر اتفاقاً کسی روز کسی معمول کو ترک کرنا پڑتا تو اس کے ساتھ باقی پورا دن بھی بے اطمینانی کی نذر ہو جاتا تھا ۔ غالباً یہی سبب تھا کہ 'انقلاب' بند ہو جانے کے باوجود مولانا مہر حسبِ معمول بہت عرصے تک اداریے قلمبند کرتے رہے ۔ دراصل مولانا بڑی لبی تلی زندگی گزارنے کے عادی تھے ۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ دفتر عمل کا طلب گار تھا ۔ ایسے میں معمولات سے احتراز کی کوئی صورت نہ تھی ۔ اپنے ایک خط میں اپنے عمومی معمولات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میں کوئی چالیس سال سے جلد سونے اور تڑکے اٹھنے کا عادی چلا آتا ہوں اور لطف یہ ہے کہ کبھی کوئی الارم نہ لگایا ، ہمیشہ طبیعت پر اور اللہ کے فضل پر بھروسہ کیا ۔ عموماً وقت پر آنکھ کھل جاتی ہے ۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں پہلے نہاتا ، پھر نوافل و نماز کے بعد سیر کے لیے نکل جاتا ۔ تین میل کا چکر کھلے میدان میں لگا آتا ۔ ناشتا کرتا ، پھر . . . ایڈیٹوریل لکھتا ۔''[۲]

مولانا مہر کے روزانہ معمولات میں سب سے قابلِ ذکر عمل نوافل کی ادائیگی ہے ۔ سردیوں میں نفل نماز فجر سے قبل ادا کیے جاتے تھے جبکہ گرمیوں میں مختلف اوقات میں ، اور وہ اس لیے کہ مولانا مہر کے لیے موسم گرما ایک عذاب سے کم نہیں تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موسم گرما عموماً سناور یا ایبٹ آباد میں گزارتے تھے ۔ لیکن وہ جہاں بھی جاتے اپنے عزیزوں کو نہ بھولتے ۔ کسی

۱۔ مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۵ جون ۱۹۶۹ع ۔
۲۔ مکتوب بنام ابوسلمان شاہجہانپوری ، مرقومہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ع ۔

کی خیریت کی اطلاع آتی یا کسی کے متعلق کوئی خوشخبری سنتے تو فوراً بطور شکرانہ کچھ نفل پڑھتے ۔ مولانا کی صاحبزادی امۃ السلام بیمار ہوئی تو منت مانی کہ اگر یہ تندرست ہو جائے تو ہر سال سو نفل بطور شکرانہ ادا کیا کروں گا۔ سو اسے تمام عمر نبھاتے رہے ۔ دراصل مولانا مہر ان بزرگوں میں سے تھے جو خوشی اور غم ہر دو موقعوں پر اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرتے اور اندوہ و مسرت سے متعلق جذبات کے اظہار میں بھی احکامِ الٰہی کا خیال رکھتے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ مولانا مہر ان رسوم و رواج کے بھی بہت خلاف تھے جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ۔ مثلاً وہ عید کے موقع پر عید کارڈ لکھنے کو عیسائیوں کی رسم قرار دیتے ہوئے خلاف اسلام تصور کرتے تھے جو محض دولت کے ضیاع کا سبب بنتی ہے ۔ لہٰذا وہ ہمیشہ عید کارڈ بھیجنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتے رہے ۔

مولانا مہر کی عام زندگی اور ان کے معمولات پر نظر ڈالی جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جو خاص طور پر ان کی شہرت کا باعث بنتا ۔ لیکن انھوں نے عمر بھر چھوٹی چھوٹی باتوں کا اس انداز میں خیال رکھا کہ وہ خود بڑے آدمی بن گئے ۔ مولانا مہر کی عظمت کا راز اسی امر میں پوشیدہ ہے ۔

انھوں نے اپنے لیے ایک راستہ متعین کیا اور پھر ہر طرح کے خطرات اور نشیب و فراز کے باوجود سود و زیاں سے بے پروا ہو کر اسی راستے پر گامزن رہے ۔ اگر یہ عہد کر لیا کہ سرکاری ملازمت نہیں کرنی تو پھر عمر بھر نہیں کی ۔ اگر سیاست سے قطع تعلق کر لیا تو پھر یاران سرپل کے اعتراضات کا جواب دینا بھی نامناسب ہی سمجھا ۔ جب یہ طے کر لیا کہ اپنے ضمیر کی تازگی٭ احساس اور نورانیت کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی سے کچھ قبول نہیں کرنا تو پھر حکومت سے اعزازات بھی نہیں لیے ۔ سادہ لفظوں میں اسی اندازِ زندگی کو وضعداری کا نام دیا جاتا ہے ۔ اس لیے مولانا مہر کی وفات کی خبر شائع کرتے ہوئے روزنامہ 'نوائے وقت' نے اپنی ۱۸ نومبر ۱۹۷۱ع کی اشاعت میں لکھا تھا کہ :

اُدمی بچ کر کہاں جائے قضا کے قہر سے
آج وہ اٹھا ہے کل اٹھ جائیں گے ہم دہر سے
مہر کا جانا مقدر تھا، مگر وہ کیا گیا
وضعداری کا جنازہ اُٹھ گیا اس شہر سے

☆ ☆ ☆

دوسرا باب

تصانیفِ مہر کا سرسری جائزہ

تصانیف :

مولانا غلام رسول مہر نے اگرچہ اپنی زندگی کے اُن مصروف ایام میں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا تھا جب وہ اخبار و صحافت کی دنیا میں مگن قوم و ملک کی خدمت میں مصروف تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ 'انقلاب' کی حتمی بندش کے بعد علم و ادب سے اُن کی گہری وابستگی کے باعث پڑھنا لکھنا ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ''غالب'' کے بعد اُن کی زیادہ تر تصانیف صحافتی دنیا سے رشتہ منقطع کر لینے کے بعد ہی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئیں ۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ مولانا مہر جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے ۔ انتقال کی وجہ سے مولانا مہر کی بہت سی رشحاتِ فکر زیورِ طباعت سے محروم رہیں ۔ اسی طرح اُن کے بعض ایسے منصوبے بھی نامکمل اور ناتمام رہ گئے جو اُن کے یادگار کارنامے ہو سکتے تھے ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر مولانا مہر کی مطبوعہ کتب کے ذکر سے پہلے غیرمطبوعہ کتب یا زیرِ تکمیل منصوبوں کا جائزہ لے لیا جائے ۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا قابلِ ذکر کام علامہ اقبال کی سوانحِ حیات کی ترتیب سے متعلق تھا ۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا مہر کی دیگر مطبوعہ کتب کی طرح شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور کی بعض کتابوں پر مذکورہ کتاب کا اشتہار بھی ملتا ہے جس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید یہ کتاب چھپ چکی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے ۔ دراصل مولانا مہر کا شمار اُن چند اکابر میں ہوتا ہے جن کو علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی صحبت میں رہنے اور اُن سے براہِ راست استفادے کا موقع میسر آیا ۔

مولانا مہر علامہ اقبال کی جلوتوں ہی نہیں بلکہ ایک نیازمند کی حیثیت

سے خلوتوں کے ساتھی بھی رہے تھے ۔ لاہور میں بھی مولانا مہر کو حضرت علامہ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا ۔ اس کے علاوہ لندن ، روم ، قاہرہ اور بیت المقدس کے سفر کے دوران میں بھی مولانا مہر شب و روز اُن کے ساتھ رہے ۔ مولانا مہر نے یہ احتیاط بھی روا رکھی کہ ایک ڈائری بنائی جس میں علامہ مرحوم سے روزانہ ملاقاتوں کی تفصیل اور پیش آمدہ ضروری واقعات کا ذکر قلم بند کیا جاتا تھا ۔ مولانا مہر اس ڈائری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ایک زمانے میں علامہ اقبال کے ساتھ روزانہ طویل ملاقاتیں ہوتی تھیں اور میں بالالتزام روزانہ گفتگوؤں کا ماحصل لکھ لیا کرتا تھا ۔ یہ کاپی نظروں سے اُوجھل ہو گئی تھی ۔ گزشتہ سال وہ مل گئی تو اسے بھی مرتب کر دینا چاہتا تھا ۔''[۱]

اپنے ایک اور خط میں حیاتِ اقبال کو مرتب کرنے کی شدید خواہش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''پچھلی مرتبہ بیمار ہوا . . . تو اس بات کا دل پر بڑا بوجھ تھا کہ میری دو کتابیں تجویز ہی کی حد تک رہ گئیں ۔ ایک مولانا آزاد مرحوم پر اور دوسری علامہ اقبال کا روزنامچہ ، جو میں نے ایک زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا ، لیکن آخر تک جاری نہ رہ سکا ۔''[۲]

بعض اہل خبر اس نوعیت کے انکشافات بھی کرتے ہیں کہ مولانا مہر نے بزمِ اقبال لاہور کے منصوبے کے مطابق علامہ اقبال کی سوانح لکھنے کا کام شروع کیا تھا لیکن بعض احباب کی ''کرم فرمائیوں'' کے باعث وہ یہ کام نہ کر سکے ۔ اس سلسلے میں اگرچہ مولانا مہر نے کہیں کھل کر تو کچھ نہیں لکھا البتہ ان کے بعض جملے کسی خفیہ داستان کے وجود کی چغلی ضرور کھاتے ہیں ۔ مولانا مہر کے ایسے ہی بعض اشاروں کے باعث مذکورہ انکشافات کو غلط قرار دینا آسان نہیں رہتا ۔ مثلاً مولانا مہر ، حمزہ فاروقی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

۱۔ مکتوب بنام ابو سلمان شاہجہانپوری ، مرقومہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۸ع ، غیرمطبوعہ ۔
۲۔ مکتوب بنام شیر بہادر پنی ، مشمولہ افاداتِ مہر ، ص ۲۵۰ ۔

''باقی رہا حضرت علامہ کے متعلق واجبات کا ادا کرنا تو یہ ایک لمبی داستان ہے لیکن اسے بھی میں جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں'' ۔!

لیکن موت نے مولانا مہر کو حضرت علامہ سے متعلق واجبات پورے کرنے کی مہلت نہ دی اور یوں یہ عظیم منصوبہ متشکل ہونے سے رہ گیا اور شائقینِ اقبال ایک نادر کتاب سے محروم ہو گئے ۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ مولانا کی رحلت کے بعد علامہ اقبال سے متعلق مرتب کردہ ڈائری پھر مفقود الخبر ہے اور اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا ۔

مولانا مہر کو جو دلچسپی مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور کارناموں سے تھی ، اس کا تقاضا تھا کہ وہ مولانا آزاد کی شخصیت و سوانح کو بھی اپنا موضوع بنائے ۔ اس موضوع پر وہ کام کا آغاز بھی کر چکے تھے اور اس کے چھ ابواب مکمل بھی ہو گئے تھے ۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"مولانا کے سوانح کا معاملہ مقتضی تھا کہ میں ہندوستان کا سفر کرتا ۔ کلکتہ ، بمبئی ، دہلی ، بھوپال ، لکھنؤ ، پٹنہ وغیرہ میں کچھ وقت گزارتا . . . افسوس کہ پاک و ہند کے حالات کی پیچیدگیوں نے ایسے کسی سفر کے لیے گنجائش نہ چھوڑی ـــ ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ مولانا کے متعلق کچھ لکھنا چاہیے ـــ اس سلسلے میں قدم اٹھا تو خاندانی حالات کے متعلق چار پانچ باب بے تکلف لکھے گئے ۔''[۲]

لیکن پھر حوالہ جات کی عدم فراہمی کے باعث یہ کام رک گیا اور مولانا مہر کے انتقال کے باعث تشنۂ تکمیل ہی رہا ۔ مولانا آزاد کے بارے میں ایک اور کام بھی ان کے پیشِ نظر تھا اور وہ یہ کہ مولانا آزاد کے سیاسی نظریات پر تفصیلاً روشنی ڈالی جائے ۔''[۳] اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مولانا آزاد کی اس شخصیت و سیرت کو اجاگر کیا جائے جو ''الہلال'' کے صفحات کے آئینے میں جلوہ گر ہوئی تھی اور جس نے دیکھتے ہی دیکھتے خبر سے راس کماری

۱۔ مکتوب بنام حمزہ فاروقی مرقومہ ، ۳ جولائی ۱۹۶۷ء ۔
۲۔ مکتوب بنام شیر بہادر پنی ، مشمولہ افاداتِ مہر ، ص ۲۵۸ ۔
۳۔ انٹرویو از یوسف طاہر ۔

لک کے مسلمانوں کے قلوب و اذہان کو مسحور کر لیا تھا ۔ اس سلسلے میں مولانا مہر کام کا آغاز تو نہیں کر سکے البتہ موضوع کی مناسبت سے اس زیر غور تصنیف کا نام ضرور تجویز کر لیا تھا اور وہ تھا ''مولانا آزاد ــ الہلال کے آئینے میں ۔''۱

مولانا مہر کو برصغیر میں سیاسی آزادی و بیداری پیدا کرنے والی تحریکات سے جو دلچسپی تھی ، اس کا اظہار سید احمد شہید ، جماعتِ مجاہدین ، سرگزشتِ مجاہدین کے علاوہ انقلاب ۱۸۵۷ع سے متعلق ان کی کتب سے بخوبی ہو جاتا ہے ۔ غالباً تحریکات آزادی سے دلچسپی کی بنا پر ایک زمانے میں انھوں نے شیرِ میسور سلطان فتح علی ٹیپو کی سوانح اور کارناموں پر کام شروع کیا تھا ۔ اس سلسلے میں مولانا مہر نے ضروری مواد بھی فراہم کر لیا تھا لیکن ان کا یہ منصوبہ بھی تشنۂ تکمیل ہی رہا ۔''۲

مولانا غلام رسول مہر کی عمر عزیز کا طویل حصہ صحافتی دنیا میں گزرا اور صحافی ہونے کے ناتے نہ صرف صحافت کے اسرار و رموز سے انھیں کامل آگہی تھی بلکہ سیاست و صحافت کے حوالے سے تحریکِ پاکستان اور اس کی تاریخ کا ایک ایک گوشہ بھی ان کے سامنے تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ روزنامہ زمیندار اور انقلاب میں شائع ہونے والے اپنے اداریوں کو اس انداز میں جمع کریں کہ اول تو مسائل کی بے جا تکرار نہ ہو، دوسرے وہ تحریکِ پاکستان کے بیشتر پہلوؤں کو بھی سامنے لے آئیں ۔ نیز مسائل و معاملات کے بارے میں مولانا مہر کا نقطۂ نظر بھی واضح ہو جائے ۔ انھوں نے زمیندار اور انقلاب کے کچھ اداریے مرتب بھی کر لیے تھے لیکن موت نے ان کو مہلت نہ دی کہ وہ اس کام کو مکمل کر سکتے ۔ بہر حال مقامات کی ترتیب کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

''احباب کو اصرار تھا کہ میں اپنے وہ مقالات بھی مرتب کروں جو ستائیس اٹھائیس سال تک 'زمیندار' اور 'انقلاب' کے لیے لکھے ۔ ان کا مرتب کر دینا مشکل نہ تھا ، لیکن آپ جانتے ہیں کہ روزانہ کے

۱۔ انٹرویو از محمد عالم مختارِ حق ۔
۲۔ انٹرویو از یوسف طاہر ۔

اداریوں میں بے شمار تکرار ہوگی اور مجموعہ بے لطف رہ جائے گا۔ سوچ کر ایک طریقہ نکالا یعنی گزشتہ پچاس سال کے مسائل کو موضوع بنایا اور ان مسائل کے متعلق متفرق مقالات جمع کر دیے . . . اس طرح ۱۹۲۲ع سے ۱۹۳۹ع تک تمام اہم مسائل کی تاریخ بھی مرتب ہو جائے گی۔"[۱]

صحافت سے تعلق کی بنا پر مولانا مہر یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ صحافت کے آغاز و ارتقاء کی ایک ایسی تاریخ مرتب کریں جس سے برصغیر میں اردو صحافت کے عہد بہ عہد ارتقاء کی داستان سامنے آ جائے۔ اس سلسلے میں بھی وہ کام شروع کر چکے تھے۔"[۲] مولانا مہر کی اپنی ذات و شخصیت سے تعلق رکھنے والے موضوعات میں سب سے اہم خود ان کی اپنی سوانح حیات تھی جسے وہ داستانِ مہر نہیں بلکہ "داستانِ آفاق" کہا کرتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اپنی خود نوشت سوانح حیات کو اس انداز میں ضبطِ تحریر میں لائیں کہ اس طویل دور کی تمام تحریکیں بھی اپنے حقیقی خد و خال کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آ جائیں اور ان تحریکوں سے وابستہ افراد و شخصیات بھی اپنے حقیقی دائرۂ عمل کے ساتھ متعارف ہو جائیں۔ ایک خط میں اپنی سوانح لکھنے کے بارے میں رقم‌طراز ہیں :

"اپنے حالات لکھوں تو کیونکر ؟ لکھنا شروع کر دوں تو ختم کون کرے گا ؟ ایک دنیا دیکھی ہے ، اس کے تصورات دماغ میں تازہ ہیں۔ ہر حصہ ایک جلد کا طلب گار ہے۔ مختلف کاموں سے فرصت ملے تو ایک تیز لکھنے والا ملازم رکھوں اور بولتا جاؤں۔"[۳]

در اصل مولانا اپنے سوانح سے زیادہ اپنے عہد کی تاریخ لکھنے کے خواہاں تھے۔ اپنے اس ارادے کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"میں خود اپنی کتاب جلد شروع کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ تاریخ ہوگی اور اس کا آغاز ۱۹۰۱ع سے ہوگا تاکہ اسلامی سیاست کے نشیب و فراز

۱۔ مکتوب بنام شیر بہادر پنی ، مشمولہ افاداتِ مہر ، ص ۲۵۳۔

۲۔ انٹرویو از محمد عالم مختارِ حق۔

۳۔ مکتوب بنام حمزہ فاروقی ، مرقومہ ۳۰ اگست ۱۹۶۹ع۔

بہتر صورت میں واضح ہو جائیں اور ہر شخص پر آشکارا ہو جائے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہم نے احیا و نشاۃ الثانیہ کا سفر کن حالات میں شروع کیا تھا اور کن کن منازل سے گزرتے ہوئے کہاں پہنچے ۔''۱

اپنی زندگی کے آخری تین چار برسوں میں مولانا مہر سراج الدین علی خاں آرزو کے تذکرے ''مجمع النفائس'' کو مرتب کر رہے تھے ۔ یوسف طاہر نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ اس کام میں وہ بھی مولانا مہر کے معاون کی حیثیت سے شریک تھے ۔ اس سلسلے کی دو جلدیں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھیں لیکن پھر یہ کام جاری نہ رہ سکا ۔

ان تمام کتب اور تشنۂ تکمیل منصوبوں کے علاوہ مولانا مہر کی کچھ اور کتابوں کا تذکرہ بھی یہیں مناسب رہے گا ۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو نصابی کتب کے طور پر تحریر کی گئیں ۔ اپنی نصابی کتب کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

''ان کتابوں کے علاوہ جن کی فہرست بھیج رہا ہوں ، تیس پینتیس کے قریب کتابیں طلبا کے نصاب کے لیے بھی لکھیں ۔''۲

مولانا کی نصابی کتب کی تعداد یقینی طور پر تیس پینتیس نہیں بنتی لیکن اگر ان کی بعض کتابوں کے مختلف حصوں کو الگ الگ کتب تصور کر لیا جائے تو یہ شمار درست قرار پاتا ہے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا کی بعض کتابیں مثلاً ''مشاہیر عالم'' اور ''نصابِ دینیات'' وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جو ایک ہی موضوع پر لکھی گئی ہیں ، لیکن ان کے مختلف جماعتوں میں پڑھائے جانے والے حصے الگ الگ شائع ہوئے ۔ مثلاً ''مشاہیر عالم'' کے تین مختلف حصے یہ تھے : (۱) مشاہیر عالم برائے جماعت سوم (۲) مشاہیر عالم برائے جماعت چہارم (۳) مشاہیر عالم برائے جماعت پنجم ۔ اگر ان الگ الگ حصوں کو جداگانہ کتب تصور کر لیا جائے تو تعداد تیس پینتیس کے شمار سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے ۔

۱- مکتوب بنام ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ، مرقومہ ۱۴ جنوری ۱۹۵۴ء ، مطبوعہ چٹان لاہور ، ۴ جون ۱۹۷۲ء ۔

۲- مکتوب بنام مشفق خواجہ ، مرقومہ ۱۴ جنوری ۱۹۶۷ء ۔

مولانا مہر کی نصابی کتب کے بارے میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ ان کی بعض نصابی کتابیں ایسی بھی ہیں جو بعد ازاں ان کے دائرۂ افادیت کے باعث مستقل کتب کے طور پر شائع کر دی گئیں ۔ مثلاً "سرور عالم" اور "مختصر تاریخِ اسلام" ۔ نصابی کتب کی تفصیلی فہرست ذیل میں درج ہے :

۱- تاریخِ ہندوستان ، از خواجہ محمد اشرف ، ٹی خوشحال سنگھ اور مولانا مہر کی مشترکہ تصنیف ، ۱۹۴۴ع -

۲- مشاہیر ، پانچ حصے برائے جماعت ششم ، ہفتم ، ہشتم ، نہم اور دہم ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، ۱۹۵۰ع -

۳- آئینۂ معلومات ، دو حصے برائے جماعت چہارم و پنجم ، پاکستان ٹائمز پریس لاہور ، ۱۹۵۱ع -

۴- بہار ادب ، تین حصے ، برائے جماعت ششم ، ہفتم ، ہشتم ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، ۱۹۵۱ع -

۵- پاک شہریت ، تین حصے ، برائے جماعت ششم ، ہفتم ، ہشتم ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، ۱۹۵۱ع -

۶- شہریت ، تین حصے ، برائے جماعت ششم ، ہفتم ، ہشتم ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، ۱۹۵۱ع -

۷- مشاہیر عالم ، تین حصے ، برائے جماعت سوم ، چہارم ، پنجم ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، ۱۹۵۱ع -

۸- نصابِ دینیات ، چھ حصے ، برائے جماعت سوم ، چہارم ، پنجم ، ششم ، ہفتم ، ہشتم ، ۱۹۵۱ع -

۹- تاریخِ پاکستان و ہند ، تین حصے ، برائے جماعت ششم ، ہفتم ، ہشتم ، ۱۹۵۲ع -

۱۰- رسول کریم ، ۱۹۵۲ع -

۱۱- قرآن آموز قاعدہ ، ۱۹۵۲ع -

۱۲- تاریخِ پاکستان و ہند ، برائے جماعت نہم و دہم ، ۱۹۵۵ع -

۱۳- اردو کی آٹھویں کتاب ، برائے جماعت ہشتم ، ۱۹۶۲ع -

۱۴- معاشرتی علوم ، حصہ چہارم ، برائے جماعت ہشتم ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، ۱۹۶۳ع -

۱۵- معاشرتی علوم ، حصہ تاریخ ، برائے جماعت نہم و دہم ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، ۱۹۶۴ع -

۱۶- متبادل آسان اردو نصاب ، برائے سیکنڈری سکول سرٹیفیکیٹ ، نیشنل ٹیکسٹ بک کارپوریشن ، ۱۹۶۴ع -

۱۷- راہِ سعادت ، تین حصے ، برائے جماعت ششم ، ہفتم ، ہشتم ، ت ۔ ن ۔

۱۸- راہِ ہدایت ، دو حصے ، برائے جماعت ششم و ہفتم ، سر رشتۂ تعلیم کراچی ، ت ۔ ن ۔

آخر میں چند ایسی کتابوں کا ذکر بھی کر دینا چاہیے جن کی تصنیف و تالیف یا ترتیب و اشاعت کے سلسلے میں مولانا مہر نے کوئی حصہ نہیں لیا اور صرف نظرثانی یا مقدمہ لکھ دینے کے باعث ان کا نام مصنف کے طور پر شائع ہو گیا ۔ اس سلسلے میں "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" ، "سیرت النبی ابن ہشام" ، "مکتوباتِ سعد اللہ خاں" ، "اسلامی فنون کی داستان" ، "دیوانِ غالب فارسی" ، "سورۂ یوسف کی تفسیر الجمال و الکمال" ، "تاریخ فرشتہ کا اردو ترجمہ" اور "عظماء کے معاشی نظریات" وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ ان کتابوں میں مولانا مہر کا کام بہت معمولی ہے ۔ اس بنا پر ان کو مولانا مہر کی تصانیف و تالیفات سمجھنا درست نہیں ۔ مثلاً وہ خود "عظماء کے معاشی نظریات" کے بارے میں لکھتے ہیں :

"عظماء کے معاشی نظریات کسی کی کتاب تھی ۔ مجھ سے اس کی تصحیح کرائی گئی تھی اور چھاپا بھی کسی نے تھا ۔"[۱]

۱- مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق (تاریخ درج نہیں ۔ قیاس ہے کہ یہ ۲ اپریل اور ۲۰ مئی ۱۹۶۵ع کے درمیان کا خط ہے) -

دیوانِ غالب فارسی کا معاملہ اس سے بھی دلچسپ ہے لیکن اس بحث کے لیے یہ موقع مناسب نہیں۔ چھٹے باب میں اس پر سیر حاصل تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔

سیرتِ امام ابنِ تیمیہ :

"سیرتِ امام ابنِ تیمیہ" کو مولانا مہر کی دیگر تصانیف پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ مولانا کی پہلی کتاب ہے، اگرچہ اسے انھوں نے مستقل کتاب کے طور پر تصنیف نہیں کیا تھا اور نہ اسے الگ چھپوانے کا ارادہ تھا۔ سیرت امام ابنِ تیمیہ کی تصنیف کے محرکات اور الگ کتابی شکل میں اشاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مہر نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے :

> "میں نے سب سے پہلے "غالب" چھاپی (۱۹۳۶ء)۔ اس سے پیشتر مولوی عبد العزیز مرحوم مالک الہلال بک ایجنسی نے امام ابنِ تیمیہ کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ کرایا تھا اور اس کے مقدمے کے لیے مجھ سے کہا تھا۔ یہ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے۔ میں حجاز جا رہا تھا (اکتوبر ۱۹۲۵ء)۔ جلدی میں مقدمہ لکھا جو خاصا طویل ہو گیا۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں حجاز سے واپس آیا۔ ایک روز کے لیے بمبئی میں ٹھہرا۔ شرف الدین اینڈ سنز کے ہاں کتابیں دیکھنے گیا تو انھوں نے "امام ابنِ تیمیہ" نام ایک کتاب دکھائی جو مولوی عبد العزیز مرحوم نے چھاپی تھی اور یہ وہی میرا مقدمہ تھا جسے مرحوم نے الگ کتاب کی صورت میں چھاپ دیا تھا۔ . . . مطلب یہ کہ پہلی کتاب وہی ہے اگرچہ وہ مستقل کتاب کے طور پر نہیں لکھی گئی۔ اس صورت میں "غالب" دوسری ہے۔"[1]

جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے سیرت امام ابنِ تیمیہ جلدی میں تصنیف کی گئی تھی۔ اس بنا پر اس میں کچھ غلطیاں بھی رہ گئیں۔ کتاب کی ان خامیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق، مرقومہ ۲۵ جنوری ۱۹۸۷ء، غیر مطبوعہ۔

''وہ دراصل ایک ترجمہ شدہ کتاب کا مقدمہ تھا اور اس وقت مجھے امام موصوف کے حالات بالتفصیل معلوم نہ تھے۔ صرف عقیدت کی بنا پر مقدمہ لکھا اور میں حجاز چلا گیا۔ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ مولوی عبد العزیز مرحوم نے اسے الگ چھاپ دیا ہے۔ غلطیاں بھی رہ گئیں۔''[۱]

مولانا چاہتے تھے کہ ''سیرتِ امام ابنِ تیمیہ'' میں جو غلطیاں اور کوتاہیاں رہ گئی ہیں ان کی تصحیح کر دی جائے لیکن پھر مولوی عبد العزیز مرحوم کا انتقال ہو گیا اور یہ سلسلہ جوں کا توں رہ گیا۔''[۲]

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ''سیرتِ امام ابنِ تیمیہ'' پہلی بار ۱۹۲۵ء میں الہلال بک ایجنسی لاہور نے کریمی پریس سے طبع کرا کے ۱۰۰۰ کی تعداد میں شائع کرائی تھی۔ اس کے لیے عام اخباری کاغذ استعمال کیا گیا تھا جبکہ طباعت کا انتظام مناسب تھا۔

غالب :

اس میں مولانا مہر نے خود مرزا غالب کے خطوط میں موجود آثار سے کام لے کر ان کے مفصل سوانحی حالات مرتب کیے ہیں۔ پہلی مرتبہ ۱۳۵۵ھ بمطابق ۱۹۳۶ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اگر ''سیرتِ امام ابنِ تیمیہ'' کو ایک مستقل کتاب تصور نہ کیا جائے تو ''غالب'' مولانا مہر کی پہلی کتاب قرار پاتی ہے۔ غالباً اسی لیے وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میں نے سب سے پہلے ''غالب'' چھاپی (۱۹۳۶ء)۔''[۳]

''غالب'' کا پہلا ایڈیشن با تصویر شائع کیا گیا تھا لیکن بعد کے ایڈیشنوں میں سے تصویریں تو حذف کردی گئیں البتہ مولانا ابوالکلام آزاد کی وہ تحریریں اور آراء، جو انھوں نے ''غالب'' سے متعلق وقتاً فوقتاً تحریر کی تھیں اور جو

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق (تاریخ درج نہیں)، غیر مطبوعہ۔
۲۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق (۲۷ اپریل اور ۲۰ مئی ۱۹۶۵ء کے درمیان کا خط) غیر مطبوعہ۔
۳۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق، مرقومہ ۲۵ جنوری ۱۹۶۵ء، غیر مطبوعہ۔

بعد ازاں ''نقش آزاد'' میں بھی شامل کی گئی تھیں ، جابجا موقع محل کے مطابق ''غالب'' کے حاشیوں میں درج کر دی گئیں جن کے باعث کتاب کی افادیت میں گراں قدر اضافہ ہوا ۔

''غالب'' کا پہلا ایڈیشن شیخ مبارک علی لاہور نے شائع کرایا تھا ۔ چوتھا ایڈیشن بھی انھوں نے ہی عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا ۔ اس اشاعت کے لیے کتابت و طباعت کا بہترین انتظام کیا گیا تھا البتہ کاغذ قدرے میلا ہے ۔

سیاسیاتِ اسلامیانِ ہند :

''سیاسیاتِ اسلامیانِ ہند'' کوئی مستقل کتاب ہونے کی بجائے ۶۸ صفحات کا ایک رسالہ ہے جس کی تصنیف کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں :

''افسوس کہ سیاسیات کی ایک ہی کاپی میرے پاس رہ گئی ۔ کوئی ٹائپسٹ مل جائے تو ٹائپ کرا لوں . . . . پچھلے دنوں سید حسام الدین راشدی کراچی سے آئے اور بتایا کہ اس کا مسودہ ان کے پاس محفوظ ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ جب بیرونی اسلامی دنیا میں پروپیگنڈے کا فیصلہ ہوا تو سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم نے مجھ سے کہا کہ پہلا کتابچہ تم لکھ دو ۔ میں اسی زمانے میں ایک آدھ مہینے کے لیے پہاڑ پر گیا ہوا تھا ۔ وہاں بیٹھے بیٹھے قلم برداشتہ لکھا اور مسودہ سیٹھ کو کراچی بھیج دیا ۔ سید حسام الدین راشدی کے بڑے بھائی نے یہ رسالہ چھپوایا اور مسودہ سید حسام الدین کے پاس رہ گیا ۔''[1]

جیسا کہ مولانا مہر کے مندرجہ بالا مکتوب کے اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے ، سیاسیاتِ اسلامیانِ ہند آل انڈیا مسلم لیگ کراچی کے دفتر خارجہ کے ایماء پر تحریر کیا گیا تھا ۔ مقصود یہ تھا کہ بیرونی اسلامی دنیا تک مسلم لیگ کی آواز پہنچائی جائے ۔ اس لیے رسالے کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرایا گیا ۔ غالباً یہ تراجم کراچی میں سید علی محمد راشدی کی نگرانی میں طبع ہوئے ، جیسا کہ خط

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، مرقومہ ۷ جون ۱۹۶۷ع ، غیر مطبوعہ ۔

سے بھی ظاہر ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ جو رسالہ[1] اردو زبان میں شائع ہوا ، وہ مولانا عبدالمجید سالک نے ۱۱ جولائی ۱۹۳۹ع کو مسلم پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا ۔

آزادی کی جنگ :

''آزادی کی جنگ'' مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے ۔ اس کتاب میں جنگِ عظیم اول کے بعد یورپ میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات سے اس طرح بحث کی گئی ہے کہ جنگِ عظیم دوم کے تقریباً تمام اسباب و علل کھل کر سامنے آ جاتے ہیں ۔

''آزادی کی جنگ'' ملک احسان الٰہی نے تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے دی پاپولر پبلشنگ ہاؤس لاہور سے شائع کرائی ۔ کتاب پر نہ تو اس کی قیمت درج ہے اور نہ ہی سنہ اشاعت تحریر کیا گیا ہے ۔ البتہ کتاب کا مقدمہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''آزادی کی جنگ'' ۱۹۴۰ع میں شائع ہوئی ہوگی کیونکہ مقدمہ نگار متحدہ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں کے دستخطوں کے ساتھ یہی سال درج ہے ۔

جوزیفین :

۱۹۴۷ع کے فسادات نے شدت اختیار کی تو لاہور بھی ان فسادات کی زد میں آیا اور یہاں کے شہریوں کے لیے گھر سے باہر نکلنا نا ممکن ہو گیا ۔ مولانا مہر بھی ان دنوں گھر کی چاردیواری میں محبوس ہو کر رہ گئے ۔ چونکہ اس عرصے میں اخباری اور صحافتی مشغولیتوں سے فرصت مل گئی تھی ، لہذا وہ اپنی بعض نامکمل کتب کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوئے ۔ لیکن ہمہ وقت ایک ہی کام میں مصروف رہنا بھی بہت مشکل تھا ۔ لہذا مولانا کو خیال آیا کہ اس عرصے میں نپولین بونا پارٹ کی پہلی بیوی ''جوزیفین'' کی سوانح عمری لکھی جائے ۔ ''جوزیفین'' ان کی اسی خواہش کا نتیجہ ہے ۔

ابتدا میں کتاب چھپوانے کا ارادہ نہیں تھا لیکن پھر ۱۹۵۰ع میں شیخ نیاز احمد نے اپنے اتحاد پریس بل روڈ لاہور سے طبع کرا کے شائع کر دیا ۔

۱۔ اس کی ایک فوٹو سٹیٹ نقل راقم کے پاس محفوظ ہے ۔

مختصر تاریخِ اسلام :

"مختصر تاریخِ اسلام" مولانا غلام رسول مہر کی ایسی کتاب ہے جس کے مطالعے سے اسلامی تاریخ کا ہر دور نہایت اختصار لیکن جامعیت سے سامنے آ جاتا ہے۔ اسے مولانا مہر نے بچوں کےلیے تصنیف کیا تھا۔ غالباً اسی لیے محمد یوسف طاہر نے مولانا مہر پر اپنے مقالے میں اسے نصابی کتب کے دائرے میں شامل کیا ہے۔

"مختصر تاریخِ اسلام" کے اب تک دو ایڈیشن آئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں، دوسرا ۱۹۶۲ء میں چھپا۔"[۱] دونوں ایڈیشن شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کیے۔

سید احمد شہید :

"سید احمد شہید" کے مقدمے اور انتساب میں مہر صاحب لکھتے ہیں کہ اس موضوع پر لکھنے کی تحریک مولانا محمد بشیر شہید نے کی تھی، جب مولانا مہر ۱۹۳۴ء میں افغانستان گئے ہوئے تھے۔ مولانا محمد بشیر نے، جو خود جماعتِ مجاہدین کے سرگرم کارکن رہ چکے تھے، مولانا مہر سے عہد لیا تھا کہ وہ سیرتِ شہید اور ان کے روشن کارناموں پر ایک مفصل و مبسوط کتاب معرضِ تحریر میں لا کر ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کریں گے جو غیروں کے مفادات اور اپنوں کی ستم رالیوں کے باعث اس عظیم شخصیت کے بارے میں پیدا ہو گئی ہیں۔ مہر صاحب نے یہ عہد نبھانے کے لیے بیس برس محنت کی اور آخرکار وہ تمام نقوش جمع کر لیے جن کی روشنی میں ہم سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کے کارناموں کی اہمیت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

مصنف کا مقدمہ دیکھنے سے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۲ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس خیال کا سبب وہ دستخط ہیں جو مقدمے کے آخر میں موجود ہیں اور جن کے ساتھ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۲ء کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "سید احمد شہید" پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو سکی۔ اس کتاب کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

۱۔ مولانا غلام رسول مہر، از محمد یوسف طاہر، ص ۹۷۔

"سید صاحب کے سوانح حیات مطبع کے حوالے ہو گئے ۔ امید ہے کہ دو مہینے میں کتاب چھپ جائے گی ۔ یہ ہمارے دور زوال کا ایک عجیب و غریب باب ہے ۔ اغلب ہے کہ اس دور کی صحیح تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک حد تک مشعلِ راہ کا کام دے ۔"[1]

اگرچہ سید احمد شہید کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ع میں شائع ہوا لیکن مولانا مہر کوشش کرتے رہے کہ جس حد تک بھی ممکن ہو اسے خوب سے خوب تر بنایا جائے اور نئے مآخذ کی روشنی میں اس میں پیش کردہ واقعات و حقائق کا جائزہ لیا جاتا رہے ۔ لیکن سید احمد شہید کا دوسرا ایڈیشن بھی کسی ترمیم و اضافے کے بغیر شائع ہوا ۔ البتہ تیسرے ایڈیشن میں کچھ ترمیمات کی گئیں ۔ اس امر کے بارے میں وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"سید احمد شہید کے تیسرے ایڈیشن کے لیے میں نے کچھ ترمیمات کر رکھی تھیں اگرچہ زیادہ نہ تھیں ۔"[2]

اسی طرح آئندہ ایڈیشن کے بارے میں ترمیمات و اضافوں سے متعلق ایک اور خط میں رقم طراز ہیں :

"سید شہید کے سوانح کئی مرتبہ پہلے ایڈیشن کے مطابق چھپے ۔ اب میں نے اُس میں جابجا تبدیلیاں کیں ۔"[3]

غالباً اسی ایڈیشن کا ذکر کرتے ہوئے ابو سلمان شاہجہانپوری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"سید احمد شہید کے سلسلے میں اس مرتبہ ایک نیا ماخذ ملا . . . . پوری کتاب از سر نو لکھوائی ۔ کاپیاں دیکھیں ، پروف دیکھے ۔ وہ ابھی پریس میں ہے ۔"[4]

۱۔ مکتوب بنام عاشق حسین بٹالوی ، مرقومہ ۱۴ فروری ۱۹۵۴ع ، غیر مطبوعہ ۔
۲۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۷ اگست ۱۹۶۵ع ، غیر مطبوعہ ۔
۳۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ۔ تاریخ درج نہیں البتہ قیاس ہے کہ ۱۹۶۷ع کا خط ہے ۔
۴۔ مکتوب بنام ابو سلمان شاہجہانپوری ، مرقومہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۸ع ، غیر مطبوعہ ۔

بہر حال تیسرا ایڈیشن متعدد اضافوں اور ترامیم کے ساتھ ۱۹۶۸ع میں شائع ہوا۔

سید احمد شہید پہلے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی لیکن اب ان دونوں جلدوں کو یکجا کر دیا گیا تھا جس کے کل ۸۶۲ صفحے تھے، البتہ کتاب کو یکجا کر دینے کے باوجود دونوں حصوں کو الگ الگ برقرار رکھا گیا۔ حصہ اول جو کہ التالیس ابواب اور ۳۷۷ صفحات پر مشتمل ہے، سید صاحب کے آباء و اجداد، ان کے خاندان، پیدائش، تعلیم و تربیت، دعوتِ اصلاح کا آغاز اور سفر حج وغیرہ کے علاوہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں بعض ابتدائی معرکوں اور جنگوں تک کے حالات پر روشنی ڈالتا ہے۔ جبکہ دوسرا حصہ، جو چھیالیس ابواب اور ۴۵۲ صفحوں پر محیط ہے، ہزارہ کے محاذ سے لے کر سید صاحب کی شہادت اور ان کے اخلاف، ازدواج و اولاد اور اخلاق و عادات کے بیان کے لیے وقف کیا گیا ہے۔

جماعتِ مجاہدین :

"جماعتِ مجاہدین" اس سلسلے کی دوسری کتاب ہے[1] جس میں سید احمد شہید کے سوانح اور کارناموں کے علاوہ ان کی قائم کردہ تنظیم، اس کے نظم و نسق، طریقِ کار اور سید احمد شہید کے رفقاء اور ساتھیوں کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ جماعتِ مجاہدین کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس میں پیش کردہ مواد یعنی تنظیم اور اس کے طریقِ کار سے واقفیت کے بغیر شاید سید احمد شہید کے حالات جان لینے سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے تھے جو اس سارے سلسلے کی تدوین کا بنیادی محرک تھے، یعنی اس روح کو بے نقاب کرنا جو ہندوستان کی آزادی اور اسلامی نظام کے نفاذ کی تڑپ رکھتی تھی اور جس نے وسائل نہ ہونے کے باوجود دیکھتے ہی دیکھتے اندرونِ ہند میں ایک انقلاب کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ یہ مقاصد جماعتِ مجاہدین ہی سے حاصل ہوئے۔

۱۔ مولانا مہر نے جماعتِ مجاہدین کے پہلے ایڈیشن کے سر ورق پر اسے اس سلسلے کی تیسری کتاب قرار دیا ہے۔ اس معمولی اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ "سید احمد شہید" کی دو جلدوں کو دو الگ الگ کتابیں تصور کرتے تھے حالانکہ بعد ازاں انہوں نے خود ان دونوں جلدوں کو یکجا کر کے شائع کرایا۔

جیسا کہ مصنف کے مقدمے کے آخر میں دستخطوں کے ساتھ درج تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے ، جماعتِ مجاہدین کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آیا ۔ اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن اور بھی آئے لیکن کسی ایڈیشن پر سنہ اشاعت اور تعداد اشاعت وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج نہیں کی گئیں ۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ سب ایڈیشن شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کراکے شائع کرائے ۔ ہر ایڈیشن کے لیے طباعت و کاغذ کا مناسب اہتمام کیا گیا اور کتاب کو رنگین گرد پوش کے ساتھ مجلد شائع کیا گیا ہے ۔

"جماعتِ مجاہدین" کا آخری ایڈیشن جس پر سنہ طباعت درج نہیں ، کل ۳۱۲ صفحات ، ۴۶ ابواب اور دو حصوں میں منقسم ہے ۔ فہرستِ ابواب اور مصنف کے مقدمے کے لیے وقف کیے گئے صفحات بھی اسی شمار میں شامل ہیں ۔ پہلا حصہ تنظیم کے اغراض و مقاصد ، اس کے طریقِ کار اور اس کی بدولت افراد و شخصیات میں آنے والے انقلاب کو نمایاں کرتا ہے ۔ یہ حصہ اگرچہ کل ۱۴ ابواب پر مشتمل ہے لیکن موضوع کی مناسبت سے اپنے اختصار کے باوجود قابلِ توجہ ہے ۔

دوسرا حصہ کل ۳۲ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں مختلف اکابر اور جماعت سے وابستہ افراد کی سوانح و شخصیت کو پیش کیا گیا ہے ۔ لیکن یہاں پر یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ جماعتِ مجاہدین میں صرف ان اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے جو جماعت میں شامل ہونے کے باوجود سید احمد شہید سے اتنے قریب نہیں تھے کہ ان کی شہادت کے بعد بھی اس مشن کو جاری رکھ سکتے ۔ البتہ بعض ایسے لوگوں کا ذکر ضرور ہے جو سید احمد شہید کی زندگی میں یا پھر بالاکوٹ کے معرکے میں ان کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے ۔ اس سلسلے میں خود مولانا مہر "جماعتِ مجاہدین" کے سرورق پر رقم طراز ہیں :

". . . ان اکابر رفقاء کے سوانح حیات جو سید صاحب کی زندگی میں یا ان کے ساتھ شہید ہوئے یا جنھوں نے بعد ازاں جہاد میں کوئی حصہ نہ لیا ۔"

سرگزشتِ مجاہدین :

"سرگزشتِ مجاہدین" سید احمد شہید کے سلسلے کی آخری کتاب ہے جیسا کہ خود مولانا مہر اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں :

"سید احمد شہید کے سلسلے کی یہ تیسری اور آخری کتاب ہے۔ اس پر وہ سفر اختتام کو پہنچا، جس کے لیے سرو سامان اور تگ و تاز میں میری زندگی کے کم و بیش بیس سال صرف ہوئے۔"[1]

سرگزشت مجاہدین پہلی بار ۱۹۵۶ء میں علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کے ایک دو ایڈیشن اور بھی چھپے جو سب کے سب شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کیے ہیں۔

سرگزشت مجاہدین ۶۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔[2] اس شمار میں نفس مضمون کے علاوہ مولانا مہر کا مقدمہ بھی شامل ہے اور وہ صفحہ بھی جس پر علامہ اقبال کے دو فارسی شعر درج کیے گئے ہیں۔ صفحہ تیرہ سے فہرست مضامین شروع ہوتی ہے جو تقریباً چھ صفحوں پر محیط ہے۔

سرگزشت مجاہدین کو کل سات (۷) حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ سید احمد شہید کی بالا کوٹ میں شہادت کے بعد نظامِ جہاد کو نئے سرے سے منظم کرنے والے اصحاب عزیمت شیخ ولی محمد اور مولوی نظیر الدین منگلوری کے ذکر سے شروع ہوکر ان کی شہادت تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلا حصہ کل اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

دوسرے حصے میں کل چودہ باب ہیں، جن میں مولوی سید نصیر الدین دہلوی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ تیسرے حصے میں مولانا ولایت علی اور

۱۔ سرگزشت مجاہدین، از مولانا مہر، ص ۷، مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور۔

۲۔ مختلف ایڈیشنوں کے ساتھ صفحات کی یہ تعداد بھی متغیر ہو جاتی ہے۔ مثلاً آخری ایڈیشن میں شائع ہونے والی سرگزشت مجاہدین کے صفحات کی تعداد ۶۶۴ ہے۔ مندرجہ بالا شمار پہلے ایڈیشن سے متعلق ہے۔

مولانا عنایت علی کے کارناموں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ تیرہ ابواب پر مشتمل یہ حصہ ستھالہ کیمپ کی تباہی و بربادی تک کے ذکر پر محیط ہے۔ جب کہ چوتھے حصے میں مولانا عبداللہ کے دورِ امارت کا تذکرہ ہے۔ آٹھ ابواب پر مشتمل یہ حصہ مولانا عبداللہ صاحب کے امیر بننے سے لے کر جنگ امبیلہ تک کے حالات بیان کرنے کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ جب کہ پانچویں حصے میں ہندوستان کے اندر جہاد کے لیے کام کرنے والے مجاہدین کے حالات اور ان کے خلاف حکومت کی کاروائیوں کا تفصیل سے ذکر ہے۔ تیرہ ابواب پر مشتمل اس حصے میں تین قابلِ ذکر مقدمات، مقدمہ انبالہ، اور عظیم آباد میں قائم ہوئے والے مجاہدین کے خلاف دو مقدموں کا تذکرہ ہے۔

چھٹے حصے میں جنگ امبیلہ سے لے کر مجاہدین کے آخری کارناموں تک کا ذکر ہے اور پندرہ ابواب پر مشتمل یہ حصہ متفرق و مختلف شخصیات کے حالات سامنے لانے کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ اسی طرح ساتویں حصے میں، جو آٹھ ابواب پر محیط ہے، اندرونِ ہند اور میدانِ جہاد میں سرگرم مجاہدین کی اعانت و امداد کرنے والوں کا تفصیلی ذکر ہے۔

۱۸۵۷ء:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر سو سال بیت چکے تھے، لیکن ابھی تک کوئی ایسی تحریر منظر عام پر نہ آ سکی تھی جو ہندوستان کی آزادی اور غیر ملکی و سامراجی تسلط کے خلاف لڑی جانے والی اس آخری جنگ کے واقعات کو بے کم و کاست اور بلا مبالغہ لیکن تعصبات و مصلحتوں کے گرد و غبار سے پاک کرکے پیش کر سکتی۔ یوں تو اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی تھیں، لیکن انگریزوں نے اپنی تصانیف میں اس جنگ کو بہ طورِ غدر ثابت کرنے اور اپنے ظلم و استبداد کا جواز پیدا کرنے کے لیے ہر طرح کی تاریخی بد دیانتی کو جائز سمجھتے ہوئے صورت واقعات کو بالکل مسخ کر دیا تھا، جب کہ ہندوستانی مصنفین اور مورخین بالخصوص مسلمانوں نے حالات بدل جانے کے باعث مجاہدین کے پسماندگان کو انگریزی عتاب سے محفوظ کرنے کے لیے جان بوجھ کر واقعات کو صحیح رنگ میں پیش کرنے سے احتراز کیا۔ اگر کچھ کتب اس موضوع پر تحریر کی بھی گئی تھیں، تو وہ اُردو میں نہیں تھیں۔ البتہ چند در چند وجوہات کے پیشِ نظر اور مجاہدوں کو خراج تحسین و عقیدت

پیش کرنے کے لیے یک گونہ مشکلات کے باوجود غلام رسول مہر نے ۱۸۵۷ع کے خونیں معرکے کی تفصیلات مرتب کرنا شروع کیں ، جس کے نتیجے میں ۱۸۵۷ع — پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی" معرض تحریر میں آئی ۔

پہلا ایڈیشن دیکھنے سے اندازہ نہیں ہوتا کہ "۱۸۵۷ع — پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی" پہلی بار کب شائع ہوئی اور پہلی مرتبہ اس کی تعداد اشاعت کیا تھی ۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اسے کتاب منزل لاہور نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا تھا ۔ ۱۹۷۷ع میں اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا ، جسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا اور کتاب کی قیمت ۲۵/۰ روپے مقرر کی گئی ۔ اس کے لیے بہتر کاغذ اور عمدہ طباعت کا اہتمام کیا گیا ۔ جلد بھی مضبوط ہے ۔

چوتھا ایڈیشن کل آٹھ حصوں اور ۴۶۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ صفحات کی اس تعداد میں ضمیموں اور فہرست ابواب اور مصنف کے مقدمے کے لیے وقف کیے گئے صفحات بھی شامل ہیں ۔

"اٹھارہ سو ستاون — پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی" کا پہلا حصہ جو تقریباً ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے ، جنگ آزادی کا پس منظر سامنے لانے کے لیے وقف کیا گیا ہے ، جب کہ دوسرے حصے میں جنگ آزادی کے آغاز اور میرٹھ میں بھڑکنے والی اس چنگاری کا ذکر ہے جو بعد ازاں ایک آتش فشاں کی شکل اختیار کر گئی ۔ تیسرا ، چوتھا ، پانچواں ، چھٹا اور ساتواں حصہ ہندوستان کے مختلف علاقوں اور صوبوں مثلاً دہلی و اطراف دہلی ، صوبہ غرب و شمال اور اودھ ، بنگال ، بہار اور اڑیسہ ، وسط ہند اور راجپوتانہ اور پنجاب و سرحد میں جنگ آزادی کے دوران رونما ہونے والے واقعات ، مجاہدین کے کارناموں اور انگریزی استبداد کی کیفیت بیان کرنے کے لیے وقف کیا گیا ہے ۔ آٹھویں یعنی آخری حصے میں بطور حرف آخر جنگ آزادی کا انجام سامنے لایا گیا ہے اور اسی حصے میں دو ضمیمے شامل کیے گئے ہیں ۔

۱۸۵۷ع کے مجاہد :

"۱۸۵۷ع کے مجاہد" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ، جس کے ذریعے مولانا مہر نے ۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی کے واقعات اور انگریزی استعمار کے

تسلط کے خلاف جہاد کرنے والے صاحبانِ عزیمت و ہمت کے ولولہ انگیز کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔

جیسا کہ مقدمے میں مولانا مہر نے خود ہی صراحت کر دی ہے کہ پہلے سے اس کتاب کو لکھنے کا ارادہ نہیں تھا، بلکہ ان کا خیال تھا کہ ۱۸۵۷ء میں ہی جنگ آزادی کے مجاہدین کے سوانحی حالات کا بھی تذکرہ کر دیا جائے گا۔ لیکن بعد ازاں اندازہ ہوا کہ "۱۸۵۷ء" میں جو اول تا آخر ایک تاریخی کتاب ہے، مجاہدین کے سوانحی حالات پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ اسی سے ان کے دل میں خیال آیا کہ "۱۸۵۷ء کے مجاہد" کے نام سے ایک الگ کتاب اس اہم کام کے لیے مخصوص کی جائے۔

"۱۸۵۷ء کے مجاہد" کے اب تک تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں، دوسرا ۱۹۶۰ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۱ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ تینوں ایڈیشن علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے کتاب منزل لاہور نے شائع کیے۔ تیسرے ایڈیشن کی قیمت بارہ روپے مقرر کی گئی اور اس کے لیے طباعت و اشاعت اور کاغذ کا خصوصی اہتمام کیا گیا اور اسے جاذب نظر گرد پوش کے ساتھ مجلد شائع کیا گیا۔

"۱۸۵۷ء کے مجاہد" کل ۲۰ ابواب اور ۳۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ صفحات کی تعداد میں فہرست ابواب اور مقدمے کے لیے وقف کیے گئے صفحات بھی شامل ہیں۔

کتاب کے کل ۲۰ ابواب میں تئیس سے زائد مجاہدین کے سوانحی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ ان مجاہدین میں زیادہ معروف اور قابلِ ذکر نام حضرت محل، رانی لکشمی بائی، عظیم اللہ خاں، سید احمد شاہ مدراسی، ڈھونڈو پنت نانا، جنرل بخت خاں، مولانا فضل حق خیر آبادی، تانتیا ٹوپے، نواب محمود خاں وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ بزرگانِ دیو بند کے نام سے ایک الگ باب قائم کیا گیا ہے۔

تاریخِ سندھ (دو جلد) :

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب پاکستان کے صوبہ سندھ کی تاریخ کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اسے سندھ کی مکمل تاریخ نہیں

سمجھنا چاہیے اور نہ ہے ۔ بلکہ سندھی ادبی بورڈ نے تاریخ سندھ کو مرتب کرنے کے لیے صوبے کی تاریخ کے مختلف دور قائم کر لیے تھے ۔ کلہوڑا اور ٹالپروں کے عہد کی تاریخ مرتب کرنے کا کام مولانا مہر کے سپرد کیا گیا تھا ۔ لیکن مواد فراہم نہ ہو سکنے کے سبب ٹالپروں کے متعلق حصہ ضبط تحریر میں نہ لایا جا سکا ۔ البتہ کلہوڑا خاندان کا دور جس کے متعلق خیال تھا کہ بہت مختصر رہے گا ، دو جلدوں پر پھیل گیا ۔ ''تاریخ سندھ'' کی تدوین و اشاعت کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

> ''سندھی ادبی بورڈ نے سندھ کی ایک مفصل تاریخ لکھوانے کی سکیم تیار کی تھی ، جس کے آٹھ حصے تجویز ہوئے تھے ۔ ان میں سے دو حصے (کلہوڑے اور ٹالپر) میرے حوالے کیے گئے تھے ۔ کلہوڑوں کا عہد قریباً ۱۷۰۰ع سے شروع ہوا اور ۱۷۸۱ع پر ختم ہوگیا ۔ ان کے حالات میں زیادہ سے زیادہ ۶۴ صفحے لکھے گئے تھے اور وہ قلیچ بیگ کی تاریخ میں ہیں ۔ میرا خیال تھا کہ شاید تین ساڑھے تین سو صفحے کی کتاب تیار ہو جائے لیکن موضوع پر غور و مطالعہ شروع کیا تو حالات کی عجیب و غریب کڑیاں ملتی گئیں ۔ یہاں تک کہ ایک ضخیم کتاب تیار ہوگئی ۔ وہ ٹائپ ہوئی تو بارہ سو صفحے میں تمام ہوئی اور دو جلدوں میں ہے ، یعنی صرف ۸۱ برس کے حالات ۔ ٹالپروں کے لیے تحریر اس وجہ سے معلق رہی کہ ضروری کتابیں اب تک فراہم نہ ہوئیں ۔''[1]

''تاریخ سندھ'' جلد اول پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ع میں دربار پرنٹنگ پریس حقانی چوک کراچی سے دو ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی ۔ مجلد کتاب کی قیمت -/۸ روپے مقرر کی گئی ، جب کہ اس کے لیے بہترین کاغذ استعمال کیا گیا ۔ صفحات کی کل تعداد ۵۷۲ ہے ۔ ان میں سے ۳۲ صفحے مصنف کے مقدمے اور تاریخ کے مآخذ کی تفصیل کے لیے وقف کیے گئے ہیں ۔

سرور عالم :

جیسا کہ کتاب کے حرف اول میں خود مولانا مہر نے صراحت کر دی ہے ، ''سرور عالم'' دراصل سررشتہ تعلیمات پنجاب کے مجوزہ نصاب کے مطابق

۱- مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۲۱ مارچ ۱۹۶۱ع ، غیر مطبوعہ ۔

چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں جماعت کی کتاب دینیات کے طور پر لکھی گئی تھی ، لیکن بعد ازاں اُردو خواں طبقے کے فائدے کے لیے اسے ایک باقاعدہ کتاب کے طور پر شائع کرنے کا ارادہ کر لیا گیا ۔ یہ ارادہ اُس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچا جب ۱۹۶۰ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے اسے مستقل کتاب کی حیثیت سے شائع کیا ۔"[۱] ویسے نصابی کتاب کی حیثیت سے یہ ۱۹۵۱ء میں تین جلدوں میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی تھی ۔

جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ :

مولانا غلام رسول مہر نے متحدہ پنجاب کے آخری وزیر اعظم خضر حیات خاں ٹوانہ کے والد جنرل عمر حیات خاں ٹوانہ کی سوانح عمری تصنیف کی تا کہ اس شخصیت کے وہ کارنامے ماضی کے دبیز پردوں میں گم نہ ہو جائیں جن کی بدولت ایک ہندوستانی نے وہ تمام اعزازات حاصل کیے تھے جو انگریزی عہد حکومت میں اس سے قبل کسی ہندوستانی کے لیے ناممکن الحصول تھے ۔ لیکن بعض قرائن سے لگتا ہے کہ جنرل عمر حیات ٹوانہ کی سرگزشت مولانا مہر نے اپنی کسی دلچسپی کی بجائے اپنے دوست خضر حیات خاں ٹوانہ کی فرمائش پر تحریر کی تھی اور غالباً یہی سبب ہے کہ اس کتاب میں جنرل عمر حیات خاں ٹوانہ کے حالاتِ زندگی اور ان کا خاندانی پس منظر تو کھل کر سامنے آ گیا ہے لیکن ہمیں وہ سوانح نگار کہیں نظر نہیں آتے ، جو سید احمد شہید اور غالب ایسی معرکہ آراء تصانیف کے مصنف کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں ۔ "جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ" کو مولانا مہر بھی کوئی بلند پایہ تصنیف قرار نہیں دیتے ۔ غالباً اسی لیے اپنے ایک خط میں اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "یہ کتاب نہ خریدیے ۔ ایک دوست کا اصرار تھا اور فیصلہ یہ ہوا تھا کہ وہ کتاب پر میرا نام نہیں لکھیں گے ۔ پھر انھوں نے مواد کچھ نہ دیا اور کہا کہ جس طور بھی ہو اسے مکمل کر دیجیے ۔ میں نے خاک چھانی ، مختلف تقریریں پڑھیں ، جو دماغ میں آیا لکھ دیا ۔"[۲]

۱۔ مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۹۰ ۔

۲۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۱۸ اگست ۱۹۶۶ء ، غیر مطبوعہ۔

تالیف و ترتیب

خطوطِ غالب :

مرزا اسد اللہ خاں غالب اپنی فارسی شاعری پر فخر کیا کرتے تھے اگرچہ ان کا اُردو دیوان بھی گزشتہ سوا سو سال سے اہلِ نظر سے برابر خراجِ تحسین حاصل کر رہا ہے ۔ اس کے علاوہ اردو میں ان کے مکاتیب بھی اہم اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اردو نثر کے مختلف اسالیب کی روایات کے پس منظر میں انھیں جدید طرز کا بانی اور موجد قرار دیا جاتا ہے ۔ مولانا غلام رسول مہر کو بھی اس کا احساس تھا ۔ مولانا مہر کے اس احساس کی ترجمانی ان کا وہ پیغام کرتا ہے جو انھوں نے فروری ۱۹۶۵ء میں اردو اکیڈیمی ملتان کی طرف سے منائے جانے والے ''یومِ غالب'' کے سلسلے میں بھیجا تھا ۔ مولانا مہر لکھتے ہیں :

''مرزا کا ایک نہایت ادبی کارنامہ ان کے خطوط ہیں جن کی کوئی مثال کم از کم مجھے اردو زبان میں نہیں مل سکی ۔ یہ محض خطوط و مکاتیب ہی کے دائرے میں یگانہ نہیں ، بلکہ حسنِ تحریر ، سلاست ، حلاوت ، دل آویزی اور حقائقِ بیان کے ایسے بدیع مرقعے شاید ہی دوسری کتابوں میں مل سکیں اور ان میں بعد کے جلیل القدر ادیبوں کی تمام کتابیں بھی شامل ہیں ۔ کاش ان خطوط پر بھی ویسی ہی توجہ فرمائی جا سکے جس کے یہ بہرحال مستحق ہیں ۔''[۱]

تاہم خود مولانا مہر اس کام کی طرف بہت پہلے توجہ کر چکے تھے اور خطوطِ غالب کو از سرِ نو ترتیب دے کر مئی ۱۹۵۱ء میں شائع کرا چکے تھے ۔ خطوطِ غالب کا پہلا ایڈیشن دو جلدوں میں شائع ہوا اور اسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے طبع کرا کے شائع کیا ۔ بعد ازاں ان دونوں جلدوں کو یکجا کر دیا گیا ۔ اس سلسلے میں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

۱۔ پیغام مولانا مہر ، مرقومہ ۱۰ فروری ۱۹۶۵ء ، مطبوعہ اردو نامہ کراچی ، شمارہ ۵۳ ، ص ۱۱۲ ۔

"خطوطِ غالب" کا پہلا ایڈیشن غالباً ختم ہو چکا ہے یا قریب الاختتام ہے۔ دوسرے ایڈیشن کی کتابت مکمل ہو چکی ہے . . . چونکہ اسے اب دو جلدوں کی بجائے ایک جلد میں چھاپنا منظور ہے، اس لیے غالباً قیمت گھٹ جائے گی۔"[۱]

تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۲ع میں شائع ہوا۔ اس میں بھی دونوں جلدوں کو یکجا رکھا گیا۔ البتہ اب بھی ہر جلد نے ایک الگ حصے کی صورت ضرور برقرار رکھی۔ چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۸ع میں شائع ہوا اور اس میں مرزا غالب کے چند اور خطوط کا اضافہ کیا گیا۔ ان اضافوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :

"آجکل، کے بعض خطوط تو لے لیے ہیں، البتہ سب کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"[۲]

جیسا کہ خود مولانا مہر نے تصریح کر دی ہے "خطوط غالب" میں ان تمام مکاتیب کو شامل کر دیا گیا ہے جن کا مرتب کو سراغ مل سکا۔ البتہ اس مجموعے میں غالب کے مکاتیب کے دو مجموعوں "مکاتیب رام پور" اور "نادرات غالب" میں شامل خطوط کو شائع نہیں کیا گیا۔ ان مجموعوں کے عدمِ شمول کے بارے میں خود مرتب نے بھی کوئی وضاحت نہیں کی۔ بہرحال اس کے باوجود مولانا مہر کا مرتب کردہ مجموعہ اپنی افادیت کے دائرے کی وسعت کی بنا پر دیگر مجموعوں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی افادیت کا دائرہ مولانا مہر کے مقدمے کی وجہ سے بھی وسیع ہو گیا ہے۔ مولانا مہر نے اپنے اس مقدمے میں اجمالاً مرزا غالب کے سوانحی حالات قلم بند کیے ہیں، مرزا کی تصانیف کا تعارف کرایا ہے اور خطوط کے حوالے سے غالب کے اسلوبِ تحریر پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے "خطوط غالب" کا پہلا ایڈیشن دو جلدوں میں شائع کیا گیا تھا لیکن بعد ازاں ان جلدوں کو یکجا کر دیا گیا۔ البتہ ان کو

۱۔ مکتوب بنام انیس جیلانی، مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۵۶ع، غیر مطبوعہ۔
۲۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق، مرقومہ ۵ جنوری ۱۹۶۸ع، غیر مطبوعہ۔

الگ الگ حصوں کی صورت دے دی گئی ۔ حصہ اول میں خاندان لوہارو کے بعض افراد کے علاوہ قربان علی بیگ ، ہر گوپال تفتہ ، حاتم علی مہر ، شیو نرائن آرام ، منشی نبی بخش حقیر اور میر مہدی مجروح وغیرہ کے نام خطوط کو شامل کیا گیا ہے ، جبکہ دوسرے حصے میں شامل خطوط خواجہ غلام غوث بے خبر ، نواب ابراہیم علی خاں بے وفا ، میاں داد خاں سیاح ، جواہر سنگھ جوہر ، نواب مصطفٰی خاں شیفتہ ، عبدالغفور خاں نساخ ، پیارے لال آشوب ، منشی نولکشور اور نواب کلب علی خاں وغیرہ کے نام ہیں ۔ اسی حصے میں مرزا غالب کے تحریر کردہ بعض دیباچے اور تقریظیں بھی شامل کی گئی ہیں ۔

مکاتیب غالب کے دیگر مجموعوں کے مقابلے میں ''خطوط غالب'' کی اہمیت یہ ہے کہ اول تو اس میں مرزا غالب کے زیادہ سے زیادہ خطوط کو یکجا کر دیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ مکتوب الیہم کے حالاتِ زندگی اور مرزا غالب سے ان کے تعلق کی وضاحت بھی کی گئی ہے جس کے باعث عام قاری خطوط اور ان کے پس منظر کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ اہم تر بات یہ ہے کہ اس مجموعے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ خطوط کو تاریخی اور زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے ۔

''خطوط غالب'' کا ایک ایڈیشن غالب صدی کے موقع پر مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے بھی شائع ہوا تھا ۔ اگرچہ اس ایڈیشن کو بھی دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن یہاں پر مولانا مہر نے مکتوب الیہم کی ترتیب بدل دی ہے ۔ ''خطوط غالب'' کے اولین ایڈیشن کے مقابلے میں اس ایڈیشن کی ضخامت بھی زیادہ ہے ۔

سرودِ رفتہ :

علامہ اقبال نے اپنے شعری مجامیع کی اشاعت کے وقت کلام کے بعض حصے خود ہی قلم زد کر دیے تھے اور یوں وہ اشاعت پذیر نہیں ہو سکے تھے ۔ ایسے اشعار کی نسبت بعض حلقے یہ خیال کرتے تھے کہ چونکہ علامہ نے اپنے کلام کو خود ہی قلم زد کر دیا ہے لہذا اسے منظرِ عام پر نہ لایا جائے ، جبکہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ علامہ کے ذہنی و فکری ارتقاء کے تفصیلی مطالعے کے لیے ان حصوں کو بھی اشاعت پذیر ہونا چاہیے ۔ مولانا مہر مؤخرالذکر نقطۂ نظر رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قلمزد کلام کی طرف متوجہ ہوئے اور اس

کلام کو صادق علی دلاوری کے تعاون سے جمع کر کے ''سرودِ رفتہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔

''سرود رفتہ'' پہلی بار ۱۹۵۹ء میں شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشرز نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے کتاب منزل کشمیری بازار لاہور سے شائع کرائی۔ طباعت و اشاعت کی دشواریوں کا ذکر کرنے کے بعد مولانا مہر ''سرود رفتہ'' کی اشاعت کے بارے میں اپنے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''بعض اوقات ایسا بھی ہوتا رہا کہ کاغذ ہی ناپید تھا اور جو ملا وہی لگا کر گزارا کیا گیا ۔ ''سرود رفتہ'' بڑی اچھی چھپی۔''[1]

''سرود رفتہ'' کل ۲۵۹ صفحات پر مشتمل ہے جن میں آٹھ صفحات پر خود علامہ اقبال کے قلم سے تحریر و تصحیح کے چند نمونے بھی شامل ہیں۔ ''سرود رفتہ'' میں بعض وہ نظمیں پوری کی پوری شائع ہو گئی ہیں جو علامہ اقبال نے قلمزد کر دی تھیں۔ مثلاً نالہ یتیم ۔ ''سرود رفتہ'' میں بعض نظموں کے کچھ حصے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ وہی حصے تھے جو نظر انداز کر دیے گئے تھے ۔ علامہ اقبال کی بہت سی نظمیں ایسی بھی ہیں جو اشاعتِ اول کے بعد نظرثانی کے مرحلے سے گزر کر مجموعے میں شامل ہوئیں اور یوں بعض اوقات مصرعوں اور اشعار کی صورت ہی بدل گئی ۔ مولانا مہر اور صادق دلاوری نے سرود رفتہ میں مصرعوں کی اولین صورت شامل کی ۔

علامہ اقبال کی بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو کسی مجموعے کی اشاعت اول میں تو شامل تھیں لیکن بعد کی اشاعتوں میں خارج کر دی گئیں۔ مثلاً اسرار خودی میں حافظ سے متعلق مثنوی ۔ ''سرود رفتہ'' میں اس مثنوی کا متن شامل کر دیا گیا ۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی نظم یا غزل کے قلمزد اشعار بعد ازاں محل کے مطابق کسی دوسرے مجموعے میں شامل کر دیے گئے ۔ ایسے اشعار کی جانب مولانا مہر نے اپنی طرف سے مباحث میں مفصل اشارے کر دیے ہیں ۔

''سرود رفتہ'' کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلے حصے میں وہ نظمیں شامل ہیں جو ابتداً شائع ہوئیں لیکن انھیں مجامیع میں جگہ نہیں دی گئی ۔

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۲۷ ۔ اگست ۱۹۶۵ء ، غیرمطبوعہ۔

دوسرا حصہ جو "باقیات بانگِ درا" کے عنوان سے ہے ، ان نظموں کی باقیات کے لیے وقف کیا گیا ہے جو "بانگِ درا" میں شامل ہیں ۔ مثلاً ہمالہ ، ایک آرزو ، صدائے درد ، والدہ مرحومہ کی یاد میں ، وغیرہ ۔ تیسرے اور چوتھے حصے میں علی الترتیب غزلیات اور قصائد دیے گئے ہیں ۔ پانچویں حصے میں مرثیے شامل ہیں ۔ چھٹے میں قطعات و متفرق اشعار اور ساتویں حصے میں قطعاتِ تاریخ شامل ہیں ۔ آخری اور آٹھواں حصہ رباعیاتِ اقبال کے لیے مختص ہے ۔ مزاحیہ کلام بھی اسی حصے میں ہے ۔ ان آٹھ حصوں کے علاوہ ایک ضمیمہ بھی ہے جس میں وہ چیزیں شامل ہیں جو تاخیر سے چھپیں ۔ اگرچہ اب بھی باقیات اقبال کا خاصا بڑا حصہ ہے جو "سرودِ رفتہ" میں شامل نہیں ۔ "سرودِ رفتہ" کے اس نقص کا احساس خود مولانا مہر کو بھی تھا ۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس میں شبہ نہیں کہ "سرودِ رفتہ" کا مجموعہ جامع نہیں ۔ یہ کام وہی لوگ احسن طریق پر انجام دے سکتے تھے جن کے پاس پرانے رسالوں کے مجموعے تھے ۔ مجھے تقسیم سے پیشتر معلوم تھا کہ دیسنہ (صوبہ بہار) میں ایسا نہایت عمدہ ذخیرہ ہے لیکن تساہل ہوا اور جا نہ سکا ۔ تقسیم کے بعد جانا دقت خیز ہو گیا ۔ جس شخص نے دیسنہ کے مجامیع سے فائدہ اٹھایا اس کی افضلیت میں کلام نہیں ہو سکتا ۔ . . . میرا مقصد یہ تھا کہ ایک خاص انداز میں وہ سب کچھ مرتب ہو جائے جو میرے پاس تھا ۔ بلکہ اب دیکھتا ہوں تو بعض ضروری چیزیں خود میرے پاس تھیں مگر وقت پر نہ مل سکیں ۔"[1]

کتاب دیکھنے سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے کون سے حصے مولانا مہر نے مرتب کیے اور کون سے حصے صادق دلاوری نے ۔ البتہ مولانا مہر نے جس انداز میں صادق دلاوری کے کام کا ذکر اپنے دیباچے میں کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترتیب کا سارا کام صادق دلاوری کا ہے اور مہر صاحب نے صرف مقدمہ لکھا ہے اور اس کے علاوہ نظموں کے تعارف میں جہاں ضرورت پیش آئی ہے ، تھوڑا بہت لکھ دیا ہے ۔ اس سلسلے میں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق (تاریخ درج نہیں) ، ص ۲۲ ، غیر مطبوعہ ۔

"سرودِ رفتہ کی تمام چیزیں میں نے اپنے ایک عزیز دوست دلاوری صاحب کے حوالے کر دی تھیں ۔ اس مجموعے کی ترتیب کے ذمہ دار وہی تھے ۔ مقدمہ میں نے پہلے مختصر سا لکھا تھا ، پھر مناسب سمجھا گیا کہ بعض ضروری مباحث بڑھا دیے جائیں ۔

مطلب قطعاً یہ نہیں کہ جو غلطیاں رہ گئیں یا فروگزاشتیں ہوئیں ان کے لیے میری ذمہ داری ساقط سمجھی جائے ۔ یقیناً میں برابر کا ذمہ دار ہوں ۔"[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا مہر ہی کی تحریک پر "سرودِ رفتہ" کو مرتب کیا گیا ۔ نیز یہ سارا مرحلہ ان کی نگرانی میں طے ہوا ورنہ وہ بہ آسانی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جاتے ۔

نقشِ آزاد :

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار ایسے مشاہیر میں ہوتا ہے جن کی زبان قلم سے نکلنے والا ایک ایک لفظ گوہرِ بے بہا سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتا ہے ۔ مولانا آزاد کی اسی خصوصیت کی بنا پر مولانا غلام رسول مہر نے "نقش آزاد" کو مرتب کیا ۔ اس کتاب میں مولانا مہر کے نام آزاد کے وہ تمام خطوط بھی آ گئے جو تقریباً چوالیس سال پر محیط طویل مدت میں لکھے گئے اور وہ تحریریں بھی جو کسی طرح مولانا مہر کے پاس محفوظ رہ گئی تھیں اور بعض ایسے خطوط بھی جو لکھے تو گئے اور لوگوں کے نام ، لیکن کسی وجہ سے مولانا مہر تک پہنچ گئے ۔

"نقش آزاد" پہلی مرتبہ جنوری ۱۹۵۹ع میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کی ۔ اس کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ چند ہی ماہ بعد یعنی جولائی ۱۹۵۹ع میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا اور مئی ۱۹۶۸ع میں یہ کتاب تیسری مرتبہ شائع ہوئی ۔ قرائن سے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ "نقش آزاد" کے بعض ایسے ایڈیشن بھی چھپے جنھیں "چور ایڈیشن" قرار دینا چاہیے کیونکہ بعض

۱- مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۲۶ جنوری ۱۹۶۱ع ؛ غیر مطبوعہ ۔

ایسے نسخے بھی ملتے ہیں جن پر سنہ اشاعت وغیرہ درج نہیں ہے اور پُرلطف بات یہ ہے کہ مولانا مہر اس قسم کے ایڈیشنوں سے محض ناواقف تھے ۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے جو الیس جیلانی اور مولانا مہر کے بعض مکاتیب کے حوالے سے سامنے آتا ہے ۔ اس واقعے کا پس منظر یہ ہے کہ الیس جیلانی نے اپنے ایک خط میں مولانا مہر سے ''نقش آزاد'' کا سنہٌ اشاعت دریافت کیا جس کے جواب میں مولانا مہر نے اپنے پاس محفوظ ''نقش آزاد'' کے پہلے اور دوسرے ایڈیشنوں کا سنہٌ اشاعت بتایا ۔ مولانا مہر کا یہ خط سات جنوری ۱۹۶۵ء کا تحریر کردہ ہے ۔ اس خط کے حاشیے میں الیس جیلانی لکھتے ہیں :

> ''ہمارے کتب خانے ''مبارک اردو لائبریری'' میں اس مجموعے کا جو نسخہ موجود ہے اس پر مطبع ، ناشر ، کاتب وغیرہ کا نام تو لکھا ہوا ہے لیکن سنہٌ اشاعت غائب ہے ۔ البتہ مہر صاحب نے تین صفحے کا جو پیش لفظ لکھا ہے وہاں ۱۴ - اکتوبر ۱۹۵۸ء رقم ہے اور یہ پہلا ایڈیشن ہے ، اس لیے کہ وی پی وصول کرنے کی تاریخ ۲۵ - جنوری ۱۹۵۹ء والد مرحوم سید مبارک شاہ جیلانی کے قلم سے درج ہے ۔''[۱]

''نقش آزاد'' کے جو چور ایڈیشن پاکستان میں چھپے ، مولانا مہر ان سے ناواقف تھے ، لیکن ہندوستان میں شائع ہونے والی چور اشاعتوں کا خود مولانا مہر کو بھی اندازہ تھا جیسا کہ وہ اپنے ایک مکتوب میں مولانا آزاد کے ''ترجمان القرآن'' کی اشاعتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ پاکستان میں کئی ایڈیشن اس کے چھپ چکے ہیں جنہیں چور ایڈیشن کہنا چاہیے ، جس طرح اقبال کی کتابوں کے بلکہ خود میری کتاب ''نقش آزاد'' کے چور ایڈیشن ہندوستان میں چھپے ۔''[۲]

''نقش آزاد'' کے تیسرے ایڈیشن کے لیے کتابت و طباعت کا تو عمدہ اہتمام کیا گیا لیکن اس کے لیے اخباری کاغذ استعمال کیا گیا ۔ مجلد کتاب کی قیمت آٹھ روپے مقرر کی گئی ۔

۱۔ حاشیہ مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۷ جنوری ۱۹۶۵ء ، غیرمطبوعہ ۔
۲۔ مکتوب بنام عبدالسلام اسلم ، مرقومہ ۳ جولائی ۱۹۶۰ء ، غیرمطبوعہ ۔

"نقش آزاد" کل ۳۴۴ صفحوں پر مشتمل ہے جبکہ ان صفحات کو کل تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے - پہلے حصے میں مولانا آزاد کے وہ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے ۱۹۱۴ع سے اپنی وفات تک کے عرصے میں مولانا مہر کے نام لکھے - دوسرے حصے کا ذیلی عنوان "غالب پر مولانا کی تحریرات" ہے اور اس میں زیادہ تر ان تحریروں کو جمع کیا گیا ہے جو مولانا آزاد ، مولانا مہر کی کتاب "غالب" کے سلسلے میں تحریر فرماتے رہے اور وہ مولانا مہر کے پاس محفوظ رہیں - "نقش آزاد" کے تیسرے حصے میں زیادہ تر ایسے مکاتیب ہیں جو دوسری شخصیات ؛ مثلاً خواجہ حسن نظامی ، ملا واحدی اور نیاز فتح پوری وغیرہ کے نام لکھے گئے ، لیکن مولانا غلام رسول مہر کے پاس جمع ہو گئے - تیسرا حصہ کتاب کے باقی دو حصوں کی نسبت بہت مختصر ہے اور صرف سولہ صفحات پر مشتمل ہے -

تبرکاتِ آزاد :

"نقش آزاد" زیادہ تر اُن خطوط پر مشتمل ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا مہر کے نام تحریر کیے ، لیکن "تبرکاتِ آزاد" میں ، جو ابوالکلام آزاد کے مکاتیب و مضامین پر مشتمل ہے ، مولانا مہر کے نام کوئی خط نہیں - اسی طرح "تبرکاتِ آزاد" میں مولانا آزاد کے جو مضامین جمع کیے گئے ہیں وہ سب کے سب مطبوعہ ہیں - یہاں صرف اس خیال سے جمع کر دیے گئے کہ یہ رسائل و جرائد کے صفحات سے نکل کر مرتب ہو جائیں اور یوں تلف ہونے سے محفوظ رہیں -

"تبرکاتِ آزاد" شیخ نیاز احمد پبلشرز نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر کتاب منزل کشمیری بازار لاہور سے شائع کی - کتاب پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے البتہ مقدمے کے آخر میں مہر صاحب نے جو تاریخ درج کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "تبرکاتِ آزاد" ۱۹۵۹ع میں منظرِ عام پر آ گئی تھی - تبرکاتِ آزاد کے لیے عمدہ کاغذ اور طباعت کا اہتمام کیا گیا - سر ورق پر کتاب اور مرتب کے نام کے علاوہ مولانا آزاد کی تصویر بھی دی گئی ہے -

"تبرکاتِ آزاد" کل ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے - اس شمار میں شامل کتاب کے آخری تین صفحے نفس مضمون سے متعلق نہیں ہیں - اسی طرح ابتدا میں تقریباً چودہ صفحات فہرستِ ابواب ، پہلے باب کا تعارف اور مولانا مہر کے مقدمے کے لیے مختص کیے گئے ہیں -

''تبرکاتِ آزاد'' کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ حصہ اول مولانا آزاد کے مکاتیب پر مشتمل ہے ۔ اس حصے کو مزید چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلا حصہ ، جس میں ۲۷ مکاتیب شامل ہیں ، ان خطوط پر مشتمل ہے جو مولانا آزاد نے مولوی محی الدین احمد قصوری اور ان کے والد مولانا عبدالقادر قصوری کے نام لکھے ۔ مذکورہ شخصیات کے نام تحریرکردہ تمام خطوط میسر نہ آ سکے اور ان کی بڑی تعداد تلف ہوگئی ۔ بہرحال جو مل سکے وہ ''تبرکاتِ آزاد'' میں چھپ گئے ۔ دوسرے حصے میں کل ۱۹ خطوط ہیں اور یہ سب کے سب مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام ہیں ۔ یہ خط ''نیا دور'' میں شائع ہو چکے تھے ۔ تیسرا حصہ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ۳۸ خطوط پر مشتمل ہے ۔ یہ خطوط بھی سلیمان ندوی کی وفات کے بعد ''معارف'' میں شائع ہو چکے تھے ۔ مولانا مہر نے ان خطوط کو نئے سرے سے مرتب کیا اور ان کو تاریخی ترتیب عطا کی ۔ خطوط کے رقم کیے جانے کی قرینِ قیاس تاریخوں کو متعین کرنے کی کوشش کی اور ضروری حواشی لکھے ۔ مکاتیب کا حصہ چہارم مولانا آزاد کے کل پندرہ خطوط پر مشتمل ہے جو مختلف دس شخصیات مثلاً مولانا الطاف حسین حالی ، جناب عبدالرحمان صاحب ممبر پارلیمنٹ اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں وغیرہ کے نام تحریر کیے گئے ہیں ۔ ان خطوط پر بھی حواشی دیے گئے ہیں اور یوں ان کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے ۔

''تبرکاتِ آزاد'' کے دوسرے حصے میں مولانا آزاد کے مضامین ہیں ۔ ان مضامین کی افادیت اس بنا پر بھی بڑھ گئی ہے کہ مولانا مہر نے ہر مضمون کے آغاز میں تمہید کے طور پر وہ پس منظر بھی دے دیا ہے جس میں وہ مضمون لکھا گیا تھا ۔ اس سے ان مضامین کی افادیت میں یقیناً قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے ۔

باقیاتِ ترجمان القرآن :

''باقیات ترجمان القرآن'' مولانا ابوالکلام آزاد کی ان تحریروں کا مجموعہ ہے جو ترجمان اول و دوم کے بعد ترجمان سوم کی حیثیت سے شائع ہوتیں لیکن مولانا آزاد کو سیاست کے خارزار سے اتنی فرصت نہ مل سکی ، البتہ ان کے انتقال کے بعد مولانا مہر نے مولانا آزاد کی ان متفرق اور بکھری ہوئی تحریروں کو جمع کیا اور بغیر کسی ترمیم و اضافے کے ''باقیات ترجمان القرآن'' کے نام سے شائع کرا دیں ۔ باقیات کی تدوین کے بارے میں مولانا مہر اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں :

"میں نے صرف اتنا کیا کہ ترجمان القرآن کا جو حصہ رہ گیا اس کے متعلق مولانا کے تراجم اپنے مطالعے کے لیے اکٹھے کر رکھے تھے۔ اُنھیں مختصر تصریحات کے ساتھ "باقیاتِ ترجمان" کے نام سے شائع کر دیا۔ تصریحات بھی مولانا ہی کی ہیں۔"[۱]

مولانا آزاد کی تصریحات کے ساتھ ساتھ مولانا مہر کے حواشی نے "باقیات" کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کتاب میں آنے والے مباحث اور اپنے کام کی نوعیت بیان کرنے کے لیے ۶۰ صفحوں پر مشتمل مقدمہ اور تقریباً ۱۸ صفحات پر محیط دیباچہ بھی تحریر کیا ہے۔

"باقیات ترجمان القران" کو پہلی مرتبہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے علمی پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔ کتاب کے لیے عمدہ کتابت و طباعت کا اہتمام کیا گیا لیکن اس کے باوجود کتابت کی خاصی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ "باقیات ترجمان القران" کل ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ مقدمے اور دیباچے کے لیے وقف کیے گئے صفحوں کی تعداد اس شمار کے علاوہ ہے۔

"باقیات ترجمان القرآن" میں کل ۶۷ سورتوں کی تشریح و تفسیر شامل ہے۔ ان سورتوں میں سے چند ایک درج ذیل ہیں :

(۱) سورۂ نور — (۲) سورۃ الفرقان
(۳) سورۂ شعراء — (۴) سورۂ نمل
(۵) سورۂ عنکبوت — (۶) سورۂ احزاب
(۷) سورۂ شوریٰ — (۸) سورۂ فتح
(۹) سورۂ نجم — (۱۰) سورۂ الرحمٰن
(۱۱) سورۃ الحشر — (۱۲) سورۂ المنافقون
(۱۳) سورۃ القیامۃ — (۱۴) سورۂ عبس
(۱۵) سورۂ الم نشرح — (۱۶) سورۃ العصر
(۱۷) سورۂ الفیل — (۱۸) سورۃ الاخلاص

۱۔ مکتوب بنام الیس جیلانی، مرقومہ ۱۴ مارچ ۱۹۶۴ء، غیرمطبوعہ۔

دیوانِ غالب :

مولانا مہر ''خطوطِ غالب'' کی ترتیب و اشاعت سے فارغ ہوئے تو غالبیات کے ضمن میں ایک اور ضروری کام کرنے کا خیال آیا اور وہ یہ کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کو شائع کیا جائے ۔ اس سلسلے میں اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں :

''شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے بعض غزلوں اور نظموں کی تاریخیں متعین کر کے ایک مجموعہ چھپنے کے لیے دیا ہے ۔''[1]

لیکن بعد ازاں بوجوہ دیوان کی اشاعت معطل ہوگئی اور پھر ۱۹۶۶ء میں مولانا مہر دوبارہ اس کام کی جانب متوجہ ہوئے ۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے سید قدرت نقوی ہی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میرے پیشِ نظر مکمل دیوان کی ترتیب بھی ہے اور اس کے لیے مواد مہیا کر لیا ہے ۔ ترتیب بھی قائم کر لی ہے ۔ نقل کرنا باقی ہے ۔''[2]

یہ دیوان پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا ۔ دیوان کی اشاعت کے لیے دو اقسام کا کاغذ استعمال کیا گیا ۔ اچھے کاغذ والے مجلد نسخوں کی قیمت ۷/۵۰ روپے اور عام نسخے کی قیمت ۵/- روپے مقرر کی گئی ۔

۴۰۱ صفحات پر مشتمل اس دیوان میں مرزا غالب کی غزلیات ، قصائد ، قطعات اور رباعیات وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ اس میں تین ضمیمے بھی ہیں ۔ پہلے ضمیمے میں وہ اشعار شامل کیے گئے ہیں جو کسی وجہ سے اس دیوان میں شامل غزلیات و قصائد اور قطعات و رباعیات والے حصوں میں نہ آ سکے تھے ۔ دوسرا ضمیمہ نسخۂ حمیدیہ کے انتخاب کے لیے وقف کیا گیا ہے ، جبکہ تیسرے ضمیمے کا عنوان ''قادر نامہ'' اور ''پنج آہنگ'' ہے ۔

۱۔ مکتوب بنام قدرت نقوی ، مرقومہ ۲۲ مارچ ۱۹۵۹ء ، غیرمطبوعہ ۔

۲۔ مکتوب بنام قدرت نقوی ، مرقومہ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۶ء ، غیر مطبوعہ ۔

تاریخِ ارادت خاں :

"تاریخ ارادت خاں" جو تھوڑے بہت اختلافاتِ متن کے ساتھ مقتل السلاطین ، تاریخ مبارکی ، تذکرۂ ارادت خاں ، جنگ بہادر شاہی ، بہادر شاہ نامہ اور سوانح عمری منشی ارادت خاں واضح وغیرہ مختلف ناموں سے ملتی ہے ، مبارک اللہ واضح نے ۱۷۱۴ع میں اُس وقت لکھی جب خود اس کی اپنی عمر تقریباً سڑسٹھ برس ہو چکی تھی - مبارک اللہ واضح جو بڑے اچھے شاعر و نثار تھے ، سلطنت مغلیہ کے مشہور امیر میر محمد باقر کے صاحبزادے تھے - وہ خود بھی سلطنت کے ذمہ دار عہدوں پر رہتے ہوئے کئی حکمرانوں کا عہد دیکھ چکے تھے اور بہت سے حکمرانوں کے عروج و زوال کی داستان ان کے سامنے تھی - چنانچہ اس کتاب میں مبارک اللہ واضح المعروف بہ ارادت خاں نے اپنی زندگی کے مختلف واقعات کو کچھ اس انداز میں سمیٹا اور جمع کیا ہے کہ اس میں اس خاص دور سے متعلق سلطنت مغلیہ کی تاریخ بھی بیان ہو گئی ہے ، اور چونکہ اپنی اس تاریخ نما سوانح عمری کا کوئی نام خود مصنف نے منتخب نہیں کیا تھا ، لہذا اکثر محققین نے اپنے کلی یا جزوی تاثرات کے باعث از خود کتاب کے نام تجویز کر لیے - اس کے بے شمار ناموں کی اس کے علاوہ کچھ تاویل نہیں ہو سکتی -

تاریخِ ارادت خاں کو ۱۹٦۸ع میں مولانا غلام رسول مہر نے نئے سرے سے اصل نسخے کے مطابق ترتیب دیا ، جب کہ اسے ادارۂ تحقیقات پاکستان پنجاب یونیورسٹی لاہور نے جنوری ۱۹۷۱ع میں پنجابی ادبی اکیڈیمی پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا - تاریخ ارادت خاں کے لیے بہترین سفید کاغذ اور عمدہ لکھائی چھپائی کا اہتمام کیا گیا - مضبوط اور خوبصورت جلد پر دیدہ زیب گرد پوش بھی ہے ، جس پر پنجاب یونیورسٹی لاہور کا مونوگرام بھی چھاپا گیا ہے - مجلد نسخے کی قیمت -/۱۸ روپے مقرر کی گئی -

تاریخ ارادت خاں کی کل ضخامت ۳۱۹ صفحے ہے ، جب کہ کتاب کے آخر میں اُنیس صفحات پر مشتمل اشاریہ اور اغلاط نامہ بھی اس میں شامل ہے - البتہ فہرست ابواب اور مقدمے کے لیے وقف کیے جانے والے صفحات اس شمار میں شامل نہیں -

مولانا مہر نے اپنے مقدمے میں مبارک اللہ واضح کے حالات بھی دیے ہیں

اور تاریخ ارادت خاں کی اجمالی سرگزشت پیش کرنے کے علاوہ اپنے کام کے بارے میں چند وضاحتیں بھی دی ہیں ۔ البتہ ایک بات محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اگر اس متن کا ترجمہ بھی ہو جاتا تو آج کا قاری بھی جو فارسی سے نابلد ہے ، استفادہ کر سکتا تھا ۔

قصائد و مثنویات فارسی :

مولانا مہر نے غالب صدی کے موقع پر قصائد و مثنویات فارسی کو ایڈٹ کیا اور مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ۔

قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مخمس :

غالب صدی کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی مجلس یادگار غالب نے مرزا غالب کی کتابوں کو شائع کرنے کا جو پروگرام بنایا تھا ، یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے ۔ اسے مولانا غلام رسول مہر نے ایڈٹ کیا اور یہ مجلس یادگار غالب کے زیر اہتمام پہلی بار ۱۹۶۹ء میں مطبع عالیہ لاہور سے شائع ہوئی ۔

"قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مخمس" کے لیے اچھی طباعت و کتابت اور عمدہ کاغذ کا اہتمام کیا گیا ۔ لیکن کتاب دیکھنے سے اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کی کیا قیمت مقرر کی گئی اور اشاعت اول میں اسے کتنی تعداد میں شائع کیا گیا ۔

"قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مخمس" کل ۲۵۲ صفحات پر مشتمل ہے ، اور جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے ، اس میں غزل ، قصائد اور مثنویوں کو چھوڑ کر مرزا غالب کے تمام فارسی کلام کو جمع کر دیا گیا ہے ۔

رسولِ رحمت :

جس طرح شبلی نعمانی اپنی کاوشوں کا ثمر نہیں دیکھ پائے تھے ، اسی طرح مولانا مہر بھی "رسولِ رحمت" کو مطبوعہ صورت میں نہ دیکھ سکے ۔ کیونکہ

یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مولانا مہر اس کام کو انجام دینے کے لیے زندہ تھے۔ یہ احساس ان کے متعدد خطوط کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے انتقال سے چند ماہ پہلے جب مولانا مہر "رسولِ رحمت" کی ترتیب میں مصروف تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کو غالباً معلوم ہو کہ جنوری کا مہینا میرے لیے سخت مصیبت کا مہینا تھا۔ مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ اب میرا جسم شدید سردی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے ارادہ کر لیا تھا کہ ایک مہینے کے لیے کراچی آ جاؤں . . . لیکن میرا دل "رسول رحمت" میں اٹکا ہوا تھا۔"[1]

"رسولِ رحمت" کی ترتیب و اشاعت کا کام بہت عرصے سے مولانا مہر کے پیشِ نظر تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مولانا آزاد کے وہ مضامین جو آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں، جمع کرکے شائع کر دیے جائیں۔ اپنے اس ارادے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

"میرے محدود علم کی حد تک صرف ایک فرد تھا جسے سیرت کے ضروری پہلوؤں کا احساس تھا، یعنی ہمارے مولانا مرحوم و مغفور۔[2] مگر انھیں کوئی چیز مسلسل لکھنے کی مہلت نہ ملی۔ سیرت کے سلسلے میں بعض مبانی کی توضیح کے لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے متفرق افادات کو مرتب کر دوں، چنانچہ بہت سی چیزیں نقل کرائیں اور اب چند روز میں ان کی ترتیب شروع کروں گا۔"[3]

جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے وضاحت ہوتی ہے، مولانا مہر نے ۱۹۶۲ء میں "رسولِ رحمت" کی ترتیب کا کام شروع کر دیا تھا اور جیسا کہ "رسولِ رحمت" کے مقدمے میں انھوں نے تصریح فرمائی ہے، وہ ۱۹۶۳ء تک

۱۔ مکتوب بنام ابو سلمان شاہجہانپوری، مرقومہ یکم مارچ ۱۹۷۱ء، غیر مطبوعہ۔

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد مراد ہیں۔

۳۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق، مرقومہ ۴۔ اپریل ۱۹۶۲ء، غیر مطبوعہ۔

اس کام کو مکمل بھی کر چکے تھے - لیکن پھر اس کی اشاعت معطل ہوگئی - اس دوران میں مولانا مہر نے یہ محسوس کیا کہ اگر مولانا آزاد کے مقالات کو جوں کا توں شائع کر دیا گیا ، تو شاید افادیت کے نقطۂ نظر سے اس کا دائرہ محدود ہو جائے گا - لہذا کوشش کی کہ جو مقامات تشنہ رہ گئے ہیں وہاں اپنی طرف سے کچھ اضافے کر دیے جائیں - ان ترامیم و اضافوں کا جواز پیش کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میری کتاب کے صرف چند باب رہ گئے ہیں - مولانا (مولانا آزاد - مرتب) کے افادات میں اپنی کوئی چیز شامل کرنا ریشم میں ٹاٹ کے پیوند کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مجبور تھا - دل نہیں چاہتا تھا کہ سیرتِ طیبہ کا کوئی ضروری حصہ تفصیل سے رہ جائے ، لہذا بہت سے باب لکھ رہا ہوں -''[1]

''رسولِ رحمت'' کی تسوید کے سلسلے میں جو حصے مولانا مہر نے اپنی جانب سے بڑھائے ، اگرچہ ان کا اندازہ ''رسولِ رحمت'' دیکھنے سے بھی ہو جاتا ہے ، کیونکہ ایسے تمام ابواب کے ساتھ مولانا مہر نے لفظ ''مؤلف'' لکھ دیا ہے ، لیکن اس امر کی انھوں نے ایک جگہ خود بھی صراحت کی ہے - اپنی طرف سے اضافہ کردہ ابواب کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اب صورت یہ ہوگئی ہے کہ کتاب ۱/۳ مولانا کی اور ۲/۳ یا کم و بیش میری -''[2]

''رسول رحمت'' مولانا مہر کے انتقال کے بعد ۱۹۷۱ع میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی - اسے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا - ''رسولِ رحمت'' کے لیے عمدہ کاغذ کا اہتمام کیا گیا - گرد پوش کے ساتھ مجلد نسخے کی قیمت ۳۰/- روپے مقرر کی گئی -

---

۱- مکتوب بنام شیر بہادر پنی ، مرقومہ ۲۴ نومبر ۱۹۶۹ع ، مطبوعہ افادات مہر ، ص ۲۱۱ -

۲- مکتوب بنام ابو سلمان شاہجہانپوری ، مرقومہ ۲۲ اپریل ۱۹۷۰ع ، غیر مطبوعہ -

''رسول رحمت'' کل ۷۹۹ صفحات پر مشتمل ہے ، جبکہ فہرست ابواب اور مقدمے کے لیے مخصوص کیے گئے صفحات اس شمار کے علاوہ ہیں - ۷۹۹ صفحات کو کل ۲۱ حصوں اور ۱۰۵ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جبکہ بعض ابواب کے آخر میں کچھ ضمیمے بھی دیے گئے ہیں -

آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ کی پیش کش کے ساتھ جابجا نقشے اور شجرہ ہائے نسب بھی دیے گئے ہیں ، تا کہ عام قارئین جغرافیائی محل وقوع اور افراد و خاندانوں کی تفصیلات کو بخوبی سمجھ سکیں -

انبیائے کرام :

''انبیائے کرام'' میں ''الہلال اور البلاغ'' سے مولانا ابوالکلام کے ان مضامین کو مرتب کیا گیا ہے جو مختلف انبیاء کی سیرت طیبہ کو اجاگر کرنے کے لیے حیطۂ تحریر میں لائے گئے تھے - انبیائے کرام کے بعض مضامین ترجمان القرآن سے بھی لیے گئے ہیں -

اگرچہ انبیائے کرام پہلی مرتبہ ۱۹۷۲ء میں یعنی مولانا مہر کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ، لیکن مولانا کے بعض خطوط اس امر کے غماز ہیں کہ انھوں نے سیرت انبیاء سے متعلق کتب مرتب کرنے کا پروگرام بہت پہلے سے بنا رکھا تھا - مثلاً وہ اپنے ایک خط میں ان کتابوں کی ترتیب سے متعلق خواہش کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''میں نے اس اثناء میں تہیہ کر لیا ہے کہ مولانا کی چند اور چیزیں جلد سے جلد مرتب کر دوں - مثلاً سیرت طیبہ پر جو کچھ انھوں نے مختلف اوقات میں لکھا اسے ترتیب دے دوں - اسی طرح سیرت ابراہیمی اور سیرت انبیائے کرام کتابی شکل میں آ جائیں -''[۱]

اس مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ''انبیائے کرام'' مرتب کرنے کا ارادہ ۱۹۶۲ء سے کر چکے تھے - لیکن اس مشکل کام کے سر انجام ہونے میں تقریباً دس برس لگ گئے ، اگرچہ پھر بھی وہ صورت پیدا نہ ہو سکی جس کے مولانا

۱- مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۴ فروری ۱۹۶۲ء ، غیر مطبوعہ -

مہر خواہاں تھے ۔ اس امر کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر ''البیانِ کرام'' کے خدو خال کو ان الفاظ میں نمایاں کرتے ہیں :

''البیانِ کرام کے متعلق ابتداء میں اضافے کا خیال تھا ۔ لیکن وہ وقت طلب ہے ، لہذا مولانا ہی کے مقالات بعض حواشی کے ساتھ دے دیے ہیں ۔ کل مختصر سا دیباچہ بھی لکھ دیا ۔ یہ کتاب ساڑھے تین سو صفحے کی ہوگی ۔ یہ بھی دو تین روز کے اندر پریس میں پہنچ جائے گی ، انشاء اللہ ۔''۱

تشاریحِ مہر

مطالبِ بالِ جبریل :

''مطالبِ بالِ جبریل'' علامہ اقبال کے شعری مجموعے ''بالِ جبریل'' کی شرح ہے جسے مولانا مہر کے پبلشرز شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے پہلی بار ۱۹۵۶ء میں علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ۔

''مطالبِ بالِ جبریل'' کل ۲۱۱ صفحات پر مشتمل ہے ۔ ان صفحات میں مولانا مہر نے نہایت اختصار سے کام لیتے ہوئے بالِ جبریل کی شرح اس انداز میں پیش کر دی ہے کہ اگرچہ بعض جگہ قارئین تشنگی محسوس کریں لیکن دوسرے شارحین کی طرح انھیں غلط راستے پر نہ ڈالا جائے ۔

''مطالبِ بالِ جبریل'' کے آغاز میں مولانا مہر نے ایک مختصر سا مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے ۔ یہ شرح بھی مولانا مہر کے منفرد انداز کے باعث پسند کی گئی اور دیگر شرحوں کی طرح اس کے بھی بہت سے ایڈیشن آئے ۔

مطالبِ ضربِ کلیم :

مولانا غلام رسول مہر نے علامہ اقبال کے شعری مجموعے ''ضربِ کلیم'' کی شرح ''مطالبِ ضربِ کلیم'' کے نام سے لکھی ۔ مطالب ضربِ کلیم بھی پہلی بار

۱۔ مکتوب بنام ابو سلمان شاہجہانپوری ، مرقومہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء ، غیر مطبوعہ ۔

۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی - اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آئندہ بیس برسوں یعنی ۱۹۷۶ء تک اس کے چھ ایڈیشن شائع ہوئے - یہ تمام ایڈیشن شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیے -

مطالبِ اسرار و رموز :

''اسرار و رموز'' چونکہ فارسی زبان میں لکھی گئی تھیں لہذا ان دو مثنویوں کی افادیت و اہمیت کے باوجود ان کی تفہیم اور بھی زیادہ مشکل تھی -

''مطالبِ اسرار و رموز'' پہلی بار جولائی ۱۹۶۰ء میں چھپی - اسے بھی شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کیا -

مطالبِ بانگِ درا :

''مطالبِ بانگِ درا'' علامہ اقبال کے پہلے اردو شعری مجموعے ''بانگِ درا'' کی شرح ہے - ''مطالب بانگِ درا'' کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے - پانچواں ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا - یہ سب ایڈیشن شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیے - کتابت و طباعت کا اہتمام مناسب نظر آتا ہے - دوسرے ''مطالب'' کی طرح جلد پر خوب صورت گردپوش بھی موجود ہے - مجلد نسخے کی قیمت -/۱۸ روپے مقرر کی گئی -

''مطالبِ بانگِ درا'' کی کل ضخامت ۳۵۹ صفحات ہے - اس شمار میں مقدمے اور فہرستِ ابواب کے لیے وقف کیے گئے صفحات بھی شامل ہیں -

نوائے سروش :

مولانا غلام رسول مہر سمجھتے تھے کہ اگر دیوان غالب میں ہر ضروری مقام پر رموز و اوقاف اور اعراب کا انتظام کر دیا جائے تو مشکلاتِ غالب سے عام قاری بھی بہ آسانی عہدہ برا ہو سکتا ہے - اس خیال سے وہ دیوان غالب کو از سر نو مرتب کرنا چاہتے تھے - اس کے لیے مولانا مہر نے مروجہ دیوان اور متفرق اشعار کا انتخاب بھی کر لیا تھا - لیکن پھر ان کے پبلشر آڑے آئے اور انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ دیوان کو الگ شائع کرنے کی بجائے مع شرح شائع کرنا زیادہ مناسب ہے - لہذا مولانا نے شرح لکھنی شروع کی - ان امور کی تفصیلات مولانا نے اپنے ایک خط میں بیان کی ہیں - دیوانِ

غالب کی اشاعت کے بارے میں استفسار کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ دیوان چھپ نہیں رہا ۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ پبلشر دیوان الگ نہیں ، بلکہ مع شرح چھاپنا چاہتے ہیں ۔ شرح ہو چکی ہے اور اب اس کی کتابت کا انتظام کیا جا رہا ہے ۔ میرے پاس نہ شرح ہے نہ متن ۔ سب کچھ پبلشر کے پاس ہے ۔"[۱]

تائیدِ مزید کرتے ہوئے سید قدرت نقوی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"میرے پیش نظر رموز و اوقاف اور اعراب تھے ۔ مدت سے خیال تھا کہ اگر یہ کام ہو جائے تو شرح کی ضرورت نہیں رہتی ، یا زیادہ ضرورت نہیں رہتی ۔ چنانچہ دیوان اسی غرض سے مرتب کیا تھا اور اس پر عرصہ گزر چکا . . . . میرے پبلشر کی خواہش تھی کہ غالب کا مروجہ دیوان الگ چھاپا جائے ، ضمیموں والا الگ ۔ پھر اس نے بہ اصرار شرح لکھوائی ، وہ الگ چھپے گی ۔"[۲]

بہرحال مولانا غلام رسول مہر نے اپنے پبلشر کی خواہش پر کلامِ غالب کی شرح لکھی اور اسے "نوائے سروش" کے نام سے شائع کیا گیا اور اقبال کے مجموعوں کی شرحوں کے برعکس اس میں کلام غالب کا متن بھی شائع ہوا ۔

"نوائے سروش" کل ۱۰۹٦ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں صفحوں کی وہ تعداد بھی شامل ہے جو مقدمے کے لیے وقف کی گئی ہے ۔ شرح کل چھ حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلا حصہ غزلیاتِ غالب اور ان کی شرح کے لیے وقف کیا گیا ہے ، جب کہ دوسرے ، تیسرے اور چوتھے حصے میں علی الترتیب قصائد ، قطعات اور رباعیاتِ غالب کی شرح کی گئی ہے ۔ پانچواں حصہ ضمیمۂ اول کے عنوان سے شامل ہے اور اس میں ایسی غزلیں ، قصائد ، قطعات اور رباعیات شامل ہیں جو مروج دیوان میں شامل نہیں ہیں ۔ آخری حصہ ضمیمۂ دوم کے طور پر شامل ہے اور اس میں نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب دے کر اس کی شرح کی گئی ہے ۔

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۲۸ اپریل ۱۹٦۶ع ، غیر مطبوعہ ۔
۲۔ مکتوب بنام سید قدرت نقوی ، مرقومہ دسمبر ۱۹٦٦ع ، غیر مطبوعہ ۔

تراجم

طبقاتِ ناصری (دو جلد) :

طبقاتِ ناصری ، ابو عمرو منہاج الدین عثمان المعروف منہاج سراج کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے ۔ اسے بعد ازاں عبدالحیؒ حبیبی قندھاری نے اپنے بیش قیمت حواشی کے ساتھ مرتب کیا اور انجمن تاریخ افغانستان نے اسے شائع کیا ۔ مولانا غلام رسول مہر نے انجمن تاریخ افغانستان کے شائع کردہ فارسی ایڈیشن کا اردو ترجمہ کیا ، جو ان کے انتقال کے بعد پہلی بار ۱۹۷۵ع میں مرکزی اردو بورڈ لاہور نے زرین آرٹ پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا ۔ جیسا کہ ذکر آیا ، کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۷۵ع میں شائع ہوئی ۔ لیکن مولانا مہر ۱۹٦۴ع میں اس کا ترجمہ مکمل کر چکے تھے ۔ یہ بات ان کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتی ہے ۔ لکھتے ہیں :

> ''طبقاتِ ناصری کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا ۔ ممکن ہے دس بارہ روز میں ختم ہو جائے ، ان شاء اللہ ۔ اگر میں نے پوری کتاب پہلے بالاستیعاب پڑھی ہوتی تو اس ادارے سے ضروری معاملات طے کرتا جس نے ترجمہ کرایا ۔''[1]

مطالعۂ تاریخ :

''مطالعہ تاریخ'' ہنری سٹیل کومیجر کی انگریزی تصنیف ''The Nature and Study of History'' کا اردو ترجمہ ہے جسے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعاتِ فرینکلن کے تعاون سے پہلی مرتبہ ۱۹۷۲ع میں یعنی مولانا مہر کے انتقال کے بعد علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے ایک ہزار ایک سو کی تعداد میں شائع کیا ۔ گردپوش سے مزین مجلد نسخے کی قیمت دس روپے مقرر کی گئی ہے ۔

''مطالعۂ تاریخ'' کل ۲۰۳ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں فہرست ابواب اور دیباچے کے لیے وقف کیے گئے صفحات کی تعداد بھی شامل ہے ۔

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ سات اگست (مکتوب پر سال ترقیم درج نہیں ، لیکن قرائن سے یہ سنہ ۱۹٦۴ع قرار پاتا ہے) ، غیر مطبوعہ ۔

اخلاق نقطہ نگاہ :

"اخلاق نقطہ نگاہ" کرٹ بائیر کی "The Moral Point of View" کا اردو ترجمہ ہے جسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے پہلی بار ۱۹۷۰ء میں شائع کیا - پہلی بار یہ کتاب ۲۱۰۰ کی تعداد میں شائع ہوئی - "اخلاق نقطہ نگاہ" کے لیے اچھا کاغذ استعمال کیا گیا اور طباعت و کتابت کا بھی مناسب اہتمام ہوا - مجلد کتاب کی قیمت دس روپے مقرر کی گئی -

جزائر فلپین — سر زمین اور باشندے :

مولانا غلام رسول مہر نے جوزفین بڈوان کی انگریزی کتاب "The Land and People of the Philippines" کا اردو ترجمہ "جزائر فلپین — سرزمین اور باشندے" کے نام سے کیا - یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی - اسے مطبوعات فرینکلن نے شیخ غلام علی اینڈ سنز کے تعاون سے طبع کرایا - کتاب کی قیمت چھ روپے مقرر ہوئی -

"جزائر فلپین — سرزمین اور باشندے" ، کل ۱۹۵ صفحات پر مشتمل ہے - اس کتاب میں مقدمہ یا دیباچہ وغیرہ شامل نہیں کیا گیا - کتاب کو کل ۲۲ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس کے بعد ایک ضمیمہ اور ایک اشاریہ بھی شاملِ کتاب ہے -

فکرِ جدید کے سانچے :

"فکرِ جدید کے سانچے" رابرٹ بی - ڈاونز کی کتاب "Molders of the Modren Mind" کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا غلام رسول مہر نے کیا -

"فکرِ جدید کے سانچے" پہلی بار ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی - اشاعت اول کی تعداد ۲۱۰۰ تھی - اسے مطبوعات فرینکلن نے شیخ غلام علی اینڈ سنز کے تعاون سے شائع کیا - مجلد کتاب کی قیمت بیس روپے مقرر کی گئی -

"فکرِ جدید کے سانچے" کل پانچ سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے - اس شمار میں فہرستِ ابواب ، مترجم کے مقدمے اور مصنف کی تمہید کے لیے وقف کیے گئے صفحات کی تعداد بھی شامل ہے جبکہ کتاب کا اشاریہ الگ صفحات میں پیش کیا گیا ہے -

ہٹلر کا عروج و زوال (تین جلد) :

"ہٹلر کا عروج و زوال" ولیم ایل شائرر کی تصنیف "The Rise and Fall of the Third Reich" کا اردو ترجمہ ہے ، جسے مولانا غلام رسول مہر نے تین جلدوں میں پیش کیا ۔ "ہٹلر کا عروج و زوال" مطبوعات فرینکلن نے شیخ غلام علی اینڈ سنز کے تعاون سے علمی پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کی ۔ اس کے لیے بہترین کاغذ اور عمدہ طباعت و کتابت کا بندوبست کیا گیا ۔ "ہٹلر کا عروج و زوال" کی تینوں جلدیں علی الترتیب ۱۹۶۸ع ، ۱۹۶۹ع اور ۱۹۶۹ع میں شائع ہوئیں ۔

بہتر تدریس بہتر مدارس :

"بہتر تدریس بہتر مدارس" کمبل وائیلز کی کتاب "Teaching for Better Schools" کا اردو ترجمہ ہے ، جسے پہلی بار ۱۹۶۷ع میں علمی پرنٹنگ پریس سے طبع کرا کے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شائع کیا ۔ پہلی اشاعت میں یہ کتاب ۲۰۰۰ کی تعداد میں شائع کی گئی ۔ "بہتر تدریس بہتر مدارس" کے لیے اچھے کاغذ اور عمدہ طباعت کا اہتمام کیا گیا ۔ مجلد کتاب کی قیمت دس روپے مقرر کی گئی جسے بعد ازاں ناشرین نے ساڑھے تیرہ روپے تک بڑھا دیا ۔

اڑن کھٹولے سے جٹ طیارے تک :

مولانا غلام رسول مہر نے کینھرائن بی ۔ شپن کی انگریزی تصنیف "A Bridle for Pegasus" کا اردو ترجمہ کیا اور ترجمے نے "اڑن کھٹولے سے جٹ طیارے تک" نام پایا ۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۶ع میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے مطبوعات فرینکلن لاہور کے تعاون سے ۲۱۰۰ کی تعداد میں چھپوا کر شائع کی ۔ کتاب کے لیے اخباری کاغذ استعمال کیا گیا ، البتہ طباعت و کتابت بہتر ہے ۔ گردپوش سے مزین مجلد نسخے کی قیمت چھ روپے مقرر کی گئی ۔

تاریخ تہذیب (دو جلد) :

مولانا غلام رسول مہر نے کرین برائن اور جان بی کرسٹوفر کی کتاب "A History of Civilization" کا اردو ترجمہ "تاریخ تہذیب" کے نام سے کیا ۔

یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی اور اسے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کیا۔

"تاریخ تہذیب" کی پہلی جلد دو ہزار ایک سو کی تعداد میں چھپ کر پہلی بار ۱۹۶۵ء میں منظر عام پر آئی ، جبکہ دوسری جلد پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔

بہتر نگرانی بہتر مدارس :

"بہتر نگرانی بہتر مدارس" کمبل وائیلز کی معروف تصنیف "Supervision for Better Schools" کا اردو ترجمہ ہے ، جو پہلی بار ۱۹۶۵ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے مطبوعات فرینکلن لاہور کے تعاون سے علمی پرنٹنگ پریس سے طبع کرا کے شائع کیا۔

پاکستان ــ معاشرہ اور ثقافت :

جیسا کہ کتاب کے ناشر نے وضاحت کر دی ہے ، ادارہ "Human Relations Files" نے اقوام عالم میں موجود مفاہمت کو تقویت دینے اور مختلف اقوام کے طرز زیست و بود و باش کو سمجھنے کے لیے مختلف ممالک کی معاشرتی صورت حال اور ثقافت و تہذیب کے بارے میں کتابیں لکھوائی تھیں۔ زیر نظر کتاب یعنی "پاکستان ــ معاشرہ اور ثقافت" بھی اسی مقصد کے پیش نظر لکھی گئی۔

"پاکستان ــ معاشرہ اور ثقافت" مختلف محققین مثلاً جان ائرڈ جان جے ہولگمن ، ڈینس برناٹ ، میری جین کینڈی ، موسین برناٹ ، جیمز ڈبلیو سپین ، زکیہ ایگلر اور ہر برٹ ایچ وریلنڈ کی نگارشات پر مشتمل ہے ، جن کو سٹینلی میرن نے یکجا کیا۔ جبکہ مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔

"پاکستان ــ معاشرہ اور ثقافت" کو پہلی بار گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور نے پنجاب پرنٹنگ پریس سے ۱۹۶۵ء میں ۲۰۰۰ کی تعداد میں چھپوا کر شائع کیا۔ مجلد نسخے کی قیمت ساڑھے سات روپے مقرر کی گئی۔

تخلیق :

"تخلیق" ای پال ٹارانس کی انگریزی تصنیف "Creativity" کا اردو ترجمہ ہے ، جو پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ میں ۲۱۰۰ کی تعداد میں شائع ہوا ۔ "تخلیق" شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرائی ۔ "تخلیق" کی قیمت ڈیڑھ روپیہ مقرر کی گئی ۔

خود اعتمادی بڑھائیے :

"خود اعتمادی بڑھائیے" سی گلبرٹ رین کی انگریزی تصنیف "To Increase Your Self Confidence" کا اردو ترجمہ ہے ، جو پہلی بار ۱۹۶۵ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شائع کرایا ۔ اشاعت اول کی تعداد دو ہزار ایک سو تھی ۔ "خود اعتمادی بڑھائیے" کو قدرے موٹے اخباری کاغذ پر شائع کیا گیا ۔ البتہ طباعت عمدہ ہے ۔ غیر مجلد نسخے کی قیمت دو روپے پچاس پیسے مقرر کی گئی ۔ خود اعتمادی بڑھائیے کل ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں پیش لفظ اور فہرستِ ابواب کے لیے مختص کیے گئے صفحات کی تعداد بھی شامل ہے ۔

ذہنِ انسانی کا ارتقاء :

مولانا مہر نے جان ہرمن رینڈل کی انگریزی تصنیف "The Making of Modern Mind" کا اردو ترجمہ کیا ، جو پہلی بار سنہ ۱۹۶۵ء میں مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کی ۔ "ذہنِ انسانی کا ارتقا" کی طباعت میں عمدہ کاغذ استعمال کیا گیا اور مجلد نسخے کی قیمت ۲۰/- روپے مقرر کی گئی ۔

"ذہنِ انسانی کا ارتقا" کل بائیس ابواب اور سات سو چھتیس صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں وہ صفحے بھی شامل ہیں جو مترجم کے پیش لفظ ، مصنف کے دیباچے ، تمہید ، انتساب اور فہرستِ ابواب کے لیے وقف کیے گئے ہیں ۔

سائنس اور عقلِ سلیم :

"سائنس اور عقلِ سلیم" ، جیمز بی ۔ کانٹ کی تصنیف "Science and Common Sense" کا اردو ترجمہ ہے جسے پہلی بار ۱۹۶۵ء میں شائع کیا گیا ۔ اشاعت اول کی تعداد ۲۱۰۰ تھی ۔ مجلد نسخے کی قیمت نو روپے مقرر کی گئی ۔

''سائنس اور عقل سلیم'' کل چار سو چھتیس صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں پیش لفظ از مترجم ، تمہید از مصنف اور فہرست ابواب کے لیے وقف کیے گئے صفحات بھی شامل ہیں ۔ کتاب کا حرفِ آغاز ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر اٹامک انرجی کمیشن پاکستان نے تحریر کیا ہے ۔

سائنس دان ، جنھوں نے دنیا بدل ڈالی :

''سائنسدان ، جنھوں نے دنیا بدل ڈالی'' لن اور گرے پول کی مشترکہ تصنیف ''Scientists who Changed the World'' کا اردو ترجمہ ہے ، جو شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن لاہور کے تعاون سے پہلی بار ۱۹۶۵ء میں شائع کیا ۔ اشاعتِ اول میں یہ کتاب ۲۱۰۰ کی تعداد میں شائع ہوئی ۔ مجلد نسخے کی قیمت پانچ روپے مقرر کی گئی ۔

''سائنسدان ، جنھوں نے دنیا بدل ڈالی'' کل ایک سو چھہتر صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں مصنفین کا دیباچہ ، پیش لفظ از مترجم اور فہرست ابواب کے لیے وقف کیے گئے صفحات کی تعداد شامل نہیں ہے ۔ کتاب کو کل بارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان بارہ ابواب میں سترہ سائنس دانوں کے مختصر حالات زندگی اور ان کے اہم کارنامے پیش کیے گئے ہیں ۔

فکرِ سلیم کی تربیت :

''فکرِ سلیم کی تربیت'' رچلس کی کتاب ''Clear Thinking'' کا اردو ترجمہ ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ء میں اکیس سو کی تعداد میں شائع ہوا ۔ اسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شائع کیا ۔ مجلد کتاب کی قیمت نو روپے مقرر کی گئی ۔

''فکر سلیم کی تربیت'' کل چار سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں مصنف کے ادائے سپاس ، مترجم کے پیش لفظ ، فہرستِ ابواب اور ادارے کی طرف سے اپنی کتابوں کے اشتہارات کے لیے وقف کردہ صفحے بھی شامل ہیں ۔

وہ لوگ جنھوں نے دنیا بدل ڈالی :

''وہ لوگ جنھوں نے دنیا بدل ڈالی'' ایگن لارسن کی تصنیف ہے جس کا اردو ترجمہ مولانا غلام رسول مہر نے کیا ۔ یہ پہلی بار ۱۹۶۵ء میں شیخ

غلام علی اینڈ سنز لاہور نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے اکیس سو کی تعداد میں شائع کی ۔ مجلد نسخے کی قیمت ۳ روپے مقرر کی گئی ۔ کتاب کی جلد پر بھی مختلف تصاویر بنائی گئی ہیں اور یوں بھی کتاب کو جابجا تصاویر سے مزین کیا گیا ہے ۔

''وہ لوگ جنھوں نے دنیا بدل ڈالی'' کل بارہ ابواب اور دو سو چھیانوے صفحات پر مشتمل ہے ۔ بارہ ابواب میں ایسی شخصیات کو پیش کیا گیا ہے جن کی انقلاب آفریں جد و جہد اور نظریات و خیالات نے دنیا کی کایا پلٹ دی ۔ مثلاً پہلے باب میں ''الیکزانڈر گرے ام بیل'' کی شخصیت اور کارناموں کو موضوع بنایا گیا ہے ۔

آزادی کے جنم دن :

''آزادی کے جنم دن'' جینی وبو فورسٹر کی کتاب ''Birthdays of Freedom'' کا اردو ترجمہ ہے جسے مولانا مہر اور عبدالمجید سالک نے ترجمہ کیا ۔ مترجمین نے ترجمے کے علاوہ مختلف ضروری ترمیمات کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں بعض ابواب کا اضافہ بھی کیا ہے ۔

''آزادی کے جنم دن'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹٦۳ء میں اس وقت شائع ہوا جب مولانا عبدالمجید سالک کے انتقال کو بھی کئی برس گزر چکے تھے ۔ اسے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا ۔ مطبوعات فرینکلن کا تعاون بھی اشاعتی مراحل میں شامل رہا ۔ پہلی اشاعت میں ''آزادی کے جنم دن'' کل ۲۱۰۰ کی تعداد میں شائع کی گئی اور اس کی قیمت پانچ روپے مقرر کی گئی ۔

بلجیم — سرزمین اور باشندے :

مولانا غلام رسول مہر نے ڈارتھی لوڈر کی انگریزی کتاب ''The Land and People of Belgium'' کا اردو ترجمہ کیا ، جو پہلی بار ۱۹٦۳ء میں ۲۱۰۰ کی تعداد میں شائع ہوا ۔ اسے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا ۔

جاپان — سرزمین اور باشندے :

''جاپان سرزمین اور باشندے'' جوزفین بلوان کی کتاب ''The Land and People of Japan'' کا اردو ترجمہ ہے ، جسے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے پہلی بار ۱۹۶۴ء میں شائع کیا ۔ اشاعتِ اول کی تعداد ۲۱۰۰ تھی ۔

خلا میں سفر کی پہلی کتاب :

مولانا مہر نے جان بنڈک کی کتاب ''The First book of Space Travel'' کا اردو ترجمہ کیا جسے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن لاہور کے تعاون سے شائع کیا ۔ کتاب پر سنہ اشاعت وغیرہ سے متعلق کوئی اندراج موجود نہیں لیکن بعض قرائن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں شائع ہو چکی تھی ۔

''خلا میں سفر کی پہلی کتاب'' کے ابواب کے عناوین درج ذیل ہیں :

(۱) خلا کیا ہے ؟
(۲) خلا میں کون پہنچا ہے ؟
(۳) ہم کس چیز پر سوار ہیں ؟
(۴) راکٹ کیونکر چلتا ہے ؟
(۵) راکٹ کیوں اڑتا ہے ؟
(۶) وزن غائب ؟
(۷) خلائی لباس ؟
(۸) خلائی پلیٹ فارم ؟

اٹلی — سرزمین اور باشندے :

فرانس ون وار کی انگریزی تصنیف ''The Land of the Italian People'' کا اردو ترجمہ مولانا مہر نے ''اٹلی — سرزمین اور باشندے'' کے نام سے کیا ۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے علمی پرنٹنگ پریس سے طبع کرا کے شائع کی ۔ پہلے ایڈیشن میں کل ۲۱۰۰ نسخے طبع ہوئے ۔ اٹلی — سرزمین اور باشندے کے لیے موٹا سفید لیکن کھردرا کاغذ استعمال کیا گیا ۔ مجلد نسخے کی قیمت چھ روپے مقرر کی گئی ۔

''اٹلی — سرزمین اور باشندے'' کل ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اس شمار میں فہرست ابواب اور مقدمہ از مترجم کے لیے وقف کیے گئے صفحات کی تعداد بھی شامل ہے ۔ کتاب کو تیرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان تیرہ ابواب میں اٹلی کے باشندوں کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کو پیش کر دیا گیا ہے ۔

اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول :

محمد اسد کی انگریزی تصنیف ''Principles of State and Government in Islam'' کا اردو ترجمہ مولانا غلام رسول مہر نے کیا جسے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعاتِ فرینکلن کے تعاون سے پہلی بار ۱۹۶۳ء میں ۲۱۰۰ کی تعداد میں چھپوا کر شائع کیا ۔ ''اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول'' کے لیے موٹا اخباری کاغذ استعمال کیا گیا ، جبکہ اس کی طباعت ٹائپ میں ہوئی ۔ گردپوش سے مزین مجلد نسخے کی قیمت ساڑھے چھ روپے مقرر کی گئی ۔ ''اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول'' کل ۱۷۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں پروفیسر کروے باوم کے پیش لفظ اور مصنف کے دیباچے کے لیے مختص کیے گئے صفحات کی تعداد بھی شامل ہے ۔

ترکی — سرزمین اور باشندے :

''ترکی — سرزمین اور باشندے'' ولیم سپنسر کی انگریزی تصنیف ''The Land and the People of Turkey'' کا اردو ترجمہ ہے ، جو مولانا مہر نے کیا ۔ پہلی مرتبہ یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی اور تعداد اشاعت اول ۲۱۰۰ تھی ۔ ''ترکی ۔ سرزمین اور باشندے'' کو شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شائع کیا اور اس کی قیمت پانچ روپے مقرر کی گئی ۔

جنگِ عظیم :

مولانا غلام رسول مہر نے لوئیس ایل ۔ سنائڈر کی کتاب ''The war, A Concise History 1939 - 1954'' کا اردو ترجمہ ''جنگِ عظیم'' کے عنوان سے کیا ۔ ''جنگِ عظیم'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے ۲۱۰۰ کی تعداد میں شائع کیا ۔ جنگ عظیم کے مجلد نسخوں کی قیمت اٹھارہ روپے مقرر کی گئی ۔

''جنگِ عظیم'' کل ۵۸۹ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں دیباچے ،

مقدمے اور مترجم کی طرف سے تحریر کردہ تعارف کے لیے مختص کیے گئے صفحات کی تعداد بھی شامل ہے ۔ البتہ ''جنگِ عظیم'' کے بعض مناظر کی تصاویر کے لیے وقف کیے گئے صفحات اس شمار میں شامل نہیں ۔ جن تصاویر کا ذکر آیا ہے ان میں چند تصویریں خاص تاریخی لمحوں سے متعلق ہیں ۔ مثلاً ناگا ساکی کی تباہی کا منظر ، جاپان کی طرف سے ہتھیار ڈالنے کی تقریب کا منظر اور کچھ جنگی قیدیوں کے فوٹو وغیرہ ۔ مترجم کے حواشی نے کتاب کو زیادہ مفید بنا دیا ہے ۔

قسطنطنیہ :

''قسطنطنیہ'' شہرۂ آفاق مصنف ہیرالڈ لیم کی انگریزی تصنیف "Constantinople-Birth of an Empire" کا اردو ترجمہ ہے ، جو مولانا مہر نے کیا ۔ اسے پہلی بار ۱۹۶۳ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شائع کیا ۔ اشاعت اول کی تعداد دو ہزار ایک سو تھی ۔ مجلد نسخے کی قیمت آٹھ روپے مقرر کی گئی ۔

''قسطنطنیہ'' کل ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں فہرست ابواب ، مقدمہ از مترجم اور پیش لفظ از مصنف کے لیے وقف کیے گئے صفحات بھی شامل ہیں ۔ کتاب کو کل تین حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلا حصہ سترہ ابواب پر مشتمل ہے اور ترکی کے مشہور شہر قسطنطنیہ یا استنبول کی تقریباً ایک ہزار تین سو پندرہ سال پر محیط تاریخ پیش کرتا ہے ۔ یہ عرصہ ۶۵۰ ق م سے ۶۶۵ع تک محیط ہے ۔ اس دور میں قسطنطین اعظم کے بسائے ہوئے قسطنطنیہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں ۔ مولانا مہر نے قسطنطنیہ کے بارے میں اپنے ایک خط میں لکھا تھا :

> ''پھر . . . ہیرالڈ لیم کی کتاب Constantinople شروع کرتا ہے لیکن بہ انداز خاص ۔ اس کا نصف حصہ میں خود لکھوں گا ۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں ''انداز خاص'' کی وضاحت یہ ہے کہ مولانا مہر نے کتاب کے پہلے حصے کو جوں کا توں ترجمہ نہیں کر دیا ، بلکہ اس کا ملخص

۱۔ مکتوب بنام عبدالسلام اسلم ، مرقومہ ۷ جولائی ۱۹۶۰ع ، غیر مطبوعہ ۔

ابھی کیا ہے تاکہ قارئین غیر ضروری مباحث ، تفصیلات اور جزئیات میں نہ الجھے رہیں - دوسرا حصہ کل تیرہ ابواب پر مشتمل ہے اور ۶۶۵ع سے ۱۹۲۴ع تک کے حالات بیان کرتا ہے - یہی وہ عہد ہے جس میں قسطنطنیہ اپنی تاریخ کے عظیم انقلابات سے دوچار ہوا اور اس عہد میں اس شہر کو جو عظمت حاصل ہوئی وہ اس سے قبل یا بعد میں اب تک اسے حاصل نہ ہو سکی - لیکن پر لطف بات یہ ہے کہ ہیرلڈ لیم کی تصنیف میں یہ حصہ سرے سے موجود نہیں ، اسے مولانا مہر نے خود تصنیف کیا -

یہی صورت ''قسطنطنیہ'' کے تیسرے حصے کے باب میں بھی ہے - اس کے کل سات ابواب ہیں اور اس حصے کا عنوان ''استنبول کے مناظر اور گردوپیش'' ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس حصے میں مولانا مہر نے شہر کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں - اس حصے کے مطالعے کے بعد قسطنطنیہ کے بازاروں ، مسجدوں ، شاہی محلات ، تاریخی عمارتوں ، عجائب خانوں اور کتب خانوں کے بارے میں واقفیت عامہ حاصل ہوتی ہے -

بعض تاریخی ناموں اور مقامات کو مزید واضح کرنے کے لیے مولانا مہر نے کتاب پر جابجا حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے جس سے کتاب اور بھی مفید ہو گئی ہے -

اسلام ـ صراط مستقیم :

مورگن نے ''رونالڈ کمپنی نیویارک'' کی تجویز پر مختلف مذاہب کی صحیح اور سچی تصویر پیش کرنے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے خیال سے اسلام پر مسلمان اہلِ قلم کے مضامین کو اکٹھا کرکے ۱۹۵۸ع میں شائع کیا ، جس کا ترجمہ مولانا مہر نے ''اسلام ـ صراط مستقیم'' کے نام سے کیا اور اس کتاب کو پہلی بار ۱۹۶۲ع میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے ۲۱۰۰ کی تعداد میں چھپوا کر شائع کیا- ''اسلام ـ صراط مستقیم'' کے لیے اخباری کاغذ استعمال کیا گیا ، البتہ لکھائی چھپائی کا عمدہ اہتمام کیا گیا- مجلد کتاب کی قیمت بارہ روپے مقرر کی گئی -

''اسلام ـ صراط مستقیم'' کل ۵۹۴ صفحوں پر مشتمل ہے جس میں کل گیارہ ابواب یعنی مقالے شامل ہیں - پہلا مقالہ ''اسلام کا مبداء'' کے عنوان سے

محمد عبداللہ دراز جامعہ الازہر قاہرہ ، دوسرا مقالہ ''اسلامی تاریخ میں افکار و تحریکات'' کے عنوان سے شفیق غربال جامعہ دول ِ عربیہ ، قاہرہ مصر کا لکھا ہوا ہے ۔ جبکہ باقی مقالوں کے مصنفین علی الترتیب : محمد شلتوت جامعہ الازہر قاہرہ ، ابوالعلا عفیفی جامعہ اسکندریہ مصر ، محمود شہابی تہران یونیورسٹی تہران ، اسحاق موسیٰ حسینی جامعہ دول عربیہ ، حسن بصری قنطائی استنبول ترکی ، مظہر الدین صدیقی سندھ یونیورسٹی پاکستان ، داود سی ایم لنگ قونصل جمہوریہ چین بیروت، حسین دستگیرات انڈونیشیا ، اور محمد راشدی سفیر انڈونیشیا کراچی پاکستان کے لکھے ہوئے ہیں ۔

ان مختلف مقالات میں تحقیقی انداز میں اسلام کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے اور مختلف اسلامی خطوں کے حوالے سے اسلام کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ بعض مقالوں میں یہ بات بھی پیش کی گئی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو کیا دیا اور مسلمانوں نے اسلام کی خدمت کس انداز میں کی ؟

تاریخ ِ شام :

''تاریخ ِ شام'' فلپ کے ۔ حتی کی انگریزی تصنیف ''History of Syria'' کا اردو ترجمہ ہے ۔ اسے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شائع کیا ۔ اس کی اشاعت ِ اول ۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آئی جبکہ مولانا مہر ترجمے کا کام ۱۹۶۰ء میں مکمل کر چکے تھے ۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

> ''فلپ کے حتی کی ''ہسٹری آف سیریا'' کا ترجمہ انشاء اللہ آج ختم ہو جائے گا ۔ یہ بھی بڑا کام تھا ۔''[۱]

''تاریخ شام'' کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا ۔ دوسرے ایڈیشن میں صرف دو تبدیلیاں ہوئیں اور وہ بھی ایسی جن کی کوئی اہمیت نہیں ہے ۔ مثلاً ایک تو یہ کہ اس بار تعداد اشاعت ۲۱۰۰ کی بجائے صرف ۱۱۰۰ رکھی گئی ۔ اس کے علاوہ جلد کا رنگ بدل دیا گیا ۔ اس کے علاوہ دونوں اشاعتوں میں کوئی

۱۔ مکتوب بنام عبدالسلام اسلم مرقومہ ، ۳ جولائی ۱۹۶۰ء ، غیر مطبوعہ ۔

فرق نہیں ہے ، سوائے اس کے کہ دوسری اشاعت کے وقت قدرے میلا اخباری کاغذ استعمال کیا گیا ۔

جزیہ اور اسلام :

"جزیہ اور اسلام" ڈینیل سی ۔ ڈینٹ جولیر کی تصنیف "Conversion and the Polltax in Early Islam" کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا غلام رسول مہر نے کیا ۔ اسے پہلی بار ۱۹۶۲ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شائع کیا ۔ اچھے کاغذ اور عمدہ طباعت کے ساتھ مجلد نسخے کی قیمت دس روپے مقرر کی گئی ۔

"جزیہ اور اسلام" کل ۲۰۷ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں مترجم کے مقدمے کے لیے وقف صفحات بھی شامل ہیں ۔ انگریزی ایڈیشن میں شامل مصنف کے حالات زندگی بھی جو ولیم ٹامس کے تحریر کردہ ہیں ، اردو ترجمے میں شامل کر دیے گئے ہیں ۔

تمہید کے علاوہ "جزیہ اور اسلام" کل چھ ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلے باب میں اہم مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے ، جبکہ باقی ابواب میں مختلف علاقوں مثلاً شام ، مصر اور خراسان وغیرہ میں اسلام کے ابتدائی دور میں غیر مسلموں کے ساتھ اسلامی حکومت و مملکت کے تعلقات بہ سلسلۂ جزیہ رقم کیے گئے ہیں ۔

کتاب کو مفید تر بنانے کے لیے مولانا مہر نے قیمتی حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے ۔ ان حواشی کی مدد سے جابجا مصنف کی غلطیوں کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں ۔

سکندرِ اعظم :

"سکندر اعظم" ہیرلڈ لیم کی کتاب "Alexander of Macedon" کا اردو ترجمہ ہے جسے پہلی بار ۱۹۶۲ء میں مکتبۂ جدید چوک انار کلی لاہور نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے نقوش پریس سے طبع کرا کے شائع کیا ۔ اشاعت اول کی تعداد دو ہزار تھی ۔ کاغذ و طباعت دونوں بہتر ہیں ۔ اس کے علاوہ کتاب کو مجلد کیا گیا ہے ۔ "سکندر اعظم" پر اس کی قیمت درج نہیں ہے ۔

سکندر اعظم کل چار سو بائیس صفحوں پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں فہرست ابواب اور دیباچے کے لیے وقف کردہ صفحات کی تعداد بھی شامل ہے ۔ کتاب کو کل تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سکندر اعظم کی پوری زندگی اور کارنامے پیش کر دیے گئے ہیں ۔

تاریخ لبنان :

تاریخ لبنان پرنسٹن یونیورسٹی میں سامی ادبیات کے اعزازی استاد فلپ کے ۔ حتی نے انگریزی زبان میں مرتب کی تھی ۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا جو پہلی بار ۱۹۶۱ء میں مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کیا ۔ اچھے کاغذ پر طباعت کا عمدہ اہتمام ہے ۔ تاریخ لبنان پر اس کی قیمت درج نہیں کی گئی ۔

تاریخ لبنان کل ۴۹۹ صفحات پر مشتمل ہے ۔ کتاب کے اصل متن کے لیے صرف ۴۸۶ صفحات وقف کیے گئے ہیں ۔ باقی صفحات میں فہرست ابواب ، کتاب میں شامل نقشوں کی فہرست اور مرتب و مترجم کے دیباچے ہیں ۔

عرب اور اہل عرب :

مولانا غلام رسول نے رچرڈ ایچ سنگر کی کتاب 'The Arabian Peninsula' کا اردو ترجمہ کیا جسے مکتبۂ معین الادب لاہور نے مطبوعات فرینکلن لاہور کے تعاون سے پہلی بار ۱۹۶۱ء میں ایک ہزار کی تعداد میں شائع کیا ۔

کتابیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی :

''کتابیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی'' رابرٹ بی۔ ڈاونز کی انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے ۔ یہ ترجمہ پہلی بار ۱۹۶۱ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے چھپوا کر ۲۱۰۰ کی تعداد میں شائع کیا ۔ مطبوعات فرینکلن کی دیگر کتب کے مقابلے میں اس کی طباعت اور اس کے لیے استعمال کیا جانے والا کاغذ بہت ناقص ہے ۔ مجلد کتاب کی قیمت سولہ روپے مقرر کی گئی ۔

''کتابیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی'' کل ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ کتاب کے آخری صفحات میں ناشر نے اپنی دیگر کتابوں کی فہرست شامل کی

ہے ۔ اس طرح ابتدائی چوبیس صفحات کا بھی اصل موضوع سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ان صفحوں میں فہرستِ ابواب اور مترجم و مصنف کے مقدمے بھی آ گئے ہیں ۔

میرے اندر کیا ہے :

''میرے اندر کیا ہے'' ہربرٹ ایس ۔ زم کی انگریزی تصنیف ''What's Inside of Me'' کا اردو ترجمہ ہے ۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۱ع میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے چار ہزار کی تعداد میں شائع کی ۔ کتاب کی قیمت اڑھائی روپے مقرر کی گئی ۔

سو تاریخی واقعات :

''سو تاریخی واقعات'' ولیم اے ۔ ڈیوٹ کی انگریزی کتاب ''100 Greatest Events'' کا اردو ترجمہ ہے ۔ جسے پہلی بار ۱۹۶۰ع میں فیروز سنز لاہور نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شائع کیا ۔ بقول مولانا مہر مطبوعات فرینکلن نے فیروز سنز ایسے تجربہ کار اشاعتی ادارے کی خدمات اس لیے حاصل کیں تاکہ اس کے تعاون سے ''سو تاریخی واقعات'' کو کاغذ ، طباعت اور تصاویر کی عمدگی کے اعتبار سے انگریزی کتب کے معیار تک پہنچایا جائے ۔ کتاب دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ واقعتاً مطبوعات فرینکلن نے اپنے مقصد کو حاصل کر لیا ۔

طیاروں کی پہلی کتاب :

''طیاروں کی پہلی کتاب'' جین بنڈک کی انگریزی تصنیف ''The First book of Airplanes'' کا اردو ترجمہ ہے ۔ ''طیاروں کی پہلی کتاب'' کو پہلی مرتبہ ۱۹۶۰ع میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شائع کیا ۔

کتاب کے لیے بہترین کاغذ اور عمدہ لکھائی چھپائی کا اہتمام کیا گیا ۔ اشاعت اول میں کتاب چار ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی ۔

موٹروں کی پہلی کتاب :

''موٹروں کی پہلی کتاب'' جین بنڈک کی کتاب ''The First book of auto Mobiles'' کا اردو ترجمہ ہے جسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے

مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے پہلی مرتبہ ۱۹۶۰ء میں چار ہزار کی تعداد میں شائع کیا ۔ کتاب کے لیے بہترین کاغذ اور عمدہ طباعت کا اہتمام کیا گیا ۔ جگہ جگہ تصاویر دی گئی ہیں ۔ موٹروں کی پہلی کتاب کی قیمت اڑھائی روپے مقرر کی گئی ۔

آزادیٔ ہند کی کہانی :

''آزادیٔ ہند کی کہانی'' مولانا ابو الکلام آزاد کی بیان کردہ سوانحِ حیات کا ، جسے ہمایوں کبیر نے انگریزی میں ''India Wins Freedom'' کے نام سے تالیف کیا تھا ، اردو ترجمہ ہے ۔

''انڈیا ونس فریڈم'' شائع ہوئی اور اس کے علاوہ اس کے بعض تراجم بھی چھپ کر سامنے آئے تو مولانا مہر نے بعض خارجی اور زیادہ تر داخلی شہادتوں کے باعث ''انڈیا ونس فریڈم'' کو ایسی کتاب ماننے سے انکار کر دیا جو بلا تحریف و ترمیم سرتاپا ابو الاالکلام آزاد کے بیانات پر مشتمل ہو ۔ کیونکہ مولانا مہر کے خیال میں ''انڈیا ونس فریڈم'' میں ایسی بہت سی باتیں تھیں جو ابو الکلام آزاد کے مزاج اور ماضی میں ان کی پیش کردہ آراء سے بالکل مختلف تھیں ۔ غالباً انھی سب تسامحات اور داخلی و خارجی شہادتوں کے اختلاف کو نمایاں کرنے اور ان پر تنقید و تبصرہ کرنے کے لیے مولانا مہر نے ''انڈیا ونس فریڈم'' کا اردو ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا ۔

انڈیا ونس فریڈم کا ترجمہ ''آزادیٔ ہند کی کہانی'' کے نام سے کیا گیا لیکن یہ کتاب چھپنے کے باوجود شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آ سکی ۔ مولانا غلام رسول مہر اس کتاب کے شائع نہ ہونے کی بنیادی وجہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میرا ترجمہ بعض آئینی موانع کے باعث شائع نہ ہو سکا ۔''[1]

آئینی اور قانونی موانعات کے باعث کتاب کے جو نسخے رف کے طور پر شائع ہوئے تھے ، وہ بھی سرکاری افسروں کی نذر ہو گئے ۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ مکتوب بنام انیس جیلانی ، مرقومہ ۳ جنوری ۱۹۶۱ء ، غیر مطبوعہ ۔

"انڈیا ونس فریڈم کا ترجمہ میں نے کیا تھا اور صرف ایک کاپی میرے پاس ہے ۔ باقی کاپیاں سرکاری افسروں کے حوالے ہوئیں جو ۱۹۵۹ء میں اس کتاب کی طباعت کے لیے اجازت دینے کے مجاز تھے ۔"[1]

"آزادیٔ ہند کی کہانی"[2] کے لیے عام اخباری کاغذ استعمال کیا گیا لیکن کتابت و طباعت کا اہتمام خصوصی طور پر کیا گیا ۔ مترجم کی طرف سے تحریر کیے گئے مقدمے کے آخر میں دستخطوں کے ساتھ درج تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب اپریل ۱۹۵۹ء میں طبع ہوئی ۔ اس کے علاوہ کتاب پر کسی قسم کے اندراجات نہیں ہیں ۔ البتہ صفحہ اول پر رف پروف کی مہر ثبت ہے ۔

"آزادیٔ ہند کی کہانی" کل ۳۰۱ صفحوں پر مشتمل ہے ۔ اس شمار میں مقدمۂ مترجم اور فہرست ابواب کے لیے مختص کیے گئے صفحوں کی تعداد شامل نہیں ہے ۔ کتاب کو کل انیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلے سترہ باب ابو الکلام آزاد کی حیات کے مختلف ادوار پیش کرتے ہیں ، جبکہ آخری دو ابواب میں سے پہلے کا عنوان "خاتمۂ سخن" اور آخری کا "ضمیمہ" ہے ۔ مترجم نے جابجا حواشی درج کر کے کتاب کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے ۔

اسلام اور قانونِ جنگ و صلح :

"اسلام اور قانون جنگ و صلح" مشہور ماہر علوم اسلامیہ مجید خدوری کی تصنیف ہے ، جو انھوں نے انگریزی زبان میں لکھی تھی ۔ یہ کتاب ذرا مختلف شکل میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۱ء میں انگلستان سے شائع ہوئی ۔ بعد ازاں موجودہ صورت میں جان ہاپکنس پریس میں طبع ہو کر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی ۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ مولانا مہر نے کیا اور یہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ء میں الشاہ پریس اردو بازار سے طبع ہو کر مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے مکتبہ معین الادب نے شائع کی ۔ مجلد نسخے کی قیمت ۹ روپے مقرر کی گئی ۔

"اسلام اور قانون جنگ و صلح" کل ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے ۔

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۲۷ مارچ ۱۹۶۷ء ، غیر مطبوعہ ۔

۲۔ "آزادیٔ ہند کی کہانی" کا وہ نسخہ جو مولانا مہر کے پاس تھا اور جس کا ذکر ان کے مکتوب سے اقتباس میں بھی آیا ہے ، آج کل محمد عالم مختار حق کے ذاتی کتب خانے کی زینت ہے ۔ راقم نے وہیں سے استفادہ کیا ۔

انسائیکلو پیڈیا تاریخِ عالم (تین جلد) :

''انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم'' ہارورڈ یونیورسٹی کے ''William L. Langer''
کی کتاب ''An Encyclopedia of World History'' کا اردو ترجمہ ہے ۔
مولانا مہر نے اس انسائیکلو پیڈیا کا اردو ترجمہ تین جلدوں میں کیا اور حسب
ضرورت اس میں اپنی جانب سے کچھ اضافے اور ترامیم بھی کیں ۔ بعض جگہ
نئے سرے سے ترتیب و تہذیب کی ضرورت پیش آئی تو واقعات کو مربوط
سلسلے میں پیش کرنے کی غرض سے مولانا مہر اس مرحلے سے بھی گزرے اور
یوں ترجمے کے علاوہ ایک زیادہ جامع تحریر معرض وجود میں آ گئی ۔

''انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم'' کی پہلی جلد پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ع میں شائع
ہوئی ۔ اس کے دوسرے دو ایڈیشن علی الترتیب ۱۹۶۱ع اور ۱۹۶۸ع میں
آئے ۔ دوسری جلد بھی پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ع میں شائع ہوئی اور اس کا دوسرا
ایڈیشن ۱۹۶۹ع میں شائع ہوا ۔ اسی طرح تیسری جلد پہلی مرتبہ ۱۹۶۰ع میں
شائع ہوئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۷ع میں اشاعت پذیر ہوا ۔

''انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم'' کی ہر جلد اور اس کی تمام اشاعتیں شیخ
غلام علی اینڈ سنز لاہور نے مطبوعات فرینکلن کے تعاون سے شائع کیں اور ہر
ایڈیشن میں تعداد اشاعت ۲۱۰۰ رہی ۔ انسائیکلو پیڈیا کے لیے بہترین کاغذ اور
ٹائپ کی طباعت کا اہتمام کیا گیا ۔ گرد پوش سے مزین مجلد نسخوں کی قیمتیں
علی الترتیب چودہ ، چودہ اور بیس روپے مقرر کی گئیں ۔ واضح رہے کہ یہ
قیمتیں ہر جلد کے آخری ایڈیشن کی تھیں ۔

انسائیکلو پیڈیا کی جلد اول جس کا ذیلی عنوان ''تاریخِ اسلام'' ہے ، صرف
اسلامی دنیا کی تاریخ پیش کرتی ہے ۔ ظاہر ہے ولیم ایل لینگر کے انسائیکلو پیڈیا
میں اس حصے کی شکل یہ نہیں تھی ، بلکہ تاریخ کے مختلف واقعات کے ساتھ ساتھ
زمانی ترتیب کے ساتھ اسلامی تاریخ کے واقعات کا ذکر بھی کر دیا گیا تھا ۔
لیکن مولانا غلام رسول مہر نے اسے ایک مکمل اور علیحدہ جلد کی شکل دے
کر زیادہ مفید بنا دیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب بہ آسانی اور ایک تسلسل کے
ساتھ اسلامی تاریخ قارئین کے سامنے آ جاتی ہے ۔

جلد اول ، جو ظہور قدسی سے شروع ہوتی ہے اور مسلم ملکوں میں

وقوع پذیر ہونے والے ۱۹۵۹ء تک کے حالات پیش کرتی ہے ، کل چون ابواب پر مشتمل ہے ، جبکہ انسائیکلو پیڈیا جلد دوم میں کل پانچ حصے ہیں ۔ پہلا حصہ جو بطور تمہید رقم کیا گیا ہے ، مزید تین ابواب پر مشتمل ہے ۔ اس حصے میں تاریخ کے مبادیات سے متعلق مباحث کے علاوہ سنگی دور کے انسان کی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے ۔ دوسرا حصہ قدیم انسانی تہذیبوں اور ممالک کی تاریخ بیان کرنے کے لیے وقف کیا گیا ہے ۔ تیسرے حصے میں قرون وسطیٰ کی تاریخ پیش کی گئی ہے ، جبکہ چوتھے حصے میں انقلابِ فرانس تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور پانچویں حصے پر کتاب ختم ہو جاتی ہے ۔ اس حصے میں نپولین کے عہد حکومت تک کے حالات آ گئے ہیں ۔

انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم کی آخری جلد میں عہدِ نپولین کے بعد سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں ۔ اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ دوسرے ایڈیشن میں گزشتہ چند سال میں پیش آنے والے اہم واقعات کو مزید بڑھا دیا گیا تھا ۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ولیم ایل لینگر کے انسائیکلو پیڈیا میں ۱۹۵۰ء تک کی تاریخ بیان کی گئی تھی ۔ گویا اس جلد میں بھی مولانا مہر نے اپنی جانب سے قابلِ قدر اضافہ کیا ۔

تینوں جلدوں کے بارے میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان میں جا بجا نقشوں کا اہتمام کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ مولانا مہر نے جا بجا حواشی درج کیے ہیں اور یوں کتاب کو زیادہ مفید بنا دیا ہے ۔

مطالعۂ تاریخ (دو جلد) :

آرنلڈ جے ۔ ٹائن بی ''مطالعۂ تاریخ'' لکھنے بیٹھے تو اس کی دس جلدیں مرتب کر دیں ۔ ظاہر ہے کہ ان دس جلدوں سے عوام تو عوام خواص بھی استفادہ کرنے میں دقت محسوس کرتے تھے ۔ اس بنا پر ڈی ۔ سی ۔ سمرویل نے ''مطالعۂ تاریخ'' کا ملخص دو جلدوں میں پیش کیا ۔ پہلی چھ جلدوں کا ملخص ایک جلد میں اور دوسری جلد میں ٹائن بی کی تصنیف کردہ آخری چار جلدوں کی تلخیص کی گئی ۔ مولانا غلام رسول مہر نے ڈی ۔ سی ۔ سمرویل کی تلخیص کردہ ''مطالعۂ تاریخ'' کا ترجمہ کیا ۔ پہلی جلد پہلی مرتبہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی ۔ اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے زرین آرٹ پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ۔ جبکہ اس کا دوسرا ایڈیشن دسمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ۔ دوسری طباعت میں تعداد اشاعت ۱۱۰۰ تھی ۔

مطالعۂ تاریخ کی دوسری جلد پہلی مرتبہ مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے مارچ ۱۹۶۳ء میں ۱۱۰۰ کی تعداد میں شائع کی گئی ۔ دونوں جلدوں کے لیے بہترین کاغذ اور ٹائپ کی طباعت کا اہتمام کیا گیا ۔ مجلد نسخوں کی قیمت علی الترتیب بائیس اور سولہ روپے مقرر کی گئی ۔

مطالعۂ تاریخ جلد اول کل ۸۸۹ صفحات پر مشتمل ہے ، جبکہ پہلے ایڈیشن میں تعداد صفحات ۱۰۳۸ تھی ۔ اس شمار میں فہرست ابواب اور مقدمے و دیباچے کے لیے وقف کیے گئے صفحات بھی شامل ہیں ۔

☆ ☆ ☆

تیسرا باب

غلام رسول مہر بحیثیت صحافی

روزنامہ انقلاب کی سیاسی خدمات

گرد و پیش کی زندگی سے متعلق واقفیت حاصل کرنے کا ذوق جتنا قدیم ہے نشر و اشاعت اور معلومات بہم پہنچانے کے اہم ذریعے کے طور پر صحافت کی داستان بھی اتنی ہی قدیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخبار یا اخبار سے مماثل صورتوں کا سراغ مصر جیسی قدیم تہذیبوں کے دور میں بھی ملتا ہے۔ لیکن اردو میں اخبار و صحافت کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ غالباً اس کی ایک وجہ تو خود اردو زبان کی نوزائیدگی ہے۔ دوسرے یہ بھی کہ وسیع پیمانے پر اردو کی ترویج و اشاعت کے باوجود اسے ایک عرصے تک سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں طباعت کی سہولتیں نہ ہونے کے باعث بھی اردو اخبارات کا اجراء نہیں ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' بہت تاخیر سے منظر عام پر آیا۔ ''جام جہاں نما'' پہلی بار ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے نکلا۔ تاہم اخبار بین طبقے کا اردو کی طرف مناسب رجحان نہ ہونے کے باعث اردو کے اس اولین اخبار نے بھی بہت جلد ذریعۂ ابلاغ و اظہار کے طور پر اردو کی بجائے فارسی کو اپنا لیا۔

اردو کا دوسرا اخبار، جسے اب تک اردو زبان کا پہلا اخبار قرار دیا جاتا رہا ہے، ''دہلی اخبار'' تھا جو ۱۸۳۶ء کے اواخر میں دہلی سے جاری کیا گیا۔ اس کے مالک مولوی محمد باقر تھے، جنہوں نے اپنے گھر میں چھاپہ خانہ قائم کرکے ''دہلی اخبار'' کو ہفت روزہ اخبار کے طور پر جاری کیا۔ مئی ۱۸۴۰ء تک یہ اخبار ''دہلی اخبار'' کے نام سے نکلتا رہا لیکن دس مئی ۱۸۴۰ء سے اس کا نام ''دہلی اردو اخبار'' کر دیا گیا اور یہ اخبار ۱۸۵۷ء میں مولوی محمد باقر کی شہادت تک نکلتا رہا۔

"سید الاخبار" دہلی سے جاری ہونے والا دوسرا پرچہ تھا ۔ یہ بھی ۱۸۳۷ع ہی میں منظرِ عام پر آیا ۔ اس کے مالک سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں تھے ۔ ان دو تین اخبارات کے علاوہ اس دور میں دہلی اور نواح دہلی کے علاوہ دکن ، پنجاب ، لکھنؤ اور بنگال سے کئی اور اردو اخبار بھی منصۂ شہود پر آئے لیکن یہ سب کے سب ہفت روزہ تھے ۔ اردو کا پہلا روزنامہ ۱۸۵۸ع میں "اردو گائیڈ" کے نام سے جاری ہوا ، جیسا کہ عبدالسلام خورشید اودھ اخبار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"بلاشبہ اُنیسویں صدی کا بہترین اردو روزنامہ تھا لیکن محققینِ صحافت کا یہ بیان درست نہیں کہ وہ اردو کا پہلا روزنامہ تھا ۔ یہ شرف کلکتہ کے اخبار "اردو گائیڈ" کو حاصل تھا جو ۱۸۵۸ع میں مولوی کبیر الدین احمد خان بہادر نے جاری کیا ۔"[1]

اردو روزناموں میں اولیت کا تاج بے شک "اردو گائیڈ" ہی کے سر ہے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سارے عہد میں جو شہرت "اودھ اخبار" کے حصے میں آئی وہ کسی دوسرے اخبار کو نصیب نہیں ہو سکی ۔ "اودھ اخبار" پہلی مرتبہ ۱۸۵۸ع میں منشی نولکشور نے لکھنؤ سے جاری کیا ۔ پہلے یہ ہفت روزہ اخبار کی حیثیت سے نکلتا رہا لیکن ۱۸۷۳ع میں اسے روزانہ اخبار کی شکل دے دی گئی ۔ "اودھ اخبار" نہ صرف نوے سال تک زندہ رہا بلکہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بھی اس کا شمار اُنیسویں صدی کے چند بڑے بڑے اردو اخبارات میں ہوتا ہے ۔ اودھ اخبار اور اس کے معاصر روزناموں کی خدمات کے باوجود یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ جدید اردو صحافت کا آغاز اُنیسویں صدی کے آخری برسوں میں جاری ہونے والے دو اخباروں "اخبارِ عام" اور "پیسہ اخبار" سے ہوتا ہے ۔ "اخبارِ عام" کے مالک پنڈت مکند لال تھے جبکہ پیسہ اخبار کے مالک منشی محبوب عالم تھے ۔ یہ دونوں اخبار اپنی تعداد اشاعت کے اعتبار سے بھی دیگر اخبارات کے مقابلے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ تعداد اشاعت میں بے حد اضافے کا ایک سبب ان کی قیمت بھی تھی ۔ یہ دونوں اخبار صرف ایک پیسے میں مل جاتے تھے اور اسی لیے خواص کے علاوہ پڑھے لکھے عام لوگوں کی دسترس میں بھی تھے ۔

۱۔ صحافت ــ پاکستان و ہند میں : از عبدالسلام خورشید ، ص ۱۵۹ ، اشاعت دوم ، مکتبۂ کارواں ، لاہور ۔

اُنیسویں صدی میں جاری ہونے والے تمام اردو رسائل و اخبار ، خواہ وہ ہفت روزہ ہوں یا روزنامے ، مزاج کے اعتبار سے تقریباً ایک جیسے ہی تھے - "دہلی اردو اخبار" کو چھوڑ کر ، جس کے مالک نے سلطنتِ مغلیہ سے وابستگی رکھنے اور انگریزوں کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر اُکسانے کے جرم میں شہادت پائی تھی ، جام جہاں نما سے سید الاخبار ، کوہ نور ، اودھ اخبار ، سائنٹیفک سوسائٹی گزٹ ، تہذیب الاخلاق اور اخبارِ عام و پیسہ اخبار تک تقریباً سب اخبار اپنی پالیسی کے اعتبار سے انگریزی راج کے گن گانے والے تھے - لیکن بیسویں صدی اپنے جلو میں جن سیاسی ہنگامہ آرائیوں کو لے کر آئی ان کے طفیل اردو اخبارات کے لب و لہجہ میں بھی ایک نمایاں تغیر نظر آتا ہے - یہ امر ہمیشہ فیصلہ طلب رہے گا کہ بیسویں صدی میں ابوالکلام آزاد ، محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں ایسے صحافیوں کے باعث سیاسی ہنگاموں ، ہڑتالوں اور تحریکات کا بازار گرم ہوا یا ان سیاسی ہنگاموں نے ان بے مثال اور عظیم الشان صحافیوں کو جنم دیا - بہرحال صورت کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی اپنے جلو میں ہندوستان میں عام سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کے لیے بھی ایک نئے دور کو لے کر آئی - اس کی غالب وجہ ۱۸۸۵ع میں آل انڈیا کانگرس کا قیام تھا جس نے ابتدا میں تو بے شک خیرخواہ حکومتِ ہند کا کردار ادا کیا لیکن بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اس کا عام لہجہ بھی قدرے متغیر ہو گیا - اسلامیانِ ہند سر سید کی تمام تر مصالحانہ کوششوں کے باوجود ابھی تک ۱۸۵۷ع کے انقلاب کے داغوں کو فراموش نہیں کر سکے تھے - یہ ایسے داغ تھے جن کو سید احمد شہید کی تحریک سے وابستہ بچے کھچے لیکن درجہء عزیمت پر فائز مجاہدین روشنی و حرارت بہم پہنچا رہے تھے - اس دور کی سیاسی بیداری اور اہلِ ہند کے حقوق کے تحفظ کے جذبے کا اظہار اس دور کے اخبارات ہی کے ذریعے ممکن ہوا - اس عہد میں اردو صحافت کے بنیادی خد و خال اور رویے متعین کرنے میں جن عظیم الشان صحافیوں نے حصہ لیا ان میں ابوالکلام آزاد ، مولانا محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں کے نام نمایاں ہیں - دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا مہر کو ان تینوں بزرگوں سے استفادے کا موقع ملا - ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں سے مولانا مہر براہِ راست متاثر ہوئے جبکہ مولانا مہر نے مولانا جوہر سے بالواسطہ طور پر اثرات قبول کیے -

مولانا مہر ۱۹۱۰ع میں بغرض تعلیم لاہور آئے تو لاہور سیاسی ہنگاموں کا مرکز بنا ہوا تھا - علامہ اقبال کی نظموں اور ظفر علی خاں کے 'زمیندار' نے

مسلم نوجوانوں کے دلوں میں ایک آگ سی لگا رکھی تھی - تعلیمی زندگی کے آخری برسوں میں مولانا مہر ''الہلال'' کا مطالعہ بھی کرنے لگے - انھی اثرات کے باعث ان کا دل سرکاری ملازمت سے نفور ہوگیا اور مولانا مہر نے اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا - لیکن چونکہ یہ زمانہء جنگ تھا اور اس زمانے میں اخبار کے اجرا میں بہت دشواریاں حائل تھیں لہذا وہ حیدرآباد دکن چلے گئے اور ملازمت اختیار کرلی - مولانا نے یہاں سے بھی اپنا اخبار جاری کرنے کی کوشش کی جس کا نام بھی تجویز کر لیا گیا لیکن ''سلطنت'' کے اجراء کا منصوبہ ابھی تشنہء تکمیل تھا کہ انھیں حیدرآباد دکن چھوڑ کر جالندھر آنا پڑا - یہاں کچھ عرصہ مجلسِ خلافت کی مصروفیتوں میں گزرا - انھی دنوں اپنے ایک دوست پروفیسر عبدالقادر کے توسط سے مولانا مہر کو روزنامہ ''زمیندار'' میں کام کرنے کا موقع میسر آیا - یہ نومبر ۱۹۲۱ع کی بات ہے جب مولانا مہر کی صحافی بننے کی دلی آرزو پوری ہوئی - اُس زمانے میں چونکہ مولانا ظفر علی خاں، اختر علی خاں اور عبدالمجید سالک قیدِ فرنگ میں تھے، لہذا اداریہ نویسی کا مشکل کام مولانا مہر کے سپرد ہوا جسے مولانا مہر نہایت سلیقہ مندی سے نبھاتے رہے تا آنکہ اواخر مارچ ۱۹۲۷ع میں مہر و سالک کو ''زمیندار'' سے الگ ہونا پڑا اور انھوں نے دوستوں کے تعاون سے روزنامہ ''انقلاب'' جاری کیا جس کا پہلا پرچہ ۲ - اپریل ۱۹۲۷ع کو منظرِ عام پر آیا - انقلاب قیامِ پاکستان کے بعد اکتوبر ۱۹۴۹ع میں بند ہوگیا - اس کے بعد اگرچہ مولانا مہر کچھ دن روزنامہ ''آفاق'' سے بھی وابستہ رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی صحیفہ نویسی کا قابلِ ذکر دور نومبر ۱۹۲۱ع سے اکتوبر ۱۹۴۹ع تک یعنی تقریباً اٹھائیس برس پر محیط ہے - اگرچہ اخبار و صحافت سے یہ ۲۸ سالہ وابستگی بھی مولانا مہر کو ایک عظیم صحافی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے لیکن بطور صحافی مولانا کی اصل متاع وہ سلیقہ مندی ہے جس کا اظہار روزنامہ زمیندار و انقلاب کے فائل دیکھنے سے ہوتا ہے اور جس کا اعتراف اس دور کے تقریباً سب ہی قابلِ ذکر صحافیوں نے کیا ہے - بطور صحافی مولانا مہر کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اپنوں کے علاوہ غیروں نے بھی ان کی بڑائی کو تسلیم کیا - جیسا کہ علی محمد راشدی لیاقت نہرو معاہدے کے ضمن میں پیدا ہونے والی بعض پیچیدگیوں کو رفع کرنے کے سلسلے میں مولانا مہر اور بھارتی صحافیوں کے درمیان کلکتہ میں ہونے والی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہیں :

''ان میں سے بہت سارے لوگ مولانا مہر کو ذاتی طور پر جانتے تھے ۔ مولانا اور میں میٹنگ میں پہنچے تو مولانا کو دیکھ کر وہ کسی قدر مرعوب ہو گئے ۔ میں نے محسوس کیا کہ مولانا کے لیے ان سب کو بے انتہا احترام تھا ۔ وہ ان کو مولانا آزاد کا ہم پلہ صحافی سمجھتے تھے ۔''[۱]

یہ بات مستزاد ہے کہ خود ابوالکلام آزاد بھی مولانا مہر کو ایک بلند پایہ صحافی کا درجہ دیتے تھے ، بصورت دیگر کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ مولانا مہر کو زمیندار سے تعلق منقطع کر کے روزنامہ خلافت کی ادارت سنبھالنے کی پیشکش کرتے ، جیسا کہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''اخبار خلافت روزانہ ، جو مرکزی خلافت کمیٹی کی جانب سے بمبئی میں جاری ہے ، آج کل سخت بدنظمی کی حالت میں ہے ۔ بدنظمی انتظام اور پریس کی نہیں ، تحریر اور ایڈیٹری کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بالفعل اس کی ایڈیٹری کا چارج لے لیں ۔''[۲]

مولانا آزاد کے علاوہ محمد علی جوہر جیسے صحافی بھی مولانا مہر کے بارے میں ایسا ہی نقطۂ نظر رکھتے تھے ۔ مولانا جوہر نے بھی ''ہمدرد'' کی ادارت کے لیے مولانا مہر کو بلانا چاہا تھا ۔ اس امر کا اندازہ مولانا محمد عرفان کے ایک خط سے ہوتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ ''ہمدرد'' کے لیے آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ مولانا کے پاس کوئی شخص نہیں جو اخبار کی شان کو قائم رکھ سکے ۔ وہ سخت پریشان ہیں ۔ واقعی اگر آپ تشریف نہیں لائیں گے تو عجب نہیں کہ ہمدرد ختم ہو جائے ۔''[۳]

۱۔ مولانا مہر کی رفاقت میں ایک سفر : از علی محمد راشدی ، روزنامہ جنگ ، کراچی ، ۵ جون ۱۹۷۲ء ۔

۲۔ نقش آزاد ، ص ۴ - ۵ ۔

۳۔ مکتوب بنام مولانا مہر ، مشمولہ مکاتیب نمبر ۲ ، ص ۹۱۶ ، نقوش لاہور ۔

مولانا جوہر کی طرف سے روزنامہ ہمدرد کی ادارت کی پیشکش کے واقعے کی تصدیق کرتے ہوئے مولانا غلام رسول مہر اپنے ایک خط میں مولانا جوہر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ایک زمانے میں میرے نہایت عزیز دوست مولانا عرفان مرحوم کے ذریعے سے مجھے ''ہمدرد'' میں بلانے کی کوشش کی تھی ۔ میں جانتا تھا کہ مولانا محمد علی مرحوم کی رفاقت میں اسلامی اور عالمی مسائل سے آگاہی کے بہترین مواقع حاصل ہوں گے لیکن میرے حالات ایسے تھے کہ جا نہیں سکتا تھا ۔''۱

یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ مولانا جوہر نے اچھے صحافی کے لیے جن خصوصیات کو ضروری قرار دیا ہے وہ مولانا مہر میں بدرجۂ اتم موجود تھیں ۔ مولانا جوہر نے ایک اچھے صحافی کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے اپنے اخبار کامریڈ میں لکھا تھا :

''صحافی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ واقعات کو پوری صحت سے درج کرے ۔ اسے خیال رکھنا چاہیے کہ واقعاتی صحت کا معیار اتنا بلند ہو کہ مؤرخ اس کی تحریروں کی بنیاد پر تاریخ کا ڈھانچا کھڑا کر سکے ۔ صحافی رائے عامہ کا ترجمان ہی نہیں ، راہنما بھی ہوتا ہے ۔ اسے صرف عوام کے دعاوی کی تائید و حمایت نہیں کرنی چاہیے بلکہ صحافتی منبر سے عوام کو درس بھی دینا چاہیے ۔''۲

''زمیندار'' اور ''انقلاب'' کے صفحات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا غلام رسول مہر کی تقریباً تمام صحافتی تحریریں صحت واقعات اور عوام الناس کی ترجمانی اور رہنمائی کرنے کے معیار پر پوری اترتی ہیں ۔ دراصل ان سب امور کا خود مولانا مہر کو بھی بہت احساس رہتا تھا جیسا کہ ان کی اس ادارتی تحریر سے واضح ہوتا ہے جو انھوں نے ہندو اخبارات کی غلط بیانیوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھی تھی ۔ انھوں نے لکھا :

۱۔ مکتوب بنام الیاس جیلانی ، مرقومہ ۱۱ جولائی ۱۹۶۵ع ۔

۲۔ روزنامہ ''کامریڈ'' ، ۶ جنوری ۱۹۱۲ع ، بحوالہ ''صحافت پاکستان و ہند'' ، ص ۱۹۷ - ۱۹۸ ۔

"ہم سب کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے - ہمارے معرض وجود میں آنے کا مدعا محض یہ ہے کہ پبلک کو صحیح راستے پر چلائیں - عوام تک صحیح حالات پہنچائیں - غلط بیانیوں اور دروغ بافیوں کے ذریعے سے ذاتی کاوشوں ، ذاتی رنجشوں یا جماعتی اختلافوں کے ناپاک جذبات کی تسکین سے ہمیں بالکل الگ رہنا چاہیے . . . نکتہ چینی اور تنقید کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہوا ہے ، لیکن اس کے لیے واقعات کی صحت کا خیال رکھنا اور تحریر کو شریفانہ تخاطب کے دائرے سے متجاوز نہ ہونے دینا ضروری ہے -"[1]

مولانا مہر کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ لکھنے والے میں کون کون سی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے - اس سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ اولین چیز قدرتِ تحریر ہے - پھر یہ کہ جس موضوع پر لکھا جائے اس کے متعلق وسیع معلومات ہونی چاہییں - اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ دل کی بات ہو اور اس میں خلوص کا جذبہ ہو - جیسا کہ مولانا مہر اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"لکھنے والے میں تین باتوں کا جمع ہونا ضروری ہے - تین باتیں یہ ہیں : اول لکھنے پر قدرت ، دوم جس موضوع پر لکھا جائے اس کے متعلق فراہمیِ معلومات پر خاص توجہ - تیسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے اس میں دلی تڑپ اور خلوص کی روح کارفرما ہو -"[2]

قدرتِ تحریر کے ضمن میں تو مولانا مہر کی شخصیت کو متنازعہ و مجروح قرار ہی نہیں دیا جا سکتا - جہاں تک موضوع سے متعلق فراہمی معلومات کا تعلق ہے تو یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ تاریخ سے لگاؤ اور محققانہ مزاج کے باعث ان کی صحافتی تحریروں میں بھی یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ہے - جو شخص اخبار کا مدیر ہونے کے باوجود صحیح رپورٹنگ کے خیال سے سیاسی جماعتوں کے جلسوں تک میں خود شرکت کرتا ہو ، ملتان ایسے دور دراز شہر میں ہونے

۱- روزنامہ انقلاب ، ۱۸ جون ۱۹۳۷ء -

۲- مکتوب بنام حمزہ فاروقی ، مرقومہ ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ء ، غیر مطبوعہ -

والے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں واقعی صورت حال جاننے کے لیے خود ملتان تک کا سفر اختیار کرتا ہو اور آلِ سعود کے بارے میں پھیلنے والی افواہوں کی تصدیق و تردید کے لیے خود حجاز مقدس جا کر اور روضۂ نبوی کی چھت تک پہنچ کر صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہو، اس کی تحریروں میں صحتِ واقعات کا معیار از خود اس بلند سطح کو چھونے لگتا ہے جس کو بنیاد بنا کر مؤرخ تاریخ کی عظیم الشان عمارت کھڑی کر سکے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ واقعہ اس دور کا ہے جب ۱۹۳۱ء میں تحریکِ کشمیر زوروں پر تھی اور حکومتِ کشمیر نے ریاستی حدود میں انقلاب کے داخلے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس پابندی کو عملاً بے اثر بنانے کے لیے عملۂ انقلاب نے کشمیری مسلمان، مظلوم کشمیر اور مکتوب کشمیر کے نام سے اخبار شائع کر کے ریاست میں بھیجنے شروع کیے۔ کشمیر سے متعلق خبروں کی فراہمی کا واحد ذریعہ بعض مسلمان کشمیری نوجوان تھے لیکن مدیرانِ ''انقلاب'' کو یہ خدشہ محسوس ہوا کہ ممکن ہے یہ نوجوان حکمرانوں کی طرف سے ہونے والے مظالم کی جانب دیگر اہلِ ہند کی توجہ مبذول کرانے کے لیے اصل واقعات میں مبالغہ و اضافہ کریں۔ اس خدشے کے سدِ باب کے لیے مدیرانِ انقلاب نے ان نوجوانوں سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے وہ اس امر کے پابند ہوگئے کہ غلط اطلاعات فراہم نہیں کریں گے اور مدیرانِ انقلاب نے یہ عہد کیا کہ انقلاب میں ان نوجوانوں کے نام شائع نہیں کریں گے تاکہ وہ حکمرانوں کے انتقام کا براہِ راست نشانہ بننے سے محفوظ رہیں۔ اس واقعے سے جہاں مدیرانِ انقلاب کی پیشہ ورانہ دیانت سامنے آتی ہے، وہیں یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ مولانا مہر صحافت کو مقدس جھوٹ اور مصلحت آمیز سچائی کی بجائے بے رحم صداقت تصور کرتے تھے۔ مولانا مہر نے اپنی تحقیقی و تاریخی کاوشوں کے علاوہ اپنے اخبار کے صفحات میں بھی صداقت و سچائی کو ایسے ہی بے رحمانہ انداز میں پیش کیا۔ انقلاب کے صفحات میں صحت واقعات کے اہتمام کا ذکر کرتے ہوئے عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

> ''یہ جو کچھ لکھتا تھا یا کوئی مراسلہ چھاپتا تھا، اس میں درج شدہ امور کی صحت کا یقین کر کے چھاپتا تھا چنانچہ ان مراسلات اور مقالات کی تردید عموماً ممکن نہیں ہوتی تھی۔''[1]

۱- صحافت ــ پاکستان و ہند میں، ص ۲۴۲ -

جہاں تک لکھنے والے کے لیے عائد کردہ تیسری شرط کا تعلق ہے ، یعنی جو کچھ لکھا جائے اس میں دلی تڑپ اور خلوص شامل ہو ، اس باب میں کچھ کہنا ممکن نہیں کیونکہ دلی تڑپ اور خلوص دونوں ایسی چیزیں ہیں جن کا اندازہ کرنے کے لیے اب تک ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں ، البتہ یہ امر قابل غور ہے کہ انقلاب کے توسط سے مولانا مہر نے قوم کے سامنے کیا پیش کیا ؟ بطور صحافی رائے عامہ کی کس حد تک ترجمانی کی ؟ اور صحافتی منبر سے راہنمائی کرتے ہوئے قوم و ملت کو کس منزل کی جانب گامزن کرنے کی کوشش کی ؟ دراصل یہ ساری بحث مدیران انقلاب کے انداز فکر ، ان کی سیاسی پالیسیوں اور ان کی ترجیحات کی طرف لے جاتی ہے -

مولانا مہر کی سیاسی پالیسیوں اور ترجیحات کے جائزے کے لیے ان کے صحافتی زمانے کو چار مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - پہلا دور ان کی صحافتی زندگی کی ابتدا سے ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد تک کے زمانے پر مشتمل ہے - دوسرا دور ۱۹۳۰ء کے بعد کے حالات سے لے کر ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری تک کے دس سالہ زمانے پر محیط ہے ، جبکہ تیسرے دور میں قرارداد پاکستان کی منظوری سے پاکستان کے قیام تک کا زمانہ شامل ہے اور چوتھا دور ۱۹۴۷ء سے اکتوبر ۱۹۴۹ء یعنی روزنامہ انقلاب کی بندش تک کے زمانے کا احاطہ کرتا ہے -

مولانا مہر کی صحافتی زندگی کا پہلا دور تقریباً نو سال پر محیط ہے - اس زمانے میں انھوں نے دو اخباروں یعنی ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' میں ادارتی کالم قلمبند کیے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمیندار سے قطع تعلق کرنے اور انقلاب کے اجراء سے مولانا مہر کے سیاسی نقطۂ نظر میں کوئی قابل ذکر تغیر نہیں آیا - بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں اخبارات سے انسلاک کے زمانے میں مولانا مہر کی سیاسی فکر میں ایک تسلسل نظر آتا ہے - مثلاً روزنامہ زمیندار میں رہتے ہوئے بھی مولانا مہر کانگرسی ذہن رکھتے تھے ، لیکن مولانا مہر کی کانگرس کے ساتھ ہمدردی ، مسلمانوں کے سیاسی ، معاشی ، معاشرتی اور مذہبی تحفظات کی ضمانت سے مشروط تھی اور اسے مولانا مہر اصطلاحاً ''تصفیۂ حقوق'' کا نام دیتے تھے - تصفیۂ حقوق کی بنیاد مسلمانوں کے لیے علیحدہ حق نیابت اور جداگانہ انتخابات کے مطالبے پر استوار تھی - یہی پالیسی ''انقلاب'' میں بھی جاری رہی - البتہ بعد ازاں اس پالیسی میں معمولی سا تغیر

اس طرح آیا کہ کانگرس کی طرف سے مسلم زعما کی عام مخالفت کے باوجود نہرو رپورٹ کی منظوری اور تصفیہ حقوق سے مسلسل انکار کی بنا پر انقلاب مسلم لیگ کی طرف جھک گیا اور مسلم لیگ کے دو متحارب دھڑوں میں سے شفیع لیگ کا ساتھ دیا ۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ اگرچہ زمیندار کے مالک تو مولانا ظفر علی خاں تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے میں مہر و سالک زمیندار سے وابستہ تھے ان دنوں مولانا ظفر علی خاں اپنی عملی سیاست کی مشغولیتوں میں اتنے مصروف تھے کہ زمیندار کے لیے نظم نگاری کے علاوہ اس ادارے میں ان کی کوئی اور مصروفیت نہیں تھی اور یوں اخبار کی پالیسی عملاً مولانا مہر اور عبدالمجید سالک ہی کے زیر اثر تھی ۔ اگرچہ مولانا ظفر علی خاں اور مہر و سالک میں بعض موقعوں پر اختلافات بھی ہوئے لیکن یہ اختلافات محض ذاتی نوعیت کے تھے ورنہ اخبار کی پالیسی کا ان سے کچھ زیادہ تعلق نہیں تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ زمیندار اور انقلاب کے ابتدائی دور کی پالیسی میں ایک گونہ مناسبت اور تسلسل صاف نظر آتا ہے ۔ اس مناسبت اور تسلسل کا اندازہ مولانا سالک کے ان الفاظ سے بخوبی ہو جاتا ہے :

> ''جب ہم نے زمیندار کو چھوڑا تو پالیسی یہ تھی کہ ہم کانگرسی ہیں اور کانگرس کو ہندوستان کی متحدہ قومی جماعت سمجھتے ہیں ۔ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر وطن آزاد نہیں ہو سکتا اور اتحاد کی صورت یہی ہے کہ آئندہ کے لیے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تعین ہو جائے تاکہ مسلمان اقلیت مطمئن ہو کر آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں حصہ لے سکے ۔ ہم جداگانہ نیابت کے حامی تھے اور کانگرس سے اس کو منظور کرانا چاہتے تھے ۔ انقلاب میں بھی یہی پالیسی جاری رہی لیکن زمیندار نے ہمارے چلے آنے کے بعد کاملاً کانگرسی اور نیشنلسٹ نقطۂ نگاہ اختیار کر لیا ۔''[1]

صرف انقلاب ہی نہیں ، اس دور کے تقریباً تمام اخبارات کانگرس کے ہمنوا تھے کیونکہ اس وقت تک یہی واحد کل ہند جماعت تھی جو جدوجہد آزادی کے عمل کو آگے بڑھانے میں مؤثر کردار ادا کر رہی تھی ۔ لیکن ان تمام اخبارات کے مقابلے میں روزنامہ انقلاب کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ یہ اخبار غیر مشروط طور پر کانگرس کا ہمنوا اور ترجمان نہیں تھا بلکہ کل ہند سطح پر

۱- سرگزشت ، از سالک ، ص ۲۳۶ ۔

آزادی کے حصول کے لیے کی جانے والی کوششوں میں فرقہ وارانہ اتحاد سے قبل اسلامیانِ ہند کے حقوق کے تصفیے کا خواہاں بھی تھا ۔ اور چونکہ کانگرس آزادی کو اولین مطمح نظر قرار دیتے ہوئے فرقہ وارانہ حقوق کے تصفیے کے لیے آمادہ و تیار نہیں ہوتی تھی اس لیے رفتہ رفتہ ''انقلاب'' اپنی ابتدائی سیاسی پالیسی کے برعکس کانگرس کا ترجمان ہونے کی بجائے اس کا ناقد بن گیا ۔ انقلاب کی سیاسی پالیسی میں اس تبدیلی کی وجہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

''ہم ترکِ موالات کے آغاز سے لے کر ۱۹۲۸ء تک مسلسل ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپیلیں کرتے رہے ، کانگرس کے سرگرم حامی رہے لیکن جب نہرو رپورٹ کے سلسلے میں گاندھی جی کی معاندانہ روش ہمارے سامنے آئی اور یہ ثابت ہوا کہ گاندھی جی ہندو راج کے سامنے پوری ملتِ اسلامیہ کے اختلافات کو بھی قابلِ توجہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں ، تو پھر پہلی مرتبہ یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ کانگرس قطعاً نیشنل جماعت نہیں بلکہ محض ایک ہندو جماعت ہے . . . یہ پہلا دن تھا کہ ہم نے کانگرس کی مخالفت شروع کی ۔''[۱]

فرقہ وارانہ حقوق کے تصفیے کے سلسلے میں روزنامہ انقلاب اس حد تک آگے بڑھ گیا تھا کہ اسی بنا پر ناقدین مولانا مہر کو فرقہ وارانہ مسائل کا ترجمان کہہ کر مطعون کرنے لگے، لیکن مولانا مہر جو ان راستوں کے تمام نشیب و فراز سے واقف و آگاہ تھے ، اپنے اس کردار پر نادم و پشیمان ہونے کی بجائے بجا طور پر فخر کیا کرتے تھے ۔ جیسا کہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''. . . اگر اپنے قومی حقوق کے لیے بے پروایانہ جہاد ''فرقہ واری'' ہے تو یقیناً میں فطرتاً فرقہ وار تھا اور اس پر ہمیشہ فخر رہے گا ۔''[۲]

قومی حقوق کے لیے بے پروایانہ جہاد انقلاب اور مدیرانِ انقلاب کا ایسا روشن کارنامہ ہے جس کا اعتراف ان کے ناقدین کو بھی کرنا پڑا ، جیسا کہ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں :

۱۔ انقلاب ، ۱۸ مئی ۱۹۳۱ء ۔

۲۔ مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۱۹ مارچ ۱۹۶۶ء ، غیر مطبوعہ ۔

"یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں میں جداگانہ حقوق کا شعور غلام رسول مہر کے زوردار قلم ہی نے پیدا کیا تھا ۔"[1]

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ چھوٹے بڑے شہروں میں ہونے والے فسادات اور مختلف سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ تناسب سے لے کر جداگانہ انتخابات اور سندھ کی بمبئی سے علیحدگی تک کے مسائل پر انقلاب ہمیشہ مسلم مفادات کی ترجمانی کرتا رہا ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ اس زمانے میں عام معاملات میں انقلاب حکومت سے تعاون کا داعی تھا ، جیسا کہ خود سرگزشت میں عبدالمجید سالک نے بھی اعتراف کیا ہے ۔[2] اس کے علاوہ اس زمانے میں مدیران انقلاب اور سر فضل حسین کے مابین بھی قریبی مراسم قائم تھے ، لیکن انقلاب نے مسلم مفادات کے تحفظ کے ضمن میں ضرورت پڑنے پر سر فضل حسین کی بھی کھل کر مخالفت کی ۔ اس سلسلے میں روزنامہ انقلاب کے ایک اداریے کا اقتباس قابلِ ذکر ہے جس میں ۱۹۱۶ء میں ہونے والے میثاقِ لکھنؤ کے بارے میں نواب احمد یار خان دولتانہ کے ایک بیان کا جواب دیتے ہوئے لکھا گیا ہے :

"میاں صاحب نادر روزگار ہستی ہوں یا اس کی ضد ، ہم اتنا جانتے ہیں کہ ان کی ذاتِ گرامی مسلمانوں کی بدقسمتی سے مسلمانوں کے لیے سب سے بڑھ کر نقصان رساں ثابت ہوئی ہے اور آج مسلمانوں کے مابین جو تشتت نظر آ رہا ہے اس کی ساری ذمہ داری میاں صاحب کی گردن پر ہے ۔ میثاقِ لکھنؤ پر دستخط کرنے والے وہی تھے ، اور جب تک یہ میثاق کسی نہ کسی شکل میں قائم رہے گا ، مسلمانانِ پنجاب اور مسلمانانِ بنگال کے حقوق کا خون میاں صاحب کے دامن سے نہیں چھٹے گا ۔ اس میثاق پر دستخط کرنے والا پنجاب میں سے کوئی اور نہ تھا . . . بلاشبہ ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتہ ضروری تھا اور نہ محض تھا بلکہ ضروری ہے اور ضروری رہے گا ، لیکن سمجھوتہ نہ کہ حقوق فروشی

۱- یادِ رفتگاں، از عاشق حسین بٹالوی ، مطبوعہ ہفت روزہ چٹان ، ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء ۔

۲- سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۲۹۸ ۔

". . . اور پنجاب میں اس فروخت کا ہار میاں فضل حسین ہی کی گردن پر ہے ۔"[1]

اسلامیانِ ہند کے حقوق کے تحفظ کی پالیسی کی بنا پر انقلاب آہستہ آہستہ اپنی ابتدائی پالیسی یعنی کانگرس کی ہمنوائی سے دستبردار ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف جھکتا چلا گیا ۔ اس زمانے میں مسلم لیگ دو حصوں یعنی شفیع لیگ اور جناح لیگ میں منقسم تھی ۔ شفیع لیگ کے صدر سر محمد شفیع تھے اور سیکریٹری علامہ اقبال ، جبکہ جناح لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح تھے اور سیکریٹری سیف الدین کچلو ۔ چونکہ شفیع لیگ الھی مطالبات و حقوق یعنی جداگانہ انتخابات اور علیحدہ نیابت وغیرہ کی حامی تھی ، جن کا موید روزنامہ انقلاب تھا ، دوسرے اس لیگ میں علامہ اقبال بھی شامل تھے ، جن سے مدیران انقلاب کے اس وقت تک گھرے مراسم پیدا ہو چکے تھے ، لہذا انقلاب شفیع لیگ کا ترجمان قرار پایا ۔ مولانا سالک شفیع لیگ اور جناح لیگ کے بنیادی اختلافات اور شفیع لیگ کے لیے انقلاب کی حمایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"شفیع لیگ گو بنیادی مطالبات میں اپنی حریف لیگ سے متفق تھی لیکن علیحدہ نیابت اور جداگانہ انتخابات پر سختی سے قائم تھی ۔ انقلاب نہایت سختی سے شفیع لیگ اور جداگانہ انتخاب کا حامی تھا ۔"[2]

اس دور میں انقلاب جس شد و مد سے نیشنلسٹ مسلمانوں کی مخالفت کرتا تھا ، اسی تندی و سختی سے جناح لیگ کو بھی ہدفِ تنقید بناتا تھا ۔ جناح لیگ کی طرف سے مخلوط انتخابات کی حمایت کے خلاف نہ صرف اداریے لکھے جاتے بلکہ نظمیں بھی شائع کی جاتی تھیں جس میں اصلاحِ احوال کی طرف توجہ دلانے کے علاوہ اکثر و بیشتر طنز و تعریض سے بھی کام لیا جاتا تھا ۔ اس سلسلے میں ۲۰ جنوری ۱۹۲۸ء کے انقلاب میں "نہ مشروطی نہ مخلوطی" کے عنوان سے مطبوعہ ایک نظم کے شعر جناح لیگ کے لیے روزنامہ انقلاب کے رویے کو متعین کرنے کے لیے کافی ہیں ۔

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ٦ جون ۱۹۲۸ء ۔
۲۔ سرگزشت ، ص ۲۳۷ ۔

لیے جاتے ہیں آخر کس طرف ہم بے نواؤں کو
الٰہی کیا ہوا ہندوستاں کے رہنماؤں کو
غضب ہے پھر اسی کافر کے قدموں پر ہے دل اپنا
ہمیشہ جس نے ٹھکرایا ہماری التجاؤں کو
یہ آساں ہے کہ ہم راہِ وفا میں خاک ہو جائیں
یہ مشکل ہے کہ توفیقِ وفا ہو بے وفاؤں کو
مسلمانوں کے لیڈر ہیں نہ مشروطی نہ مخلوطی
الٰہی دور کر مسلم کے سر سے ان بلاؤں کو[1]

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ میثاقِ لکھنؤ اور سائمن کمیشن کے بارے میں انقلاب کے مسلک پر شفیع لیگ کے زعماء، خاص طور پر علامہ اقبال کے خیالات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ انقلاب اور مدیرانِ انقلاب پر عموماً یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ یہ قائداعظم محمد علی جناح کے مخالف تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ یہ الزام کچھ زیادہ بے جا بھی نہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قائداعظم کی مخالفت کا وہ شدید رویہ، جو تحریروں میں کم اور مولانا مہر کی نجی محافل کے حوالے سے زیادہ سامنے آتا ہے، اسی دور میں پیدا ہوا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ محمد علی جناح نے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ طے کرانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، جبکہ انقلاب اس پیکٹ کو حقوق فروشی کے نام سے تعبیر کرتا تھا۔ انقلاب شفیع لیگ کے موقف کی تائید میں سائمن کمیشن کے مقاطعے کے خلاف تھا جبکہ قائداعظم کانگرس کے موقف سے قریب تر تھے۔ انقلاب مسلمانوں کے لیے علیحدہ حقِ نیابت اور جداگانہ انتخابات کا حامی تھا جبکہ قائداعظم "تجاویز دہلی" میں مشروط طور پر مخلوط انتخابات کو قبول کر چکے تھے۔ ان اختلافات کے باعث انقلاب نے اس دور میں قائداعظم کے خلاف نہایت تند و ترش اداریے رقم کیے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ انقلاب نے کبھی کسی پارٹی یا فرد کے ساتھ غیر مشروط تعاون نہیں کیا اور نہ کسی کی بے جا مخالفت کی، بلکہ جہاں تک ہو سکا ہمیشہ یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کے عام

۱۔ 'مشروطی' اور 'مخلوطی' سے علی الترتیب جناح لیگ اور کانگرس کے حامی مسلمان مراد ہیں۔

مفادات کی محافظ جماعتوں سے تعاون کر کے ان کی آواز کو مضبوط بنایا جائے لیکن اگر وہ کوئی غلطی کریں تو بلا تامل ان پر تنقید بھی کی جائے۔ انقلاب کا انداز فکر خود اس کے اداریے کے ایک اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے :

"۔۔۔ لاہور لیگ کے شرکاء نے آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت سے انکار کرنے میں سخت غلطی کا ارتکاب کیا لیکن انقلاب نے ان کی اس غلطی کو نظرانداز نہیں کیا ۔ پھر ہڑتال کے معاملے میں لاہور لیگ سے یقیناً انقلاب کو اختلاف تھا اور اس نے کھلم کھلا اختلاف کیا ۔ تاہم جس حد تک افتراق کا تعلق ہے ، انقلاب اب بھی لاہور لیگ کے ساتھ ہے اور اسے حق بجانب سمجھتا ہے اور مسٹر جناح ، ڈاکٹر کچلو اور ان کے بعض رفقاء کی روش کو صحیح نہیں سمجھتا ۔ تصفیۂ حقوق کی سعی میں بھی لاہور لیگ سے علیحدگی کا خواہاں نہیں ۔"[1]

لیکن انقلاب شفیع لیگ کے موقف کو درست سمجھتا تھا یا جناح لیگ اور ان کے رفقاء کی روش کو غلط ، اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت کا یہ اختلاف و افتراق خود انقلاب کے اصل مقاصد سے متصادم تھا اور انقلاب کو بھی اس امر کا شدید احساس تھا ۔ انقلاب چاہتا تھا کہ ہندوستان کے جملہ مسلمان متحد و متفق ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے جدوجہد کریں ۔ انقلاب کے اس احساس کا اظہار ان اداریوں سے بھی ہوتا ہے جو سائمن کمیشن کے مسئلے پر لیگ کی دھڑے بندی کے بارے میں لکھے گئے اور اُن اداریوں سے بھی جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے قیام کے دوران لکھے گئے ۔ انقلاب آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے قیام اور اس کے مطالبات کا حامی تھا کیونکہ انقلاب کے نزدیک یہ جماعت مسلم لیگ کے غیرمؤثر ہو جانے کی صورت میں نہرو رپورٹ کے مضر اثرات کو زائل کرنے اور مسلمانوں کے مطالبات کی ترجمانی کا کٹھن فرض بخوبی پورا کر سکتی تھی ۔ اس کے علاوہ انقلاب ہر موقع پر لیگ کے متحارب دھڑوں کے اتحاد کی اہمیت و ضرورت پر بھی زور دیتا رہا ۔ مثلاً فروری ۱۹۳۰ء میں جب مسٹر جناح نے دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس بلایا تو اس موقع پر لیگ کے اتحاد کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے انقلاب نے "جناح لیگ اور شفیع لیگ کے اتحاد کی ضرورت" کے

۱- روزنامہ انقلاب ، ۹ مارچ ۱۹۲۸ء -

زیر عنوان اداریہ لکھتے ہوئے لکھا :

''مسلمانوں کی بدقسمتی سے ان کی سب سے بڑی سیاسی انجمن آل انڈیا مسلم لیگ دو سال سے دوپارہ ہو چکی ہے اور مسلمانوں کے بہترین دماغ ، جنھیں غلامی ہند کی موجودہ مصیبتوں میں متحد ہو کر ملتِ بیضا کی خدمات انجام دینی چاہیے تھیں ، محض چند اصطلاحی اختلافات کی وجہ سے متفرق ہو رہے ہیں . . . اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ مسلمان اپنے اندرونی اختلافات کا تصفیہ کر کے اپنے مشترک مطالبات معین کر لیں تاکہ اگر گول میز کانفرنس میں جانے کی نوبت آئے تو کم از کم مسلمان اپنے مطالبات پیش کر سکیں اور دنیا وہاں تو ان کے شرمناک اختلافات کا تماشا نہ دیکھنے پائے . . . ہم مسٹر جناح ، سر محمد شفیع ، سر ذوالفقار علی خاں کے ہم خیال حضرات کی خدمت میں نہایت مخلصانہ و مؤدبانہ گزارش کرتے ہیں کہ ۹ فروری کو جناح لیگ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہونے والا ہے ۔ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور کوئی نہ کوئی ایسی راہ نکالیں کہ بچھڑے بھائی آپس میں گلے مل جائیں اور مسلمانوں کی صحیح راہنمائی کر سکیں ۔''[۱]

جب لیگ کے دونوں گروپ متحد ہوگئے اور قائداعظم متحدہ مسلم لیگ کے صدر چن لیے گئے تو روزنامہ انقلاب نے اس اتحاد کو ''گزشتہ دو سال میں مسلمانوں کا پہلا مبارک قدم'' قرار دیتے ہوئے ''دونوں مسلم لیگیں متحد ہوگئیں'' کے عنوان سے اداریہ شائع کیا ۔ اس اداریے میں جہاں اس اتحاد کو قابلِ تحسین و لائقِ صد مبارک باد قرار دیا وہیں مسلمانوں کے لیے آئندہ لائحہ عمل کے تعین کی کوشش کرتے ہوئے مولانا مہر نے ایک اچھے صحافی کی حیثیت میں صحافتی منبر سے قوم کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے لکھا :

''اس سلسلے میں ایک ضروری چیز یہ ہے کہ اسمبلی میں ایک متحدہ مسلم پارٹی بنائی جائے اور ہر مسلمان ممبر اسمبلی اس میں شریک ہو ۔ مسلمانوں کا متحدہ مطالبہ سب کا محور ہو اور سب اس کے لیے متحدہ کوشش فرمائیں ۔ جس طرف ہاتھ اٹھائیں سب متحد ہو کر اٹھائیں ، جس طرف

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ۵ فروری ۱۹۳۰ع ۔

بڑھیں سب متحد ہو کر بڑھیں ۔ اس طرح خدا کے فضل و کرم سے ایک نہایت ہی قلیل مدت میں مسلمانوں کی آواز مؤثر و نتیجہ خیز بن سکتی ہے ۔ حکومت بھی ان کی آواز کو عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے گی اور ہندوؤں کو بھی یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ مسلمانوں کے افتراق سے فائدہ اٹھا کر ان کے حقوق کو معرض اختلال میں ڈالیں ۔ نیز قدم قدم پر ان کا مذاق اڑائیں ۔''[1]

مسلم لیگ کے اتحاد کے سلسلے میں یہ بات اپنے طور پر اہم ہے کہ انقلاب نے اس اقدام کو نہ صرف ایک مبارک قدم قرار دیا بلکہ جس حد تک ممکن ہوا لیگ کے دونوں دھڑوں کو متحد کرنے میں بھی مؤثر کردار ادا کیا ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مدیران انقلاب ہی تھے جنھوں نے دونوں لیگوں کے سیکریٹریوں سے اتحاد کے سلسلے میں ابتدائی نوعیت کی بات چیت کی تھی ۔ اس ضمن میں عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں :

''دو متوازی لیگوں کو اکٹھا کرنے میں بھی انقلاب نے نمایاں حصہ لیا ۔ علامہ اقبال اور ڈاکٹر کچلو کے درمیان ابتدائی بات چیت مدیران انقلاب ہی نے کرائی ۔''[2]

انقلاب کا یہ کارنامہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے اس دور میں ہندوستان کے وسیع و عریض ملک میں اسلامی سلطنت اور اسلامی ملک کے تصور کی دل و جان سے تائید و حمایت کی جب ہندوستان کے شمال مغربی حصے کو اسلامی مملکت سے تعبیر کرنا شاعر کے خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا ۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جولائی ۔ اگست ۱۹۳۰ع سے اوائل ۱۹۳۱ع تک انقلاب میں مسلسل ایسے اداریے اور مضامین چھپتے رہے جن میں شمال مغربی ہند کے چاروں صوبوں کو اسلامی مملکت سے تعبیر کیا جاتا تھا ۔ جس زمانے میں خطبہ الہ آباد پیش کیا گیا اس وقت علامہ اقبال اور مدیران انقلاب میں نہایت قریبی تعلقات قائم ہو چکے تھے ، اس لیے یہ بات بعید از امکان نہیں کہ مولانا مہر و سالک خطبہ الہ آباد کا متن لیگ کے اجلاس الہ آباد میں پیش کیے جانے سے قبل ہی دیکھ

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ۹ مارچ ۱۹۳۰ع ۔
۲۔ صحافت ۔۔ پاکستان و ہند میں ، ص ۲۸۱ ۔

چکے ہوں ۔ اسی لیے انقلاب اگست ۱۹۳۰ع ہی سے مسلمانانِ ہند سے اپیلیں کرتا رہا کہ وہ الہ آباد میں ہونے والے مسلم لیگ کے مجوزہ اجلاس میں جوق در جوق شرکت کریں جس کی صدارت علامہ اقبال کر رہے ہیں ۔ اس امکان کو انقلاب میں چھپنے والے بعض اداریوں سے مزید تقویت ملتی ہے ۔ مثلاً انقلاب نے اجلاسِ لیگ کی صدارت کے لیے علامہ اقبال کے انتخاب پر خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا :

> ''خدا کا شکر ہے کہ وقت کی نزاکت ، ملت کی پیچیدہ ضروریات اور اجلاس کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صدارت کے لیے بھی موزوں ترین شخصیت منتخب ہوئی ہے ، یعنی حضرت علامہ اقبال مدظلہ العالی ، جن سے بڑھ کر آج حقائقِ حیاتِ ملت کا رمز شناس کوئی نہیں . . . ہم تحقیقی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ حضرت علامہ اقبال اپنے خطبۂ صدارت میں کیا فرمائیں گے لیکن اس بات کا یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کو حقیقی جماعتی زندگی کا راستہ اس طرح دکھائیں گے کہ ہر شخص کو اس راستے کے موصل الی المقصود ہونے کا خود بخود یقین ہو جائے گا اور ان کے خطبۂ صدارت کی روشنی میں مسلمان اپنے لیے بہترین لائحۂ عمل وضع کرنے کے قابل ہو جائیں گے ۔''[1]

لیکن پہلی گول میز کانفرنس کے انعقاد اور اس میں شرکت کے لیے مسلمان سربراہوں کی انگلستان روانگی کے باعث لکھنؤ میں منعقد ہونے والا اجلاسِ لیگ ملتوی کر دیا گیا ۔ بعد ازاں یہ جلسہ الہ آباد میں منعقد ہوا ۔ اجلاس الہ آباد سے قبل بھی انقلاب میں پے درپے ایسے اعلانات اور اداریے شائع ہوتے رہے جن میں مسلمانوں کو جوق در جوق اجلاس میں شرکت کی ترغیب دی جاتی تھی مثلاً ایک اداریے میں لکھا گیا :

> '' . . . ہمیں امید واثق ہے کہ علامہ اقبال کی راہنمائی میں لیگ کا یہ اجلاس نہایت کامیاب ہوگا اور اس نازک زمانے میں مسلمانوں کی صحیح ترجمانی اور صحیح رہنمائی کا پورا پورا حق ادا کرے گا ۔ تمام مسلمانانِ ہند کو لازم ہے کہ الہ آباد کے اجلاس میں جوق در جوق شامل ہوں

۱- روزنامہ انقلاب ، ۵ - اگست ۱۹۳۰ع ۔

اور حضرت علامہ اقبال کا خطبۂ صدارت سنیں جس میں علامہ ممدوح اپنے انداز خصوصی میں مسلمانوں کو ایک نہایت روشن نصب العین کی طرف توجہ دلا کر پیغام عمل دیں گے ۔''[۱]

اس کے علاوہ ان اعلانات و اداریوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مدیران انقلاب اجلاس سے قبل ہی تصور پاکستان کے خد و خال نمایاں طور پر دیکھ رہے تھے۔ مثلاً انقلاب کے ایک سنڈے ایڈیشن کے صفحہ اول پر ''پنجاب ، سندھ ، سرحد اور بلوچستان اسلامی ملک ہیں ۔ ان میں اسلام کا علم بلند رکھو'' کے عنوان سے یہ اعلان شائع ہوا :

''شمالی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس عنقریب ہونے والی ہے۔ اس کانفرنس میں پنجابی ، سندھی ، سرحدی اور بلوچستانی مسلمان جمع ہو کر ان تدابیر پر غور کریں گے جن سے ان کے علاقوں میں مسلمانوں کے حقوق اکثریت محفوظ کیے جا سکتے ہیں اور اسلام کا جھنڈا بلند رکھا جا سکتا ہے . . . اگر ہندوستان میں اسلام کی بقا چاہتے ہو تو شمالی ہند کی کانفرنس میں آؤ ۔''[۲]

جیسے ہی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبۂ الہ آباد پیش کیا گیا ، ہندو پریس اور کانگرس نے اس کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا شروع کر دیا ۔ اس پورے دور میں یہ امتیاز صرف انقلاب ہی کو حاصل ہے کہ اس نے علامہ اقبال اور خطبۂ الہ آباد کے خلاف ہونے والے زہر ناک پروپیگنڈے کا مؤثر جواب دیا ۔ یوں تو انقلاب میں شائع ہونے والے بے شمار اداریے اور مضامین بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ چند اداریے خاص طور پر قابل ذکر ہیں : ''ٹریبیون کے حملے علامہ اقبال پر ، ۳ جنوری ۱۹۳۱ع'' ''علامہ اقبال اور ہندو جرائد ، ۹ جنوری ۱۹۳۱ع'' ۔ ''علامہ اقبال پر ہندوؤں کے حملے ، ۱۱ جنوری ۱۹۳۱ع''۔ ''ہندو راج پر اقبال کی فاتحانہ ترکتاز'' ، ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ع ۔'' محولہ بالا آخری اداریے میں ''ہندوؤں کے واویلا کی حقیقی علت'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا گیا :

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ۱۸ دسمبر ۱۹۳۰ع ۔

۲۔ روزنامہ انقلاب ، ۱۴ دسمبر ۱۹۳۰ع ۔

''اگر آج ہندو قوم اپنی آرزوؤں کی بسملی اور اپنی توقعات کی خوں شدگی کا غصہ حضرت علامہ اقبال کے خلاف سوقیانہ ہاؤ ہو کی شکل میں نکال رہی ہے تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے ؟ حضرت علامہ اقبال کا خطبۂ صدارت ہندو راج کے آسیب کے لیے نقش رحمانی کا حکم رکھتا ہے ۔ اس آوازۂ حق نے ملتِ آوارہ کو زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کا صحیح ، صاف اور سیدھا راستہ بتا دیا ہے ۔ کاروانِ اسلام کے لیے ''بانگِ درا'' کا سامان مہیا کر دیا ہے ۔''۱

اس دور میں روزنامہ انقلاب میں ایسے مضامین بھی شائع ہوتے رہے جن کی رو سے ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلے کا واحد حل ہند کے شمال و مغربی علاقوں پر مشتمل اسلامی مملکت کا قیام تھا ۔ اس موضوع پر بھی بے شمار مضامین اور اداریے شائع کیے ۔ لیکن ۳ فروری ۱۹۳۱ع کے انقلاب میں ''شمال و مغرب ہند میں اسلامی حکومت'' کے زیرِ عنوان رقم کیے گئے اداریے میں اس علاقے کے صوبوں میں فرقہ وارانہ تناسب آبادی ، آبادی کے نقشوں اور اس سلسلے میں ہندوؤں کے شور و غوغا کی علت بتانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو علامہ اقبال کی طرف سے عطا کردہ نصب العین پر غور و فکر کرنے کی دعوت بھی دی گئی ہے ۔ ایک اور اداریے میں جو ''پنجاب ، سندھ ، سرحد اور بلوچستان کا اتحاد'' کے عنوان سے قلم بند کیا گیا ، مدیر نے ''مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا :

'' . . . اگر سندھ ، سرحد ، بلوچستان اور پنجاب کو (بہ استثنائے قسمت انبالہ) ملا کر ایک سلطنت یا ایک صوبہ بنا دیا جائے تو اس صوبے میں مسلمانوں کا تناسب شاید ستر فی صد سے بھی زائد ہو جائے گا ۔ اس صورت میں اولاً ہندو اور سکھ خود بخود جداگانہ انتخاب پر جمے رہیں گے لیکن اگر ان کی طرف سے مخلوط انتخاب کا مطالبہ ہوگا تو پھر مسلمانوں کو اس کے قبول کرنے میں قطعاً کوئی تامل نہ ہوگا ۔ غرض شمال و مغربی ہند میں اسلامی حکومت کا قیام پہلے سے طے شدہ ہے اس لیے کہ اس حصے میں غلبہ بہرحال مسلمانوں کو حاصل ہوگا یا از روئے انصاف حاصل ہونا چاہیے ۔''۲

۱- روزنامہ انقلاب ، ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ع ۔

۲- روزنامہ انقلاب ، ۲۰ جنوری ۱۹۳۱ع ۔

غرضیکہ یہ ایک ناقابلِ تردید لیکن فراموش شدہ حقیقت ہے کہ اس پورے دور میں انقلاب اور مدیرانِ انقلاب مسلم مفادات و حقوق کے لیے جہاد کرتے رہے ۔ اس سلسلے میں تاریخ ایسا کوئی ایک لمحہ بھی پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے انقلاب اور مولانا مہر کو مسلم مفاد کی حفاظت کے فرض سے بے پروا یا روگرداں پایا ہو ۔ اس دور میں مولانا مہر کی ان عظیم الشان خدمات کو سراہا بھی گیا اور ان کا اعتراف بھی کیا گیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اجلاس الہ آباد میں شرکت کے لیے مسلم لیگ نے صوبہ پنجاب سے جن لوگوں کو نامزد کیا تھا ان میں مولانا مہر کا نام بھی شامل تھا ۔

اسلامیانِ ہند کے لیے اپنی انھی قابلِ قدر خدمات کے باعث روزنامہ انقلاب مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ یہی سبب تھا جس کے باعث فروری ۱۹۳۲ء میں روزنامہ انقلاب کی بندش کے خدشے کو محسوس کرتے ہوئے عامۃ المسلمین اس روزنامے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہوگئے۔ اس قسم کے تعاون کا ذکر کرتے ہوئے ایک اداریے میں لکھا گیا :

> "انقلاب کی ضمانت اور بندش کی خبر نے صوبے بھر کے مسلمانوں میں ایسا اضطراب پیدا کر دیا ہے اور خلوص و محبت کے ایسے ایسے مظاہرے دیکھنے میں آ رہے ہیں کہ ان کی نظیر نہیں ملتی ۔ بے شمار خطوط موصول ہو رہے ہیں جن میں زر ضمانت کی فراہمی پر آمادگی ظاہر کی گئی ہے ۔ ایک مخلص دوست امرتسر سے تشریف لائے اور تنہا پانچ ہزار روپے دینے پر آمادہ ہو گئے ۔ ایک دوست جو سرکاری ملازم ہیں ، اپنا مکان رہن رکھ کر پانچ ہزار روپے مہیا کر دینے پر آمادہ ہیں . . . بعض خواتین کے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں لکھا ہے کہ اگر انقلاب چندے کی فہرست کھول دے تو ہم اپنا زیور اس کے زرِ ضمانت کی فراہمی کے لیے دینے کو تیار ہیں ۔"[۱]

انقلاب کے دورِ اول کی سیاسی پالیسی کا جائزہ لیتے ہوئے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انقلاب نے اپنے اوراق میں ہر موقع پر ان مطالبات و حقوق کی ترجمانی کی جو آگے چل کر پاکستان کی اساس ثابت ہوئے ۔ مثلاً جداگانہ انتخاب ،

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ۴ مارچ ۱۹۳۲ء ۔

علیحدہ نیابت ، علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد اور قائداعظم کے چودہ نکات کی تائید و ترجمانی وغیرہ ۔ دوسرے دور میں بھی انقلاب کی سیاسی پالیسیوں میں یہی روح کارفرما نظر آتی ہے ۔ اس دور میں بھی انقلاب نے اپنی پوری قوت و توانائی کے ساتھ مسلم مطالبات کی تائید و حمایت اور ترجمانی کی ۔ اس سلسلے میں جداگانہ انتخابات کا ذکر کیا جا سکتا ہے جسے بار بار کے تلخ تجربات کی روشنی میں ''تجاویز دہلی'' کے برعکس اپنے چودہ نکات میں خود قائداعظم بھی ، جو ایک عرصے تک ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہے جا رہے تھے ، تسلیم کر چکے تھے۔ لیکن اب ایک مرتبہ پھر اکثر مسلم زعماء نے گول میز کانفرنسوں کی مسلسل ناکامی کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے لیے جداگانہ انتخابات سے متعلق اپنے مطالبے سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا ۔ ان مسلم زعماء میں سر فضل حسین ، سردار سکندر حیات خاں ، سر محمد شفیع ، مولانا شوکت علی ، مسٹر عبدالحلیم غزنوی اور ڈاکٹر عبداللہ سہروردی وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں ۔ لیکن مدیرانِ انقلاب نے اپنے ذاتی تعلقات کے باوجود جداگانہ انتخاب سے دستبرداری کے ان اعلانات کی مذمت کی ۔ مثلاً انقلاب کے ایک اداریے میں لکھا گیا :

> ''. . . کپتان سردار سکندر حیات خاں اور ملک فیروز خاں نون سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ . . . ان بزرگوں کو مسلمانوں کی کس انجمن کس ، مجلس ، کس گروہ اور کس طبقے نے یہ حق دیا تھا کہ وہ مخلوط انتخاب کی تجویز کے متعلق ایسی روش اختیار کریں جس سے ظاہر ہو کہ مسلمان تجویز مذکورہ کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں - ہمارے نزدیک ان وزراء نے مسلمانوں کے حقوق کو سخت نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور قوم ان سے پرسش کی پوری حقدار ہے - ہر فرد اسی وقت تک قوم کا نمائندہ ہے جب تک قوم کے واضح فیصلوں کی پابندی کرے اور ان سے بال برابر بھی ادھر اُدھر نہ ہو ۔''[1]

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس سلسلے میں انقلاب نے صرف اشخاص ہی نہیں بلکہ ان مذہبی تنظیموں پر بھی سخت تنقید کی جو اپنے مخصوص مفادات یا کوتاہ اندیشی کے باعث جداگانہ انتخابات سے دستبرداری کا اعلان کرکے مخلوط انتخابات کی حمایت پر کمر بستہ ہو گئی تھیں ۔ اس سلسلے کی سب

۱- روزنامہ انقلاب ، ۳ - اپریل ۱۹۳۲ -

سے بہتر مثال فرقہ ٔ اہلِ حدیث کے فیصلے پر انقلاب کی تنقید ہے ۔ یہ بات معلوم ہے کہ خود مولانا مہر کا تعلق بھی اسی مسلک سے تھا۔ لیکن جب اہل حدیث بورڈ بنارس نے مخلوط انتخابات کو قبول کرنے کا اعلان کیا تو مولانا مہر نے اپنے ایک اداریے میں لکھا :

"۔ ۔ ۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اہلِ حدیث کا یہی مطالبہ جس پر بحث ہو رہی ہے ، ہندوؤں کے نزدیک اہلِ حدیث کی محبوبیت کی دلیل ہے ۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوگا۔ وہ جماعت جماعت اور گروہ گروہ بن کر اپنی حقیقی قوت کو فنا کریں گے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جنون میں اپنی ملت کے مفاد کو قربان کرکے ہندوؤں کے تسلط اور ہما گیری کا راستہ صاف کر دیں گے ۔"[1]

روزنامہ انقلاب اس دور میں بھی ہندو مسلم اتحاد کا داعی تھا ، لیکن تصفیہ ٔ حقوق کے بغیر اتحاد کو حقوق فروشی قرار دیتا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ جب اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے لکھنؤ کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تو مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ مولانا مہر نے بھی کانفرنس کے منتظمین کو کانفرنس میں اپنے شریک نہ ہونے کی اطلاع دے دی ۔ انھوں نے منتظمین کے نام جو تار بھیجا ، اس سے مجوزہ کانفرنس اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ان کا نقطہ نظر عیاں ہو جاتا ہے ۔ اور اسے محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا کہ جن وجوہات کے باعث علامہ اقبال نے مجوزہ کانفرنس میں عدم شرکت کا فیصلہ کیا ، مولانا مہر نے بھی انھی وجوہ کا ذکر کرتے ہوئے کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ۔ انھوں نے لکھا :

"جب تک ہندوؤں کی طرف سے قطعی تجاویز پیش نہ ہو جائیں ، مسلمانوں کو کانفرنس کے انعقاد سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے ، لہذا میرے لیے شریک ہونا مشکل ہے ۔"[2]

دوسرے دور میں بھی انقلاب مسلم لیگ اور قائد اعظم محمد علی جناح کی

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ۴ جولائی ۱۹۳۳ء ۔
۲۔ روزنامہ انقلاب ، ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء ۔

تائید و حمایت کرتا رہا ۔ اگرچہ پہلی گول میز کانفرنس کے بعد محمد علی جناح ہندوستان کی سیاست سے مایوس ہو کر انگلستان ہی میں مقیم ہو گئے تھے ، لیکن پھر اسلامیان ہند کے پے در پے مطالبات کے باعث انھیں دسمبر ۱۹۳۳ء میں واپس ہندوستان آنا پڑا ۔ ہندوستان آتے ہی مسٹر جناح کو آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر چن لیا گیا ۔ قائد اعظم کی واپسی نے مسلم لیگ کے جسدِ مردہ میں نئی روح پھونک دی ۔ قائد اعظم نے ۱۹۳۷ء میں ہونے والے انتخابات میں کامیابی کے لیے انتہائی محنت اور جد و جہد کے بعد مسلمانوں کی دونوں تنظیموں یعنی آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی مشترکہ پارلیمنٹری مجلس تشکیل دی ۔ انقلاب نے نہ صرف مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے لیے اٹھنے والے اس مناسب قدم کا خیر مقدم کیا ، بلکہ عام مسلمانوں کو اس کے ساتھ تعاون کرنے کی ترغیب بھی دی ۔ مثلاً انقلاب نے ایک اداریے میں ”کانفرنس لیگ پارلیمنٹری مجلس“ کے قیام پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا :

”مقام مسرت ہے کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ نے آئندہ انتخابات کے لیے ایک مشترکہ پارلیمنٹری مجلس بنا دی ہے جو مسلمانوں کو ایک خاص نصب العین اور خاص لائحہ عمل کے ماتحت اسمبلی میں لے جائے گی ۔ وہ متحد طریق پر زیادہ طاقت و قوت کے ساتھ ان الزاماتِ بد کا مقابلہ کر سکیں گے جو اسلامی حقوق کو نقصان پہنچانے والی مخالفانہ کوششوں سے پیدا ہو سکتے ہیں ۔ مسلمانوں کی طرف سے انتخابات کے تعلق میں یہ پہلی منظم اور اجتماعی کوشش ہے ۔ ہمیں اُمید ہے کہ تمام مسلمان اس کا خیر مقدم کریں گے اور کانفرنس لیگ پارلیمنٹری مجلس کے زیر سرکردگی منتخب ہو کر حقوق کی حفاظت کا فرض انجام دیں گے ۔“[1]

اس کے علاوہ روزنامہ انقلاب میں نہ صرف اس پارلیمنٹری مجلس کے ساتھ تعاون کرنے اور اس کی طرف سے نامزد ارکان کو ووٹ دینے کی اپیلیں شائع ہوتی رہیں بلکہ ان ارکان کی انتخابی کامیابیوں کو بھی نمایاں طور پر شائع کیا جاتا رہا ۔ انقلاب نے پارلیمنٹ میں مسلمان ممبران اسمبلی کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت کو بھی ضروری قرار دیا ۔ اس کے علاوہ اسمبلی میں قائد اعظم کے ہر

۱- روزنامہ انقلاب ، ۲۳ اگست ۱۹۳۶ء ۔

اقدام پر ان کی تائید و حمایت کی ۔ مثلاً فرقہ وارانہ اتحاد کے بارے میں پارلیمنٹ میں مسٹر جناح کے بیانات کی حمایت کرتے ہوئے انقلاب نے ''ہندوستان کی اکثریت جناح کے ساتھ ہے'' کے زیر عنوان لکھا :

''حکومت کے لیے صحیح راستہ وہی ہے جس کی طرف مسٹر جناح نے رہنمائی کی ہے اور اس کا فرض ہے کہ اسی راستے کو اختیار کرے ۔ کانگریس اور مالویہ پارٹی پر بھی واضح ہو گیا کہ ان کے راستے غلط ہیں ۔ فرقہ وار فیصلے کی مخالفت کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو کچھ نہ ملے ۔ اور اس سلسلے میں کوئی سمجھوتا کیے بغیر غیر جانب داری کے معنی بھی یہی ہیں کہ مسلمان اور دوسری اقلیتیں اپنے جائز حقوق سے محروم رہیں ۔''۱

ہندی سیاست میں بیسوی صدی کے چوتھے عشرے کا اہم ترین واقعہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں قراردادِ پاکستان کی منظوری ہے ۔ اس سلسلے میں بھی انقلاب کا کردار قابلِ تعریف قرار پاتا ہے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اجلاس سے قبل انقلاب کے معتدبہ اداریوں میں علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد کے حوالے سے مسلم اکثریت کے علاقوں میں آزاد اسلامی حکومت کا تصور صاف طور پر نظر آتا ہے ۔ اس کے علاوہ اجلاس لاہور سے قبل رقم کیے جانے والے متعدد ایسے اداریے بھی لکھے گئے جن میں مسلمانانِ پنجاب سے یہ اپیلیں بھی کی گئیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہو کر اس اجلاس کو کامیاب بنائیں ۔ اس کے علاوہ صحافتی منبر سے مدیران انقلاب نے مسلمانانِ پنجاب کے مختلف گروہوں اور دھڑوں کو اس عظیم الشان موقع کی مناسبت سے اپنے تمام اختلاف بھول کر متحد ہو جانے کا درس بھی دیا ۔ اپنے ایک اداریے میں روزنامہ انقلاب نے واقعی صورت حال کا احساس دلاتے ہوئے لکھا :

''جن بزرگوں کو مسلم لیگ کی بعض شخصیتوں یا صوبہ مسلم لیگ سے اختلافات ہیں ، ان کی خدمت میں ہماری مخلصانہ استدعا ہے کہ وہ ان اختلافات کو فی الحال بالائے طاق رکھیں ۔ کیونکہ اجلاس کے مقابلے میں شخصیتوں یا صوبہ مسلم لیگ کا کوئی سوال نہیں ۔ یہ اجلاس

۱- روزنامہ انقلاب ، ۱۰ فروری ۱۹۳۵ع ۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا ہے جس کی صدارت قائد اعظم فرما رہے ہیں اور ان کی قیادت سے بزرگان مذکور بھی سرتابی نہیں کر سکتے ۔ اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کی واحد نمائندہ انجمن کا نام بلند ہو ۔ اس کا اجلاس کیا بہ لحاظ انتظامات اور کیا بہ لحاظ نتائج کامیاب ہو ۔ جو شخص اس کام میں مزاحم ہوگا وہ ہمارے نزدیک صرف لیگ سے نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں سے دشمنی مول لے گا ۔"۱

انقلاب نے ۱۹۳۴ء میں مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کے بعد مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ تنظیم ، قائداعظم کو مسلمانوں کا غیر متنازعہ رہنما اور پاکستان کو مسلمانوں کی آخری منزل قرار دیا ۔ یہ بات روزنامہ انقلاب کے ان تمام اداریوں سے واضح ہوتی ہے جو قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد مختلف مخالف حلقوں کی طرف سے اعتراضات کے جواب میں لکھے گئے ۔ اس کے علاوہ اس دور میں لکھے گئے اداریوں میں اسلامی مملکت کے قیام کے لیے ہندوستان کی تقسیم کو ناگزیر قرار دیا گیا اور اس مجوزہ اسلامی ریاست کے لیے پاکستان کا لفظ بھی اختیار کر لیا گیا ۔ اگرچہ اس دور میں انقلاب نے مسلم لیگ اور پاکستان کے لیے انتھک جدوجہد کی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کے اس عشرے میں بعض ایسی صورتیں بھی پیدا ہوئیں ، جنھوں نے آگے چل کر نہ صرف انقلاب کی تمام تر کارکردگی پر پانی پھیر دیا بلکہ مدیرانِ انقلاب کو بھی تمام تر اعزازات سے محروم کر دیا ۔ اگرچہ اس صورتِ حال میں زیادہ تر ہر لمحہ بدلتی ہوئی رفتارِ سیاست کو بھی دخل تھا لیکن انقلاب اور مدیرانِ انقلاب سے بھی وقت کے حقیقی تقاضوں کو سمجھنے میں کوتاہی ہوئی ۔ دراصل معاملہ اقوام کا ہو یا افراد کا ، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب اعمال و افعال اور خیالات و افکار میں تضاد کی صورت نمایاں ہونے لگتی ہے تو وہیں سے زوال کا آغاز بھی ہو جاتا ہے ۔ مدیرانِ انقلاب کے لیے یہ صورت حال اپریل ۱۹۳۶ء میں اس وقت پیدا ہوئی جب سر فضل حسین کے ایماء پر سکندر حیات خاں نے ریزرو بنک کی ملازمت سے استعفا دے کر میدانِ سیاست میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا ۔ اس کے ساتھ ہی گویا یونینسٹ پارٹی کے تن مردہ میں روح حلول کر گئی ۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی واحد

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ۲۵ فروری ۱۹۴۰ء ۔

نمائندہ تنظیم مسلم لیگ کی موجودگی میں انقلاب ''اتحاد پارٹی'' کی بھی اسی طرح مذمت کرتا جس طرح اس نوعیت کی دیگر تنظیموں کی کر چکا تھا لیکن ہوا یہ کہ انقلاب نے اپنے ایک اداریے میں یونینسٹ پارٹی کی اس حیاتِ نو پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا :

''. . . یونینسٹ پارٹی کے تمام سابقہ اعمال سے سب کو کاملاً اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن آئندہ کے لیے فیصلہ کرتے وقت دو حقیقتوں کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے ۔ اول یہ کہ نظر بہ ظاہر اس پارٹی میں زیادہ سے زیادہ افراد کے شامل ہونے کا امکان ہے اور کوئی دوسری پارٹی اس لحاظ سے یونینسٹ پارٹی کے مقابلے پر نہیں آسکتی ۔ دوسرے یہ کہ پارٹی کا پروگرام صوبے کی اہم ترین تعمیری ضروریات پر حاوی ہے اور اس پروگرام کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں جس پر فرقہ واری کا الزام عائد ہو سکے ۔''۱

غور کیجیے کہ انقلاب نے نہ صرف اس تنظیم کے قیام کی مخالفت نہیں کی بلکہ عوام الناس کو اتحاد پارٹی میں شمولیت کی بھی ترغیب دی ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ انقلاب نے اتحاد پارٹی کی جو ممتاز خصوصیات بیان کیں وہ بھی انقلاب کے سابقہ سیاسی موقف سے متصادم ہیں ۔ اگر کسی سیاسی پارٹی میں شمولیت کے لیے محولہ بالا اقتباس میں پیش کردہ معائیر ہی کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں تھی ۔ اس کے علاوہ ان معیارات پر آل انڈیا کانگرس ، اتحاد پارٹی کے مقابلے میں بہتر طریق پر پوری اُتر رہی تھی ۔ وہ آل انڈیا کانگرس جس کے خلاف نہرو رپورٹ کے زمانے میں انقلاب نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا ۔ صرف یہی نہیں بلکہ اتحاد پارٹی کی حمایت کر کے روزنامہ انقلاب نے ایسی صورت پیدا کر دی جس میں جداگانہ انتخابات اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ حقِ نیابت کا پرانا مطالبہ بھی بے معنی سا نظر آنے لگا ۔ اسی زمانے میں صوبائی سطح پر اسمبلیوں میں لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے کا اعلان کیا گیا تو انقلاب نے اس کی بھی مخالفت کی اور وہ لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی مخالفت اور اتحاد پارٹی کی حمایت میں اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ اس نے قائداعظم اور حضرت علامہ اقبال کے خلاف بھی تند و تیز اداریے لکھنے شروع کر دیے ۔ قائداعظم کی مخالفت تو اس لیے

۱- روزنامہ انقلاب ، ۷ - اپریل ۱۹۳۶ع -

زیادہ ناقابلِ فہم نہیں کہ انقلاب ماضی میں بھی ان سے بہت سی معرکہ آرائیاں کر چکا تھا اور اب بھی بحیثیت سیاست دان ان کے ہر سیاسی عمل پر تنقید کرنے کا حق رکھتا تھا ۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ مولانا مہر کی ادارت میں نکلنے والے انقلاب نے اس شخصیت کے بارے میں بھی زہرناک لفظ استعال کیے جس کے بارے میں انقلاب ہی کے صفحات میں مولانا مہر کی یہ تحریر چھپ چکی تھی :

''میں مسلمانوں اور بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کو اس معیار پر مردہ یا زندہ دیکھنے کا عادی ہوگیا ہوں ۔ جتنے لوگ اقبال کو پڑھتے ہیں اور پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں انھیں میں زندہ سمجھ سکتا ہوں ۔ جو اسے پڑھتے نہیں یا پڑھ کر سمجھنے سے معذور ہیں ، میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ وہ مردہ ہیں ۔''۱

معلوم نہیں اب انھی علامہ اقبال کے خلاف افسوس ناک انداز میں اداریے رقم کر کے انقلاب اور مدیرانِ انقلاب اپنے مردہ ہونے کا ثبوت کیوں فراہم کر رہے تھے ؟ علامہ اقبال نے اپنے ایک بیان میں اتحاد پارٹی کے قیام اور لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی مخالفت کو رجعت پسندی قرار دیا تو انقلاب نے علامہ کے مقاصد و مصالح کو سمجھنے اور ان کا ساتھ دینے کی بجائے علامہ اقبال پر جوابی اعتراضات و الزامات کی بوچھاڑ کر دی ۔ ایک اداریے میں لکھا :

''حضرت علامہ اقبال کا عمل اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ۱۹۲۷ء میں مسٹر جناح کے اشد مخالف تھے اور جب تک مسلم کانفرنس کے صدر رہے اس عنصر کی مخالفت کرتے رہے جو مخلوط انتخابات کا حامی تھا ۔ خواہ وہ مسٹر جناح تھے یا احرار تھے یا ملک برکت علی تھے یا مولانا شوکت علی تھے اور نواب اسماعیل خاں وغیرہ تھے ۔ جس رجعت پسندی کا آج اعلان فرمایا گیا ہے اس کی ماہیت سے ہم ناواقف ہیں اور چونکہ اس رجعت پسندی کی مذمت میں ایک طرف ملک برکت علی صاحب علامہ اقبال کے ہم نوا ہیں ، دوسری طرف ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین ، پیر تاج الدین اور مسٹر غلام رسول بیرسٹر ہم نوا ہیں ، اس لیے ہماری قوتِ فہم بالکل حیران ہے ۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا سمجھیں اور

۱- روزنامہ انقلاب ، زبور عجم نمبر ، ۱۷ جولائی ۱۹۲۷ء ۔

مجاہدین کے اس گروہ لو کے کارنامہ ہائے جہاد کی تلاش کے لیے کس دائرے میں جائیں ۔ قدرت کا یہ عجب کھیل ہے کہ رجعت پسندی کا جو الزام کل تک حضرت علامہ اقبال کے لیے بھی ہماری طرح ناقابل فہم تھا وہ آج صرف ہمارے لیے ناقابل فہم رہ گیا ہے ۔ حضرت علامہ اقبال عدم فہم کی اس سراسیمگی سے بالکل پاک ہو چکے ہیں ۔"[1]

یہ درست ہے کہ انقلاب نے میدان سیاست میں شخصی احترامات کو کبھی لائق توجہ نہیں سمجھا اور اس بنا پر غلطی کرنے پر بڑے بڑے مسلم رہنما حتیٰ کہ ابوالکلام آزاد تک کی کھلم کھلا مخالفت کی ، لیکن علامہ اقبال کی بصیرت سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ براعظم کے مسلمانوں کے عام مفادات کے خلاف بھی کوئی اقدام کر سکتے ہیں اور یہ حقیقت خود مدیران انقلاب پر بھی منکشف تھی ۔

اس زمانے میں انقلاب آل انڈیا مسلم لیگ کو اسلامیان براعظم کی واحد نمائندہ سیاسی تنظیم تسلیم کرنے کے باوجود اتحاد پارٹی کے مقابلے میں پنجابی مسلمانوں میں اس کے اثر و رسوخ کو پسند نہیں کرتا تھا اور اپنی اس سیاسی پالیسی کے جواز کے طور پر دیگر یونینسٹ حلقوں کی طرح انقلاب نے بھی صوبائی اور آل انڈیا مسائل کی بے معنی اصطلاحات وضع کر لی تھیں ۔ انقلاب نے جو موقف اختیار کیا وہ یہ تھا کہ مسلم لیگ آل انڈیا مسائل و معاملات طے کرنے کے لیے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے لیکن اپنی اس امتیازی خصوصیات کے باوجود اسے صوبائی معاملات و مسائل میں دخل اندازی سے احتراز کرنا چاہیے ۔ اس ضمن میں انقلاب نے اپنا موقف پیش کرتے ہوئے ایک اداریے میں لکھا :

"۔ ۔ ۔ لیگ اگر صوبوں کو خود مختاری دے کر آل انڈیا مسائل میں انھیں متحد رکھنے کا مسلک اختیار کر لے تو ہمیں یقین ہے کہ تمام مسلمان تہ دل سے اس کا ساتھ دیں گے اور مسلمانوں کی جو تنظیم مسٹر جناح کے سامنے ہے وہ جلد سے جلد پایۂ تکمیل پر پہنچ جائے گی ۔"[2]

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ۱۵ مئی ۱۹۳۶ع ۔

۲۔ روزنامہ انقلاب ، ۷۔ اپریل ۱۹۳۷ع ۔

لیکن جب قائد اعظم نے انقلاب کے موقف کے برعکس صوبائی سطح پر بھی مسلم لیگ کو منظم کرنے کی کوشش کی اور اسمبلیوں میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ بنانے کا فیصلہ کیا تو انقلاب نے قائد اعظم کے اس اقدام کی پرزور مخالفت کی ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی مخالفت وہی انقلاب کر رہا تھا جو قبل ازیں لیگ کانفرنس پارلیمنٹری مجلس کی تائید و حمایت میں بے شمار اداریے لکھ کر قوم کو اتحاد و اتفاق کا درس دے چکا تھا ۔ اس صورت حال میں ۱۹۳۷ء کے انتخابات ہوئے جن میں مسلم لیگ دوسرے مسلم اکثریتی صوبوں کی طرح پنجاب میں بھی انتخاب ہار گئی ۔ انقلاب کے اس زمانے کے اداریوں اور فکاہیہ کالموں میں لیگ اور لیگ بورڈ کی مخالفت کے ساتھ ساتھ طنز و استہزاء کا ایسا رنگ بھی ملتا ہے جو عام طور پر صحافتی روایات کے خلاف ہے ۔ یہ صورت حال اُس وقت تک چلتی رہی جب تک اکتوبر ۱۹۳۷ء میں سکندر جناح پیکٹ کے باعث سردار سکندر حیات خاں نے مسلم لیگ میں باقاعدہ شمولیت اختیار نہیں کر لی ۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ انقلاب نے سکندر جناح مخالفت کے ہر دور میں ہمیشہ سکندر حیات خاں کا ساتھ دیا لیکن پنجاب سے غیر متعلق مسائل میں انقلاب اس دور میں بھی قائداعظم کی ہم نوائی کرتا اور انھیں مسلمانوں کا واحد مسّلمہ لیڈر قرار دیتا رہا ۔ اس بنا پر اس دور میں قائداعظم کے بارے میں انقلاب کے رویے کو دو رخہ قرار دیا جاتا ہے جیسا کہ احمد سعید لکھتے ہیں :

"روزنامہ انقلاب نے قائداعظم کے بارے میں دو رخہ رویہ اختیار کیا ۔ کل ہند مسائل میں تو روزنامہ انقلاب قائداعظم کی ہم نوائی کرتا تھا لیکن قائداعظم اور سکندر کے درمیان اختلاف کی صورت میں سر سکندر کی وکالت اور مدافعت کو اپنا فرضِ اولین سمجھتا تھا ۔"[۱]

اگرچہ سکندر جناح معاہدے کی مختلف اور متضاد تعبیرات کے باعث لیگ یولینسٹ تنازعہ بہت عرصے تک چلتا رہا اور سکندر حیات خاں کی زندگی میں انقلاب نے ہمیشہ یولینسٹ پارٹی کا ساتھ دیا ، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ

۱۔ مسلم صحافت اور جدوجہدِ آزادی ، از احمد سعید ، مشمولہ جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان ، جنوری ۱۹۸۱ء ، ص ۱۰۲ ۔

اپنے اسی دور میں لیگ سے تمام تر اختلافات کے باوجود مدیرانِ انقلاب نے مسلم لیگ کے لیے خدمات بھی انجام دیں ۔ اس کی سب سے بڑی مثال وہ رسالہ ہے جو مولانا مہر نے جولائی ۱۹۳۹ء میں ''سیاسیاتِ اسلامیانِ ہند'' کے نام سے تحریر کیا تھا ۔

سیاسی نقطۂ نظر سے انقلاب کے تیسرے دور کا آغاز بھی انھی حالات میں ہوا ۔ یعنی انقلاب صوبائی مسائل و معاملات میں اتحاد پارٹی کا ہم نوا رہا جبکہ کل ہند مسائل کے ضمن میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ساتھ دیتا تھا ۔ لیکن اب چونکہ ہر لمحہ منقلب ہوتی ہوئی ہندی سیاست کے تقاضے مختلف تھے لہذا یہ دو عملی زیادہ عرصے تک نہیں چل سکتی تھی ۔ خاص طور پر اس صورت حال میں جبکہ ایک سیاسی گروہ نے محض اپنے وقتی مفادات کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا تہیہ کر رکھا تھا اور دوسری جانب قوم سیاسی اعتبار سے اس قدر بیدار ہو چکی تھی کہ کسی طالع آزما کے لیے اس کے دامن میں کوئی گنجائش نہیں تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں لیگ اور اتحاد پارٹی کی باہمی رنجشوں اور مناقشات نے کھلی جنگ کی صورت اختیار کر لی ۔ مسلم لیگ کو یہ تفوق حاصل تھا کہ بیدار مسلم رائے عامہ اس کے ساتھ تھی اور اسے پنجاب میں جوش و جذبے سے معمور نوجوان رہنما بھی میسر آ گئے تھے ، جبکہ اتحاد پارٹی کے پاس اقتدار تھا اور اقتدار کی چندھیا دینے والی روشنی بہت سی نگاہوں کو خیرہ کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی ۔ افسوسناک امر یہ تھا کہ اس دور میں انقلاب اور اس کے جہاندیدہ مدیر بھی سیاسی صورت حال کا صحیح تجزیہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ گو انھوں نے پاکستان ، مسلم لیگ اور قائداعظم کی حمایت میں بے شمار افتتاحیہ مقالے لکھے اور وہ ان اداریوں میں مسلمانوں کے عمومی مطالبات کی حمایت بھی کرتے رہے لیکن اس دور میں ان کا مجموعی طرزِ عمل ملتِ اسلامیہ کے حقیقی مفادات کے لیے سود مند ثابت نہ ہوا ، اس لیے کہ انقلاب نے ہر نازک موقع پر خضر حیات ٹوانہ اور اتحاد پارٹی کی ترجمانی اور وکالت کو اپنا بنیادی موقف قرار دے لیا ۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے زمانے میں اپنی سیاسی ترجیحات کے اعتبار سے روزنامہ انقلاب عجیب شش و پنج اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہا ۔ ایک طرف ملتی مفادات اور بیدار رائے عامہ کے مطالبات تھے اور دوسری جانب صوبائی حکومت اور اس کے کارپردازوں سے مدیرانِ انقلاب کے دوستانہ تعلقات و

مراسم تھے ، جن کے باعث انقلاب کے لیے حق گوئی و بیباکی کی قلندرانہ روش کو نبھانا مشکل ہو گیا اور انقلاب نے قائداعظم اور لیگ کے مطالبات سے اصولی اتفاق کے باوجود عملاً خضر حیات خان کی دوہری وفاداریوں کی پالیسی کی حمایت کی ۔ اس کا واضح ترین ثبوت اُس وقت سامنے آتا ہے جب ہم انقلاب کے وہ اداریے دیکھتے ہیں جو نواب افتخار حسین ممدوٹ صدر پنجاب مسلم لیگ کی طرف سے سکندر جناح پیکٹ کے خاتمے کے اعلان کے سلسلے میں تحریر کیے گئے ۔ مثلاً انقلاب اپنے ایک اداریے میں لکھتا ہے :

”حقائق آپ کے سامنے ہیں ۔ مسلمان تنہا وزارت نہیں بنا سکتے ۔ چودھری سر چھوٹو رام کے گروہ یا اس گروہ کے ہم خیال غیر مسلموں کے سوا ، پنجاب میں کوئی گروہ ایسا نہیں ہے جو صوبائی نظم و نسق میں اور تمام قوموں کے جمہور کے لیے مفید پروگرام میں مسلمانوں سے قریب تر ہو ۔ ان کے اشتراک سے جو وزارت بنائی گئی ہے . . . اسے مسلم لیگی وزارت نہیں کہا جا سکتا ، بلکہ محض کوالیشن وزارت کہا جا سکتا ہے اور پارٹی کوالیشن یونینسٹ پارٹی ہے جیسا کہ سکندر جناح پیکٹ کی شق اول میں تصریحاً مرقوم ہے ۔ اس کے بعد چکر کھانے یا چکر دینے کی کوشش کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے ؟ صوبائی دائرے میں ہمارا نظریہ یہ ہے ۔ لیکن اس دائرے سے باہر پنجاب کا ہر لیگی ، لیگ پارٹی کا ہر ممبر اور ہر لیگی وزیر . . . مسلم لیگ کے ساتھ ہے ۔ لیگ پارٹی بطور جماعت سر سکندر حیات مرحوم کے عہد میں بھی یقیناً لیگی نظام کے تابع تھی اور آج بھی تابع ہے ۔“[1]

اس سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ انقلاب کے پیش نظر محض وقتی اقتدار کا معاملہ تھا جو کسی بھی حیلے سے مسلمانانِ پنجاب کو مل رہا تھا جبکہ مسلم لیگ کے پیشِ نظر یہ امر تھا کہ کیا وہ اس صورت حال کو قبول کر لیں کہ لیگ کے ارکان دوہری وفاداریوں کا دم بھرتے ہوں ؟ اگر ایسا کیا جاتا تو کیا پاکستان کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا تھا جس کے نقوش واضح کرنے میں انقلاب نے بھی ایک عرصے تک جدوجہد کی تھی ؟ حقیقت وہی ہے کہ جب اقوام یا افراد دو عملی اور تضاد کا شکار ہو جائیں تو انھیں یہ بھی

۱- روزنامہ انقلاب ، ۲۸ مئی ۱۹۴۳ء ۔

نہیں سوجھتا کہ وقتی مصلحتوں کے تحت وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ، بالآخر اس کا حتمی نتیجہ کس صورت میں ظاہر ہوگا ؟ اور یہ دوعملی اور تضاد ، اتحاد پارٹی ، خضر حیات خاں اور انقلاب کا محور سیاست بن گئی تھی جس کے باعث مسلمانان ہند اور پنجاب کے مسلمانوں کو بطور خاص بے انتہا نقصان پہنچا ۔ اسی لیے دوعملی کے نتیجے میں مسلم لیگ کو اتنا موقع نہ مل سکا کہ وہ پنجاب کے مسلمانوں میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانے پر ضروری توجہ دے سکتی ۔ اس کے باعث ۱۹۴۶ء میں کوالیشن وزارت قائم ہوئی جس کے باعث اکثریتی پارٹی ہونے کے باوجود مسلم لیگ کو حزب اختلاف کے بنچوں پر بیٹھنا پڑا اور مسلمانان پنجاب ان ثمرات سے محروم ہو گئے جو مسلم لیگ کو اقتدار ملنے کی صورت میں قیام پاکستان کے وقت ان کے لیے مفید ہو سکتے تھے ۔ اسی دوعملی کے نتیجے میں مسلم لیگ کو بالآخر صوبوں کی تقسیم مزید پر مجبور ہونا پڑا جس کے باعث نہ صرف کٹا پھٹا پاکستان معرض وجود میں آیا بلکہ وہ مسائل بھی پیدا ہوئے جو آج تک پاکستان کے لیے سوہان روح بنے ہوئے ہیں ۔

ان تمام حقائق کے باوجود انقلاب اور مدیران انقلاب کی سیاسی پالیسی اور ان کی ترجیحات کے بارے میں ایک مختلف نقطۂ نظر بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہ سب کچھ کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت نہیں ہوا بلکہ واقعات کی جو تصویر ان کے پیش نظر تھی اس کا منطقی نتیجہ وہی تھا ، جو مدیران انقلاب نے مرتب کیا ۔ یعنی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر کے اعمال و افعال کسی غلطی کا سبب تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کی بنیاد میں فتور نیت کو دخل نہیں ، جیسا کہ وہ خود بھی لکھتے ہیں :

"میں جب ماضی پر نظر بازگشت ڈالتا ہوں تو اکثر اپنے سابقہ افعال کو میزان حق و انصاف میں تولا کرتا ہوں ۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی فعل میں نیت کا فتور محسوس نہیں ہوا ۔ ممکن ہے کہیں رائے نے ٹھوکر کھائی ہو ، اندازے میں غلطی سرزد ہوئی ہو یا کسی مسئلے کے تمام متعلقہ حقائق نگاہوں کے سامنے نہ آئے ہوں تو کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ تاہم نیت ہمیشہ یہ رہی کہ مسلمانوں کی بہتری اور بہبود کو تقویت پہنچے ، ان کی حالت سدھرے اور وہ از سر نو ترقی کے مدارج

طے کریں۔"[1]

مولانا مہر کا یہ دعویٰ اس لیے قرین حقیقت نظر آتا ہے کہ علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد سے لےکر قراردادِ پاکستان کی منظوری تک وہ خود بھی دیگر مسلم زعماء کے ساتھ تشکیل و قیامِ پاکستان کے تقریباً تمام مراحل میں شریک رہے۔ مثلاً یہ مولانا مہر ہی تھے جنھوں نے انقلاب کے اداریوں اور مضامین کے ذریعے نہ صرف خطبۂ الہ آباد کے موقع پر پاکستان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے عملی جدوجہد کی بلکہ سیٹھ عبداللہ ہارون کے ایماء پر مولانا مہر نے بھی اس کمیٹی میں کام کیا جس کو قراردادِ پاکستان کے خاکے کی تیاری کا کام سونپا گیا تھا۔ اس کمیٹی کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے روزنامہ انقلاب کے ایک اداریے "پاکستان کی تاریخ" میں مولانا مہر نے لکھا:

"۱۹۳۸ء میں حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم نے مختلف سکیموں پر غور و فکر کے بعد ایک نئی تجویز سوچی جسے مکمل صورت میں مرتب کرنے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ سے ایک سب کمیٹی مقرر کرائی۔ اس کمیٹی نے ایک ڈھانچہ تیار کیا جس کی بنا پر مارچ ۱۹۴۰ء میں لیگ نے اپنی شہرۂ آفاق قرارداد منظور کی۔"[2]

مذکورہ بالا سب کمیٹی میں اپنی رکنیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"جس کمیٹی نے تقسیم کی مفصل سکیم تیار کی تھی اس کا ایک رکن میں بھی تھا۔ وہ سکیم اب تک میرے پاس ہے۔"[3]

اسی طرح اس کمیٹی اور اس میں مولانا مہر کے کام کا ذکر کرتے ہوئے علی محمد راشدی لکھتے ہیں:

"سر عبداللہ ہارون نے کمیٹی سے کام لینے کا پروگرام بنایا ہوا تھا تاکہ جس نظریے کو وہ آگے بڑھانا چاہتے تھے اس کو شروع ہی سے

۱۔ مکتوب بنام حمزہ فاروقی، مرقومہ ۱۲ جون ۱۹۶۸ء، غیر مطبوعہ۔
۲۔ روزنامہ انقلاب، ۱۲ فروری ۱۹۴۵ء۔
۳۔ مکتوب بنام الیس جیلانی، مرقومہ ۱۳ مئی ۱۹۶۳ء، غیر مطبوعہ۔

مسلم لیگ کا کور . . . حاصل رہے ۔ کمیٹی کے چیئرمین تو وہ خود بنے مگر باقی کام انھوں نے مولانا مہر اور راقم الحروف پر چھوڑ دیے، یعنی صورت یہ بنی کہ نام اور روپیہ سیٹھ عبداللہ ہارون کا ، دماغ غلام رسول مہر کا اور دفتری کام اس خادم کے سپرد ۔''[1]

تحریکِ پاکستان سے ان کے خلوص کا ثبوت یہ بھی ہے کہ مولانا مہر اور روزنامہ انقلاب نے بعض اوقات اصولی موقف پر خضر حیات ٹوانہ کی مخالفت بھی کی ۔ مثلاً جب ۱۹۴۶ع میں کانگرس کے ساتھ مل کر کوالیشن وزارت قائم کی گئی تو مولانا مہر نے اسے غیرطبعی وزارت قرار دیتے ہوئے لکھا :

''پنجاب میں جو وزارت بنی ہے اسے اس کا بڑے سے بڑا حامی بھی صحیح اور نمائندہ وزارت قرار نہیں دے سکتا ۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت اس سے الگ ہے ، اور مسلم اکثریت والے صوبے میں مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت جس وزارت سے الگ ہو وہ کسی حق دوست انسان کے نزدیک صحیح وزارت نہیں ہو سکتی ۔ پنجاب میں موجودہ دستور کے ماتحت اس قسم کی غیرطبعی حالت پہلی مرتبہ پیدا ہوئی ہے اور اس پر مسلمانوں میں اگر تشویش و اضطراب یا غم و غصہ کے جذبات پیدا ہوئے تو انہیں کوئی شخص ناواجب قرار نہیں دے سکتا ۔''[2]

لیکن اول تو خضر حیات کے اکثر اقدامات مثلاً سردار شوکت حیات خاں کی وزارت سے برطرفی ، شملہ کانفرنس میں نمائندگی کے مسئلے پر لیگ سے تنازعہ اور ۱۹۴۶ع میں کوالیشن وزارت کی تشکیل وغیرہ کو ناواجب اقدامات قرار دینے کے باوجود انقلاب نے حتی المقدور خضر حیات اور اتحاد پارٹی کے موقف کے بارے میں ہمدردانہ رویہ اپنائے رکھا اور معاملات کو لیگی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بجائے اتحاد پارٹی کے مفادات کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ دوسرے اس دور میں مسلم لیگ سے واضح طور پر مخاصمت بھی پیدا ہو گئی ۔

۱- مولانا غلام رسول مہر ، از علی محمد راشدی ، ۲۰ مارچ ۱۹۷۲ع ، روزنامہ جنگ ، کراچی ۔

۲- روزنامہ انقلاب ، ۱۵ مارچ ۱۹۴۶ع ۔

اگرچہ اس مخاصمت و مخالفت کے بہت سے اسباب تھے لیکن اوائل ۱۹۴۷ء میں مخالفت کا سب سے بڑا محرک مسلم لیگ کا صوبجات بنگال و پنجاب کی تقسیم پر رضامند ہو جانا تھا ۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بنائے مخالفت بھی غیر طبعی تھی ، اس لیے کہ جس اصول کے تحت مسلمان ہندوستان کی تقسیم پر اصرار کر رہے تھے وہی اصول صوبوں کی تقسیم مزید کا سبب بھی تھا ۔ اس کے علاوہ علاقائی مفادات کی اساس و بنیاد پر قائم ہونے والے سیاسی گروہوں نے ہی مسلم لیگ کو ایسی پوزیشن میں لا کھڑا کیا تھا کہ وہ صوبوں کی تقسیم کو طوعاً و کرہاً قبول کرنے پر مجبور ہوگئی ۔

بہرحال ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ جہاں مسلم لیگ اور اسلامیانِ ہند کے لیے انقلاب آفریں ثابت ہوا وہیں روزنامہ انقلاب اور اس کے مدیروں کے لیے بھی فیصلہ کن قرار پایا اور یہی دور ہے جس نے مولانا مہر سے اعزازات و امتیازات کی ہر دولت چھین کر انھیں تہی دامن کر دیا ۔

انقلاب کی سیاسی پالیسی کے چوتھے دور کا آغاز بھی شخصی و ذاتی تصادمات کے پس منظر میں ہوا ۔ پاکستان قائم ہوا تو مرکز اور صوبوں میں اقتدار کی مالک مسلم لیگ ہی لیکن چونکہ انقلاب اور مسلم لیگ میں مخالفت کی صورت پیدا ہو چکی تھی لہذا یہ سلسلہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی چلتا رہا ۔ پاکستان میں مہاجرین کی آمد اور ان کی آبادکاری کے ضمن میں انقلاب اور صوبائی مسلم لیگ کے زعماء کی مختلف آراء کے باعث اختلافات کو مزید ہوا ملی ۔ لیکن اب بھی صورت یہ تھی کہ اندرون ملک حکومت کی پالیسیوں پر ضرور تنقید کی جاتی لیکن بیرونی خطرات کے پیشِ نظر عوام کو ہر لمحہ اتحاد کا درس دیا جاتا ۔ اس کے علاوہ حیدرآباد دکن اور ریاست جموں و کشمیر کے معاملات میں بھی روزنامہ انقلاب نے حکومت پاکستان کے موقف کی تائید و حمایت کی ۔

ہماری سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کرنے والوں کو عموماً ریاست کا مخالف قرار دیا جاتا ہے ۔ یہی سب کچھ قیامِ پاکستان کے بعد روزنامہ انقلاب اور اس کے مدیروں کے خلاف بھی ہوا ۔ انقلاب نے بعض امور میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی مخالفت کی تو انقلاب کو پاکستان اور قائداعظم کا مخالف قرار دے دیا گیا حالانکہ صوبائی حکومت کے کارپرداز وہ لوگ تھے جن کی مفاد پرستانہ ذہنیت اور اصل مقاصد سے غافل

ہو کر ہمہ وقت سیاسی بازی گری کی عادت اور جاہ طلبی سے آخرکار خود قائداعظم بھی نالاں و بیزار ہو گئے تھے اور انھوں نے تنگ آ کر پنجاب کے صوبائی حکمرانوں سے لاتعلقی کا رویہ اختیار کر لیا تھا ۔ ایسی صورت حال میں یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ قائداعظم کے حقیقی بہی خواہ کون تھے ؟ وہ لوگ جو ان کی توہین کے مرتکب ہوئے یا وہ اخبار جس نے ان کے انتقال کو ملت کا نقصان عظیم قرار دیتے ہوئے سیاہ حاشیے میں لکھا :

''ممکن ہے بعض لوگوں کو نیک نیتی کے ساتھ قائداعظم کے بعض خیالات و اعمال سے اختلاف ہوا ہو ۔ وہ پنجاب و بنگال کی تقسیم اور اس کے بعد کی ہولناک خونریزی پر انتہائی غم دیدہ ہونے کی وجہ سے قائداعظم کو بھی ذمہ داری سے بری نہ سمجھتے ہوں ، لیکن دنیا میں وہ کون سا لیڈر ہے جس کی ساری زندگی پوری قوم کے نزدیک اعتراض سے پاک رہی ہو ۔ دیکھنا یہ ہے کہ من حیث المجموع قائد اعظم محمد علی جناح کا کام کس قدر شاندار ہے ۔ ان کی شخصیت نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ اس پورے برکوچک میں اپنی قابلیت ، قانونی لیاقت ، صلاحیت مذاکرات اور بلندیِ سیرت و کردار کے اعتبار سے فقید المثال تھی ۔ وہ عمر بھر کسی سرکاری عہدے کے خواہش مند نہ ہوئے ۔ یہی وہ بے داغ کردار تھا جس نے ان کی شخصیت میں رعب و داب اور دبدبہ و جلال پیدا کر دیا تھا کہ بڑے سے بڑے اشخاص بھی ان کے سامنے لرزہ براندام ہو جاتے تھے ۔

پاکستان کی نوزائیدہ دولت ابھی بے شمار داخلی و خارجی عقدوں سے دوچار ہے ۔ ہمیں اس نازک وقت پر اپنے قائداعظم کی اشد ضرورت تھی ۔ وہ مسلمانوں کے لیے طاقت اور اتحاد کا ایک بلند و مستحکم مینار تھے ۔ ان کی واحد تنہا شخصیت ، پاکستان میں ہر قسم کے رجوع کا مرکز تھی ۔ ان کی ایک ڈانٹ بڑے سے بڑے وسیع تنازعات کو ایک لمحے کے اندر نابود و بے اثر کر دیتی تھی ۔ اور ظاہر ہے کہ پاکستان کی موجودہ حالت میں ایسی شخصیت کا وجود کس قدر بیش بہا ملی سرمایہ تھی جس سے ہم موت کے ہاتھوں محروم ہوگئے اور ہمارا جہاز سلطنت موجوں اور چٹانوں کے درمیان ٹھوکریں کھاتا ہوا اپنے ناخدا کا ماتم کر رہا ہے ۔

قائداعظم محمد علی جناح کے انتقال سے ملت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ پوری ملت پاکستان کے استحکام اور اس کے دوام کے لیے متحد ہو جائے۔ قائداعظم ہمیں عمر بھر اتفاق و اتحاد کی تلقین کرتے رہے ۔ اگر ہمیں قائداعظم سے محبت ہے اور پاکستان کا قیام و استحکام مقصود ہے تو ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہم متحد ہو جائیں اور اندرونی و بیرونی فتنوں کا مقابلہ کرنے میں ہرگز تامل نہ کریں ۔ قائداعظم بلاشبہ زندہ نہیں ہیں لیکن ان کا نام اور کام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا اور پاکستان کا زندہ اور باوقار مملکت کی حیثیت حاصل کرنا ہماری ہی مساعی پر موقوف ہے . . .

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح کو اپنے دامن مغفرت کے سائے میں پناہ دے ۔ ان کی ملت کے ہر فرد کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ہم سب کو توفیق دے کہ جو امانت مرحوم نے ہمیں سونپی ہے اس کی مردوں کی طرح حفاظت کر سکیں اور دولت پاکستان کو اس قابل بنا دیں کہ وہ سچ مچ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہلانے کے قابل ہو جائے ۔"[1]

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات نامناسب لگتی ہے کہ مولانا مہر کو قائداعظم کا مخالف کہہ کر سیاسی اور صحافتی دائرے میں ان کی خدمات کا اعتراف کرنے سے انکار کر دیا جائے ۔ یہ الگ بات کہ خود مولانا مہر اپنی وسیع القلبی ، قناعت پسندی اور اس احساس کے باعث کہ اب زمانہ اور اس کے معیارات بدل گئے ہیں ، اپنی قدر و منزلت سے بے پروا ہو گئے تھے ۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں :

"میں نے ۱۹۲۳ع سے ۱۹۴۹ع تک سیاسی دائرے میں کام کیا ہے اور اگر اسے خودستائی نہ سمجھا جائے تو مختلف ادوار میں میرا کام واقعی حیرت انگیز تھا ۔ اتنا حیرت انگیز کہ ہماری اخبار نویسی کی پوری سرگزشت میں ایسی مثالیں شاذ ہی ملیں گے ۔ دورِ حاضر میں معیار بدل گئے ، نقطۂ نگاہ دوسرا ہوگیا ۔ اس میں میرے کام کی وہ قدر و منزلت

۱- روزنامہ انقلاب ، ۱۶ ستمبر ۱۹۴۸ع -

نہ رہی جس کا حق دار تھا ۔ اس پر نہ رنج ہے نہ افسوس ۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے ۔"[1]

مولانا غلام رسول مہر کی اداریہ نویسی

مولانا غلام رسول مہر کا شمار اردو کے اُن چند صحافیوں میں ہوتا ہے جو ابتداء میں صرف اخبار کے مدیر کی حیثیت سے مشہور ہوئے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرسید احمد خاں ، ابوالکلام آزاد ، ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ اگر صحافتی میدان میں نہ بھی آتے تو بھی ان کا شمار مصلح قوم ، شاعر و ادیب ، مقرر اور عالم دین کی حیثیت سے مشاہیر وقت میں ہوتا ۔ لیکن مولانا مہر میدانِ صحافت میں آئے تو ان کے دامن میں اس قسم کی کوئی متاع نہیں تھی ۔ البتہ اخبار نویسی کا جنون کی حد تک پہنچا ہوا شوق ضرور تھا اور اس شوق کے ساتھ ساتھ مولانا مہر کے پاس تاریخی شعور ، حقائق کی نقاب کشائی کرنے والا عاقلانہ ذہن ، اپنے عہد کے تعصبات کے غبار میں لپٹے مسائل و معاملات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت اور پھر جرأت و بے باکی کے ساتھ مسائل و معاملات کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرکے عوام کی رہنمائی کرنے کا ملکہ ضرور تھا ۔ انھی تمام اجزاء کے مناسب و متوازن مرکب نے مولانا مہر کو اپنے زمانے کا بے مثال اداریہ نویس بنانے میں اہم کردار ادا کیا ۔

جیسا کہ ابتداء میں ذکر آ چکا ہے ، اردو صحافت کا آغاز "جامِ جہاں نما" سے ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ طور پر اداریہ نویسی کی ابتداء مغربی علوم سے استفادہ کرنے والے سرسید احمد خاں کے اخبار سائنٹیفک سوسائٹی گزٹ کے اجراء سے ہوئی ۔ اس کے بعد تقریباً سبھی اردو اخبارات نے اداریے کو خبروں سے جدا کرکے شائع کرنا شروع کر دیا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے بعد اردو اداریہ نویسی کی روایت میں اہم اضافہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد ، ظفر علی خاں اور مولانا جوہر کے اداریے قرار دیے جا سکتے ہیں ۔ اتفاق یہ ہے کہ اردو کے ان تین عظیم اور اہم اداریہ نگاروں کی اداریہ نویسی کا پس منظر تقریباً ایک ہی ہے اور ان کے اداریوں کا مقصد وحید بھی ایک ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ مجبور و بے بس اور غلام ہندوستانیوں میں برطانوی سامراج کے

۱- مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۹ ستمبر ۱۹۶۲ء ، غیر مطبوعہ ۔

ظلم و استبداد کے خلاف جرأت کے ساتھ ڈٹ جانے کا عزم و حوصلہ پیدا کیا جائے ۔ دراصل زمیندار ، ہمدرد ، وکیل اور الہلال و البلاغ نے مردہ دل اور سوئی ہوئی قوم کو زندہ و بیدار کرنے کے لیے صورِ اسرافیل کا کام انجام دیا ۔ ان اخبارات کو جس نوعیت کے مسائل اور حالات کا سامنا تھا ، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پرجوش اور جذباتی تحریروں کی ضرورت تھی لیکن جب مولانا مہر نے اداریہ نویسی شروع کی ، اس وقت حالات کافی بدل چکے تھے ۔ اب نہ صرف قوم بیدار ہو چکی تھی بلکہ تقسیمِ بنگال ، جنگِ طرابلس و بلقان اور تحریکِ خلافت ایسے جذباتی واقعات تاریخ کا جزو بن چکے تھے ۔ انگریز بھی یہ بات محسوس کر چکا تھا کہ اب جلیانوالہ باغ ایسے سانحات کو دہرایا نہیں جا سکتا ۔ اگر ہند کو اپنی قلمرو میں شامل رکھنا ہے تو ظلم و تعدی سے کنارہ کش ہو کر مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق کے سبز باغ دکھانا ہوں گے ۔ غالباً برطانوی حکومت اس طریقِ عمل سے بطور خاص دو فوائد حاصل کرنے کی خواہاں تھی ۔ اول یہ کہ اس نوع کے اقدامات سے اس کے خلاف نفرت کا لاوا سرد ہو جائے گا ، دوسرے یہ کہ رعایات و حقوق کے ضمن میں برعظیم کے طول و عرض میں بسنے والی اقوام ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو کر از خود اس کے اقتدار کو طول دینے کے مواقع فراہم کر دیں گی ۔ یہ توقع اس لیے بھی تھی کہ انگریز جانتا تھا کہ ہندوستان کی مختلف اقوام سینکڑوں سال سے ایک دوسرے کے قریب رہنے کے باوجود باہمی اعتماد سے محروم ہیں جس کے باعث مختلف اقوام میں اپنے اپنے حقوق کی حفاظت کی طویل جنگ کا آغاز ہو جائے گا ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ جیسے ہی بعض آئینی اقدامات کا اعلان کیا گیا ، کانگرس نے ہندوستان کی قومی جماعت ہونے کا دعویٰ کر کے انگریزوں سے معاملہ کرنے کی کوشش کی ، جبکہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کی حیثیت میں اپنے ملی مفادات کے تحفظ اور ہندی مسلمانوں کو رام راج سے محفوظ رکھنے کا عزم صمیم کر لیا ۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال میں جوش و جذبات سے زیادہ اُس ذہن کی ضرورت تھی جو دلیل و منطق کی بنیاد پر اپنے موقف کی عمارت تعمیر و استوار کر سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس سارے دور میں اسلامی سیاست کے سٹیج پر مولانا ظفر علی خاں ، محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد کی بجائے قائد اعظم محمد علی جناح کی قانون و آئین سے واقف اور دلیل و منطق کے ہتھیاروں سے لیس شخصیت ابھرتی نظر آتی ہے جبکہ صحافت کے میدان میں اس ضرورت کو مولانا غلام رسول مہر اور انقلاب نے پورا کیا ۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ انقلاب کے اداریوں

کی اہم ترین خصوصیت ان کا منطقی اور استدلالی انداز ہے ۔ انقلاب کے اداریوں کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے عبدالمجید سالک لکھتے ہیں :

''انقلاب کسی بھی حالت میں جذبات انگیزی اور ہنگامہ آرائی میں شامل نہ ہوتا تھا بلکہ متانت اور سنجیدگی سے سیاسی معاملات پر بحث کرتا تھا ۔''۱

ظاہر ہے کہ حقوق اور تصفیہ حقوق کی جنگ میں جذبات انگیزی اور ہنگامہ آرائی کی نسبت متانت اور سنجیدگی ہی کامیابی کی واحد کلید بن سکتی ہیں ۔ دراصل مولانا مہر کا انداز فکر یہ تھا کہ مسائل و معاملات پر بحث کرتے ہوئے ان میں جذبات کی رنگ آمیزی کی بجائے استدلال سے کام لیا جائے تو لوگ وقتی طور پر متاثر و مسحور ہونے کی بجائے دیرپا اثر قبول کرتے ہیں اور یہی دیرپا اثر بعدازاں ان کی سیاسی آرا میں ایک زبردست اور انقلاب آفریں تبدیلی کرتا ہے ۔ یہ اسی انداز فکر کا اعجاز تھا کہ مولانا مہر کے گنتی کے چند اداریوں کے سوا جذباتی سے جذباتی مسائل پر لکھے گئے اداریے بھی دل سے زیادہ دماغ کو متاثر کرتے اور اپنا ہمنوا بناتے ہیں ۔ مولانا مہر کے اداریوں کا یہ انداز اگرچہ روزنامہ زمیندار سے وابستگی کے زمانے میں بھی نمایاں ہو چکا تھا لیکن اس کا کامل اظہار روزنامہ انقلاب ہی کے صفحات میں ہوا ۔ جیسا کہ مسکین حجازی لکھتے ہیں :

''زمیندار سے وابستگی کے دوران میں بھی اگرچہ ان کے مدلل اور جامع اداریوں کی منفرد حیثیت نمایاں ہو چکی تھی ، انقلاب میں آ کر ان کے اداریوں کا منفرد انداز پختہ اور مستحکم ہو گیا ۔''۲

غالباً یہ حالات اور مسائل کا اقتضا تھا کہ مولانا مہر نے اردو صحافت کے جدید دور کا نقیب ہونے کے باوجود انقلاب کے اداریوں میں سرسید احمد خاں کے سائنٹیفک سوسائٹی گزٹ کے اداریوں کی خصوصیت پیدا کی ۔ ان دونوں اخبارات میں ۱۸۵۷ء اور تحریک خلافت کے جذباتی پس منظر کے باوجود منطق و استدلال

۱- سرگزشت ، از عبدالمجید سالک ، ص ۳۲۹ - ۳۳۰ -

۲- اداریہ نویسی ، از مسکین حجازی ، ص ۳۶۹ ، طبع دوم ، ۱۹۷۶ء ، مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن ، لاہور ۔

سے اپنے حقوق منوانے کی جد و جہد مشترک قرار پاتی ہے ۔ اسی بنا پر سرسید احمد خاں اور مولانا مہر بھی بڑی حد تک مشترک خصوصیات کے حامل اداریہ نویس کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ۔ سرسید احمد خاں اور مولانا مہر کے اداریوں کی اس مشترک صفت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

''انھوں نے صحافت میں ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں کی ادبیت کو زندہ رکھا اور اس کے ساتھ سرسید کی حقائق پسندی کو رواج دے کر اداریہ نویسی کی ایک نئی روایت قائم کی ۔''۱

لیکن سرسید اور مولانا مہر کے اداریوں میں اس قدر اشتراک کے علاوہ ایک اور چیز بھی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ یہ اداریے عقل و منطق کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں اور دل سے زیادہ دماغ کو متاثر کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے اداریے جس جذبۂ خلوص اور دل سوزی سے رقم کیے جاتے ہیں اس کی بنا پر ذہن کے ساتھ ساتھ دل کو بھی اپنا ہمسفر بنا لیتے ہیں ۔ اور یہی وہ چیز ہے جو سرسید احمد خاں اور مولانا مہر کی اکثر صحافتی تحریروں کو بھی فن اور آرٹ کے مرتبے پر فائز کر دیتی ہے ۔ مولانا مہر کے اداریوں میں اسی جذبۂ خلوص کا اعتراف کرتے ہوئے مسکین حجازی لکھتے ہیں :

''مولانا مہر کے اداریے سادہ اور منطقی ہونے کے باوجود موثر ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف وہی بات لکھتے جس پر ان کو یقین ہوتا ۔ چنانچہ خلوص کے ساتھ کہی ہوئی بات ہمیشہ موثر ہوتی ہے ، خواہ وہ کسی بھی انداز میں کہی جائے ۔''۲

سوال یہ ہے کہ آخر مولانا مہر کے اداریوں میں پیش نظر روایت اور عصری تقاضوں کے برعکس یہ منطقی اور استدلالی انداز کیونکر پیدا ہوا ؟ دراصل مولانا مہر مختلف سیاسی واقعات کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ کرتے اور ان پر اپنی رائے دیتے ہوئے گزشتہ و آئندہ حالات کی مکمل تصویر سامنے رکھتے تھے ۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

۱۔ مولانا مہر ۔ بحیثیت مصنف ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، ص ۲۴ ، فنون ، لاہور ۔
۲۔ اداریہ نویسی ، از مسکین حجازی ، ص ۳۸۴ ۔

''مہر صحافت کو وقتی مسائل کی بازی گاہ نہ سمجھتے تھے بلکہ آنے والے پچاس سال کا نقشہ ان کے سامنے ہوتا تھا اور ان کا ہر اداریہ اس نقشے کی تکمیل کی ایک کڑی ہوتا تھا ۔ ان کی منطق مضبوط ، ان کی عبارت ادیبانہ ، ان کے استدلال میں جدل کے سب اوصاف موجود ۔''[1]

مولانا مہر کے اداریوں کی دوسری اہم خوبی ان کی تحقیق و تاریخ سے دلچسپی کے باعث پیدا ہوئی ۔ مولانا مہر اُس وقت تک اداریے کے لیے موضوع کا انتخاب ہی نہیں کرتے تھے جب تک موضوع کے بارے میں کامل معلومات حاصل نہ کر لیتے ۔ پھر ان معلومات کی چھان پھٹک سے جو نتائج حاصل ہوتے ان کی بنیاد پر اپنی سیاسی آراء قارئین کی نذر کر دیتے تھے ۔ مولانا مہر کے اداریوں کی اس خصوصیت کا جائزہ لیتے ہوئے عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں :

''جب کسی مسئلے پر لکھنا ہوتا تو اس کے تمام پہلوؤں پر پورے غور و تفحص سے کام لیتے ، حقائق کی چھان پھٹک کرتے ، تمام معلومات حاصل کرتے اور اس کے بعد اس مسئلے کو اداریے میں پیش کرتے ۔''[2]

اداریوں میں حقائق کی چھان پھٹک اور مکمل معلومات پیش کر دینے کے اسی انداز کے باعث اردو صحافت کے مورخین انقلاب کے اداریوں کو ''مباحث'' قرار دیتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا مہر کے اکثر اداریوں کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اخباری اداریے کا مطالعہ کرنے کی بجائے ایک خاص موضوع پر ہونے والے مباحثے کے لیے مقالہ پڑھ رہے ہیں ۔ مولانا مہر نہ صرف مسئلے کے بارے میں اپنی آراء کے حق میں دلائل و براہین کا انبار لگا دیتے بلکہ مخالفین کے اعتراضات اور ان کے دلائل کا جواب بھی پیش کرتے ۔ مثلاً بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے حق میں اپنے دلائل کے ساتھ ساتھ مخالفین کی دلیلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''علیحدگی کے مخالفین لے دے کر ایک دلیل پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ سندھ اپنے وسائل و ذرائع کی قلت اور اپنی آمدنی کی کمی کے باعث

۱۔ بیادِ مہر ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، روزنامہ جاوداں ، ۱۹ نومبر ۱۹۷۱ع ۔
۲۔ صحافت — پاکستان و ہند میں ، از عبدالسلام خورشید ، ص ۲۴۳ ۔

ایک مستقل حکومت کے مصارف ضروریہ کا بار نہیں اٹھا سکتا ۔ لیکن یہ دلیل بے انتہا کمزور و ضعیف ہے اور حقیقی حالات سے لاواقفیت کی بنا پر پیش کی جاتی ہے ۔ آسام ایک جداگانہ صوبہ ہے حالانکہ اس کی آمدنی محض سوا دو کروڑ روپے سالانہ بتائی جاتی ہے ۔ اس کے مقابلے میں سندھ کی آمدنی ساڑھے تین کروڑ روپے سالانہ ہے اور اس آمدنی میں بندرگاہ کراچی کے محاصل شامل نہیں جو روز بروز ترقی کر رہے ہیں اور سندھ کی علیحدگی کے بعد ان میں بے انتہا ترقی اور اضافے کا قوی یقین ہے ۔ نیز موجود حالات میں سندھ کی زمین کا صرف ۱/۵ حصہ زیر کاشت ہے ۔ سکھر کے بند کی تکمیل کے بعد امید کی جاتی ہے کہ کم از کم نصف زمین مزروعہ ہو جائے گی ۔ زراعت کے دائرے کی اس حیرت انگیز وسعت سے سالانہ آمدنی میں جو بیش بہا اضافہ ہوگا ، وہ محتاج بیان نہیں ۔''۱

اس کے علاوہ اداریوں میں متعلقہ مسئلے کے بارے میں اعداد و شمار بھی قارئین کی نذر کیے جاتے تا کہ وہ حقائق کی بنا پر مدیر کے ہم رائے ہو سکیں ۔ یوں تو مولانا مہر ہر پیش آمدہ مسئلے کا تجزیہ اعداد و شمار کی بنا پر ہی کیا کرتے تھے لیکن ملازمتوں اور تعلیم وغیرہ کے میدان میں ہندو مسلم تناسب کا ذکر کرتے ہوئے اس امر کو خاص طور پر مد نظر رکھتے ۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کے ملازمت پیشہ مسلمان انقلاب کو اپنا پشت پناہ اور ہمدرد تصور کرتے تھے ۔ انقلاب کی اس خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے احمد سعید لکھتے ہیں :

''روزنامہ انقلاب نے باقاعدہ اعداد و شمار پیش کرکے مختلف سرکاری اور نیم سرکاری محکموں میں مسلمانوں کی حالت زار پر خاطر خواہ روشنی ڈالی اور اپنے اداریوں میں اس مسئلے پر مسلم جذبات کی ترجمانی کی ۔''۲

مثلاً جالندھر ڈویژن کے ، جہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد آباد تھی ، عملۂ تعلیم میں ہندو مسلم تناسب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا گیا :

۱- روزنامہ انقلاب ، ۴ مئی ۱۹۲۷ء -

۲- مسلم صحافت اور جد و جہد آزادی ، از احمد سعید ، ص ۱۰۸ -

"اگرچہ قسمت جالندھر میں مسلمانوں کی تعداد پوری آبادی کے نصف کے قریب ہے ، لیکن اس کے باوجود منوہر لال وزیر تعلیمات کی مہربانیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ڈویژن کا عملۂ تعلیم سارے کا سارا ہندوؤں اور سکھوں سے بھرا پڑا ہے ۔ اس عملے کے افسروں کی فہرست ملاحظہ ہو :

انسپکٹر : سردار بہادر بشن سنگھ

ڈسٹرکٹ انسپکٹر فیروز پور : سردار بکرم سنگھ

"ڈسٹرکٹ انسپکٹر جالندھر : سردار جگندر سنگھ

. . . . "[1]

اعداد و شمار کی اس پیش‌کش نے مولانا مہر کے اداریوں میں صحت واقعات کی ایسی خصوصیت پیدا کی جس کی بناء پر ان کے دلائل و براہین اور پیش کردہ نتائج کو جھٹلانا ممکن نہیں رہتا تھا ۔ مولانا مہر کے اداریوں میں یہ خوبی ان کے تبحرِ علمی ، وسعت معلومات اور ہمہ دانی کے باعث ہی پیدا ہوئی ۔ مولانا جس موضوع پر قلم اٹھاتے اپنی وسیع معلومات کے پس منظر میں اس کے ایک ایک پہلو کا اس انداز میں تجزیہ کرتے کہ اصل مسئلے کے تمام خدو خال نمایاں ہو کر قارئین کے سامنے آ جاتے ۔

مولانا مہر کے اداریوں کا ایک اور نمایاں وصف ان کی تکرار ہے ۔ اخبارات میں کسی موضوع پر عموماً ایک آدھ اداریہ ہی لکھا جاتا ہے ، لیکن مولانا مہر جس موضوع پر اداریہ لکھتے ، اُس کی جملہ کڑیوں کی نقاب کشائی کے لیے صرف ایک آدھ اداریے پر اکتفا نہ کرتے ، بلکہ اصل مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو بار بار موضوع بنا کر اسے پورے طور پر قارئین کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کیا کرتے تھے ۔ اس بناء پر انہیں اول تو ایک ہی موضوع پر بار بار اداریے لکھنے پڑتے ۔ مثلاً ہندو مسلم اتحاد ، جداگانہ انتخابات ، بمبئی سے سندھ کی علیحدگی ، بلوچستان کے لیے آئینی حقوق ، نہرو رپورٹ ، خطبہ الہ آباد ، پنجاب مسلم لیگ اور اتحاد پارٹی کشمکش اور قراردادِ پاکستان وغیرہ کے موضوعات پر بے شمار اداریے لکھے گئے ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی طویل

۱-

اداریہ کئی مختلف قسطوں میں چھپتا رہتا ۔ مثلاً ان کا پہلا اداریہ ''طلوع صبح اُمید'' بھی چار قسطوں میں شائع ہوا تھا ۔ اس کے علاوہ انقلاب دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بہت سے اداریے دو دو اور تین تین قسطوں میں شائع ہوئے ۔ مولانا مہر کے اداریوں کے اس وصف کا تذکرہ کرتے ہوئے مسکین حجازی لکھتے ہیں :

''دوسرے اخبار عموماً متعلقہ مسئلے پر ایک اداریہ چھاپتے اور پھر اس مسئلے کو فراموش کر دیتے ۔ مگر مولانا مہر جب کسی مسئلے کو اٹھاتے تو اسے کسی نتیجے تک پہنچانے کی کوشش کرتے ۔''۱

اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک ہی موضوع پر متعدد یا طویل اداریوں کے علاوہ مولانا مہر یہ بھی کیا کرتے تھے کہ ایک اداریے کے مختلف پہلوؤں کو مختلف حصوں میں تقسیم کرکے الگ الگ ذیلی عنوانات کے تحت لکھا کرتے تھے ۔ مثلاً ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابو الکلام آزاد کے طرزِ عمل کے بارے میں جو اداریہ کلکتہ کے بعد ''کانگرس کے دوسری مہلک غلطی'' کے عنوان سے ۹ جنوری ۱۹۳۰ع کو شائع ہوا ، اس میں ''صحیح طریقِ عمل'' ''کانگرس کی پہلی ہول ناک غلطی'' ، ''دوسری ہولناک غلطی'' ، ''وائس رائے کا اعلان اور کانگرس'' اور ''آزاد و انصاری کا اعلان'' وغیرہ متعدد ذیلی عناوین ہیں ۔

تکرار کے باوجود انقلاب کے اداریے کبھی بے محل نہیں ہوتے تھے ۔ مولانا مہر کو موضوع کا انتخاب کرنے میں بھی کمال حاصل تھا ۔ وہ عموماً اسی موضوع پر لکھتے جس پر قلم اٹھانے کا حالات تقاضا کرتے ۔ دراصل حالات کے اقتضاء کی اس فہم کے بغیر صحافی اپنے قارئین کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کے قابل بھی نہیں رہتا ۔ رہنمائی کا حق اسی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے جب اداریے موقع محل کی مناسبت سے تحریر کیے جائیں اور ان مسائل پر لکھے جائیں جو پیش آ رہے ہیں اور جن کے خدو خال کو جاننے ، سمجھنے اور نمایاں طور پر دیکھنے کے لیے عام قاری بے تاب ہے ۔ انقلاب کے اداریوں میں حالات سے ہم آہنگی کی یہ خصوصیت اس وجہ سے بھی پیدا ہوئی کہ مولانا مہر

۱۔ اداریہ نویسی ۔ از مسکین حجازی ، ص ۱۶۳ ۔

صحافتی منبر سے عوام الناس کی رہنمائی کے علاوہ اُن کے سامنے ایک مقصد بھی پیش کرنا چاہتے تھے ۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے ، مولانا مہر نہ تو ابو الکلام آزاد کی طرح عالم دین تھے اور نہ مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر جیسے خطیب و مقرر ، جس کے باعث انھیں عام مجمعوں میں لوگوں کے سامنے اپنی بات پیش کرنے کا موقع ملتا ۔ لے دے کر ان کے پاس انقلاب کے صفحات تھے جن کے توسط سے وہ لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر سکتے تھے ۔ چنانچہ مولانا مہر نے یہی کیا بھی ۔ متعلقہ مسائل کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کے اداریوں میں عموماً ''دعوت'' کا سا انداز نمایاں ہونے لگتا ہے ۔ مثلاً مولانا مہر نے جناح لیگ کے بعض فیصلوں پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے ایک اداریے میں لکھا :

''خدا کے لیے سنبھلو ، ہوش میں آؤ ، وقت نازک اور حالات اضطراب انگیز ہیں ۔ قوم کی موت و حیات کا فیصلہ تمھارے ہاتھ میں ہے ۔ ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت اور سمجھوتے کے امکانات بڑھ رہے ہیں ۔ اس زریں فرصت کو باہمی کشمکش میں ضائع نہ کرو ۔ ایسی کوششیں عمل میں لاؤ کہ جو تم سے الگ ہو جائیں وہ بھی تمھارے ساتھ مل جائیں یا بدرجہ آخر مخالفت سے محترز رہیں ۔''[۱]

مولانا مہر کے اداریوں میں داعی کے عام انداز کے باوجود خطاب کا وہ عنصر نہیں پایا جاتا جو مولانا ظفر علی خان ، مولانا جوہر اور ابو الکلام آزاد کے اداریوں کا وصف خاص ہے ۔ لیکن مولانا مہر کے اداریوں میں وہ ادبی چاشنی اور شعریت ضرور ملتی ہے ، جو ان کو مذکورہ بالا صحافیوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے ۔ یہ شعریت اور ادبیت جہاں مولانا مہر کو ظفر علی خان اور ابو الکلام آزاد کا ہم پایہ اداریہ نویس بناتی ہے ، وہیں ان عناصر کی بدولت ان کے اداریوں میں وہ نقص بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ صحافت کے جدید دور سے تعلق رکھنے کے باوجود اداریہ نویسی کے جدید تقاضوں پر پورا نہیں اترتے ۔ جدید دور کا اداریہ نویس اپنے اداریوں میں آسان اور عام فہم زبان استعمال کرتا ہے تا کہ کم پڑھا لکھا قاری بھی ان کا مطالعہ کر سکے اور اداریہ پڑھنے کے بعد مسئلے کے جملہ پہلوؤں کو سمجھ کر اس کی اصل

۱- روزنامہ انقلاب ، ۱۲ جنوری ۱۹۲۸ع ۔

نوعیت سے واقف ہو سکے ۔ اگرچہ مولانا مہر کے اداریوں میں ایسی مشکل اور دقیق زبان تو نہیں ہوتی جو الہلال کا طرۂ امتیاز تھی ، اس کے باوجود ان کی زبان کہیں کہیں مشکل ہو جاتی ہے ۔ دراصل اسلوب کے اعتبار سے مولانا کے اداریوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلا دور وہ ہے جب مولانا مہر زمیندار سے منسلک تھے ۔ چونکہ اس عہد کی عام فضا جذباتی نوعیت کی تھی لہذا مولانا مہر بھی اس دور کے عام تقاضوں سے دامن نہیں بچا سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے اداریوں میں عقل و منطق اور استدلال پر جذبے کی مضبوط گرفت نظر آتی ہے ۔ مثلاً :

''ہم کس طرح اپنے دل کے خونچکاں ٹکڑوں کو دنیا کے سامنے رکھ دیں کہ ایک ایک آنکھ میں اشک ہائے غم کے دریا موجزن ہو جائیں ۔ ہم کس طرح اپنے زخم ہائے جگر کے ٹانکے کھول دیں کہ ایک ایک قلب جذبات درد و الم کے طوفان سے معمور ہو جائے ۔ ہم کس طرح اپنے سینے کو چیر کر اس کے داغوں کی قیامت خیز بہار کو وقفِ تماشا کر دیں کہ ایک ایک زبان آہ و فغاں کی شورشوں کا محشر ستاں بن جائے ۔ آہ کہاں ہیں وہ آنکھیں جو کاروانِ اسلام کی مصیبتوں پر خوننابہ فشانی کرنے کی دعویدار ہیں ؟ کہاں ہیں وہ قلب جو قافلۂ حق و صداقت کے مٹنے پر تڑپنے اور لوٹنے کے لیے مضطرب ہیں اور کہاں ہیں وہ زبانیں جو حریت و آزادی کے حسن کی آرائش و زیبائش چھن جانے پر اپنے نالہ و شیون سے عرش کے کنگروں کو ہلا دینا چاہتی ہیں کہ جبر و تشدد کی طاغیت نے قیامت برپا کر دی ۔ ظلم و جور کے شیطانوں کی زنجیریں اتار دی گئیں ۔ غضب و دشنام کا جہنم بھڑک اٹھا اور ستم و تعدی کا سمندر تلاطم پر اتر آیا ۔''[1]

مولانا مہر کی اداریہ نویسی کے اولین دور کے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں :

''اس زمانے میں وہ مولانا ابو الکلام آزاد اور ظفر علی خاں کے اسلوب نگارش سے متاثر تھے ــ آزاد سے زیادہ ، ظفر علی خاں سے کم ۔ چنانچہ

۱- روزنامہ زمیندار ، ۷ فروری ۱۹۲۲ء ۔

ایک تو اداریے طویل ہوتے تھے ۔ دوسرے ان میں ادیبانہ رنگ بھی تھا اور خطیبانہ ٹھاٹھ بھی اور کہیں کہیں جوش و خروش استدلال پر غالب آ جاتا تھا ۔''۱

اس دور میں جذبے کی یہی فراوانی مولانا مہر کے اداریوں کو تشبیہ و استعارہ کے زیور سے آراستہ کرتی ہے اور اسی کے باعث ان کی تحریروں میں ادبیت و شعریت کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے ۔ لیکن دوسرے دور میں جس کا آغاز تقریباً اجرائے انقلاب ہی سے ہوا ، یہ کیفیت بڑی حد تک ختم ہوگئی ۔ اب مولانا مہر کے اداریوں میں جذبے کے مقابلے میں منطق و استدلال کی وہ خشکی زیادہ نظر آتی ہے جو اداریے کو اس کے حقیقی مقام پر فائز کرتی ہے ۔ غالباً اسلوب میں اس انقلاب عظیم کے دو بڑے سبب ہیں ۔ اول وہ تجربہ جو اخبار نویسی سے انسلاک سے ہوا ، دوم جذباتی پس منظر کی تبدیلی ۔ بہر حال وجوہ کچھ بھی ہوں ، دوسرے دور کے اداریے پہلے دور سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں ۔ اگرچہ اب بھی کہیں کہیں پہلے والا انداز تحریر نمایاں ہو جاتا ہے لیکن عموماً منطق و استدلال کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی ۔ مثلاً اپنے ایک اداریے میں لکھتے ہیں :

''ہندو کی یہ حالت ہے کہ اس نے ایک دستور بنایا ، چند مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ۔ اعلان کر دیا کہ یہ قومی دستور ہے اور انگریز کو چاہیے کہ ایک سال کے اندر اندر اسے قبول کر لے ۔ ایک سال گزر گیا تو فی الفور اعلان کر دیا گیا کہ ہم کامل آزادی کے طلب گار ہیں اور نہرو رپورٹ زائد المیعاد ہو چکی ہے ۔ لیکن مالوی جی اٹھتے ہیں اور مختلف پارٹیوں کو ساتھ ملا کر کانگرس کی مخالفت میں سرگرم عمل ہو جاتے ہیں اور اب تک نہرو رپورٹ کو بہترین شے سمجھتے ہیں ۔ کانگرس کہتی ہے کہ نہرو رپورٹ زائد المیعاد ہو چکی ہے ۔ یہ نہیں کہتی کہ رپورٹ غیر منصفانہ تھی اور اب کسی جماعت یا فرد کو حق نہیں کہ اس غیر منصفانہ دستور کو ، جسے کانگرس غلطی سے قومی دستور سمجھتی رہی ، کسی صورت میں بھی ملک کے اندر نافذ

۱۔ افکار و حوادث ، از عبدالسلام خورشید ، سنڈے ایڈیشن روزنامہ مشرق ، نومبر ۱۹۷۱ع ۔

کرے یا نافذ کرنے کی کوشش عمل میں لائے۔ مالوی جی کی مخالفت بھی نہیں کرتی ۔ اب ہوگا یہ کہ گاندھی اور نہرو ''آزادی آزادی'' پکارتے رہیں گے ۔ مالوی جی نہرو رپورٹ کو لے کر دوسری طرف مصروف سعی و جہد ہو جائیں گے ۔ مسلمانوں کو گاندھی اور نہرو کی حمایت میں لانے کے لیے آزاد و انصاری اپیل کر چکے ہیں ۔ مسلمان اس اپیل پر متوجہ ہوئے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ مالوی جی نہرو رپورٹ کو کسی نہ کسی شکل میں منظور کرا لیں گے ۔ کانگرس یا گاندھی و نہرو کہہ دیں گے کہ ہمیں مالوی جی کے طریقِ عمل سے اختلاف ہے ۔ لیکن وہ نظام ملک میں نافذ ہو جائے گا ۔ گاندھی و نہرو تین سال تک بائیکاٹ جاری رکھیں گے ۔ پھر جوابی تعاون کا دور آئے گا اور انجام کار عام تعاون شروع ہو جائے گا ۔ مسلمان اس وقت تک اور برباد ہو جائیں گے اور نقصان رساں نظام حکومت کی اتنی مخالفت بھی نہ کر سکیں گے ، جتنی کہ نہرو رپورٹ کی کر چکے ہیں ۔''[۱]

پہلے دور کی نسبت اب زبان آسان اور سہل ہوگئی ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد مولانا مہر کے اداریوں میں اداریہ نویسی کے طویل تجربے کے باعث ایسی زبان استعمال ہونے لگی جو ادبیت و شعریت سے تقریباً خالی لیکن اداریہ نویسی کے جدید تقاضوں سے قریب تر ہے ۔ البتہ مولانا مہر کے اسلوب نگارش کی عام خصوصیات اس دور کے اداریوں میں بھی ملتی ہیں ۔ اس کے علاوہ اس دور میں بھی جہاں کہیں عربی ، فارسی ضرب الامثال جزو تحریر بن جائیں ، زبان پھر سے مشکل ہونے لگتی ہے ۔ مولانا مہر ، ابو الکلام آزاد اور ظفر علی خاں کی طرح اپنے اداریوں میں عربی فارسی ضرب الامثال بکثرت تو استعمال نہیں کرتے ، لیکن موقع محل کی مناسبت سے ان کے استعمال سے احتراز بھی نہیں کرتے ، جس کے باعث زبان سلیس اور آسان نہیں رہتی ۔ عربی فارسی ضرب الامثال اور قرآنی آیات کے ٹکڑے اداریے کی عبارت میں حسبِ ضرورت استعمال کیے جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ان کو اداریے کا ذیلی عنوان بھی بنا دیا جاتا ہے اور اکثر ضرورت کے مطابق ان میں ترمیم و تحریف بھی کر دی جاتی ہے ، لیکن طنز و مزاح کے لیے ۔ تحریف کی بہترین مثالیں وہ ہیں جو بعض اوقات

۱- روزنامہ انقلاب ، ۱۰ جنوری ۱۹۳۰ء ۔

ناموں کے سلسلے میں سامنے آتی ہیں ۔ مثلاً پنجاب لوکل سیلف گورنمنٹ کے محکمے کا نام اس کے وزیر گوکل چند کے نام کی رعایت سے انقلاب کے اداریوں کے عناوین میں اکثر ''گوکل سیلف گورنمنٹ'' ہی لکھا جاتا تھا ۔''۱ طنز و مزاح اور تمسخر و استہزاء کے ضمن میں وہ اداریے بھی بے مثال ہیں ، جو سکھوں کی مخالفانہ روش کے جواب کے طور پر لکھے گئے ۔ مثلاً ۱۶ اپریل ۱۹۳۲ء کے روزنامہ انقلاب میں شائع ہونے والے اداریے کا عنوان ''جمہوریت کا سکھ تصور ۔ ہندوستان کی ایک نہایت دلچسپ قوم'' ہے ۔ اسی طرح ۲۸ اپریل ۱۹۳۲ء کے انقلاب کے اداریے کا عنوان بھی ''سکھ بھائیوں کی تازہ دلائل آرائی ۔ ہندوستان کی نہایت ہی دلکش قوم'' ہے ۔ اسی طرح ایک اور اداریے کا عنوان ہے ''بابا کھڑک سنگھ کا مورچہ ۔ دلچسپ قوم کے دلچسپ فرد کا دلچسپ فیصلہ ۔''۲ مزاح کا یہ انداز عناوین کے علاوہ اداریوں کے متن میں بھی آ جاتا ہے ۔ مثلاً ایک اداریے میں مولانا شوکت علی کی بے احتیاطی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا گیا :

> ''ہمارے محترم بزرگ مولانا شوکت علی کئی مضامین لوگوں کے کہنے سننے پر یونہی لکھ دیا کرتے ہیں ۔ چنانچہ انھوں نے سیوا جی پر بھی ایک مضمون پچھلے دنوں لکھا تھا ۔ اس میں مولانا نے سیوا جی کی اس وجہ سے تعریف کی تھی کہ وہ ان لوگوں کے خلاف مردانہ وار لڑتا رہا جنھیں اپنا دشمن سمجھتا تھا ۔ تعریف کا یہ پہلو شاید ہی کسی کے ذہن میں آیا ہو ۔ اس اصول کی بنا پر دنیا کے 'برے سے 'برے انسان کی تعریف کی جا سکتی ہے ۔''۳

اس طنز و مزاح میں اس وقت تلخی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا جب مولانا مہر کسی ایسی شخصیت کے بارے میں قلم اٹھاتے جو ان کے خیال میں خیر کی توقعات کے باوجود ایسے قدم اٹھاتی ، جو اسلامیانِ ہند کے عمومی موقف سے متصادم ہوتے یا جن سے خود مولانا غلام رسول مہر متفق نہ ہوتے ۔

۱۔ انقلاب ، ۳۰ مارچ ۱۹۳۲ء ۔
۲۔ انقلاب ، یکم مئی ۱۹۲۵ء ۔
۳۔ انقلاب ، ۱۴ مئی ۱۹۲۷ء ۔

مسٹر جناح اور مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے بارے میں لکھے گئے بعض اداریوں کی تحریریں ایسے ہی تلخ اور شدید طنز کا نمونہ ہیں ۔ مثلاً پنجاب میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں مہدی زمان خان کی شمولیت پر انقلاب نے جو اداریہ لکھا وہ اس سلسلے کی نمایاں مثال ہے :

"بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت علامہ اقبال کے سوا بورڈ کے اندر کوئی ایسا شخص موجود نہیں جو صدارت کے منصب کا اہل سمجھا جا سکے ۔ اگرچہ بورڈ کے ساتھ بڑے بڑے ذی اثر اصحاب وابستہ بتائے جاتے ہیں ، مثلاً ملک برکت علی ، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین ، راجا غضنفر علی خان یا احرار میں سے چودھری افضل حق ، مولانا حبیب الرحمن صدر مجلس احرار اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری ، جن کے ساتھ امیر شریعت کا دم چھلا بھی لگا ہوا ہے ۔"[1]

مولانا مہر کے اداریوں کے بارے میں عموماً یہ رائے بھی دی جاتی ہے کہ وہ اپنے اداریوں میں شعر استعمال نہیں کرتے تھے ۔ جیسا کہ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں :

"مہر صاحب اپنے لیڈنگ آرٹیکل میں کبھی شعر نہیں استعمال کرتے تھے ۔"[2]

لیکن انقلاب کا فائل دیکھ کر مندرجہ بالا رائے کی تائید نہیں کی جا سکتی ۔ یہ درست ہے کہ انقلاب کے اداریوں میں شعر نقل کرنے کا وہ رجحان نظر نہیں آتا جو مولانا ظفر علی خان کی ادارتی تحریروں کا امتیازی وصف ہے ، لیکن انقلاب کے بہت سے اداریوں میں بھی اردو فارسی اساتذہ کے بے شمار شعر ملتے ہیں ۔ بعض اوقات یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ مقالہ افتتاحیہ کا آغاز بھی شعر سے ہوا اور اختتام بھی اور اس کے بعد شذرات بھی شعر یا مصرعے سے شروع ہوئے ۔"[3] البتہ اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوں جوں بحیثیت اداریہ نویس

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ۲۰ اگست ۱۹۳۶ع ۔
۲۔ یاد رفتگاں ، از عاشق بٹالوی مشمولہ افادات مہر ، ص ۸۰ ۔
۳۔ روزنامہ انقلاب ، ۲۴ اپریل ۱۹۲۷ع ۔

مولانا مہر کے تجربے میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے ان کی اداری تحریروں میں سے دوسرے شعری عناصر کی طرح شعر کے استعمال کا رجحان بھی کم ہوتا چلا گیا -

بہرحال بحیثیت اداریہ نویس مولانا مہر کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے مختصراً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مولانا مہر اردو کے واحد صحافی ہیں جنھوں نے مسلسل ستائیس برس تک اداریہ نویسی کا مشکل فرض انجام دیا اور اس کے ذریعے ملک و قوم کی گراں قدر خدمت انجام دی - مولانا مہر کو بلاخوف تردید ایسا اداریہ نگار قرار دیا جا سکتا ہے جو اداریہ نویسی کے قدیم و جدید رویوں کے سنگم پر کھڑے نظر آتے ہیں - اگر ایک طرف ان کی اداریہ نویسی میں سرسید احمد خاں کے انداز و اسلوب کی نمایاں جھلکیاں نظر آتی ہیں تو دوسری جانب وہ جملہ خصوصیات بھی موجود ہیں جنھوں نے حمید نظامی کو جدید دور میں اردو کا سب سے بڑا اداریہ نویس بنایا -

☆ ☆ ☆

چوتھا باب

غلام رسول مہر بحیثیت سوانح نگار

اردو سوانح نگاری کا مختصر جائزہ

مولانا غلام رسول مہر جامع الحیثیات ادیب تھے ۔ وہ شاعر بھی تھے اور صحافی بھی ، مترجم بھی تھے اور اعلیٰ پائے کے شارح بھی ، تحقیق میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور تاریخ نگاری میں بھی ۔ لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ ان کے تصنیفی کام کا بنیادی اور اہم حصہ صنف سوانح سے متعلق ہے ۔ مولانا مہر کی پہلی کتاب یعنی ''سیرت امام ابن تیمیہ'' بھی سوانح عمری ہی ہے اور آخری کتاب یعنی ''رسول رحمت'' بھی سیرت و سوانح ہی کی کتاب ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ مولانا مہر کی تصانیف کا بہ اعتبار کیفیت و کمیت قابلِ قدر اور لائق ذکر حصہ بھی تراجم و تشاریح کی بجائے سوانح نگاری ہی سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس سلسلے میں ''غالب'' اور ''سید احمد شہید'' کا حوالہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے ۔ یہ امر مستزاد ہے کہ مولانا مہر کی سوانح عمریوں کا معتدبہ حصہ معاش کی مجبوریوں کی بجائے دلی تڑپ اور ان عظیم شخصیات سے یک گونہ طبعی و ذہنی مناسبت کے باعث معرض اظہار میں آیا ، لیکن مولانا مہر کی سوانح نگاری کا جائزہ لینے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں سوانح نگاری کے ارتقاء کا اجمالی جائزہ لے لیا جائے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ انہوں نے سوانح نگاری شروع کی تو انھیں ورثے میں کس نوعیت کی روایت ملی تھی ؟ اس کے بعد ہی اردو سوانح نگاروں میں مولانا مہر کے حقیقی مقام کا تعین ممکن ہو سکے گا ۔

اگرچہ اردو میں سوانح نگاری کے نمونے مثنویوں ، قصیدوں اور تذکروں کی صورت میں دکنی دور سے لے کر انقلاب ۱۸۵۷ء تک تخلیق کیے جانے والے

ادب میں بھی ملتے ہیں ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز سرسید تحریک کے زیراثر لکھنے والوں کے زور قلم ہی کا نتیجہ تھا ۔ اردو کی پہلی سوانح عمری مولانا حالی کی "حیات سعدی" ہے ۔ سوانح عمری کے نقطۂ نظر سے "حیات سعدی" میں جو معائب و نقائص نظر آتے ہیں ، "یادگار غالب" بڑی حد تک ان سے پاک ہے ۔ اس کے باوجود بحیثیت سوانح نگار حالی کے اصل جوہر "حیاتِ جاوید" ہی میں کھلتے ہیں جس میں انھوں نے اقتضائے وقت کے باوجود سرسید احمد خاں کی زندگی کو کریٹکل نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ یہ الگ بات کہ حالی کی تمام تر "کاں کنی" کے باوجود بھی وہ اہلِ نظر کے نزدیک صرف ایشیائی طرز کی قصیدہ گوئی اور مدلل مداحی ہی قرار پائی ۔ سوانح نگاری کے ضمن میں حالی کا مقام و مرتبہ متعین کرتے ہوئے فنی اعتبار سے خواہ کتنی ہی موشگافیوں کو روا رکھا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو میں سوانح نگاری کے بانیوں میں اولین نام مولانا حالی ہی کا ہے ۔

اردو میں سیرت و سوانح کے لیے جو راہ مولانا حالی نے ہموار کی تھی ، اس دور میں اس پر بہت سے ادیب گامزن نظر آتے ہیں اور یوں گویا سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا ہے ۔ لیکن ان تمام سوانح نگاروں کے بارے میں بلا تأمل یہ رائے دی جا سکتی ہے کہ اول تو ان کی توجہ زیادہ تر آنحضرتؐ کی سیرت مقدسہ کی پیش کش کی جانب رہی ، دوسرے اس میں بھی ان مصنفوں نے اپنی تخلیقات کو صرف الہی اعتراضات کے جواب تک محدود رکھا جو آنحضرتؐ کی شخصیت پر کیے گئے تھے ۔ یوں یہ تمام سیرتیں مناظرانہ رنگ میں رنگی نظر آتی ہیں اور ان میں فنی اعتبار سے وہ پختگی بھی نظر نہیں آتی جو سیرت و سوانح کی جان ہوا کرتی ہے ۔ البتہ سوانح نگاروں کی اس کثیر تعداد میں مولانا شبلی نعمانی منفرد و ممتاز نظر آتے ہیں ۔ یہ ایک حقیقت ہے اردو میں سوانح نگاری کی جو بنیاد مولانا حالی نے رکھی تھی اسے مولانا شبلی کے نادرہ کار قلم ہی نے مستحکم اور استوار کیا ۔ اردو ادب میں سوانح عمریوں کے علاوہ مقدمہ شعر و شاعری ، مسدس اور جدید قومی شاعری کے گراں بہا نمونے بھی مولانا حالی کو بلند حیثیت دیتے ہیں ۔ لیکن مولانا شبلی کی عظمت کا زیادہ تر دار و مدار ان کی سوانح عمریوں پر ہی ہے ۔ اگرچہ شبلی کی تخلیقات میں اردو فارسی شاعری ، مقالات کے مجموعے ، شعرالعجم اور موازنۂ انیس و دبیر کو بھی اہم مقام حاصل ہے لیکن ان کے اہم ترین کارنامے وہی ہیں جنھیں خود مولانا شبلی نے عجم کی مدح اور عباسیوں کی داستانوں سے تعبیر کیا ہے ۔ شبلی کی سوانحی تصانیف

میں المامون ، سیرۃ النعمان ، الفاروق ، الغزالی ، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی شامل ہیں ۔ ان تمام تصانیف کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتابیں اپنے مؤرخانہ انداز کے باعث سوانح کے ساتھ ساتھ تاریخ کی تصنیفات بھی ہیں ۔ یوں مولانا شبلی اردو کے پہلے سوانح نگار قرار پاتے ہیں جنھوں نے سیرت و سوانح میں ماضی کے گرد و غبار میں اٹے واقعات کو روایت و درایت اور مؤرخانہ چھان پھٹک کے ساتھ پیش کرنے کی بنیاد رکھی ۔ یہ چیز ان کی سوانح عمریوں کی بہت بڑی خوبی بھی ہے اور بعض اوقات عیب کا روپ بھی دھار لیتی ہے ۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر شبلی اپنے مؤرخانہ مزاج سے دست و گریباں نظر آتا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شبلی بھی حالی کی طرح مقصد پرست سوانح نگار ہیں اور انھوں نے اپنی سوانح عمریوں کے ذریعے شکست خوردہ اور درماندہ قوم کو ماضی کے تابناک نقشے دکھا کر حال اور مستقبل کے مسائل کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کی کوشش کی ہے ۔

حالی و شبلی کے بعد سوانح نگاری کے دو مختلف دبستان تشکیل پاتے نظر آتے ہیں ۔ ایک دبستان وہ ہے جس نے صاحبِ سوانح اور اس کی شخصیت و سیرت کے مختلف پہلوؤں کو غیرجانبداری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ۔ دوسرے دبستان میں ان سوانح نگاروں کے نام شامل ہیں جو ایک خاص مقصد کے تحت سوانح تصنیف کرتے ہیں اور محض ان شخصیات کو اپنا موضوع بناتے ہیں جو زوال کے اس دور میں قوم و ملت کے لیے روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ جیسا کہ الطاف فاطمہ لکھتی ہیں :

> ''اس صدی میں . . . سوانح نگاری کے دو بڑے دبستان نظر آتے ہیں ۔ ایک وہ فریق جس نے اپنی سوانح نگاری کی بنیاد جذبات اور خاص مقاصد پر رکھی اور دوسرا وہ گروہ جو سوانح نگاری کو شخصیت کا مطالعہ اور کردار کا آئینہ بنانا چاہتا ہے اور جس نے اپنی سوانح نگاری کی بنا زیادہ حقیقت پسندانہ نظریے کے ساتھ رکھی ہے ۔''[1]

پہلے گروہ سے تعلق رکھنے والے سوانح نگاروں میں زیادہ تر وہ لوگ شامل

۱۔ اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ، از الطاف فاطمہ ، ص ۲۰۶ ، اشاعتِ اول ، ۱۹۶۱ع ، مطبوعہ اردو اکادمی ، کراچی ۔

ہیں جو مولانا حالی اور حالی سے زیادہ شبلی کے سوانحی کارناموں اور تصور سوانح سے متاثر تھے ۔ اس گروہ میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو دارالمصنفین سے متعلق تھے ۔ اگرچہ مولانا غلام رسول مہر کا دارالمصنفین سے کوئی تعلق نہیں تھا اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی اپنے تصوراتِ سوانح نگاری کے باعث اسی دبستان کے مؤید و حامی نظر آتے ہیں ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مولانا مہر نے بھی اپنی سوانحی تصانیف میں عموماً ناموران اسلام ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے ۔ ''سیرت امام ابن تیمیہ'' سے لے کر ''رسول رحمت'' تک ان کی تقریباً تمام موضوع شخصیات اپنے اپنے دائرۂ حیات میں اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کے لیے کام کرتی رہی ہیں اور غالباً اسی بنا پر مولانا مہر نے ان اکابر کی زندگیوں کے نقوشِ حیات کو محفوظ کرنے کی سعی و کوشش کی تاکہ قوم و ملت مستقبل کی بے پایاں تاریکیوں میں ماضی کے ان منارہ ہائے نور سے اپنی چشمِ بصیرت کو روشن کرے ۔ دراصل غلام رسول مہر بھی جدید نظریۂ انتقاد سے کامل واقفیت اور آگہی کے باوجود سوانح نگاری کے اس تصور سے متفق نہیں تھے جس کی رو سے سوانحی تصنیف کو صرف شخصیت کا مطالعہ اور کردار کا آئینہ بنا دیا جاتا ہے ۔ بہ نظر ظاہر یہ تصور خواہ کتنے ہی حقیقت پسندانہ نظریے پر قائم و استوار ہو ، اس کے باوجود ملتِ اسلامیہ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا ۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب ملت کا چراغ تند و تیز ہواؤں کی زد میں بھی ہو ۔ یہی سبب تھا جس کی بنا پر مولانا حالی نے کرٹیکل بائیو گرافی کے نظریے سے واقفیت رکھنے اور نکتہ چینی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینے کے دعوے کے باوجود مدلل مداحی کی اور یہی وجہ تھی کہ مولانا شبلی عجمیوں کی مدح سرائی پر مجبور ہوئے ۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مغرب کا تصور سوانح ، جس کے مطابق انسانی روح کے ظاہر و باطن کی سچی ، غیر جانبدارانہ اور صاحب سوانح کی داخلی و خارجی زندگی کی مکمل اور بے لاگ تصویر پیش کرنے کے نام پر موضوع شخص کی زندگی کے ہر پسندیدہ و ناپسندیدہ پہلو سے بحث کی جاتی ہے ، مغرب کے مذہبی اور معاشرتی پس منظر میں پیدا ہوا ۔ مغرب گناہوں اور ناپاکیزگی میں لتھڑے ہوئے جس انسان کا تصور رکھتا ہے ، اس کے پس منظر میں تخلیق شدہ سوانح عمری کے نظریے کا اطلاق مشرق اور خاص طور پر مسلمانوں پر کرنا زیادتی ہے ۔ اس لیے کہ اسلام جس انسان کا تصور دیتا ہے اول تو

اس کی زندگی کے ظاہری و باطنی رویوں میں اختلاف و تضاد کا کھوج لگانا ہی کار فضول ہے ۔ دوسرے شریعتِ حقہ کی پابندی اس کی زندگی کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتی ہے ، جس میں تلاش بسیار کے باوجود کسی ایسے پہلو کا سراغ تک نہیں ملتا جس کے دلفریب بیان میں صاحبِ تصنیف اور قاری اپنی نا آسودہ خواہشات کا عکس دیکھ سکے ۔ ہمارے سوانح نگاروں کی یہ دقت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب وہ مذہبی شخصیات کو اپنا موضوع بناتے ہیں ۔ چونکہ سوانح نگار صاحبِ سوانح شخصیات میں کوئی اخلاقی برائی نہیں دکھا پاتے لہذا مغرب زدہ ناقدین کی مخالفانہ تنقید و تنقیص کا ہدف بن جاتے ہیں حالانکہ یہ سوانح نگار بھی وہی کچھ دیکھتے اور قلم بند کرتے ہیں جو یہ شخصیات اپنے دائرۂ حیات میں کرتی ہیں ۔ یوں بھی سوانح کو فرد کی زندگی کی تاریخ قرار دیا جاتا ہے ۔ غور کیجیے کہ اس تاریخ میں مغربی تصور سوانح کے مطابق دلچسپی پیدا کرنے والے اُن واقعات کو کیسے تحریر کیا جائے جو صاحب سوانح کی زندگی میں وقوع پذیر ہی نہیں ہوئے ۔ البتہ یہ بات قابلِ تسلیم ہے کہ اگر صاحب سوانح کی زندگی میں کمزوریاں ہوں تو ایک سچے سوانح نگار کو ان کے ذکر سے احتراز نہیں کرنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ سوانح نگاری کا جدید مغربی تصور غلام اور پسماندہ اقوام کے لیے ان کی سیاسی ، سماجی اور معاشی صورتِ حال کے باعث بھی ناقابلِ قبول قرار پاتا ہے ۔ پسماندگی اور غلامی کے دور میں ناموران قوم کے معائب کا بیان افراد قوم کے قوائے عمل کو ضعیف تر کرنے کا سبب بنتا ہے جبکہ ایسے عہد میں اسلاف و اکابر کے روشن کارناموں کا بیان سوچنے اور غور کرنے والے اذہان کے لیے مہمیز کا کام دے سکتا ہے اور وہ مستقبل کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے ماضی سے روشنی حاصل کر سکتے ہیں ۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ خود مغرب میں بھی جدید تصور سوانح نے اس وقت جنم لیا جب مغربی دنیا معاشی و سیاسی اعتبار سے کامل طور پر خود اختیاری و خود مختاری کی منزل کو پا چکی تھی ۔ یہ وقت کے تقاضے ہی تھے جن کی بنا پر اُردو کا اولین نقاد بھی کرٹیکل بائیوگرافی سے واقف ہونے کے باوجود نکتہ چینی سے محترز رہا ۔ جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے :

''ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کرٹیکل طریقے سے لکھی جائے ۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی

جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں ۔''[۱]

یہ امر کسی وضاحت و تصریح کا محتاج نہیں کہ معاشی اور سیاسی ترقی کے اعتبار سے مسلمان ابھی تک مغرب سے صدیوں پیچھے ہیں لہذا حقیقت یہ ہے کہ اپنے ادبی و تنقیدی رویے متعین کرتے ہوئے ہمیں اس فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے ۔ بصورتِ دیگر شاید ہم قابلِ تحسین اور کرلیکل سوانح عمریاں تو لکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن اپنی قومی و ملی زندگی کو بھی خطروں سے دوچار کر لیں گے ، قومی کردار کی تباہی اس پر مستزاد ہوگی ۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے تقریباً سبھی سوانح نگار اول تو اکابر کی لغزشوں کو اچھالتے نہیں لیکن اگر کوئی ایسا موقع آ جائے تو اس کی مناسب تاویل پیش کر دیتے ہیں ۔ اُردو کے اولین سوانح نگار حالی اور شبلی کی سوانح عمریوں میں بھی اسی طریقِ کار سے کام لیا گیا ہے ، جبکہ جدید دور کے مؤرخ ادب اور سوانح نگار شیخ محمد اکرام نے بھی اپنی سوانحی تصانیف میں اسی انداز کو برتا ہے ، جیسا کہ وہ خود اپنے طریقِ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''حالی نے ''حیات جاوید'' میں سرسید کی جس طرح ہمدردانہ ترجمانی کی تھی شبلی نے اس پر جابجا اعتراض کیا ۔ وہ اسے ''مدلل مداحی'' کہتے تھے اور ایشیائی قصیدہ لویسی کی قسم قرار دیتے تھے ۔ لیکن ہمدردانہ مطالعے کے بغیر صاحبِ سیرت کا نقطۂ نظر سمجھنا مشکل ہوتا ہے جو صحیح سیرت نگار کے لیے ضروری ہے ۔ ایک مؤرخ کی طرح ایک سیرت نگار بھی واقعات کا پابند ہوتا ہے ۔ اس کا فرض ہے کہ وہ سچ لکھے اور سوائے سچ کے کچھ نہ لکھے ۔ نقد و تبصرہ میں بھی کڑے علمی و فنی اصولوں کی پابندی ناگزیر ہے ، لیکن ہمدردانہ ترجمانی کا تقاضا ہے کہ صاحبِ سیرت کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی پوری کوشش کی جائے اور اختلافی معاملات کی جہاں تاویل ہو سکتی ہے ، وہ بیان کر دی جائے ۔ موجودہ کتاب میں یہی طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے بلکہ کہیں کہیں تو ان غیر اہم بیانات کو بھی ، جو مستند ہونے کے باوجود

۱۔ دیباچہ حیات جاوید ، از مولانا حالی ، ص ۳۵ ، طبع دوم ، اگست ۱۹۷۱ع ، مطبوعہ عشرت پبلشنگ ہاؤس ، لاہور ۔

غلط فہمیوں اور صاحبِ سیرت کی اصل شخصیت کے نظر سے اوجھل ہو جانے کا باعث ہو سکتے تھے (اور جنھیں محتاط ورثاء اشاعت سے پہلے ہی قلم زن کر دیتے ہیں) نظرانداز کر دیا ہے۔''[۱]

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حالی نے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں جن حالات کے پیشِ نظر کرٹیکل طریقے سے لکھی جانے والی بائیوگرافی کے لیے وقت کی ناسازگاری کا ذکر کیا تھا ، مسلمانانِ برعظیم بحیثیت مجموعی ابھی تک اسی قسم کے حالات کا شکار ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مہر بھی موجودہ عہد میں کرٹیکل بائیوگرافی کے نظریے کے حامی نظر نہیں آتے ۔ مولانا مہر کے اس نقطۂ نظر کا ثبوت ان تاثرات سے ملتا ہے جو نیاز فتح پوری کی طرف سے 'نگار' کے اقبال نمبر میں علامہ اقبال کی حیاتِ معاشقہ اور ان کی شخصیت کی دیگر کمزوریوں کے بارے میں بحث چھیڑنے پر مولانا مہر نے اپنے ایک خط میں تحریر کیے تھے ۔ انھوں نے لکھا :

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی انسان کو معصوم نہیں سمجھتا ، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو سامنے آئے اس کے معائب کا تختہ پیشانی پر لگا کر مردود قرار دیتا پھروں ۔ اس باب میں اصول و مبانی ہیں ۔ ان کی تفصیلات ہیں جو لکھ نہیں سکتا ۔ . . . ملاقات ہو تو . . . آپ کی خدمت میں عرض کروں کہ حقیقت حال کیا ہے ؟ اکابر کے سوانح کیوں لکھے جاتے ہیں ؟ اس ضمن میں کن امور پر خاص توجہ ہونی چاہیے اور قومی کردار کی تعمیر کے اصول و مبانی کیا ہیں ؟ جب تک یہ چیزیں واضح نہ ہوں آپ اندازہ نہیں فرما سکتے کہ نیاز صاحب نے جو شیوہ اختیار کیا ہے اس کی حیثیت کیا ہے ؟''[۲]

اس کے علاوہ مسلمان سوانح نگاروں کو ایک اور دقت بھی پیش آتی ہے اور غالباً اس سبب سے بھی اردو میں کرٹیکل اور حقیقت پسندانہ سوانح عمریاں سامنے نہیں آ سکیں ۔ دراصل مذہبی طور پر مسلمانوں کو کسی شخص کے انتقال

۱۔ دیباچہ یادگارِ شبلی ، از شیخ محمد اکرام ، ص ۶ ، طبع اول ۱۹۷۱ع ، مطبوعہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ، لاہور ۔

۲۔ مکتوب بنام الیمی جیلانی ، مرقومہ ۴ جنوری ۱۹۶۲ع ۔ (غیر مطبوعہ) ۔

کے بعد اس کی برائیوں کا ذکر کرنے سے روک دیا گیا ہے - یہی وجہ ہے کہ اول تو سوانح عمریوں میں افراد کی کمزوریوں کا ذکر کیا ہی نہیں جاتا اور اگر ان کمزوریوں سے صرفِ نظر نہ کیا جا سکے تو ان کی تاویل اور جواز پیش کر دیا جاتا ہے - 'الفاروق' میں حضرت عمرؓ کی تندیٔ مزاج کے واقعات کے ساتھ شبلی کی تاویلات کا یہی بنیادی سبب ہے اور یہی صورت دیگر سوانح عمریوں میں بھی نظر آتی ہے - چونکہ مولانا غلام رسول مہر بھی بنیادی طور پر مذہبی میلان رکھتے تھے لہذا وہ بھی مرنے والوں کی اچھائیوں کو سامنے رکھنے کے قائل نظر آتے ہیں جیسا کہ رئیس احمد جعفری کی وفات کے بعد ان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''جعفری صاحب کی وفات واقعی قلق افزا ہے - انھوں نے بہت کچھ لکھا - اس کی حیثیت کسی کے نزدیک کیسی ہی ہو لیکن جو کام وہ کر گئے اس کی توقع ہر صاحبِ تحریر سے نہیں ہو سکتی - بعض چیزیں انھوں نے ایسی بھی لکھیں جو میرے نزدیک حق و انصاف کے نقطۂ نگاہ سے نامناسب تھیں ؛ مثلاً مولانا آزاد مرحوم کی کتاب کو کسی بھی نقطۂ نگاہ سے ''آزادیٔ ہند کا ترجمہ'' نہیں کہا جا سکتا لیکن اب تو مرنے والے کی اچھائیوں کے سوا کچھ بھی ہمارے سامنے نہ ہونا چاہیے -''[۱]

مولانا مہر کے اس نقطۂ نظر کا اظہار ان کے ایک اور مکتوب سے بھی ہوتا ہے ، بلکہ اس دوسرے مکتوب میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی ذرا کھل کر وضاحت کی ہے - اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ نیاز فتح پوری نے نسیم اختر ہالوی کا ایک مضمون ''مولانا ابوالکلام آزاد کی حیاتِ معاشقہ'' کے عنوان سے نگار میں شائع کیا - اس مضمون میں بہت سی سخن گسترانہ باتیں بھی آ گئی تھیں - جب مولانا مہر سے ان پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے لکھا :

''نیاز صاحب نے جو کچھ لکھا ، یہ ان کے خیالات ہیں اور عموماً بے اصل - مولانا کیا ، کوئی بھی شخص ابتدائی دور میں شاید پارسا نہ

۱- مکتوب بنام انیس جیلانی ، مرقومہ ۴ نومبر ۱۹۶۸ع - (غیر مطبوعہ) -

رہا ہو ، الا ماشاء اللہ ۔ اللہ تعالیٰ پالوی صاحب کو ، نیاز صاحب کو اور مجھے معاف فرمائے ۔ یہ سب کچھ اس حدیثِ نبوی کے خلاف ہے "اموات کا ذکر بہتر طریق پر کرو ۔"[۱]

مولانا مہر کے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے ان کے مکتوبات کے اقتباسات کے علاوہ روزنامہ انقلاب کے وہ بے شمار اداریے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جو مختلف شخصیات کے انتقال پر تحریر کیے گئے اور جن میں مولانا مہر نے ان شخصیات کا ذکر ہمیشہ بہتر طریق پر کیا ۔ اس سلسلے کی بہترین مثال وہ اداریہ ہے جو پنڈت موتی لال نہرو کی موت پر لکھا گیا تھا ۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ متحدہ ہندوستان کی آئینی تاریخ میں نہرو رپورٹ کو مرتب کرنے والے پنڈت نہرو ہی تھے اور مولانا مہر ، نہرو رپورٹ کی بے باک مخالفت کو اپنی صحافتی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ تصور کرتے تھے ۔ اس کے باوجود موتی لال نہرو کی موت پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مہر نے لکھا :

"۔ ۔ ۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں ، پنڈت جی کی زندگی کے آخری دور میں ہمیں ان کی روش سے شدید اختلاف کی ضرورت پیش آئی ۔ ۔ ۔ پنڈت موتی لال نہرو اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے گرد و پیش مسلمانوں کے لیے کوئی ایسی خوشگوار یاد نہیں بلکہ نہرو رپورٹ کی تلخ یاد ہے ۔ تاہم آج موتی لال کی خوبیاں ہی سامنے آنی چاہییں ، اور شدید اختلاف کے باوجود ہر شخص اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ موتی لال نہرو ہندوستان کا بہت بڑا رہنما اور بھارت کا نہایت جلیل القدر فرزند تھا اور اس کی موت ہندوستان کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے ۔"[۲]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر بھی حالی اور شبلی نعمانی کی طرح ایسی سوانح عمریاں منظرِ عام پر لائے کہ مغربی تصور سوانح نگاری کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے ان کی تخلیقات کو بلا تأمل مدلل مداحی اور ایشیائی طرز کی قصیدہ نویسی قرار دیا جا سکتا ہے ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ

۱۔ مکتوب بنام انیس جیلانی ، مرقومہ ۶ فروری ۱۹۶۹ع ، غیر مطبوعہ ۔

۲۔ روزنامہ انقلاب ، ۱۰ فروری ۱۹۳۱ع ۔

تصالیف بھی 'حیاتِ جاوید'، 'الماموں'، 'سیرۃ النعمان'، 'الفاروق' 'الغزالی' اور 'سوانح مولانا روم' کی طرح 'اقتضائے وقت' کا مؤثر جواب ہیں اور اُس قوم کے لیے 'بانگِ رحیل' کی حیثیت رکھتی ہیں جو تن آسانی، بے عملی اور بے بصری کے باعث گم کردہ راہ ہے۔ دراصل مولانا مہر نے بھی اپنی سوانح عمریوں سے وہی کام لینا چاہا ہے جو حالی اور شبلی کے پیشِ نظر تھا، یعنی اسلاف کے سبق آموز روشن کارناموں کو پیش کر کے اخلاف میں روحِ عمل کو بیدار کرنا۔ مولانا مہر کے نزدیک اکابر و اسلاف کی سرگزشت حیات کے مطالعے کا بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ اس سے عبرت و موعظت حاصل کی جائے۔ جیسا کہ وہ اپنی کتاب ''سید احمد شہید'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کتاب کے بارے میں کچھ کہنا میرا منصب نہیں، لیکن یہ عرض کر دینا ضرور ہے کہ یہ ایک شخصیت کی سیرت نہیں بلکہ ایک نہایت اہم دینی تحریک کی مفصل سرگزشت ہے جو اس عاجز کے محدود علم کے مطابق پاک و ہند کی اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کی یگانہ تحریک تھی۔ یہ جن حالات میں شروع ہوئی تھی وہ ہمارے عہد کے حالات سے بہت مشابہ تھے لہذا اس سرگزشت میں ہمارے لیے عبرت و موعظت کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ موجود تھا۔''[۱]

اسلاف و اکابر کے سوانحی کارناموں میں عبرت و موعظت کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ تلاش کرنے کا یہی رجحان مولانا مہر کو شبلی کے مکتبۂ فکر سے متعلق سوانح نگاروں کے دائرے میں لے آتا ہے۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ شبلی سے بہت زیادہ متاثر ہونے کے باوجود مولانا غلام رسول مہر مزاج کے اعتبار سے شبلی سے بہت مختلف تھے۔ شبلی اپنے انداز کے اعتبار سے سوانح نگار سے زیادہ مؤرخ کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جبکہ مولانا مہر اپنی سوانحی تصالیف میں تحقیق اور تاریخی حوالوں کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنے کے باوجود سوانح نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ لیکن یہ بات شاید اُس وقت تک واضح نہ ہو سکے جب تک تاریخ اور سوانح کے فرق کو نہ سمجھ لیا جائے۔ اس باب میں قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ سوانح کی خواہ کوئی بھی تعریف کر لی جائے،

۱۔ دیباچہ سید احمد شہید، ص ۱۵، اشاعت سوم ۱۹۶۸ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

لیکن اسے تاریخ سے بالکل جدا و منفک نہیں کیا جا سکتا ، کیونکہ بہرحال سوانح بھی تاریخ ہی ہوتی ہے ، خواہ کسی مخصوص فرد کی زندگی کے واقعات ہی کی سہی ۔ البتہ سوانح اور تاریخ کے انداز میں واضح فرق ہوتا ہے ۔ اولین بات یہ ہے کہ مؤرخ اپنی تحریر کو محض واقعات کی وقوع پذیری تک محدود رکھتا ہے جبکہ سوانح نگار کا موضوع ایک شخصیت ہوتی ہے اور وہ اس شخصیت کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات ہی کو بیان نہیں کرتا بلکہ ان واقعات کے پس پردہ اسباب و محرکات کو بھی سامنے لاتا ہے ۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مؤرخ کا تجزیہ بے لاگ اور غیر ہمدردانہ ہوتا ہے ، اس سبب سے تاریخی حقائق کامل طور پر غیر جانبداری کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں ، جبکہ سوانح نگار کے بے لاگ تجزیوں میں بھی ہمدردی کا عنصر پایا جاتا ہے ۔ تاریخ و سوانح کے اس فرق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں :

"سوانح نگاری کی تحریک شخصی جذبے سے ہوتی ہے اور مؤرخ کا فن غیر شخصی ہوتا ہے اور وہ تاریخی حقائق کی جستجو میں قدم (یا قلم) اٹھاتا ہے کہ شخص سے اسے شخصی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ یہ شخصی اور غیر شخصی فن کا فرق ہے اور یہ بہت بڑا فرق ہے ۔"[1]

اس طرح دیکھا جائے تو مولانا مہر اول و آخر سوانح نگار ہی قرار پاتے ہیں ۔ غالب اور سید احمد شہید کا تو ذکر ہی کیا ، وہ اپنی شدید جذباتی وابستگیوں کے باعث اورنگ زیب عالمگیر میں بھی کسی لغزش کو ماننے کے لیے تیار نہیں ۔ مولانا مہر کی محبت و عقیدت کے جذبے کو یہ بھی گوارا نہیں کہ اورنگ زیب کی سوانح حیات میں کسی انسانی کمزوری تک کا بھی ذکر کیا جائے ۔ اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولانا مہر مکمل طور پر سوانح نگار تھے اور انھوں نے جن موضوعات اور شخصیات پر قلم اٹھایا ، وہ ان کے ساتھ شدید جذباتی وابستگی رکھتے تھے ۔

مولانا مہر کی سوانح نگاری

مولانا مہر کی پہلی کتاب سیرت امام ابن تیمیہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی تھی ۔ اس کے بعد تقریباً چھیالیس برس تک قلم و قرطاس سے ان کا رشتہ برقرار

۱۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مصنف ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، نمبر ۲۱ ، مجلہ فنون ، جولائی ۔ اگست ۱۹۷۵ء ، لاہور ۔

رہا ۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے پندرہ سے زائد ایسی کتابیں ترتیب دیں جو صنف سوانح سے متعلق ہیں ۔ اگر مطبوعات فرینکلن کے لیے کیے گئے سوانحی تراجم کو نظر انداز کر دیا جائے تو مولانا مہر کی تقریباً تمام کتب سیرت و سوانح کو ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں قرار دیا جا سکتا ہے ۔ یعنی ان کے پیش نظر بھی شبلی کی طرح ناموران اسلام کی زندگیوں کو پیش کرنا تھا اور وہ بھی اس انداز میں کہ عبرت و موعظت سے مملو کارنامے زوال آمادہ قوم کے لیے حیات نو کا پیغام بن سکیں ۔ اگر مولانا مہر اور شبلی کے کام میں کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ مولانا مہر کا منصوبہ شبلی کے مقابلے میں مختصر اور محدود تھا ۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

''میں ذاتی طور سے مہر کو شبلی اور ابوالکلام آزاد کے خانوادۂ ادب سے متعلق سمجھتا ہوں . . . ان پر شبلی کا گہرا اثر نظر آتا ہے ۔ انداز بیان میں بھی اور علمی منصوبے میں بھی ۔ یہ اور بات ہے کہ شبلی کا پروگرام وسیع تر تھا ۔''[1]

بہر حال مولانا مہر کی تقریباً تمام سوانح عمریوں کو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں قرار دینے کے باوجود موضوعات و مواد کے فرق کے باعث کئی مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً ایک شعبہ سیرۃ النبی سے متعلق ہے ۔ دوسرا اُن شخصیات کی سوانح سے تعلق رکھتا ہے جنھوں نے دور زوال میں اپنی قوت ایمانی سے عزیمت کے چراغ روشن کیے اور اسلام کے احیاء کے لیے ہر میدان میں بے تامل و بے تکلف عظیم الشان قربانیاں پیش کیں ۔ سیرت امام ابن تیمیہ ، سید احمد شہید ، جماعت مجاہدین ، سرگزشت مجاہدین اور اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد اسی سلسلے کی سوانح عمریاں ہیں ، جبکہ "غالب" مولانا مہر کی غالب سے جذباتی وابستگی کی بہترین مظہر ہے ۔ یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ مرزا غالب خود برعظیم میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی علامت کی حیثیت رکھتے ہیں اور غالب کی شخصیت سے مولانا مہر کی بے پایاں دلچسپی کا ایک بڑا محرک بھی یہی ہے ۔ ان چند طبع زاد سوانح عمریوں کے علاوہ مولانا مہر نے کچھ سوانحی تراجم بھی کیے ہیں اور یہ بھی صنف سوانح سے ان کی دلچسپی کا واضح ثبوت ہے ۔

۱۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مصنف ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، نمبر ۲۱ ، مجلہ فنون ، جولائی ۔ اگست ۱۹۷۵ع لاہور ۔

رہا ۔ اس تمام عرصے میں انھوں نے پندرہ سے زائد ایسی کتابیں ترتیب دیں جو صنف سوانح سے متعلق ہیں ۔ اگر مطبوعات فرینکلن کے لیے کیے گئے سوانحی تراجم کو نظر انداز کر دیا جائے تو مولانا مہر کی تقریباً تمام کتب سیرت و سوانح کو ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں قرار دیا جا سکتا ہے ۔ یعنی ان کے پیش نظر بھی شبلی کی طرح ناموران اسلام کی زندگیوں کو پیش کرنا تھا اور وہ بھی اس انداز میں کہ عبرت و موعظت سے مملو کارنامے زوال آمادہ قوم کے لیے حیات نو کا پیغام بن سکیں ۔ اگر مولانا مہر اور شبلی کے کام میں کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ مولانا مہر کا منصوبہ شبلی کے مقابلے میں مختصر اور محدود تھا ۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

''میں ذاتی طور سے مہر کو شبلی اور ابوالکلام آزاد کے خانوادۂ ادب سے متعلق سمجھتا ہوں . . . ان پر شبلی کا گہرا اثر نظر آتا ہے ۔ انداز بیان میں بھی اور علمی منصوبے میں بھی ۔ یہ اور بات ہے کہ شبلی کا پروگرام وسیع تر تھا ۔''[۱]

بہر حال مولانا مہر کی تقریباً تمام سوانح عمریوں کو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں قرار دینے کے باوجود موضوعات و مواد کے فرق کے باعث کئی مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً ایک شعبہ سیرۃ النبی سے متعلق ہے ۔ دوسرا اُن شخصیات کی سوانح سے تعلق رکھتا ہے جنھوں نے دور زوال میں اپنی قوت ایمانی سے عزیمت کے چراغ روشن کیے اور اسلام کے احیاء کے لیے ہر میدان میں بے تامل و بے تکلف عظیم الشان قربانیاں پیش کیں ۔ سیرت امام ابن تیمیہ ، سید احمد شہید ، جماعت مجاہدین ، سرگزشت مجاہدین اور اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد اسی سلسلے کی سوانح عمریاں ہیں ، جبکہ ''غالب'' مولانا مہر کی غالب سے جذباتی وابستگی کی بہترین مظہر ہے ۔ یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ مرزا غالب خود برعظیم میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی علامت کی حیثیت رکھتے ہیں اور غالب کی شخصیت سے مولانا مہر کی بے پایاں دلچسپی کا ایک بڑا محرک بھی یہی ہے ۔ ان چند طبع زاد سوانح عمریوں کے علاوہ مولانا مہر نے کچھ سوانحی تراجم بھی کیے ہیں اور یہ بھی صنف سوانح سے ان کی دلچسپی کا واضح ثبوت ہے ۔

۱۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مصنف ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، نمبر ۲۱ ، مجلہ فنون ، جولائی ۔ اگست ۱۹۷۵ء لاہور ۔

مولانا مہر کے تمام سوانحی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے یہ امر مناسب رہے گا کہ ان کی سوانح نویسی کے مختلف شعبوں کے متعلق کتب کا الگ الگ جائزہ لے لیا جائے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے سیرۃ النبی سے متعلق تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

اردو میں سیرت النبی اور مولانا مہر

ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک مولانا غلام رسول مہر شبلی اور ابو الکلام کے خانوادۂ ادب سے تعلق رکھتے ہیں ۔ شبلی ، ابوالکلام آزاد اور مولانا مہر کے صرف اسلوب نگارش ہی میں مماثلت و مشابہت نہیں پائی جاتی ، بلکہ اپنے علمی منصوبے کے مطابق بھی مولانا مہر کا تعلق شبلی کے ادبی خانوادے سے ہے ۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود شبلی بھی تمام عمر عجم کی مدح سرائی کرتے کرتے اپنی زندگی کے آخری حصے میں سیرۃ النبی کی طرف متوجہ ہوئے اور چاہا کہ اسی پر ان کا خاتمہ بالخیر ہو جائے ۔ اس کے علاوہ وہ اپنی تمام تر محنت اور کوشش کے باوجود اپنے اس عظیم کارنامے کو نہیں دیکھ سکے اور اس سے پہلے ہی انتقال کر گئے ۔ اتفاق یہ ہے کہ مولانا غلام رسول مہر کی آخری تصانیف بھی سیرۃ النبی ہی سے متعلق ہیں ۔ مولانا مہر بھی ان تصانیف کے حد درجہ شائق تھے ۔ لیکن وہ بھی اپنی محنت شاقہ کا ثمر دیکھنے سے محروم رہے اور اس سے قبل ہی دار فانی سے کوچ کر گئے ۔ یوں گویا شبلی اور مولانا کا حقیقی معنوں میں خاتمہ بالخیر ہوا ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی ان کی پختگیٔ فن کا شاہکار ہے ، اسی طرح مولانا مہر نے بھی ''رسولِ رحمت'' میں اپنے خونِ جگر کا ایک ایک قطرہ صرف کر دیا ہے ۔ لیکن ''رسولِ رحمت'' کی قدر و قیمت متعین کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں سیرۃ النبی کی روایت کا جائزہ لے لیا جائے ۔

اگرچہ ''خطباتِ احمدیہ'' کو بھی سیرۃ النبی ہی کی کتاب سمجھنا چاہیے جس میں سرسید احمد خاں نے آنحضرتؐ پر ولیم میور کی طرف سے کیے گئے اعتراضات کا عمدہ جواب دیا ہے ۔ اس کے علاوہ سیرۃ النبی کے ضمن میں سید امیر علی کا نام بھی خاص اہمیت کا حامل ہے ۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں سیرۃ النبی کی پہلی اور باقاعدہ اور قابلِ قدر تصنیف شبلی نعمانی ہی کی مرتب کردہ ہے ۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ، اگرچہ مولانا شبلی اپنے اس عظیم

کارنامے کو تکمیل کے مرحلے تک نہ پہنچا سکے ، اس کے باوجود سیرۃ النبی مولانا کی محنت شاقہ اور موضوع سے خصوصی دلچسپی کے باعث صرف اردو ہی نہیں ، بلکہ عربی اور فارسی ادبیات کے وافر ذخیرۂ ادب میں بھی بے مثال و بے نظیر قرار دی گئی ہے ، جیسا کہ شیخ محمد اکرام شبلی کی سیرت النبی کے بارے میں لکھتے ہیں :

"... انھیں موت نے تکمیل کار کی مہلت نہ دی ، لیکن پھر بھی حیاتِ نبوی کی پہلی ڈیڑھ جلد انھوں نے جس محنت ، دقتِ نظر ، وسیع علمیت ، غور و فکر ، حسن استدلال اور ادبی شان کے ساتھ لکھی ہے ، اس کی مثال عالمِ اسلامی کے ادب میں مشکل سے ملے گی ۔"[۱]

شبلی نعمانی کی سیرت النبی کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید عبداللہ بھی کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک سیرۃ النبی اپنے موضوع کی ماورائیت کے باوجود ، جس کے تحت مغربی تصور کی حقیقت نگاری ممکن نہیں ، بہترین سوانح عمری ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"شبلی کی سیرۃ النبی کو بھی ــــ اس کے موضوع کی ماورائیت کے باوجود ، جس کے تحت مغربی تصور کی حقیقت نگاری ممکن نہیں ــــ ہم ایک عمدہ اور اول درجے کی سوانح عمری قرار دے سکتے ہیں ۔"[۲]

عجیب بات یہ ہے کہ مولانا غلام رسول مہر شبلی کی اول درجے کی سوانح عمری اور اسلامی ادب کی اس بے مثال تصنیف کے بارے میں قدرے مختلف رائے رکھتے تھے ۔ اگرچہ وہ اسے سیرۃ النبی پر موجود کتب کے مقابلے میں بہترین کتاب سمجھتے تھے ، اس کے باوجود اس کے سوانحی پہلو سے مطمئن نہیں تھے ۔ جیسا کہ اپنے ایک خط میں اردو میں سیرت کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ یادگار شبلی ، از شیخ محمد اکرام ، ص ۴۳۶ ۔

۲۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، ص ۱۳۳ ، بار سوم ۱۹۷٦ع ، علمی کتاب خانہ لاہور ۔

''اردو میں سیرۃ کی ایک بھی کتاب ایسی نہیں جسے نقائص و عیوب سے پاک سمجھا جائے - سیرۃ النبی شبلی مرحوم کی دو جلدیں (پہلی اور دوسری) اصل سیرت کے متعلق ہیں - باقی دو جلدوں میں بھی مفید اور نہایت عمدہ دینی مباحث ہیں - مگر سیرۃ کا حصہ ناقص ہے . . . تاہم کوئی قابل ذکر کتب خانہ اس سے خالی نہیں رہ سکتا -''[1]

مولانا مہر نے اپنے ایک اور مکتوب میں ذرا تفصیل سے کام لیتے ہوئے وہ امور بھی واضح کیے جن کے باعث تمام ضروری وسائل مہیا ہونے کے باوجود مولانا شبلی سیرت نگاری کے اس عظیم منصوبے سے صحیح طور پر عہدہ برا ہونے میں ناکام رہے - مولانا مہر لکھتے ہیں :

''ان کی تمام تصانیف یا اکثر تصانیف کی طرح سیرۃ میں بھی ان کا ''دو دلا پن'' برابر قائم رہا - ایک طرف اسلام کی سادگی ، بے تکلفی ، خلق خدا کے لیے رحمت ہونے کا احساس ، دوسری طرف مسلمان فرمانرواؤں کا جاہ و جلال ، فتح و تسخیر ، فوجی اقدامات کے عدیم المثال ہنگامے یا تخت طاؤس ، تاج محل ، الزہرا ، الزاہرہ وغیرہ کارنامے ، وہ دونوں میں سے کسی ایک کو اصل و اساس نہ بنا سکے - اس وجہ سے جو کچھ مرتب ہوا وہ معیاری نہ تھا (کم از کم میرے نزدیک) - پھر قدرت نے انھیں مہلت نہ دی اور بے چارے پہلی جلد بھی مکمل نہیں کر سکے تھے کہ عالم بقا کو سدھارے - نیز انھیں سرسید احمد کی طرح یہ بھی خیال تھا کہ اسلام اور سیرۃ کو اہل فرنگ کے اعتراضات سے محفوظ کر دیں - یہ امر بجائے خود بالکل ضروری تھا مگر اس سلسلے میں حقائق کی حقیقی صورت کچھ سے کچھ ہو گئی اور ایک رخ کو صاف کرتے کرتے دوسرے رخ یا رخوں پر کئی دھبے پڑ جانے کا دروازہ کھل گیا -

سب سے آخر میں یہ کہ جغرافیائی معلومات میں اُن کا سرمایہ حد درجہ مضحکہ خیز تھا - اس کی مثال آپ مجھ سے سنیں گے تو متحیر رہ جائیں گے -''[2]

۱- مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۲۵ جولائی ۱۹۶۱ع ، غیر مطبوعہ -

۲- مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۴ اپریل ۱۹۶۲ع ، غیر مطبوعہ -

مولانا مہر کے نزدیک شبلی کی سیرت ہی نہیں بلکہ اردو زبان میں سیرت کا پورا سرمایہ ایسی کوئی بھی تصنیف نہیں رکھتا جس پر اظہار اطمینان کیا جا سکے ۔ کسی میں موضوع سے زیادہ اظہار علمیت پر توجہ دی گئی ہے اور کسی میں مصنف کے اپنے عقائد کے حوالے سے فرقہ وارانہ مباحث ضرورت سے زیادہ آگے ہیں اور بعض مصنفوں نے اپنی کتب سیرت میں مباحث کا پرانا رنگ برقرار رکھا ہے جس کے سبب سیرت اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام ہو گئی ۔ دراصل مولانا مہر کو تمام سیرت نگاروں سے ایک خاص شکایت ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

"سیرتیں لکھنے والے لوگ عموماً یہی کرتے ہیں کہ رطب و یابس جمع کرکے کتاب ضخیم بناتے ہیں ۔ نہ موضوع سیرت کی اہمیت پیش نظر ہوتی ہے ۔ نہ شخصیت کی عظمت کے بنیادی پہلوؤں سے پوری آگاہی حاصل کرتے ہیں ۔ اور ایسی آگاہی کے بعد ہی کچھ لکھنا چاہیے تاکہ واہی باتوں یا روایتوں کو رد کیا جا سکے یا نظر انداز کر دیا جائے ۔ یہ مصیبت عام ہے ، کوئی کرے تو کیا کرے ۔"[1]

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر سیرت نگاری کے وہ کون سے اصول و معائیر ہیں جن کی روشنی میں مولانا مہر اردو اور فارسی کی تمام کتب سیرت کو رد کرتے ہیں ۔ جب تک اس سوال کا جواب تلاش نہ کر لیا جائے اس وقت تک سیرت نویسی سے متعلق مولانا مہر کے خیالات و نظریات کو سمجھنا بھی مشکل ہے اور خود ان کے اپنے کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنا بھی ۔ دقت یہ ہے کہ اس ضمن میں مولانا مہر نے کسی مقام پر کھل کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا ، البتہ سیرت کی بعض کتب پر ان کے ناقدانہ خیالات کا محاکمہ کرتے ہوئے اور خطوط و مکتوبات مہر میں بکھرے ہوئے مختلف جملوں کی مدد سے بڑی حد تک ان کے تصورات تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے ، یعنی انھوں نے اردو کی کتب سیرت پر جو اعتراضات کیے ہیں سیرت کی معیاری کتاب کو ان سے پاک ہونا چاہیے ۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مہر کے نزدیک سیرت نگار اپنے کام کا آغاز کرنے سے قبل ہی فیصلہ کر لے کہ وہ اپنی تصنیف میں آنحضرتؐ کی حیات مقدسہ کے کس خاص پہلو کو

۱- مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۱۸ نومبر ، ۱۹۶۴ع ، غیر مطبوعہ ۔

پیش کرے گا۔ انسان ہوتے ہوئے بھی آنحضرتؐ کی حیات مبارک ایک عام انسان کی زندگی نہیں ۔ آپ کی زندگی کا ایک ایک پہلو درس و موعظت کے بے شمار پہلو رکھتا ہے اور اگر سیرت نگار اپنے تمام تر عشق و جذباتی وابستگی کے باوجود ان تمام پہلوؤں کی حقیقی قدر و قیمت متعین نہیں کر سکتا یا پھر ان میں توازن قائم رکھنے میں ناکام رہتا ہے تو وہ سیرت نگار ہونے کی حیثیت میں اپنے خاتمہ بالخیر کا اہتمام تو کر لے گا لیکن سیرت نویسی کے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہے گا ۔ یہی طریقہ ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہر طرح کے رطب و یابس کو سمیٹنے کے الزام سے بھی بچا جا سکتا ہے اور قارئین کے دل میں وہ نقوش بھی ثبت کیے جا سکتے ہیں جن کے لیے سیرت لکھنے کا اہتمام کیا گیا تھا ۔

سیرت نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سیرت کو سیرت کے نقطۂ نظر سے مرتب کرے ۔ اس کو اظہار علمیت کا ذریعہ نہ بنائے ورنہ سیرت نگار کو اپنی شخصیت کی نمود کا موقع تو ضرور مل جائے گا لیکن سیرت کا اہم اور بنیادی مقصد پورا نہ ہو سکے گا ۔ اسی طرح سیرت کو اپنے مخصوص فرقہ واری عقائد کی تبلیغ کا ذریعہ بنانا بھی مستحسن نہیں جیسا کہ مولانا مہر مرزا بشیر احمد کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''ایک اچھی کتاب مرزا بشیر احمد قادیانی نے لکھی جس کی تین جلدیں نکل چکی ہیں ۔ بڑی اچھی کتاب ہے مگر بعض مباحث میں فرقہ واری کا رنگ آ گیا ہے ۔ انداز بیان بالکل بے کیف ہے جو میرے نزدیک موزوں نہیں ۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں مولانا مہر نے مرزا بشیر احمد قادیانی کے بے کیف اور اسی باعث ناموزوں اسلوب کا ذکر کیا ہے ۔ اس سے یہ غلط فہمی جنم لے سکتی ہے کہ شاید مولانا سیرت کے لیے بھی شاہی اسلوب نگارش کو پسند کرتے ہیں حالانکہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے ۔ مولانا کے نزدیک سیرت کے اسلوب کے لیے صرف یہ بات ضروری ہے کہ وہ دل میں اترنے والا ہو جیسا کہ سیرت کے انداز کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۲۵ جولائی ۱۹۶۱ع ، غیر مطبوعہ۔

''پیغمبر کی سیرت میں داعیانہ انداز کا ہونا ضروری ہے اس لیے کہ اصل مقصود محض بیان نہیں بلکہ ایسا بیان ہے جو دل میں اترے ۔''[1]

دراصل مولانا مہر کے نزدیک سیرت صرف سوانحی خاکے کا نام نہیں بلکہ وہ اسے شخصیت کا پورا اخلاق ، مذہبی اور طبعی نقشہ قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک سیرت نویسی اور مطالعۂ سیرت آنحضرت[3] کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کا دوسرا نام ہے ۔ اگر سیرت اپنے اس مقصد کو پورا نہیں کرتی تو لاحاصل ہے ۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''سیرۃ طیبہ کے واقعات کی ہر ممکن تفصیل جاننا یا جاننے کا شوق رکھنا تقاضائے ایمان ہے مگر میں سیرۃ کے مطالعے پر اس خیال سے زور دے رہا ہوں کہ زندگی کے بنیادی حقائق میں اس ''سراج منیر'' سے کسب فیض کیا جائے . . . سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کائنات کے بہترین انسان کی سیرت ہمارے لیے کیسی روشنی مہیا کرتی ہے . . . دوسرے لفظوں میں اس مقدس ترین انسان اور داعی حق کا صراطِ مستقیم کیا تھا جس پر چل کر انسان اس کائنات کی بہترین خدمت انجام دے سکتا ہے ۔ اگر اس کے نشان مل جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ سیرت کا مطالعہ فائدہ مند ہوا ورنہ ایک انسان کے سوانح یا متعلقہ تاریخی حقائق کو محض جان لینے سے علم میں کتنا ہی اضافہ ہو جائے مگر عمل و اعتقاد کو کیا فائدہ پہنچا ۔''[2]

یہ بات درست ہے کہ کسی انسان کے سوانح یا متعلقہ تاریخی و جغرافیائی حقائق کو محض جان لینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا ، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ تاریخی و جغرافیائی حقائق ہی کی روشنی میں اس امر کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ صاحب سوانح کے پیشِ نظر کام کی اصل غایت اور اہمیت کیا تھی ؟ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے صاحب سوانح کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور وہ کیا ماحول تھا جس کو بدلنے کی کوشش کی گئی ۔ اس کے علاوہ قارئین اس ماحول اور پس منظر سے ابھی صحیح طور پر

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، مرقومہ ۵ اپریل ۱۹٦۲ع ، غیر مطبوعہ ۔
۲۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، مرقومہ ۵ اپریل ۱۹٦۲ع ، غیر مطبوعہ ۔

واقف نہیں ہو سکتے جس میں آنحضرت ؐ نے دیکھتے ہی دیکھتے انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا ۔ لیکن کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے سیرت نگاروں نے ہر طرح کا رطب و یابس جمع کر دینے کے باوجود تاریخی و جغرافیائی نوعیت کے حقائق کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی ۔ اس پہلو کی جانب سے سیرت نگاری کی غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک آنحضور ؐ کی کوئی متفق علیہ تاریخ وفات سامنے نہیں آ سکی ۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت کتنی حیرت افزا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ تفصیلات مرتب کر دینے کا دعویٰ کرنے والوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ غزوۂ احزاب میں مدینۂ منورہ کی کس کس سمت میں اور کتنی لمبی خندق تیار کی گئی تھی ؟ دراصل تاریخی و جغرافیائی حقائق سے اسی غفلت و اغماض کے نتیجے میں اہل مغرب اور دیگر معترضین کو انگشت نمائی کا موقع ملتا ہے جس کی بنا پر سیرت نگاری کے اصل مدعا و مقصد کو پس پشت ڈال کر مناظرانہ سیرت نگاری کی طرف توجہ دینا پڑتی ہے ، حالانکہ اگر ابتدا ہی سے جغرافیائی و تاریخی حقائق کی طرف مناسب توجہ کی جائے اور روایت کے ساتھ ساتھ درایت کے اصول کو پیش نظر رکھ کر نتائج مرتب کیے جائیں تو معترضین کو اعتراضات کا موقع ہی نہ مل سکے ۔

مولانا غلام رسول مہر ایک اچھے سیرت نگار سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ وہ حقائق کی چھان پھٹک خواہ کتنے ہی بے لاگ اور غیر جانبدارانہ انداز میں کرے ، اس کے باوجود ادب و احترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے ۔ اس لیے کہ آنحضرت انسان ہونے کے باوجود عام انسانوں سے بہت مختلف تھے ۔ اسی لیے ڈاکٹر سید عبداللہ سیرت النبی کو عام سوانح نگاری کی نسبت ماورائی موضوع قرار دیتے ہیں اور اسی لیے مولانا مہر کو بھی لکھنا پڑا تھا :

> ''تلوار کی دھار پر چلنا آسان ہے ، سیرت مقدسہ کے لیے قلم اٹھانا آسان نہیں ۔''[1]

گویا مولانا مہر نے سیرت کے بارے میں وہی بات کہہ دی جو نعت گوئی کے بارے میں عرفی کہنے پر مجبور ہوا تھا :

۱۔ دیباچہ سرور عالم ، ص ہ ۔

عرفی متاب ایں راہ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قلم را

دراصل مولانا مہر کے نزدیک سیرت نگاری دیگر علمی و تحقیقی مشاغل کی طرح قلم و قرطاس کا کھیل نہیں ہے ، بلکہ ان کے نزدیک اگر انسان خلوص نیت سے سیرت نویسی کی طرف متوجہ ہو تو یہ اس کے لیے فلاح و نجات آخرت کا سامان بھی بن جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے وہ اپنی ہر سیرت کے دیباچے میں اپنے قارئین سے کتاب سے مستمتع ہونے کی صورت میں اپنے لیے دعا کی درخواست کرتے ہیں جیسا کہ ''رسولِ رحمت'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''آخر میں دردمندانہ التجا ہے کہ اگر میری تحریر کا کوئی بھی حصہ کسی دل میں حبِ رسول (صلی اللہ علیہ و سلم) کے چراغ کی لو کسی قدر تیز کر سکے تو وہ صاحب دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس روسیاہ کی عاقبت بخیر ہو ۔''[1]

اگر سیرت پر مولانا مہر کی تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اس موضوع پر لکھتے ہوئے متذکرہ بالا تمام امور کو پیش نظر رکھا ہے ۔ سرور عالم ہو یا رسول رحمت ، قلم اٹھانے سے پہلے مولانا مہر پر یہ امر واضح تھا کہ وہ کس مقصد کے تحت لکھ رہے ہیں ۔ ان کی کتب سیرت میں داعیانہ انداز بھی ہوتا ہے لیکن غیر متعلق مباحث چھیڑ کر یا پھر رنگین اسلوب کے ذریعے اپنی علمیت کا رعب بٹھانے کی کوشش نہیں کرتے ۔ اس کے علاوہ اپنی تحریر کو عقائد اور فرقہ واری جھگڑوں سے بھی آلودہ نہیں کرتے اور تحقیق و تاریخی چھان پھٹک کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ لیکن اس بے لاگ تحقیق اور تاریخی چھان پھٹک کے باوجود ادب و احترام کا رشتہ بھی برقرار رہتا ہے ۔

۱۔ سرورِ عالم :

سیرت کے ضمن میں مولانا مہر کی اہم تر تصنیف ''رسول رحمت'' ہے لیکن چونکہ پہلے ''سرور عالم'' زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی ، اس لیے کتبِ سیرت کے سلسلے میں پہلے اسی کا جائزہ لینا مناسب رہے گا ۔

۱۔ دیباچہ رسولِ رحمت ، ص ۴ ۔

جیسا کہ مولانا مہر کے تصانیف کے سرسری جائزے میں واضح کیا گیا ہے ''سرور عالم'' کوئی باقاعدہ کتاب نہیں تھی بلکہ اسے تین حصوں میں چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے طالب علموں کے استفادے کے لیے دینیات کی کتاب کے طور پر لکھا گیا تھا ، لیکن بعد ازاں اس کی عمومی افادیت کے پیش نظر اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ۔ جیسا کہ مولانا مہر لکھتے ہیں :

''سیرتِ مقدسہ کا یہ مرقع سر رشتۂ تعلیمات پنجاب کے مجوزہ نصاب کے مطابق چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کی کتب دینیات کے لیے لکھا گیا تھا . . . بعد میں خیال آیا کہ اگر ان ابواب کو مستقل کتاب کی شکل میں چھاپ دیا جائے تو یہ انشاء اللہ عام اردو خواں اصحاب کے لیے مفید ہوگی ۔''[1]

اگرچہ ''سرور عالم'' چھوٹی جماعتوں کے طالب علموں کی نصابی ضروریات کے پیشِ نظر لکھی گئی ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے باوجود اس کا پایہ عام کتب سیرت سے کسی طرح کم نہیں ۔ اپنے اختصار کے باوجود ''سرورِ عالم'' مولانا مہر کو قابلِ ذکر سیرت نگاروں کی صف میں شامل کر دیتی ہے ۔ جیسا کہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری لکھتے ہیں :

''جہاں تک سیرت نگاری میں ان کی عظیم الشان خدمت اور ان کے مقام کی عظمت کے تعین کا تعلق ہے ، اس کے لیے ان کا پہلا رسالہ ''سرورِ عالم'' ہی کفایت کرتا ہے ۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ مولانا نے اپنے قارئین کی ذہنی سطح کے پیش نظر اسلوب و اندازِ بیان میں سلاست کو مدنظر رکھا اور بالاہتمام علمی و تحقیقی بحثوں سے احتراز کیا ،[3] اس کے باوجود یہ کتاب آنحضرت ؐ کی حیات مقدسہ کے پورے دور کا احاطہ کرتی ہے اور اس میں آپ ؐ کی تریسٹھ سالہ زندگی

۱۔ دیباچہ سرورِ عالم ، ص ۳ ۔

۲۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیت سیر نگار ، از ابو سلمان شاہجہانپوی ، ص ۶۳ ، نومبر ۔ دسمبر ۱۹۷۳ع میثاق لاہور ۔

۳۔ دیباچہ سرورِ عالم ، ص ۳ ۔

کا کوئی ایک بھی اہم واقعہ نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مزید یہ کہ اگرچہ مولانا مہر نے قارئین کو تحقیقی و علمی مباحث میں نہیں الجھایا ، لیکن واقعات کی پیش کش میں مستند کتب سیرت کو ضرور سامنے رکھا ، تاکہ عام اردو خواں طبقہ اور نوخیز طالب علموں کے ذہنوں میں سیرت مقدسہ کا صحیح تصور اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اجاگر ہو سکے ۔ اس سلسلے میں خود مولانا مہر لکھتے ہیں :

''اس میں سیرت مقدسہ کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا ۔ تمام واقعات مستند اور معتمد علیہ کتابوں سے لیے گئے ہیں اور تحریر میں ہر واقعے کے پس منظر اور احوال و ظروف کو بھی جزو واقعہ بنا کر پیش کیا گیا ہے ۔''[۱]

کسی بھی شخصیت کے کارناموں کی حقیقی اہمیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان حالات و کوائف سے مکمل واقفیت حاصل کی جائے جن میں اس شخصیت نے جنم لیا اور اپنی عمر بسر کی ۔ اس سلسلے میں جغرافیائی حالات ، تاریخ ، مذہبی عقائد اور معاشرتی رسوم و روایات خاص طور پر قابل ذکر ہوتی ہیں ۔ ''سرور عالم'' کا جائزہ لیا جائے ، تو معلوم ہوگا کہ مولانا مہر نے کتاب کے کل اڑتیس ابواب میں سے پہلے سات باب اسی مقصد کے لیے وقف کیے ہیں ۔ ان ابواب میں عرب کے جغرافیائی حالات ، اہل عرب کی عام معاشرت ، اسلام سے پہلے عرب اور اہل عرب کے حالات ، مکہ مکرمہ اور قریش عرب کی ہمسایہ اقوام اور خود آنحضرت ؐ کے گھرانے کے حالات پیش کیے ہیں ۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگرچہ ان حالات کے لیے صرف اڑتیس صفحے مخصوص کیے گئے ہیں ، اس کے باوجود اختصار کے ساتھ تقریباً تمام ضروری امور واضح ہو جاتے ہیں ۔ مستزاد یہ ہے کہ مولانا مہر نے جدید ترین تحقیقات سے بھی استفاضہ کیا ہے ۔ مثلاً عرب کا جغرافیہ پیش کرتے ہوئے قدیم سیرت نگاروں کا سا انداز اختیار نہیں کیا ، بلکہ عرب کی جدید علاقائی تقسیم کو مد نظر رکھا ہے تاکہ قارئین کے لیے دقت پیدا نہ ہو ۔ مثلاً عرب کے ایک حصے شام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ دیباچہ سرور عالم ، ص ۳ ۔

"شام پرانے زمانے میں بہت بڑا تھا ۔ پھر یہ ٹکڑوں میں بٹتا گیا ۔ پہلے فلسطین کو الگ کیا گیا ۔ فلسطین کا سب سے بڑا شہر قدس شریف (یروشلم) ہے جو عیسائیوں ، یہودیوں اور مسلمانوں ، تینوں کے نزدیک یکساں مقدس ہے ۔ غزہ ، یافہ ، حیفا ، عکہ اور تل ابیب اس کے دوسرے قابل ذکر مقام ہیں ۔ اب فلسطین کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے ۔ ایک حصہ عربوں کو دے دیا گیا ہے ۔ دوسرا حصہ یہودیوں کے لیے الگ کر دیا گیا ہے ۔

شام کا ایک علاقہ لبنان ہے جسے الگ ریاست بنا دیا گیا ہے ۔ بیروت اس کا دارالحکومت ہے ۔ خود شام کا مرکزی مقام دمشق ہے جو ایک زمانے میں اسلامی خلافت کا مرکز تھا اور بہت پرانا شہر ہے ۔"[1]

اسی طرح عرب کی ہمسایہ قوموں کا ذکر کرتے ہوئے رومیوں کا ذکر آیا تو ان کے دونوں مراکز حکومت یعنی روما اور قسطنطنیہ کا ذکر بھی کیا گیا ۔ لیکن چونکہ قسطنطنیہ نام سے کوئی شہر جدید اٹلس اور نقشوں میں نہیں ملتا ، لہذا مولانا مہر نے حاشیے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا :

"۱۴۵۳ء میں ترکوں نے اس شہر کو فتح کر لیا ، تو اس کے بعد بھی شہر کا نام قسطنطنیہ ہی مشہور رہا ۔ علامہ اقبال نے بلاد اسلامیہ میں یہی نام استعمال کیا ہے ۔ آج کل اس کا نام استنبول ہے ۔"[2]

عربوں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے بھی اگرچہ اختصار سے کام لیا گیا ہے ، لیکن کوئی ضروری بات ایسی نہیں جو رہ گئی ہو ۔ قریش مکہ کے تمام محاسن و معائب کو نہ صرف پیش کر دیا گیا ہے ، بلکہ ان محاسن و معائب کا پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے ۔ مثلاً اخلاف خلیل میں بت پرستی کے رواج کا پس منظر بتاتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

"قبیلہ خزاعہ کا ایک سردار تجارت کے سلسلے میں شام گیا ۔ وہاں لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو شام سے چند بت اٹھا لایا اور انھیں

۱- سرور عالم ، ص ۱۵ - ۱۶ -
۲- سرور عالم ، حاشیہ ص ۴۳ -

کعبے کے آس پاس لا کر رکھ دیا ۔ اُس وقت سے عرب میں بت پرستی کی عام شہرت ہو گئی ۔ بت پرستی کے عام ہونے کا ایک یہ بھی سبب قیاس میں آتا ہے کہ جو لوگ کعبے کی زیارت کے لیے آتے تھے وہ اس کے آس پاس سے ایک دو پتھر تبرک کے طور پر ساتھ لے جاتے تھے ۔ تبرک کے یہ پتھر گھر گھر پہنچ گئے ۔ شروع شروع میں ان کی عزت ہوتی تھی ۔ عزت نے ترقی کرتے کرتے پرستش کی صورت اختیار کر لی ۔''[1]

مولانا مہر نے آنحضرتؐ کے گھرانے اور خاندان کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے ۔ اگرچہ چند اہم ترین شخصیات کو اپنا موضوع بنایا ہے لیکن ان کے بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں ۔ مثلاً حضرت عبدالمطلب کے نام کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ہاشم کی وفات کے وقت ان کے چاروں لڑکے کم عمر تھے ، اس لیے ان کے بھائی ''مطلب'' نے سارے کام سنبھال لیے ۔ ہاشم نے ایک شادی یثرب (مدینہ منورہ) میں بھی کی تھی ۔ بی بی وہیں رہیں ۔ وہیں ان کے ایک بیٹا پیدا ہوا ، جس کا نام ''شیبہ'' رکھا گیا ۔ مطلب اپنے اس عزیز بھتیجے کو مدینے سے مکہ لائے اور بڑی شفقت سے پرورش کی ۔ مکہ شریف کے لوگ انہیں عبدالمُطّلب (لفظی معنے مُطّلب کا غلام لیکن سمجھنا چاہیے مُطّلب کا پالا ہوا) کہنے لگے ۔ یہی عبدالمُطّلب ہمارے رسولؐ کے دادا تھے ۔''[2]

آٹھویں باب میں آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد آپؐ کی حیات طیبہ کا ہر اہم واقعہ ضروری تفصیلات کے ساتھ اور زمانی ترتیب کے مطابق بیان کر دیا گیا ہے ۔ البتہ بعض ایسے واقعات چھوڑ دیے گئے ہیں جو طالب علموں اور عام اردو خواں اصحاب کے لیے زیادہ مفید نہیں ہو سکتے تھے ۔ مثال کے طور پر ہر واقعے کی سینکڑوں جزئیات و تفصیلات کا ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن سب سے بہتر مثال وہ واقعہ ہے جو آنحضرتؐ اور

۱- سرورِ عالم ، ص ۳۱ ۔

۲- سرورِ عالم ، ص ۳۷ ۔

ورقہ بن لوفل کی ملاقات سے متعلق ہے ۔ بہرحال بعض واقعات کو نظر انداز کر دینے کے باوجود ''سرورِ عالم'' میں دنیا کے عظیم ترین داعی حق کی مکمل تصویر بن جاتی ہے اور حیاتِ طیبہ کا ایک ایک پہلو آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ۔

سیرتِ طیبہ سے متعلق جو واقعات معرضِ بیان میں نہیں آ سکے ، اس کا سبب ''سرورِ عالم'' کا اختصار ہے ۔ لیکن اس اختصار کی خوبی یہ ہے کہ اس میں جامعیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ اختصار و جامعیت کی مثالیں ''سرورِ عالم'' میں جا بجا بکھری پڑی ہیں ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ پوری کتاب ہی اختصار و جامعیت کا دلاویز مرقع ہے ۔ لیکن یہ کیفیت اس وقت دوبالا ہو جاتی ہے جب مولانا مہر کوئی واقعہ پیش کرکے اپنے قارئین کو اس کے حاصل کی طرف متوجہ کرتے ہیں ۔ مثلاً نبوت کے پہلے دور میں واقعۂ معراج کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"اس مقام پر پہنچ کر نبوت کا پہلا دور ختم ہو جاتا ہے ۔ اس میں اسلام پھیلتا رہا لیکن مسلمان باقاعدہ جماعت بن کر انتظامی معاملات کو اپنے ہاتھ میں نہ لے سکے اور اجتماعی زندگی کی برکات دنیا کو نہ دکھا سکے ۔ مکے اور طائف نے اس کارِ خیر میں پیش قدمی سے انکار کر دیا تو ضرورت پیش آئی کہ کسی دوسرے موزوں مقام کی تلاش کی جائے ، جہاں مسلمان جمع ہو کر دنیا پر اس حقیقت کو روشن کر سکیں کہ اسلام خدا کے بندوں کے لیے کتنی بڑی رحمت ہے ۔ اس سلسلے میں مکہ شریف کو چھوڑ کر آپؐ مدینے تشریف لے گئے اور نبوت کا دوسرا دور شروع ہوا ۔''[۱]

اسی طرح کتاب کے آخر میں سیرتِ طیبہ کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے مولانا مہر نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جامعیت اور ایجاز و اختصار کی خوبی کے باعث لاثانی اور بے مثال عبارت ہے ۔ مولانا مہر نے حیاتِ طیبہ کو چند نکات میں یوں پیش کیا ہے ۔

۱۔ سرورِ عالم ، ص ۷۷ ۔

"حیاتِ طیبہ کا نچوڑ چند لفظوں میں پیش کرنا چاہو تو یوں کر سکتے ہوں :

(۱) جب تک مخالفوں کا زور رہا اور وہ ہر قسم کے ظلم و جور سے کام لیتے رہے ، آپؐ نے ایک ایک آن صبر و شکر کے ساتھ گزاری - کبھی پیشانی مبارک پر بل نہ آیا -

(۲) جب ان کے ساتھ مقابلہ آ پڑا تو عزم کے ساتھ پہاڑ کی طرح جم کر کھڑے ہو گئے -

(۳) مخالفت و عداوت کے خوفناک طوفانوں میں بھی کسی کے ساتھ معاملے کی صورت پیدا ہوئی تو اسے بلا تامل قبول فرما لیا اور دوست دشمن کی تمیز کیے بغیر ہر دعوے کو اس راست بازی سے پورا کیا کہ دشمنوں کی زبانیں بھی اعتراف و تحسین کے ترانے گانے لگیں -

(۴) جب خدا نے غلبہ عطا کیا تو ہر مخالف اور ہر دشمن کو بے تکلف معاف فرما دیا - جن دشمنوں نے اکیس برس تک آپؐ کے پیغامِ ہدایت کے جواب میں تلواریں ، بھالے اور تیر چلائے تھے ، ان کے زخم آپؐ کے جسم مبارک پر اور آپؐ کے ساتھیوں کے جسموں پر تازہ تھے ، ان کے لیے بھی زبان پر ایک ہی ارشاد تھا - جاؤ تم آزاد ہو ، تم پر کوئی الزام نہیں - یہ چار نادر خصوصیتیں جس طرح رسول پاک کی ذات اقدس میں جمع ہوئیں ، آج تک انسانوں کی پوری تاریخ میں کسی ایک وجود کے اندر جمع نہیں ہوئیں -"[1]

مولانا مہر نے سیرت نگاری کو تلوار کی دھار سے تعبیر کیا تھا - غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اختصار و جامعیت کے ساتھ اسلوب اور طرزِ بیان کی سادگی و سلاست کو اس انداز میں برقرار رکھنا بھی تلوار کی دھار سے کم نہیں - لیکن کمال یہ ہے کہ مولانا مہر نے اپنے قارئین کی ذہنی سطح کے پیشِ نظر شبلی و ابوالکلام اور مولانا ظفر علی خاں کے خانوادۂ ادب سے تعلق رکھنے کے

۱- سرورِ عالم ، ص ۲۵۰ -

باوجود "سرورِ عالم" میں سادگی و سلاست کے تمام تقاضوں کو بڑی خوبی سے نبھایا۔ لیکن یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ "سرورِ عالم" کی سادگی بے جان اور سپاٹ نہیں ہے۔ بلکہ بعض عبارات تو اپنی رنگینیٔ اسلوب کے باعث دلآویزی، رعنائی اور شگفتگی کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ مثلاً ظہور قدسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "پیر کا دن تھا، مشرق کی پیشانی صبح کے نور کی دودھیا روشنی سے جگمگانے لگی تھی۔ گویا یہ بھی قدرت کی طرف سے اس بات کا اشارہ تھا کہ نامرادیوں اور مایوسیوں کی رات ختم ہو گئی۔ گمرہی اور حق ناشناسی کے اندھیرے نے سامانِ سفر باندھ لیا۔ ہدایت کا سورج طلوع ہونے کا وقت آ گیا۔ انسانیت کے مرجھائے ہوئے باغ میں پھر شادابی و تازگی کی بہار آنے کی۔ ایمان و اخلاق کی اجڑی ہوئی بستیاں آباد ہوں گی، خدا سے ٹوٹے ہوئے رشتے نئے سرے سے جڑ جائیں گے۔"[1]

اس طرح کی عبارات "سرورِ عالم" میں جابجا بکھری پڑی ہیں لیکن ان عبارات میں کسی قدر رنگینی کے باوجود وہ شے نہیں جسے ابوالکلامیت کا نام دیا جاتا ہے۔ دراصل مولانا مہر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ سرور عالم کن لوگوں کے لیے لکھ رہے ہیں لہذا شعوری طور پر اسی ذہنی سطح کے تقاضوں کا خیال رکھا گیا۔ اگرچہ سیرتِ مقدسہ کے لیے یہ اسلوب اختیار کرنا کوہ بے ستون سے دودھ کی نہر نکالنے سے کم محنت طلب اور مشکل نہ تھا لیکن اسی محنت نے سرور عالم کے دائرۂ افادیت کو بے انتہا بڑھا دیا اور یہی اس کتاب کی سب سے اہم خوبی ہے۔

۲- رسولِ رحمت:

سیرت کے سلسلے کی اہم کتاب "رسولِ رحمت" ہے جس کے بارے میں بلاتامل کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر بھی شبلی نعمانی کی طرح عرب و عجم کی داستانوں کی ترقیم کے بعد سیرت النبی سے متعلق اپنی کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے شدید خواہاں تھے۔ جیسا کہ تصانیف مہر کے سرسری جائزے میں ذکر آ چکا ہے، یوں لگتا ہے جیسے موت نے بھی انھیں اسی کتاب کی

۱- سرورِ عالم، ص ۴۷۔

تکمیل کی مہلت و فرصت دے رکھی تھی ۔ اس لیے کہ جیسے ہی "رسول رحمت" کا مسودہ تیار ہو کر پریس میں پہنچا ، ویسے ہی مولانا مہر بھی راہی ملک عدم ہو گئے ۔ یوں گویا ان کی آرزوؤں کے مطابق ان کا خاتمہ بالخیر ہوا ۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ "رسول رحمت" کی تصنیف و تالیف میں عشق رسول کے بنیادی جذبے کے علاوہ بعض دوسرے محرکات و عوامل نے بھی حصہ لیا ہے ۔ ان میں سب سے اہم محرک مولانا ابوالکلام آزاد سے مولانا مہر کا چوالیس سال پر محیط رشتۂ ارادت ہے ، جیسا کہ وہ خود رسول رحمت کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

" "الہلال" و "البلاغ" میں اگرچہ بڑی ہی عجیب و غریب چیزیں شائع ہوئیں لیکن ان رسالوں کی روح و رواں دعوت دین ہی تھی ۔ اس لیے بھی مضطرب تھا کہ مجھ عاجز کی گردن پر چوالیس سال کی پرخلوص عقیدت اور حق صحبت کا بار احسان تھا ۔"[1]

یہ امر کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ مولانا مہر نے ابوالکلام آزاد کے معمولی خطوط سے لے کر ادبی و مذہبی تمام تحریرات تک کو جمع کرکے شائع کرانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ۔ پھر وہ 'الہلال' و 'البلاغ' کے ان مضامین کو کیسے نظرانداز کر دیتے جن میں سیرت طیبہ کو موضوع بنایا گیا تھا ۔ اگرچہ یہ امر قابل اطمینان تھا کہ حکومت ہند نے تحریرات آزاد کی اشاعت کا کام ساہتیہ اکیڈمی کے سپرد کر دیا تھا لیکن مولانا مہر نے محسوس کیا کہ جس طرح ان مقالات کو مرتب کرکے شائع کرنے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے ، اس سے یہ بلاشبہ محفوظ تو ہو جائیں گے لیکن ان کی حقیقی افادیت ختم ہو جائے گی ۔ اس بنا پر انھوں نے وسائل کی کمی کے باوجود سیرت سے متعلق مضامین و مقالات آزاد کو اپنے منصوبے کے مطابق شائع کرنے کا فیصلہ کیا ۔ صورت حال یہ تھی کہ اگرچہ مولانا آزاد کے مقالات نادر و بصیرت افروز تھے اور ان کی مدد سے آنحضرت ؐ کی حیات مقدسہ پر نئی روشنی پڑنے کے ساتھ ساتھ غور و فکر کے بے شمار پہلو سامنے آتے تھے ، لیکن مشکل یہ تھی کہ مولانا آزاد کے ان مضامین میں تسلسل اور ربط مفقود تھا ۔ لہذا ان کو مربوط کرنے اور

۱- دیباچہ رسول رحمت ، صفحہ ح ۔

متفرق مقالات کو مستقل کتاب کی شکل دینے کے لیے مولانا مہر نے جابجا تحریرات و عبارات کا اضافہ کیا ، جس کی وجہ سے صورت یہ ہوگئی کہ اب 'رسولِ رحمت' میں مولانا آزاد کے مقالات سے کہیں زیادہ خود مولانا مہر کے مضامین شامل ہیں اور اسی بنا پر رسولِ رحمت کو تالیف کی بجائے تصنیف کہنا زیادہ مناسب لگتا ہے ۔ مولانا مہر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عبارات میں بھی قریب قریب مولانا آزاد ہی کا اسلوب بیان اختیار کیا ۔ یہاں تک کہ اگر مولانا مہر نے ہر مضمون کے ساتھ یہ صراحت نہ کی ہوتی کہ وہ کس کا تصنیف کردہ ہے ، تو آزاد و مہر کی تحریرات کو الگ الگ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ۔ لیکن اس کے باوجود مولانا مہر اپنے اضافوں سے مطمئن نہیں تھے اور اسے ایک مجبوری قرار دیتے تھے ، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں :

> ''مولانا کی تحریرات میں اپنی تحریریں شامل کر دینا ایسا ہی ہے جیسے حریر صد رنگ میں ٹاٹ کے ٹکڑے رکھ دیے جائیں ۔ . . لیکن ظاہر ہے کہ میں مجبور تھا ۔''۱

مستقل مقالات و مضامین کے علاوہ ضرورت محسوس ہونے پر مولانا مہر نے آزاد کے مقالات میں بھی کچھ اضافے کیے ، البتہ ان اضافوں کو نمایاں کرنے کے لیے قوسین میں لکھ دیا گیا ، جیسا کہ وہ اپنے ایک نوٹ میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''جہاں جہاں مجھے ترتیب و تصریحِ مطالب کے لیے چند الفاظ بڑھانے ضروری معلوم ہوئے انھیں قوسین میں درج کر دیا تاکہ مولانا کی تحریر سے الگ رہیں ۔ نیز بعض مفصل تحریروں میں سے کچھ حصے حذف کر دیے اور بعض ٹکڑوں کو اشتراکِ مطالب کی بنا پر یکجا کر دیا لیکن اصل تحریر بدستور مولانا ہی کی رہی ۔''۲

گویا مولانا آزاد کی تحریروں میں صرف اضافے ہی نہیں کیے گئے بلکہ ضرورت پڑنے پر تعریف و حذف کے علاوہ عبارات کو نئے سرے سے مرتب بھی کیا گیا ۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ''رسولِ رحمت'' کو زیادہ مفید بنایا گیا ۔

۱۔ دیباچہ رسولِ رحمت ، صفحہ ل ۔

۲۔ رسولِ رحمت ، ص ۱۰۷ ۔

اگرچہ مولانا مہر کی سعی و کاوش نے ''رسولِ رحمت'' کو بہترین تصنیف بنا دیا اس کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ اگر وہ مولانا آزاد کے ساتھ رشتۂ عقیدت کی نسبت کتاب کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے تو ''رسولِ رحمت'' کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ، جبکہ رشتۂ عقیدت و محبت نے اس میں کئی معائب پیدا کر دیے ہیں ۔ ''رسولِ رحمت'' کا سب سے بڑا نقص تکرار ہے ۔ تکرار کی سب سے بڑی وجہ خود ''رسولِ رحمت'' کا محرک تالیف و تصنیف ہے یعنی مولانا آزاد کی تحریروں کو جمع کرنے کا شوق ۔ یہ درست ہے کہ مولانا آزاد کے اکثر مقالات موقع و مناسبت کے اعتبار سے سیرت کے بہت سے پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں لیکن ان کی ہر تحریر کو محفوظ کر دینے کے شوق میں مولانا مہر نے آزاد کے بہت سے ایسے مضامین بھی "رسولِ رحمت" میں شامل کر دیے ہیں ، جن میں پیش کردہ واقعات کو خود مولانا مہر زیادہ تفصیل سے لکھ چکے ہیں ۔ سیرت النبی کے ایک واقعے کو بار بار پڑھنا فلاح دین و دنیا کا موجب تو ضرور ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح کی تکرار سے کتاب کے توازن و تناسب کو نقصان پہنچتا ہے ۔

تکرار کے ضمن میں یوں تو مولانا آزاد کے بہت سے مضامین کا حوالہ دیا جا سکتا ہے لیکن وہ مقالہ بطور خاص قابلِ ذکر ہے جو ہجرت نبوی کے سلسلے میں مکہ مکرمہ سے کوچ کر کے غارِ ثور میں قیام تک کے واقعات بیان کرنے کے بعد ''مولانا کی تصریحات'' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے ۔ اسی طرح غزوۂ بدر کے واقعات کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد مولانا آزاد کا مضمون شامل کیا گیا ہے ، حالانکہ اصل واقعات کے ضمن میں اس مضمون کی چنداں ضرورت نہیں تھی ۔ البتہ اس سلسلے میں ایک بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ مولانا آزاد کے بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو بظاہر کتاب کے موضوع سے متعلق نہیں لگتے، مثلاً مولود شریف اور حج کے بارے میں مولانا آزاد کے مقالات ۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ تمام مضامین بعض اہم واقعات اور پہلوؤں کی توضیح و تشریح کے لیے بہت ضروری تھے ، جیسا کہ اسی نوعیت کے ایک مضمون کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

> ''یہ خیال نہ فرمایا جائے کہ یہ مقالہ حج سے بظاہر بے تعلق سا ہے ۔
> حقیقتاً مولانا نے حج کی تمہید کے طور پر یہ مقالہ مرتب فرمایا تھا . . .
> اس مقالے سے مقصود یہ تھا کہ اسلامی زندگی دراصل جماعتی زندگی ہے ۔

اس مقالے کو غالباً ایک اور مقالے کے ذریعے سے حج کے ساتھ ملا دینے کے خواہاں تھے جو لکھا نہ جا سکا ۔ دراصل یہ مباحث حج ہی کی تمہید ہے اور بجائے خود بھی اس کی اہمیت کسی توضیح کی محتاج نہیں ۔"[۱]

مولانا آزاد سے عقیدت و محبت کے باعث صرف تکرار ہی کا نقص پیدا نہیں ہوا بلکہ جابجا مولانا مہر کو ایسی عبارات بھی لکھنا پڑیں جو خواہ مخواہ رسول رحمت کی ضخامت میں اضافے کا سبب بنتی ہیں اور جن کو سیرت سے دور کا بھی تعلق نہیں ۔ مثلاً مولانا آزاد کے ایک ناتمام مقالے کے اختتام پر لکھا گیا :

"مقدمہ تفسیر کا جو فرمہ پولیس کے تصرف سے کسی طرح محفوظ رہ گیا تھا وہ یہاں پر ختم ہو گیا ۔ بعد کے اوراق میں خدا جانے کیا بحثیں ہوں گی لیکن سورہ فاتحہ کے نزول اور آغاز نبوت کے احوال و کوائف کے متعلق جو کچھ مولانا نے فرمایا ہے اس کی کوئی مثال دوسری جگہ شاید ہی مل سکے ۔"[۲]

ایک ہی موضوع پر آزاد اور مولانا غلام رسول مہر کی الگ الگ تحریروں نے "رسول رحمت" میں ایک اور خامی بھی پیدا کر دی ہے اور وہ یہ کہ اکثر مقامات پر اعداد و شمار کے ضمن میں دونوں تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً مولانا مہر حبش کی طرف پہلی ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"حبش میں کل مہاجرین کی تعداد ایک سو ایک تک پہنچ گئی (تراسی مرد اور اٹھارہ عورتیں) ۔"[۳]

جبکہ مولانا آزاد ان مسلمانوں کی تعداد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پہلے بارہ مرد اور چار عورتوں کا قافلہ مکہ سے نکلا جس کے رئیس حضرت عثمان بن عفان تھے ۔ اس کے بعد اور لوگ نکلے جن کی تعداد

۱۔ رسول رحمت ، حاشیہ ص ۶۰۵ ۔

۲۔ رسول رحمت ، ص ۱۰۷ ۔

۳۔ رسول رحمت ، ص ۱۴۴ ۔

بہتر مردوں اور اٹھارہ عورتوں تک پہنچ گئی ۔''[1]

مولانا آزاد اور مولانا مہر کے بیانات میں اس طرح کے اختلاف کئی جگہ نظر آتے ہیں ، اگرچہ بعض مقامات پر مولانا مہر نے ان اختلافات کو دور بھی کر دیا ہے اور حاشیے میں اس کی وضاحت کر کے قارئین کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے ۔ مثلاً مولانا آزاد نے اپنے خیال کے مطابق ایک مقام پر غزوۂ اُحد کے انجام کو مسلمانوں کی شکست قرار دیا تو مولانا مہر نے وضاحت کرتے ہوئے حاشیے میں لکھا :

''مولانا بھی مولانا شبلی کی طرح اُحد میں مسلمانوں کی ہزیمت کے قائل تھے لیکن اسے ہزیمت قرار دینا صحیح معلوم نہیں ہوتا ، البتہ اس جنگ میں مسلمانوں کا نقصان بہت ہوا تھا ۔ تاہم قریش میدان چھوڑ کر پلٹ گئے تھے اور مسلمانوں نے حمراء الاسد تک ان کا تعاقب کیا تھا جو مدینۂ منورہ سے آٹھ میل پر ہے ۔ جب یقینی اطلاع مل گئی کہ قریش واپس چلے گئے تو مسلمان بھی حمراء الاسد سے لوٹ آئے ۔''[2]

اسی طرح مولانا مہر کے تحریر کردہ حصوں میں بھی بعض فروگزاشتیں نظرآتی ہیں ؛ مثلاً ایک موقع پر مؤرخین کے ہاں غزوۂ احد کی تاریخوں میں اختلاف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

''غزوۂ اُحد کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے ۔ ابن ہشام ''جوامع السیرۃ'' وغیرہ کے مطابق یہ غزوہ ۱۵ شوال ۳ھ (۳۱ مارچ ۶۲۵ع) کو پیش آیا ۔ دن ہفتے کا تھا ۔ طبقات ابن سعد میں اس کی تاریخ ۷ شوال ۳ھ (۲۳ مارچ ۶۲۵ع) مرقوم ہے ۔ اس روز بھی ہفتہ ہی تھا ۔''[3]

یہاں پر تاریخوں میں عجیب و غریب فروگزاشت کا پتا چلتا ہے ۔ وہ یہ کہ اگر ہفتے کا دن پندرہ شوال کو تھا تو پھر سات کی بجائے آٹھ شوال کو ہفتہ ہونا چاہیے ، اور اگر ہفتے کا دن سات شوال کو تھا تو پھر

۱۔ رسول رحمت ، ص ۱۲۸ ۔
۲۔ رسول رحمت ، ص ۲۶ ۔
۳۔ رسول رحمت ، ص ۲۱۲ ۔

پندرہ کی بجائے چودہ شوال کو ہفتہ ہونا چاہیے تھا ۔ لیکن اول تو یہ معمولی بات ہے ، دوسرے یہ کہ چونکہ مولانا مہر نے یہ تاریخیں دیگر کتب سیرت کے حوالے سے لکھی ہیں لہذا اگر کوئی غلطی ہے بھی تو وہ مولانا مہر کی نہیں ہے ۔ اگر مولانا مہر کی کوئی فروگزاشت قرار پاتی ہے تو وہ یہ ہے کہ انھوں نے ترجیحات قائم کیے بغیر ان دونوں اختلاف تاریخوں میں سے ایک تاریخ قبول کر لی ہے ، جیسا کہ وہ غزوہ حمراء الاسد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"غزوۂ اُحد ۱۵ شوال ۳ھ (۳۱ مارچ ۶۲۵ع) کو ہوا تھا ۔"[1]

لیکن مولانا مہر نے "رسولِ رحمت" میں اس تاریخ کو قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی ۔ البتہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسے ایک کے مقابلے میں دو روایات کے باعث قبول کیا ۔ بہرحال ان چند چھوٹی چھوٹی اور معمولی نوعیت کی فروگزاشتوں کے باوجود رسولِ رحمت ذخیرۂ سیرت میں ایک اہم اور قابلِ ذکر اضافہ ہے ۔ رسولِ رحمت کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ اس کے ایک ایک واقعے میں داعیِ حق کا انداز جھلکتا ہے ۔ ہر مقام پر اس عظیم شخصیت کی نقاب کشائی ہوتی ہے جس کا ہر عمل دوست دشمن کی تمیز کیے بغیر ہر شخص کو خیر و فلاح کی طرف بلاتا ہے ۔ جس کی ناراضی اور حسنِ سلوک سب ایک ہی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں ، جس نے جنگ لڑی تو بھی یہی مقصد پیشِ نظر رکھا کہ انسانوں کو زیورِ انسانیت سے کیسے آراستہ کیا جائے اور معاہدۂ امن کیا تو بھی اس لیے کہ نسلِ انسانی کو ان اوصافِ حسنہ سے متعارف کرایا جائے جن کی بدولت دین و دنیا کی عظیم سعادتیں ان کا مقدر ہو جائیں گی ۔

مولانا مہر نے نہ صرف سیرت کے داعیانہ پہلو کو پیش کیا ، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنے ذاتی تبصروں کی صورت میں یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی کہ آج کل یعنی دور زوال میں مسلمانوں کا انداز زیست کیا ہونا چاہیے ۔ مثلاً مدینۂ منورہ سے بدر کی جانب آتے ہوئے باری آنے پر صحابہ کرام کے اصرار کے باوجود آنحضرتؐ کے پیدل سفر کرنے کے واقعے کو پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

۱- رسولِ رحمت ، ص ۳۲۲ ۔

''یہ ہے نبوی قیادت اور نبوی مساوات ۔ مسلمان لیڈر ان بنیادی امور سے بالکل غافل ہو گئے ہیں اور انھوں نے اپنی برتری کے لیے سینکڑوں بہانے تلاش کر لیے ہیں جو صرف فکر و نظر کے فریب ہیں ۔''[۱]

آنحضرتؐ کی حیات مقدسہ کا ایک ایک واقعہ اور ایک ایک گوشہ تابانیوں سے مملو ہے ، لیکن یہ پہلو سب پر حاوی ہے کہ وہ دنیا میں دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ۔ قرآن شریف کا ارشاد ہے ''وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین'' آپؐ کی ذات اقدس دنیا و مافیہا کے لیے رحمت و شفقت کے ابر گہر بار اور سمندر بیکراں کے سوا کچھ نہ تھی اور ''رسولِ رحمت'' میں آنحضرتؐ کی شخصیت کے اسی مرکزی پہلو کو پیش کیا گیا ہے ۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ دیگر سیرت نگاروں کی طرح صرف دعویٰ ہی نہیں کیا گیا ، بلکہ اس کے لیے دلائل و براہین کے ساتھ ثبوت پیش کیے گئے ہیں ۔ مثلاً صراحت کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کی وہ جنگیں جو محض انا کی خاطر لڑی گئیں اور جن کا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا ان میں لاکھوں افراد مارے گئے ، لیکن آنحضرتؐ کو ایک ہجری سے ۸ھ تک اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جتنی جنگیں پیش آئیں ان میں مسلمانوں اور کفار کا زیادہ سے زیادہ جانی نقصان ایک ہزار اٹھارہ بنتا ہے ۔ بالفرض اگر اس نقصان کو دوگنا اور تین گنا بھی کر لیا جائے تو بھی اسے انسانی جانوں کے اس اتلاف سے کیا نسبت ہو سکتی ہے جو جنگِ عظیم اول و دوم میں ہوا ؟ اس کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ہر اسلامی لشکر کو روانگی سے قبل جو ہدایات دی جاتی تھیں اور جن پر حرف بحرف عمل بھی ہوتا تھا ، آج کی ترقی یافتہ اور مہذب دنیا بھی اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے ۔ پھر یہ امر بھی ناقابلِ فراموش ہے کہ کوئی جنگ ایسی نہیں جس میں پیش قدمی آنحضرتؐ کی طرف سے کی گئی ہو ۔ عہد نبوی کی تمام جنگیں مسلمانوں پر مسلط کی گئی تھیں ۔ اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر جنگ آپؐ کے مشن میں شامل ہوتی تو صلح حدیبیہ نامی کوئی معاہدۂ امن تاریخ کے اوراق میں نہ پایا جاتا ۔ بہرحال اگر طرفین کے جانی نقصان کو پیش نظر رکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ معمولی اتلاف بھی بے نتیجہ نہیں رہا ۔ اس اتلاف نے ایک نئی قوم کو جنم دیا ۔ ایسی قوم کو جو معاشرتی ، سماجی ، اخلاقی اور مذہبی حوالوں سے تاریخ کی

۱۔ رسول رحمت ، ص ۲۷۹ ۔

بدترین قوم ہے ۔ وہ قوم جسے نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے پر معمور کیا گیا ۔ لطف انگیز امر یہ ہے کہ اس قوم نے اُس قوم کے بطن سے جنم لیا تھا جو اخلاق اور مذہبی طور پر ہر طرح کی پستیوں کا شکار تھی ۔

''رسول رحمت'' کے کل ایک سو پانچ ابواب میں سے آخری پندرہ ابواب اسی مقصد کے لیے وقف کیے گئے ہیں کہ مختلف واقعات و حالات کے وہ پہلو اور گوشے پیش کیے جائیں جو آپؐ کی رحمۃ للعالمینی کی بیّن دلیل ہیں ۔ یہاں پر یہ خیال گزرتا ہے کہ مولانا مہر کے ذہن میں رسول رحمت میں پیش کردہ مواد کا خاکہ بہت پہلے مکمل ہو چکا تھا اور وہ سیرت النبی کے اس پہلو کو پیش کرنے کے لیے پہلے ہی ایک منصوبہ بنا چکے تھے ۔ اس خیال کی تائید کے لیے سیرت پر مولانا مہر کی پہلی کتاب یعنی ''سرورِ عالم'' کے بعض مباحث پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً ''سرورِ عالم'' کے آخری باب کا عنوان ''جہانوں کے لیے رحمت'' ہے ۔ اس کے علاوہ اخلاق نبوی سے متعلق تحریر کیے گئے دو ابواب میں بھی اسی نقطے کو مرکزیت حاصل ہے ۔ مثلاً وہ ''سرور عالم'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

''رسولؐ پاک کی سیرت کا نقشہ سامنے رکھو ۔ ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ آپؐ سراپا رحمت تھے ۔ آپؐ کی ذات بابرکات سے جہانوں پر آشکارا ہوا کہ رحمت کسے کہتے ہیں ؟ نیکی ، تہذیب ، پاکیزگی ، ہمدردی ، محبت اور اخوت کیا ہوتی ہے ۔ گمرہی کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے والی دنیا کے واسطے حقیقی امن کی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے کون سی روشنی درکار ہے ۔''[۱]

غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ یہی اجمال تھا ، جو رسول رحمت میں تفصیل سے بیان ہوا ۔ گویا مولانا مہر رسول رحمت پر کام شروع کرنے سے قبل ہی طے کر چکے تھے کہ ان کے پیشِ نظر مقصد کیا ہے اور وہ سیرت میں آپؐ کی شخصیت کے کس پہلو کو پیش کریں گے ؟

۱- سرورِ عالم ، ص ۲۵۶ ۔

''سرورِ عالم'' کے مقابلے میں رسول رحمت کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تحقیقی و علمی مباحث سے بالاہتمام احتراز نہیں کیا گیا ۔ یعنی رسول رحمت میں نہ صرف موضوع سے متعلق تمام ضروری علمی و تحقیقی مباحث آئے ہیں ، بلکہ نتائج مرتب کرتے ہوئے تمام جدید و قدیم محققین اور سیرت نگاروں سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ علاوہ ازیں اپنی تحقیقات یا پیش کردہ ثبوت کے لیے جہاں ممکن ہوا ، اپنے ذاتی تجربات بھی بیان کیے ہیں ۔ مثلاً غارِ ثور سے مدینۂ منورہ کے لیے آنحضرتؐ نے جو راستہ اختیار فرمایا تھا ، اس کا ذکر کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں اپنے سفرِ عرب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ہم اپنے خیال کے مطابق طریق سلطانی سے مدینۂ منورہ پہنچنے کے خواہاں تھے ۔ رابغ سے آگے بڑھے تو ہم لوگ اطمینان سے شغدفوں میں سوگئے ۔ ساربان رات کی تاریکی میں راستہ بھول گئے اور طریقِ سلطانی چھوڑ کر طریقِ جبل الغائر پر ہو لیے ۔ ایک منزل طے ہوگئی تو پتا چلا کہ ہم غلط راستے پر آ گئے ہیں ۔ غور و فکر کے بعد ایک منزل واپس جا کر طریقِ سلطانی اختیار کرنے کے بجائے اسی راستے پر سفر جاری رکھنا مناسب سمجھا گیا ۔ اس وقت تک مدینہ منورہ پر فرمالروائے نجد کا قبضہ نہیں ہوا تھا ۔ جبل الغائر کے قریب پہنچے تو ایک تیز رو قاصد مدینہ منورہ سے آتا ہوا ملا جس نے خوش خبری سنائی کہ نجدی فوجیں پرامن طریق پر مدینہ منورہ میں داخل ہو گئیں ۔ قاصد مکہ مکرمہ جا رہا تھا اور اس نے طریق الغائر اس لیے اختیار کیا تھا کہ اس کا فاصلہ دوسرے راستوں کے مقابلے میں کم تھا ۔''[1]

اگر ''سرورِ عالم'' بچوں اور عام اردو خواں اصحاب کے لیے لکھی گئی تھی ، تو رسول رحمت ان ذہنوں کے لیے جو سیرت النبی کے ایک ایک واقعے کی معمولی معمولی تفصیلات اور جزئیات تک سے واقف ہونے کے خواہاں ہیں ، تا کہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے اور اہم و غیر اہم مقام پر آپ سے راہ نمائی حاصل کر سکیں ۔ جہاں ''سرورِ عالم'' کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے صدقۂ جاریہ ہے ، وہاں ''رسول رحمت'' اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہنوں کے لیے فیض عام کا درجہ رکھتی ہے اور مولانا مہر کا محققانہ ذہن اس کتاب کو مفید تر بنا دیتا ہے ۔

۱- رسول رحمت ، ص ۱۹۱ ۔

تحقیقی و علمی مباحث کے باوجود مولانا مہر نے کسی بھی مقام پر عقیدت و محبت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔ اگرچہ بعض مقامات ایسے بھی آئے جہاں مولانا مہر اکثر سیرت نگاروں سے مختلف رائے رکھتے تھے اور واقعات کی جو صورت انھوں نے بیان کی اس کی بنا پر بعض لوگ مسلمانوں کے طرزِ عمل پر اعتراض کر سکتے تھے ۔ لیکن مولانا مہر نے واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کی جو تاویل پیش کی ہے وہ بجائے خود معترضین کا منہ بند کر دینے کے لیے کافی ہے ۔ اس ضمن میں قریش کے تجارتی قافلے پر مسلمانوں کے حملے کی کوشش کا واقعہ اہم ترین ہے ۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

''اس باب میں قافلے کو حملے کا ہدف تسلیم کرنے سے گریزاں ہونا سراسر تکلف ہے ۔ قریش اور مسلمانوں کے درمیان حالتِ جنگ قائم تھی اور حالتِ جنگ میں دشمن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا قطعاً مستوجبِ طعن نہیں ہو سکتا ۔ جن بزرگوں نے اس باب میں تکلف فرمائے ہیں ، میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے حقیقی صورت حال پیشِ نظر نہیں رکھی اور صرف اس خیال سے متاثر ہو گئے کہ کہیں مسلمانوں پر غارت گری کا الزام عائد نہ ہو جائے ۔ لیکن پیش بندی کے طور پر دشمن کو نقصان پہنچانا اور اسے جنگ کے معاملے میں بے دست و پا بنادینا ہر اعتبار سے درست اور جائز ہے اور یہ سب کے نزدیک تدابیر جنگ میں سے ایک تدبیر ہے ۔''[1]

مولانا غلام رسول مہر اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ دین اور دینداری آنحضرتؐ سے محبت و عقیدت ہی کا دوسرا نام ہے ۔ یہ نہیں تو جبہ و دستار سے لے کر مسجد و تسبیح تک سب کچھ بولہبی ہے ۔ مولانا مہر کے اس عقیدے کا اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ اوطان و اقوام کے سلسلے میں کہی جانے والی اقبال کی نظم کا آخری شعر ''رسول رحمت'' کے صفحہ اول پر درج کیا ہے ۔ اور یہ حقیقت اس طرح بھی منکشف ہوتی ہے کہ ''رسول رحمت'' کا ایک ایک لفظ محبت و عقیدت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے اور یہ رنگ اتنا گہرا ہے کہ آنحضرتؐ اور ان کی سیرتِ مقدسہ

۱- رسول رحمت ، ص ۲۶۰ ۔

کا تو ذکر ہی کیا ، مکۂ مکرمہ اور مدینۂ منورہ تک کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر نے احترام کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔ آنحضرت ؐ کی ذات مقدس سے اپنے جذبۂ عقیدت و محبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''جب سے ہوش سنبھالا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک اور دین حق کے لیے ایک تڑپ قلب و روح کی گہرائیوں میں موجزن رہی ۔ اس کا تموج اُس وقت بھی خاصہ تیز تھا جب میں اس کی حقیقت سے بڑی حد تک ناآشنا تھا اور آج بھی خاصا تیز ہے جب میں اس سے بالکل غیر متعارف نہیں رہا ۔ یہی تڑپ ہے جس نے زندگی کی تاریک منزلوں میں اُمید کا چراغ لگا تار روشن رکھا ۔ ہر کام میں میری رہنمائی کی ، ہر سفر میں یہ میرے لیے توشہ و زادِ راہ بنی رہی ۔ یہی تڑپ ہے جو عملِ حسن سے محرومی کی حسرتوں کے ہجوم میں بھی زندگی کا حاصل معلوم ہوتی ہے ۔''[1]

یہ جذبۂ عشق ہی تھا جس نے مولانا مہر کے اسلوب کو وہ مرتبہ عطا کیا ، جس کے باعث ان کے مقالات ابو الکلام آزاد کی تحریروں کے پہلو بہ پہلو ہونے کے باوجود بے لطف معلوم نہیں ہوتے ۔ رسول رحمت کے اسلوب کو دیکھ کر ہی یہ بات حقیقت بن کر سامنے آتی ہے کہ مولانا مہر شبلی و آزاد کے خانوادۂ ادب سے تعلق رکھتے تھے ۔

رسول رحمت کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ یہ صرف اسی بنا پر اہم کتاب نہیں ہے کہ بحیثیتِ مصنف مولانا مہر کو اس کے بعد بقائے دوام کے دربار میں کسی اور خریطے کی ضرورت نہیں ، بلکہ اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ یہ اُخروی زندگی میں ان کی کامیابی کی ضمانت بھی بن جائے گی ۔

مولانا مہر کی سوانحی تصانیف

مولانا مہر نے سیرت کے علاوہ سوانح نگاری پر بھی توجہ دی ہے اور اس سلسلے میں ان کی چار کتابیں غالب ، سید احمد شہید ، جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ اور جوزیفین ملتی ہیں ۔ جوزیفین فراغت کے زمانے کی یادگار ہے جبکہ

۱۔ رسول رحمت ، دیباچہ ، صفحہ ۰ ۔

"جنرل سرعمرحیات خاں ٹوانہ" لکھتے وقت غالباً تعلقات نبھانے کا مسئلہ درپیش تھا ۔ البتہ غالب اور سید احمد شہید ، مولانا مہر کی نوشتہ ایسی سوانح عمریاں ہیں جن کی بنا پر سوانح نگاری کے ضمن میں ان کا تذکرہ ضروری ہو جاتا ہے ۔

ان دونوں سوانح عمریوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مہر نے ایسی شخصیات کو اپنا موضوع بنایا جو کسی نہ کسی حوالے سے مسلم تہذیب و ثقافت کی علامت قرار پاتی ہیں ۔ سید احمد شہید نے تیغ و سناں کے ذریعے پرچم اسلام بلند رکھنے کی کوشش کی تو مرزا غالب نے قلم و قرطاس کے سہارے اس تہذیب و ثقافت کو دوام بخشا ، جس میں اسلامی عناصر کو تفوق و برتری حاصل تھی اور یہی بات مختلف دائروں میں کام کرنے والی ان دو عظیم شخصیات میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ مولانا مہر ان شخصیات کی زندگیوں کو پیش کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے ؟

۱۔ غالب :

تفہیم غالب کا باقاعدہ آغاز "یادگار غالب" سے ہوا تھا ۔ "یادگار غالب" میں نہ صرف مرزا غالب کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا تھا بلکہ غالب کی حیات کو بھی موضوع بنایا گیا تھا ۔ لیکن چونکہ مولانا حالی کے نزدیک غالب کی زندگی میں کوئی ایسا پہلو موجود نہیں تھا جو زوال آمادہ قوم کو راہ ترقی کی جانب گامزن کرنے میں معاون ہو سکتا ، لہٰذا انھوں نے یادگار غالب میں سوانحی پہلو پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی تھی جس کی بنا پر یہ حصہ بہت حد تک تشنہ رہ گیا تھا ۔ غالباً اسی کے پیش نظر مولانا مہر نے غالب کے سوانحی حالات مرتب کرنے کا مشکل فریضہ انجام دینے کی کوشش کی ۔ ان کی یہی کوشش "غالب" کی شکل میں مرزا کے مداحوں کے سامنے ہے ۔ صرف ذخیرۂ غالبیات ہی نہیں بلکہ مولانا مہر کی یہ تصنیف اردو سوانح نگاری کی تاریخ میں بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ، اس لیے کہ اس پر مولانا مہر نے اردو میں سوانح نگاری کی عام روایت کے برعکس اپنے لیے نئی راہ نکالی ۔ عام مروجہ طریق سے ہٹ کر ایک نئے راستے پر چلتے ہوئے خود صاحب سوانح کی تحریروں سے اس کی سرگزشت حیات مرتب کرنے کی کامیاب کوشش کی ۔ مولانا مہر کے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے الطاف فاطمہ لکھتی ہیں :

"یہ تصنیف سوانح غالب کے بطور ہی ایک کارنامہ اور شاہکار کا درجہ

نہیں رکھتی بلکہ اردو فن سوانح نگاری میں ایک نیا اور ناقابل فراموش اضافہ ہے ۔ مولانا غلام رسول مہر نے اردو سوانح نگاری کو ایک نئے طریق کار سے روشناس کیا ہے یعنی صاحب شخصیت کی نظم و نثر اور نجی خطوط کی روشنی اور حوالے سے اس کی سوانح مرتب کرنا ۔"[۱]

مولانا مہر نے "غالب" کا بنیادی ڈھانچہ تو "یادگار غالب" سے لیا ہے جبکہ واقعات کی تفصیلات سامنے لانے اور ان کے رد و قبول کے سلسلے میں مرزا غالب کے خطوط اور ان کی اردو و فارسی شاعری اور دیگر تحریروں میں موجود بیانات سے استفادہ کیا ہے ۔ اسی طریق کار کی بنا پر "غالب" نہ صرف بہترین سوانح عمری بن گئی ہے بلکہ تحقیق و تفحص کے بھی تمام تقاضے پورے ہو گئے ہیں ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ "غالب" کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سوانح نگاری کے تقاضے بھی باحسن وجوہ پورے کیے ہیں ۔ ضروری مواد کی فراہمی ، اس میں سے بذریعہ انتقاد معنی خیز اور مفید مطلب جزئیات کا انتخاب ، شخصیت کی نقش گری ، احساس تکمیل اور شعور صداقت ، ہر شے اس سوانح عمری میں موجود ہے ۔"[۲]

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جن پہلوؤں کی جانب ڈاکٹر سید عبداللہ نے اشارہ کیا ہے ، وہی غالب کے بنیادی خصائص ہیں ۔ مولانا مہر نے مختلف مآخذ سے غالب کے سوانحی حالات کی تفصیلات جمع کیں اور ان کو اس انداز میں مرتب کیا کہ وہ نہ صرف مکمل سوانح عمری کا روپ اختیار کر گئیں بلکہ ان میں مرزا کی شخصیت بھی جلوہ گر نظر آتی ہے ، اور شخصیت کی اس جلوہ گری میں حقیقت و صداقت کا عنصر بھی موجود ہے اور یہی تقاضا ہم ایک سوانح عمری سے کرتے ہیں ۔

اگرچہ غالب بھی مولانا مہر کا جذباتی موضوع تھا اور وہ اس کے پردے

۱- اردو سوانح نگاری ، از الطاف فاطمہ ، مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ، ص ۹۰۶ ، جلد دسویں ، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔

۲- مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مصنف ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، ص ۲۳ ، مشمولہ فنون ۔

میں بھی ملتِ اسلامیہ کے زوال کا ماتم کر رہے تھے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے باوجود مولانا مہر نے غالب کی زندگی کے جملہ پہلوؤں کی پیشکش میں کوئی تامل نہیں کیا ، بلکہ اپنی تصنیف میں ڈومنی کے عشق سے لے کر فریزر کے قتل کے سلسلے میں انگریزوں سے ساز باز تک اور ان کی شراب نوشی سے لے کر قمار بازی تک کا برملا ذکر کیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ مرزا غالب میں کردار کی یہ کمزوریاں موجود بھی تھیں ۔ پھر یہ بھی ہے کہ مرزا غالب کے ساتھ مولانا مہر کی عقیدت شیفتہ کی طرح ان کے کمالِ فن اور شاعری کی وجہ سے تھی ، اُن کی پرہیزگاری اور اتقا کی وجہ سے نہیں تھی ۔ پھر یہ محبت و عقیدت مولانا حالی کی طرح دھیمی بھی نہیں بلکہ مولانا مہر کا شدید جذباتی رویہ اسے درجۂ انتہا پر پہنچا دیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مہر نے مرزا غالب کی شخصیت کی کمزوریوں کو جس انداز میں پیش کیا ہے ان سے غالب کی طرفداری کی بو آتی ہے ۔ یہ الگ بات کہ یہ چیز بجائے خود ایک اچھے سوانح نگار کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ صاحب سوانح کی شخصیت کا ہمدردانہ نقطہ نظر سے جائزہ لے ۔ اسی ہمدردانہ جائزے اور تجزیے نے ''غالب'' کو مرزا کی جملہ سوانح عمریوں میں منفرد و ممتاز کر دیا ہے ۔

''غالب'' میں بطور سوانح عمری نمایاں اوصاف کے ساتھ ساتھ کچھ نقائص بھی ہیں ۔ مثلاً اس کا سب سے بڑا نقص تو یہی ہے کہ جذباتِ عقیدت و محبت کے باعث غالب کی شخصیت کے بعض نمایاں معائب کو پیش کرنے سے احتراز کیا گیا ہے ۔ مثلاً معلوم ہے کہ مرزا غالب بعض اوقات امراء و رؤساء کو خوش کرنے کے لیے ان کی بے جا تعریف کر دیتے تھے ، لیکن مولانا مہر نے شخصیت کے اس پہلو کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ ابوالکلام آزاد کی طرف سے تحریری طور پر اس پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانے کے باوجود وہ مرزا کی شخصیت کا یہ رخ گول کر گئے ، حالانکہ یہ سب باتیں مرزا کی اپنی عبارات میں اندرونی شہادتوں کے طور پر موجود ہیں ۔

طنز و مزاح مرزا غالب کے کلام کا نمایاں وصف ہے ۔ صرف کلام ہی نہیں بلکہ وہ عام زندگی میں بھی ہنستے مسکراتے نظر آتے ہیں ، لیکن ''غالب'' میں مرزا کی شخصیت کے اس پہلو کا کہیں سراغ نہیں ملتا ۔ البتہ تحقیق کی سنجیدگی نے کتاب کو گرانبار ضرور کر دیا ہے ۔ غالب کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں :

"یادگار غالب پڑھنے کے بعد غالب کی جو دلآویز اور رعنا شخصیت ابھرتی ہے وہ مولانا مہر کی "غالب" میں نظر نہیں آتی ۔ یادگار غالب میں غالب کی زندگی ایک موج تبسم بن کر دکھائی دیتی ہے ۔ ان کے حالات میں ان کی زندہ دلی اور شگفتگی چھائی رہتی ہے ۔ غالب کے لطائف و ظرائف ان کی زندگی کا اہم پہلو ہیں ۔ ان سے ان کے ذہنی اور نفسیاتی رجحانات کے ساتھ ان کی طبعی شوخی اور فطری بے باکی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اس کے ساتھ وہ ادبی مطائبات بھی ہو گئے ہیں ۔ لیکن مولانا مہر نے اپنی کتاب میں ان کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے ۔"[1]

"غالب" کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس میں اکثر جگہ تکرار کا احساس ہوتا ہے ۔ یہ تکرار یقیناً مولانا مہر کے قلم کا نتیجہ نہیں ۔ لیکن مولانا آزاد سے تعلقات کے باعث انھوں نے اکثر مقامات پر غالب کے بارے میں ان کی جو تحریریں شامل کر دی ہیں وہ تکرار کا باعث بنتی ہیں ۔ ان تحریروں کی وجہ سے جہاں بسا اوقات مولانا مہر کے پیش کردہ دلائل کی تائید ہوتی ہے اور کچھ نئی تفصیلات سامنے آ جاتی ہیں ، وہیں بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ مولانا مہر کے پیش کردہ نتائج کا استرداد ہو جاتا ہے ۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں قاری چکرا جاتا ہے ۔ اس لیے کہ وہ کسی واضح اور متعین نتیجے تک نہیں پہنچ پاتا ۔ اس قسم کی سب سے نمایاں مثال قمار بازی کے الزام میں غالب کی گرفتاری اور اس پر بادشاہ سمیت روسائے دہلی کے تاثرات ہیں ۔

"غالب" کا ایک اور نمایاں نقص یہ ہے کہ اس میں سوانحی واقعات کو زمانی ترتیب سے پیش نہیں کیا گیا ۔ مثلاً غالب کے پانچویں اور چھٹے ابواب کے عناوین بالترتیب "سفر کلکتہ" اور "رام پور اور میرٹھ کا سفر" ہیں ۔ لیکن خود مولانا مہر کی تحقیق کے مطابق مرزا غالب کو پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر ۱۸۲۵ء میں پیش آیا تھا ، جبکہ وہ میرٹھ اُس وقت گئے تھے جب ۱۸۶۰ء میں نواب شیفتہ کو رہائی ملی تھی ۔ ان دونوں سفروں میں تقریباً تیس سال کا زمانی فاصلہ ہے ۔ سوانحی تسلسل کے ٹوٹنے کا اندازہ اس سے بھی کیا

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں ، از سید صباح الدین عبدالرحمٰن حصہ دوم ، ص ۱۵ ، طبع اول ۱۹۷۹ء ، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۔

جا سکتا ہے کہ ۱۸۲۷ء میں پیش آنے والے سفر کا ذکر کرنے کے بعد اگلے باب میں پھر پنشن کے مقدمے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ''غالب'' میں مرزا کی زندگی کے بعض اہم ادوار کو سرے سے موضوع ہی نہیں بنایا گیا۔ مثلاً ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۷ء تک کے طویل عرصے کے متعلق ''غالب'' میں مرزا کی زندگی کے بارے میں کوئی بیان نہیں ملتا۔ البتہ ان چند درخواستوں کا ذکر ضرور ہے جو پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں مختلف افسروں کو پیش کی گئیں۔

''غالب'' کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس میں تحقیقات کے نتائج حتمی طور پر اطمینان بخش نہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرزا غالب کی سوانح عمری کے طور پر ''غالب'' میں کچھ نقص بھی ہیں۔ اس کے باوجود اس کی خوبیوں کا پلہ بھاری ہے۔ انھی خوبیوں کی وجہ سے غالبیات کے وسیع ذخیرۂ کتب اور اردو سوانح نگاری کی پوری روایت میں کوئی تصنیف اس سے لگا نہیں کھاتی۔

۲۔ سید احمد شہید :

مذہبی اور سیاسی دائرے میں کام کرنے والی شخصیات کی سوانح عمریوں میں سب سے اہم سوانح حیات ''سید احمد شہید'' ہے۔ سید احمد شہید برعظیم کی تاریخ کے اس دور میں پیدا ہوئے جب یہاں کی سینکڑوں سالہ اسلامی حکومت کا جنازہ نکل چکا تھا۔ اگرچہ ہندوستان کے طول و عرض میں اسلامی پرچم سرنگوں نہیں ہوا تھا لیکن وہ آثار پیدا ہو چکے تھے جن کے پس منظر میں اس پرچم کی سرنگونی زیادہ دور نہیں تھی۔ ایک طرف بدیسی حکمرانوں کا غول بیابانی آدھے سے زیادہ ہندوستان پر قابض ہو کر لال قلعے کو اپنے نرغے میں لینے کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا اور دوسری جانب ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سکھوں کے سر تاجِ سلطانی سے آراستہ ہو کر عقل و ہوش سے بیگانہ ہو رہے تھے۔ سید احمد شہید نے میدانِ جہاد میں قدم رکھا اور اپنا سب کچھ نچھاور کرکے پرچم اسلام کو سربلند رکھنے کی جرأت مندانہ کوشش کی۔ اگرچہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے، اس کے باوجود اہلِ ہند کے مردہ قلوب میں وہ حرارت ضرور پیدا کر دی جس نے ۱۸۵۷ء میں استعماری قوت کو ریزہ ریزہ کر دینے کی کوشش کی اور آخر کار ۱۹۴۷ء میں اسے پارہ پارہ کر دیا۔

سید احمد شہید کی داستان حیات جہاں آہوں اور آنسوؤں کی داستان ہے وہیں جرأت اور حوصلہ مندیوں کی کہانی بھی ہے ۔ شدائد اور سختیوں میں زندگی گزارنے والی یہی شخصیت ہے جس نے ثابت کیا کہ دور زوال میں بھی ایسے نقوش ثبت کیے جا سکتے ہیں جو دور عروج کے درخشاں نشانات کی طرح تاباں و منور ہوں ۔ سید احمد شہید کی حیات کے اسی رخ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

''تاریخ پاک و ہند میں جس عہد کو مسلمانوں کا دور زوال کہا جاتا ہے ، یہ اس کا ایک باب ہے ۔ لیکن کیا کوئی حق پسند اور حق شناس انسان اس اعتراف میں تامل کرے گا کہ مسلمانوں کے عہد عروج و اقبال کا بھی کوئی حصہ اصولاً اس سے زیادہ شاندار یا زیادہ قابلِ فخر نہیں ہو سکتا ۔''[۱]

حیات سید احمد شہید کا یہی پہلو ہے جس کی بنا پر اپنوں اور بیگانوں سب نے اسے اپنا موضوع بنایا ، لیکن عجیب امر یہ ہے کہ دونوں جان بوجھ کر سید احمد شہید کی حقیقی زندگی کو پیش کرنے کی بجائے اصل تصویر کو بھی مسخ کرتے رہے ۔ غیر تو اس لیے کہ عمل و عزیمت کی حامل اس شخصیت کی داستانِ حیات میں بھی وہ سحر تھا جو انگریزوں کے چراغ حکومت کے لیے تند و تیز ہوا کے جھونکے کی حیثیت رکھتا تھا ، جبکہ اپنوں نے اس خیال سے ان کی شخصیت اور کارناموں پر پردے ڈال دیے کہ کہیں اصل صورت حال کے سامنے آتے ہی پس ماندگانِ شہید اور خود لکھنے والے عتاب حکومت کی زد میں نہ آ جائیں ۔ اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ حقیقتیں ماضی کے غبار میں دب کر رہ گئیں اور بے سروپا افسانے حقیقت سے بھی زیادہ معتبر ٹھہرے ۔ حقائق کو اس کے صحیح تناظر میں پیش کرنے کے لیے مولانا غلام رسول مہر نے ۱۹۳۴ء میں مولانا محمد بشیر شہید کے سامنے عہد کیا کہ وہ اس مجاہد اعظم کے سوانح مرتب کریں گے ۔ اس عہد کو عملی شکل دینے میں بیس برس کا طویل عرصہ صرف ہوا اور سید احمد شہید ۱۹۵۴ء میں پہلی مرتبہ چھپ کر سامنے آئی ۔

۱۔ سید احمد شہید ، ص ۱۵ ، اشاعت سوم ۱۹۶۸ء ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔

یہ سوانح بھی صاحب سوانح سے مولانا مہر کی محبت و عقیدت کا بیّن ثبوت پیش کرتی ہے ، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس تصنیف کی محرک اول بھی سید شہید سے مولانا مہر کی محبت ہی ہے ۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ سلسلۂ مجاہدین کی کتب کا مقصد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مقصد اس سلسلے کے دو ہیں ۔ اول اپنے محبوب مجاہد کی خدمت میں جذبات عقیدت کا ارمغان پیش کرنا ، دوسرا (خود مہر کے الفاظ میں) اس غلطی فہمی کو رفع کرنا کہ مسلمانانِ ہند نے آزادیٔ ہند کے لیے کچھ نہیں کیا ۔"[1]

جذباتِ عقیدت کا ایک سیل رواں ہے جو سید احمد شہید کے ایک ایک صفحے اور ایک ایک سطر میں موجزن نظر آتا ہے ۔ اور دراصل یہی وہ جذبہ ہے جس نے اس تصنیف کو تحقیق و تاریخ سے زیادہ کامیاب سوانح عمری کے درجے پر فائز کیا ہے ۔

مولانا مہر نے سید احمد شہید میں اگرچہ ان تمام الزامات و اعتراضات کا ذکر کیا ہے جو معترضین کی طرف سے اس عظیم شخصیت کے بارے میں اٹھائے جاتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان تمام اعتراضات کو یا تو تحقیق و انتقاد کی روشنی میں رد کر دیا گیا ہے یا پھر ان کی مناسب تاویل کی گئی ہے ۔ مثلاً سید احمد شہید کے بارے میں اس بات نے خصوصی شہرت پائی کہ وہ اُمّی تھے اور تعلیم و تعلم سے انھیں کوئی علاقہ نہیں تھا ۔ اس سلسلے میں اگرچہ مولانا مہر نے تسلیم کیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے زیر تربیت رہنے اور اہلِ علم کے گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود سید احمد شہید ، شاہ اسماعیل شہید ایسے عالم تو نہ بن سکے ، لیکن یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ وہ سرے سے کچھ جانتے ہی نہ تھے ۔ مولانا مہر لکھتے ہیں :

"سید صاحب علم سے کورے نہ تھے ۔ بے شک انھیں کتابی علوم میں وہ درجہ حاصل نہ ہوا جو مثلاً شاہ عبدالعزیز یا شاہ اسماعیل شہید کا تھا تاہم وہ خاصے پڑھے لکھے تھے ۔ شرعی اوامر و نواہی سے بخوبی

۱۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مصنف ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، ص ۲۲ ، بشمولہ فنون ۔

واقف تھے ، عربی اور فارسی بے تکلف سمجھتے تھے ، آیات و احادیث
کے معارف بیان فرماتے تھے ۔''[۱]

اس کے علاوہ اور بہت سے امور ایسے ہیں جن کے بارے میں مورخین نے سید احمد شہید پر نکتہ چینی کی ہے ۔ مثلاً بار بار ناقابل اعتماد قرار پانے والے افغان سردار یار محمد خاں پر فتح پشاور کے بعد اعتماد کرنے اور پشاور کو اس کے حوالے کر دینے پر اکثر مورخین نے اعتراض کیا ہے اور بظاہر یہ اعتراض وقیع بھی ہے ۔ کیونکہ اگر یہ غلطی نہ کی جاتی تو شاید آج برعظیم کی تاریخ مختلف ہوتی ۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر حالات و واقعات اور سید صاحب کے مشن کے منظر میں ان کے طرز عمل کو مناسب اور اقتضائے وقت کے مطابق قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ان پر سید صاحب کا اعتماد بھی درست ثابت نہ ہوا ۔ مگر آپ سوچیں خاص اس موقع پر اعتماد کے سوا چارہ کیا تھا ؟ سید صاحب نفیر عام کے داعی تھے ۔ جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہہ رہے تھے ، ان میں سے کسی کو کس بنا پر رد کر سکتے تھے ؟ یہ کیونکر کہہ سکتے تھے کہ فلاں کا تعاون منظور ہے فلاں کا منظور نہیں ! خصوصاً ان بھائیوں میں تفرقہ ناممکن تھا ۔ اگر یار محمد خاں کے تعاون کو قبول نہ کرتے تو دوسرے بھائیوں سے تعاون کی کیا امید ہو سکتی تھی ۔ اگر ان سب کو چھوڑ دیتے تو کیا وہ اہل سرحد کے تعاون میں خلل انداز نہ ہوتے اور سکھوں کے ساتھ خفیہ ساز باز کرکے سید صاحب کے لیے دو جانب سے خطرات پیدا نہ کر دیتے ؟ پھر انہی سرداروں کے بھائی افغانستان کے بڑے حصے پر مسلط تھے ۔ ان سے اعانت و امداد کی کیا امید ہو سکتی تھی ؟ حالات و مصالح کے اعتبار سے وہی طرز عمل درست تھا جو سید صاحب نے اختیار کیا ۔''[۲]

لیکن یہ امر واضح ہے کہ تاویل وہیں کی جا سکتی ہے ، جہاں اس کی گنجائش ہو ، جبکہ انسان سے بعض اوقات ایسی غلطیاں بھی سرزد ہو سکتی ہیں

۱۔ سید احمد شہید ، ص ۶۲ ۔

۲۔ سید احمد شہید ، ص ۳۶۱ - ۳۶۲ ۔

جن کا کوئی جواز پیش ہی نہ کیا جا سکے ۔ اور آخر سید احمد شہید بھی ایک انسان ہی تھے اور حد درجہ احتیاط کے باوجود ان سے بھی کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی ۔ پرلطف بات یہ ہے کہ محبت و عقیدت کے بے پایاں جذبات کے باوجود مولانا مہر نے سید صاحب کی ایسی فروگزاشتوں سے چشم پوشی نہیں کی ، جیسا کہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

''میرے علم کے مطابق ان سے دو مرتبہ خطائیں سرزد ہوئیں ۔ ایک مرتبہ بچی کو دودھ پلانے پر اصرار کے ضمن میں اپنے ایک ارادت مند کے بچے کا پورا خیال نہ رکھنا ۔ جب اس خطا کا احساس ہوا تو نہ محض اس شخص سے معافی مانگی بلکہ اپنے ارادت مندوں کو جمع کر کے سب کے سامنے غلطی کا اعتراف کیا اور دوبارہ عفو کے خواست گار ہوئے ۔ . . . دوسری مرتبہ جنگ مایار سے صرف ایک دن پیشتر تورو میں ایک ارادت مند کو بے ساختہ مردود کہہ دیا ۔''[۱]

مولانا مہر نے نہ صرف سید احمد شہید کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کا اعتراف کیا بلکہ بعض مقامات پر ان سے منسوب بیانات اور ان سے متعلق ان کے خلفاء کی بعض تحریروں کو بھی صحت سے بعید قرار دیا ۔ اس سلسلے میں سب سے بہتر مثال سید احمد شہید کی غیبوبت کا معاملہ ہے ۔ خاص وقت کے لیے سید صاحب کے غائب ہو جانے سے متعلق نہ صرف ان کے اپنے بعض بیانات مشہور ہیں ، بلکہ واقعۂ بالا کوٹ کے بعد مولانا ولایت علی نے ''دعوت'' نام سے ایک رسالہ لکھ کر اس عقیدے کو خاص طور پر عام کرنے کی کوشش کی ، لیکن مولانا مہر اس رائے کی تردید میں مختلف دلائل پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

''اگر اُمت کی بے چارگی کے نازک ترین اوقات میں سید صاحب ہدایت و رہنمائی کے لیے ظاہر نہ ہوئے تو اس ہادی و مرشد کے وجود پر کسی کو کیا خوشی ہو سکتی ہے جو ظہور کے بعد اچانک غائب ہو جائے اور مصیبت زدہ دنیا غیبت کی ظلمت زائل ہونے کے انتظار میں لامتناہی مدت تک ضلالت و نامرادی کی ٹھوکریں کھاتی رہے ۔''[۲]

۱۔ سید احمد شہید ، ص ۸۳۷ ۔

۲۔ سید احمد شہید ، ص ۸۱۳ ۔ ۸۱۴ ۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مہر نے سوانح لکھتے ہوئے بھی تاریخ کے تقاضوں کو پورا کیا ہے ۔ دراصل ''سید احمد شہید'' کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ و سوانح کا آپس میں کیا تعلق ہے ؟ مولانا مہر نے خواہ سید شہید کی زندگی کے مختلف واقعات پیش کیے ، خواہ ان کے اوصاف کی تصویر کشی کی یا ان کی غلطیوں اور فرو گزاشتوں کا نقشہ پیش کیا ، انھوں نے ہر جگہ تحقیق و تاریخ کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔ سوانحی واقعات پیش کرتے ہوئے محض افسانوی روایات کا نہ صرف سہارا نہیں لیا بلکہ ان روایات کو حقیقت کی کسوٹی پر بھی کسا ۔ جو کھری نکلیں اُن کو اپنی تصنیف میں جگہ دی ورنہ رد کر دیا ۔

تحقیق و تاریخ کے ساتھ واقعات کی پیشکش میں استدلالی و منطقی انداز فکر کو اختیار کیا ۔ اسی اندازِ فکر کے باعث اپنوں اور بیگانوں کی افترا پردازیوں اور غلط نتائج کو کامیابی سے رد کیا جا سکا ۔ مثلاً نواب امیر خاں کے لشکر میں سید صاحب کی شمولیت کے بارے میں اکثر مورخین یہ رائے رکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ اقدام دراصل سپہ گری کی تربیت حاصل کرنے کے لیے اٹھایا تھا ، جبکہ مولانا مہر اس رائے کو درست تسلیم نہیں کرتے ۔ ان کا خیال ہے کہ نواب امیر خاں کے لشکر میں شمولیت کا اصل سبب یہ تھا کہ ہندوستان کی اس نئی ابھرتی ہوئی مسلم قوت کو منظم کرکے اس سے اسلامی نشاۃ الثانیہ کا کام لیا جائے ۔ مولانا مہر اپنی رائے قائم کرنے کے لیے دلائل دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ سپہ گری کی مشق کا وہ پیمانہ سید صاحب کے زمانے میں موجود ہی نہ تھا جس کے تصور میں ہم لوگ آج کل سرمست ہیں ۔ عام ہتھیاروں کا استعمال سب لوگ جانتے تھے ۔ لڑائیوں کا طریقہ ایسا تھا کہ جواں مردی اور استقامت ہی کو کامیابی کا سب سے بڑا گر سمجھا جاتا تھا ۔ خود نواب امیر خاں نے کون سی عسکری تربیت گاہ میں سپہ گری کے ہنر سیکھے تھے کہ اس کے لشکر میں شمول جوہر سپہ گری کی مشق کے لیے زیادہ موزوں نظر آیا ؟ جب سید صاحب نے خود مستقل فوجی تنظیم کا بندوبست کیا تو ان کے رفیقوں میں سے کتنے تھے جن کے لیے سپہ گری کی باقاعدہ مشق کا انتظام کیا گیا تھا ؟ شاہ اسماعیل صاحب سید صاحب کے سپہ سالاروں میں سب سے ممتاز مانے جاتے تھے ۔ انھوں نے کب اور کہاں سپہ گری

کی مشق کی تھی ؟ آخر میں یہ بھی ظاہر ہے کہ سید صاحب نے سات برس نواب کے لشکر میں گزارے ۔ وہ مختلف لڑائیوں میں شریک رہے ، لیکن جس حد تک میں معلوم کرسکا ہوں ، نہ اس کے لشکر میں جنگی فنون کے لیے کوئی تربیت گاہ موجود تھی اور نہ سید صاحب کو کسی تربیت گاہ میں کم یا زیادہ مدت بسر کرنے کا موقع ملا ۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کو وہی جذبۂ خدمتِ دین کشاں کشاں نواب کے لشکر میں لے گیا تھا جس کی بنا پر انجام کار انھوں نے بطور خود فداکاروں کی ایک جماعت مرتب کی . . . یعنی وہ اسلامی حکومت کے احیا کی خاطر جہاد فی سبیل اللہ کا عزم لے کر امیر خاں کے پاس گئے تھے ۔"[۱]

"سید احمد شہید" میں منطق و استدلال سے کام لے کر حقیقی صورتِ حال کو سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے ۔ اس سے سید شہید کی پوری زندگی قارئین کے سامنے آ جاتی ہے اور ان کی شخصیت کے تمام نقوش واضح ہو جاتے ہیں ۔ سید احمد شہید کی چلتی پھرتی اور زندہ و متحرک تصویر کو وہ مکالمے مزید قوت عطا کرتے ہیں جو سید شہید کے ارد گرد موجود مختلف کرداروں کی زبان سے ادا ہوئے اور جنھیں مولانا مہر نے محفوظ کر دیا ہے ۔ ان مکالموں کے ذریعے سید شہید کی زندگی اپنی تمام تر جزئیات و تفصیلات کے ساتھ اس طرح سامنے آ گئی ہے کہ ہم نہ صرف ان کی شخصیت کے ایک ایک پہلو کو بے نقاب پاتے ہیں بلکہ اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں ۔ ان مکالموں نے سید احمد شہید کو حقیقت کا رنگ بھی عطا کر دیا ہے ۔

"سید احمد شہید" میں بعض ایسے نقائص اور معائب بھی ہیں جو اس کو اعلیٰ اور بہترین سوانح قرار دینے میں رکاوٹ بنتے ہیں ۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ یہ نقائص اور عیوب ایسے ہیں جو مصنف کی ذرا سی توجہ سے دور ہو سکتے تھے ۔ مثلاً مولانا غلام رسول مہر نے اپنے قارئین کی وسعتِ معلومات کے خیال سے اکثر اوقات سوانحی تسلسل کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ مثلاً سید شہید کی دہلی میں پہلی مرتبہ آمد اور اکبر آبادی مسجد میں ان کے قیام کا ذکر کرنے

۱- سید احمد شہید ، ص ۸۶ - ۸۷ ۔

کے ساتھ اکبر آبادی مسجد کو موضوع بنا لیا گیا ہے اور اس عمارت کی تفصیلات کے علاوہ اس کے سنہ تعمیر اور وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالی گئی ہے - اسی طرح سید احمد شہید کے وطن سے نکل کر صوبہ سرحد تک پہنچنے کے مختلف مراحل اور منازل کا ذکر کرتے ہوئے بعض اوقات غیر ضروری تفصیلات بیان کی گئی ہیں - مثلاً پیر صبغۃ اللہ شاہ اور ان کے شجرۂ نسب کے بارے میں تفصیلات موضوع سے کاملاً غیر متعلق ہیں - یہ شجرۂ نسب دیکھ کر خیال گزرتا ہے کہ شاید مولانا مہر نے اسے سوانح کا ضروری حصہ تصور کرکے نہیں لکھا بلکہ کچھ لوگوں سے اپنے تعلقات نبھانے کی کوشش کی ہے -

اگرچہ ''سید احمد شہید'' میں اس طرح کے اور بہت سے مقامات بھی آتے ہیں ، اس کے باوجود سوانح سے بظاہر غیر متعلق ان تمام حصوں کو مسترد کرنا بھی درست نہیں ہے اس لیے کہ مولانا مہر نے واقعات کی حقیقی صورت پیش کرنے کے لیے ان بظاہر غیر ضروری تفاصیل سے پس منظر کا کام لیا ہے - غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان حصوں کے بغیر اکثر مقامات پر ابہام پیدا ہو سکتا تھا یا ان تفاصیل کے بغیر سید احمد شہید کے کارنامے کی اصل اہمیت و حیثیت اجاگر نہیں کی جا سکتی تھی - مثلاً مولانا مہر نے امیر خاں کے لشکر میں شمولیت کے اغراض و مقاصد پر بحث کر چکنے کے بعد سید احمد شہید کے اصل منصوبے کی اہمیت واضح کرنے کے لیے اس دور کے ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے اور بالوضاحت بتایا ہے کہ سارا مسلم ہندوستان خواب غفلت کا شکار تھا جبکہ غیر مسلم دیسی و بدیسی قوتیں اپنے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھیں - ایسے میں سید احمد شہید کی نگاہ انتخاب امیر خاں پر پڑی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑی قوت جمع کرلی تھی اور جسے منظم کرکے ہندوستان کی سیاست میں انقلاب آفریں تبدیلی لائی جا سکتی تھی -

اسی طرح ''رزم گاہ بالاکوٹ کا نقشہ'' کے عنوان سے جو کچھ ضبط تحریر میں لایا گیا ہے وہ سرسری نظر میں اصل موضوع سے غیر متعلق ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس جغرافیائی پس منظر کی وضاحت کے بغیر وہ تصویر اپنے صحیح خد و خال کے ساتھ پیش ہی نہیں کی جا سکتی تھی جو رفیقان سید احمد شہید کی جرأت اور شان عزیمت کا حقیقی نقشہ پیش کرتی ہے - اسی جغرافیائی پس منظر میں ہم سید احمد شہید کے ساتھیوں کی شکست کے اسباب کا

تجزیہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور یہی وہ پس منظر ہے جس میں سید احمد شہید کے بارے میں فسانہ غیبوبت کی حقیقت واضح ہوتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود بنیادی اعتراض برقرار رہتا ہے ۔ اکثر واقعات کے بارے میں قارئین یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں کہ اگر وہ کتاب میں شامل نہ ہوتے تو ''سید احمد شہید'' بہت عمدہ سوانح عمری ہوتی ۔ مثلاً سید احمد شہید کے اکثر رفقا کے سوانحی حالات کو بھی اسی سوانح عمری میں قلمبند کر دیا گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان کا سید شہید کی زندگی سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ۔ اس سے صرف کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہوتا ہے ، یا پھر ہماری معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے ۔ غالباً مولانا مہر کے پیش نظر سوانح کے ساتھ ساتھ تحریکِ مجاہدین کی پوری سرگزشت بھی تھی ، جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں :

> "یہ ایک شخصیت کی سیرت نہیں بلکہ ایک نہایت اہم دینی تحریک کی مفصل سرگزشت ہے ۔"[1]

''سید احمد شہید'' میں اس کے علاوہ بھی کچھ فروگزاشتیں ہیں لیکن چونکہ فنِ سوانح نگاری کے اعتبار سے وہ زیادہ نہیں کھٹکتیں لہذا ان کے ذکر کا مناسب موقع تاریخ نگاری کے متعلق باب میں آئے گا ۔ بہر حال ان چند معمولی فروگزاشتوں کے باوجود ''سید احمد شہید'' مشرقی انداز کی کامیاب سوانح عمری ہے ۔ اس میں قارئین کے لیے عبرت و موعظت کے صدہا پہلو موجود ہیں اور اس شخصیت کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے جس نے ادبار اور تاریکیوں کے دور میں اپنے خون سے چراغِ حریت جلاکر مسلمانانِ ہند کو آزادی کی منزل سے روشناس کرنے کی کوشش کی ۔

۳۔ جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ :

جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ متحدہ پنجاب کے آخری وزیر اعظم اور یونینسٹ پارٹی کے راہنما خضر حیات خاں کے والد تھے ۔ خضر حیات ٹوانہ کے ساتھ مولانا مہر کے ایک عرصے سے گہرے تعلقات تھے اور غالباً انہی تعلقات کے باعث مولانا مہر ، جنرل عمر حیات خاں کے سوانحی حالات قلمبند کرنے پر مجبور ہوئے ۔ مجبور اس لیے کہ اول تو یہ موضوع ان کے علمی منصوبے سے

۱۔ سید احمد شہید ، ص ۱۵ ۔

کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ بعض حوالوں سے بالکل مختلف اور متضاد ہے ۔ ظاہر ہے کہ سید احمد شہید اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے شہیدوں پر لکھنے والے مولانا مہر بخوشی ٹوڈی عمر حیات خاں کو اپنا موضوع نہیں بنا سکتے تھے ۔ اس کتاب کے بارے میں مولانا مہر کے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے محمد عالم مختار حق لکھتے ہیں :

''بیشک 'سر جنرل عمر حیات خان ٹوانہ' مہر صاحب کے قلم کی تراوش کا نتیجہ ہے ، مگر کیا کیا جائے بعض اوقات تلخ گھونٹ حلق سے اتارنا ہی پڑتے ہیں ۔ میں نے اپنا نسخہ دستخطوں کے لیے پیش کیا تو مہر صاحب نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا کہ میں اسے اپنی تصنیف تسلیم نہیں کرتا ۔ مگر ان کے نہ تسلیم کرنے سے دنیا کو کس طرح مطمئن کیا جا سکتا ہے ۔''[۱]

مولانا مہر کی ناخوشی کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ ''جنرل سر عمر حیات خان ٹوانہ'' کے بعض ایسے نسخے بھی ملتے ہیں جن پر بحیثیت مصنف کسی کا نام درج نہیں ہے ۔ اور جن نسخوں پر مولانا مہر کا نام درج ہے وہ بھی موعودہ صورت کی صریح خلاف ورزی ہے ۔ اس کے علاوہ اس امر کا یہ بھی بین ثبوت ہے کہ مولانا مہر نے خلافِ وضع ''جنرل سر عمر حیات خان ٹوانہ'' کے دیباچے کے آخر میں اپنا نام درج نہیں کیا ۔ بہر حال صورت کچھ بھی ہو ، اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب مولانا مہر ہی کی تصنیف ہے ، اگرچہ وہ اس نسبت سے ناخوش تھے ۔

سوانح نگاری کے اصول و مبادیات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سوانح نگار صاحبِ سوانح سے اپنے قلبی لگاؤ کے باعث ہی قلم اٹھاتا ہے اور یہی قلبی لگاؤ مردہ و نیم مردہ واقعات کو نئے سرے سے زندہ کرکے موضوع شخصیت کو حیاتِ نو عطا کرتا ہے ۔ گویا زیر بحث سوانح عمری کی قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ صاحبِ تصنیف کو اپنے موضوع سے کوئی قلبی لگاؤ تو درکنار ، معمولی سی دلچسپی بھی نہیں تھی ۔

۱۔ مکتوب محمد عالم مختارِ حق بنام راقم ، مرقومہ ۲۷ دسمبر ۱۹۸۲ء ، غیر مطبوعہ ۔

یہی وجہ ہے کہ ''جنرل سر عمر حیات خان'' بھی کامیاب سوانح عمری بننے کی بجائے تاریخی واقعات کی ایسی کھتونی بن گئی جس کو مولانا مہر سے منسوب کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

''جنرل سر عمر حیات خان ٹوانہ'' کا سب سے بڑا نقص تو یہی ہے کہ یہ تصنیف حد درجہ غیر متناسب ہے۔ اس کی غیر متوازن ترتیب کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کل چار سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے، جبکہ پہلے تقریباً دو سو صفحات محض پس منظر کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ ان دو سو صفحات میں ٹوانہ خاندان کی تفصیلی تاریخ، شمالی پنجاب میں ان کی آمد اور یہاں پر ان کی آبادکاری و حکمرانی کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ پہلے ایک سو اڑتیس صفحے تو ایسے ہیں جن کی بے جواز حیثیت کا اندازہ خود مولانا مہر کو بھی تھا، جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

''اب ہم ملک احمد یار خان ٹوانہ کے جامعِ اوصاف فرزند ملک صاحب خان کے حالات پر پہنچ گئے ہیں، جو ملک عمر حیات خان ٹوانہ کے والد ماجد تھے اور یہیں سے ہماری کتاب کے اصل موضوع کا آغاز ہوتا ہے۔''[1]

اگرچہ جنرل عمر حیات خان ٹوانہ نے کسی نہ کسی طور میثاقِ لکھنؤ کی مخالفت کی اور اپنے بعض بیانات میں جداگانہ انتخاب کے مسلم مطالبے کی تائید و حمایت کی اس کے باوجود زندگی بھر ان کا طرزِ عمل سرکار پرستانہ رہا۔ وہ پنجاب کے ان بے شمار زمینداروں میں سے ایک تھے جنھوں نے اپنی اپنی جاگیروں اور معاشرتی مناصب کے تحفظ کے لیے سرکار کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ دیگر جاگیرداروں میں اگر جنرل صاحب ممتاز تھے تو صرف اس وجہ سے کہ وہ فوج میں اعلیٰ عہدوں تک پہنچے، ''سر'' کا خطاب حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، شاہی لقیب کے اہم منصب تک رسائی حاصل کی، شہنشاہِ انگلستان کے اے۔ ڈی۔ سی بنے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام کارناموں کے باوجود عمر حیات خان ٹوانہ کو سید شہید سے کیا نسبت ہو سکتی ہے اور اسی فرق نے ''جنرل سر عمر حیات خان ٹوانہ'' کو اعلیٰ درجے کی سوانح عمری نہیں بننے دیا۔

۱۔ جنرل سر عمر حیات خان ٹوانہ، ص ۱۳۸، مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس، لاہور۔

سمجھا جاتا ہے کہ سوانح عمری کی دلچسپی کے لیے کسی بڑی دینی اور مذہبی شخصیت کا ہونا ضروری نہیں ، ایک عام آدمی کی سوانح حیات بھی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے لائقِ توجہ ہو سکتی ہے ، بشرطیکہ سوانح حیات میں وہ پہلو موجود ہوں جو دلچسپی کا سبب بن سکیں ۔ لیکن سر جنرل عمر حیات خاں کی لائف میں یہ پہلو بھی مفقود نظر آتا ہے ۔ عین ممکن ہے کہ مولانا مہر سوانح نگاری سے متعلق اپنے عمومی تصورات و نظریات سے دستکش ہو کر اس سوانح میں عبرت و موعظت کے پہلوؤں کی تلاش کی بجائے ایسے ہی عناصر کی طرف توجہ کرتے لیکن خضر حیات خاں سے شخصی تعلقات نے غالباً یہ راستہ بھی بند کر دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مہر نے کتاب کو عمر حیات خاں کی تصاویر سے سجانے کا اہتمام کیا ۔ لیکن ستم یہ کہ ان تصاویر میں بھی جنرل عمر حیات خاں کہیں گھوڑوں کی مالش کرتے نظر آتے ہیں ، کہیں ان کے ہاتھ پر بہری بیٹھی ہے ، کہیں وہ شطرنج کھیل رہے ہیں اور کسی تصویر میں انگلستان میں منعقد ہونے والی کتّوں کی دوڑ میں جیتنے والی اپنی کتیا کی زنجیر پکڑے کھڑے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے واقعات اور اس قسم کی تصاویر میں نہ تو دلکشی اور دلچسپی کا کوئی پہلو موجود ہے اور نہ ہی عبرت و موعظت کا ۔ اور یہی اس سوانح عمری کی سب سے بڑی کمزوری ہے ۔

یہ کتاب لکھتے ہوئے مولانا غلام رسول مہر کو غالباً ایک اور المناک صورتِ حال سے بھی دوچار ہونا پڑا ۔ ہم جانتے ہیں کہ مولانا مہر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے ؟ اس جنگ میں حصہ لینے والے لوگ مولانا مہر کے نزدیک قومی زعما میں شامل ہیں لیکن مولانا مہر کو اپنے معتقدات و خیالات کے برعکس اس کتاب میں جنگِ آزادی کو غدر لکھنا پڑا ، جیسا کہ وہ ایک مقام پر ملک صاحب خاں ٹوانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''انہیں غدر کے متعلق کوئی علم نہ تھا ۔ فوری طلبی کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ پھر کسی نے ہتھیاروں کے متعلق شکایت کر دی ہے ۔''[1]

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مولانا مہر کو جنگِ آزادی میں انگریزوں کے

۱۔ جنرل سر عمر حیات ٹوانہ ، ص ۱۶۰ ۔

ساتھ ٹوانہ خاندان کے تعاون کے لیے ایسے جوازات تلاش کرنا پڑے جو قومی نقطۂ نگاہ سے بالکل لایعنی اور خود غرضانہ ٹھہرتے ہیں ۔ مثلاً مولانا مہر ٹوانہ خاندان کے طرز عمل کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پنجاب کے اکثر رئیسوں اور خود ٹوانوں کے سامنے ایک بہت بڑا سوال یہ تھا کہ آیا فوج میں مدراسیوں اور پوربیوں کی برتری گوارا کرلیں ؟ اگر وہ اس موقع پر حکومت کا ساتھ نہ دیتے تو یقیناً فوج میں ان کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہتی ۔ ایک قابلِ غور نکتہ یہ تھا کہ سکھ ، جن کے ہاتھ سے پنجاب کی حکومت چھنی تھی ، اس موقع پر اجتماعی حیثیت میں حکومت کے ساتھ ہوگئے تھے اور اہلِ پنجاب کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ مبادا جنگ کے بعد وہی فوجی امتیازات کے مالک بن جائیں اور اہلِ پنجاب ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے تک جن آفتوں اور پریشانیوں کا ہدف بنے رہے تھے، وہ انہی شکل میں دوبارہ ان پر مسلط ہو جائیں ۔ یہ حالات و اسباب تھے جن کی بنا پر ٹوانوں نے آگے بڑھ کر حکومت کی اعانت کی ۔"[1]

غور فرمائیے کہ ٹوانوں کے مخصوص طرزِ عمل کے لیے پنجاب کے خاص حالات کا عذر کیا معنی رکھتا ہے ؟ یہ حالات تو ہر جگہ موجود تھے۔ فوج میں گنجائش اور خصوصی امتیازات کی خواہش کس علاقے کے لوگوں میں نہ ہوگی ؟ ظاہر ہے کہ قومی مصالح پر ذاتی مصلحتوں کو ترجیح دینے کی یہ روش مولانا مہر کے نزدیک بھی پسندیدہ قرار نہیں پا سکتی تھی ۔ انھوں نے صرف بات بنانے کے لیے یہ عذر پیش کیا ہے ۔

عالمی جنگیں تو خیر ایسی لڑائیاں تھیں جن میں ہندوستان کی مختلف قوموں کی اکثریت نے مختلف مصالح کے پیش نظر برطانوی حکومت کا ساتھ دیا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مولانا مہر نے اپنے عمومی خیالات و افکار کے برعکس افغانستان کے امان اللہ خاں کے خلاف برطانوی افواج میں عمر حیات خان کی شمولیت کو بھی قابلِ فخر کارنامے کے طور پر پیش کیا ۔ مثلاً مولانا مہر اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱- جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ ، ص ۱۵۹ -

"اس لڑائی میں بھی ملک عمر حیات خان نے صرف اپنی خدمات پیش نہ کیں بلکہ ان کے اکلوتے فرزند نے بھی اس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور جب تک لڑائی جاری رہی وہ خیبر کے محاذ پر ٹھہرے رہے۔"[1]

حیران کن بات یہ ہے کہ یہ الفاظ اُس قلم سے نکلے ہیں جو ایک طویل مدت تک افغانستان میں پائیدار حکومت کے قیام کی بنا پر روزنامہ "انقلاب" کے استقلال نمبر نکالتا رہا۔

ان تمام امور کے پیشِ نظر یہ کہنا پڑے گا کہ "جنرل سر عمر حیات خان ٹوانہ" مولانا مہر کی انتہائی کمزور سوانح عمری ہے۔ یہ ان کے تصورِ سوانح عمری سے بھی متصادم ہے اور ان کے افکار و خیالات سے بھی۔ اس میں نہ تو عبرت و موعظت کا وہ پہلو موجود ہے جو قوموں کو زوال و نکبت سے بام عروج تک پہنچانے میں مہمیز کا کام دیتا ہے اور نہ وہ دلچسپی جو کسی سوانح حیات کو قابلِ ذکر بناتی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی نقطۂ نظر سے اس میں وہ تمام محاسن و معائب پائے جاتے ہیں جو مولانا مہر کی تاریخ نگاری اور سوانح نویسی میں عام طور پر ملتے ہیں۔

۴۔ جوزیفین :

مولانا مہر نے اپنی اس تصنیف میں نپولین بونا پارٹ کی پہلی بیوی جوزیفین کے حالاتِ زندگی پیش کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوع ایسا نہیں ہے جسے مولانا مہر کے علمی منصوبے کا حصہ تصور کیا جا سکے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا سبب تھا جس کی بنا پر مولانا مہر نے جوزیفین کے سوانحی حالات قلمبند کیے؟ اس سلسلے میں وہ خود رقم طراز ہیں:

"۱۹۴۷ء میں لاہور خوفناک فسادات کا مرکز بن گیا تو اخبار چند روز کے لیے بند کر دینا پڑا۔ ہنگاموں کا یہ حال تھا کہ گھر سے باہر نکلنا بھی مشکل ہو گیا۔ اس زمانے میں خیال آیا کہ جو تصانیف مدت سے کم فرصتی کے باعث نامکمل ہیں انھیں مکمل کر لینا چاہیے۔ ایک دو روز میں مجھے محسوس ہوا کہ سارا وقت ایک ہی قسم کے مشاغل

۱۔ جنرل سر عمر حیات خان ٹوانہ، ص ۳۱۱۔

میں گزارنے کے لیے دماغ سازگار نہیں ۔ ''تبدیلِ ذائقہ'' کے لیے کسی ہلکے پھلکے موضوع کی تلاش ہوئی ۔ نپولین بونا پارٹ کے ساتھ مجھے ابتدا ہی سے خاص شیفتگی رہی ہے ، لیکن اردو اور انگریزی میں اس کے کئی سوانح موجود تھے اور اس موضوع پر نئی کتاب لکھنے میں کوئی لطف نہ تھا ۔ بیٹھے بیٹھے اس کی پہلی بیوی جوزیفین کا خیال آیا جس کے متعلق میرے علم کے مطابق اردو میں کوئی کتاب موجود نہ تھی ۔ اس پر لکھنا شروع کر دیا ۔''[۱]

گویا ''جوزیفین'' محض تبدیلیِ ذائقہ اور تفریحِ طبع کے لیے لکھی گئی ۔ یہی سبب ہے کہ اُس پر مولانا مہر نے اتنی محنت نہیں کی جتنی کہ دوسری سوانحی کتب کی تکمیل میں انھیں کرنا پڑی ۔ اس کے باوجود اس مختصر سی تصنیف کے حوالے سے جوزیفین کی زندگی کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے اور جوزیفین کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے ۔ اور ہم مارتی نیق کے جزیرے میں پیدا ہونے اور مالمائزاں میں انتقال کرنے والی اس عورت سے مکمل واقفیت حاصل کر لیتے ہیں ، جس نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی اور پھر تمام دنیوی اعزازات حاصل کرنے کے بعد انتہائی کس مپرسی کے عالم میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئی ۔ گویا مولانا مہر کی اس موضوع شخصیت کی زندگی میں دیدۂ بینا کے لیے عبرت و موعظت کا تمام سامان موجود ہے۔

جوزیفین کی دوسری نمایاں خوبی اس سوانح عمری میں موجود دلچسپی کے عناصر کے باعث ہے ۔ اول تا آخر ہر واقعے میں قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے ۔ سوانح کے اتار چڑھاؤ اور مختلف ڈرامائی واقعات کے علاوہ مولانا مہر کے اسلوب بیان نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا ہے ۔

سوانحی تصنیف کے اعتبار سے جوزیفین میں چند معائب و نقائص صاف طور پر عیاں ہیں ۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ سوانح حیات تو جوزیفین کی ہے لیکن اس تصنیف میں ہر جگہ نپولین چھایا ہوا نظر آتا ہے ۔ یہ درست ہے کہ نپولین ، جوزیفین کا شوہر اور فرانس کا بادشاہ تھا اور اس حوالے سے اس کا ذکر لازمی بھی ہے ، لیکن نپولین سے مولانا مہر کی شیفتگی نے اکثر مقامات پر

۱۔ دیباچہ جوزیفین ، از غلام رسول مہر ، صفحہ ج ۔

بے ضرورت بھی نپولین کے کارناموں کا ذکر ضروری سمجھا ہے ۔ خاص طور پر اس کے جنگی کارنامے اور مختلف لڑائیوں میں اس کی کامیابیاں جوزیفین کے موضوع سے خارج ہیں ۔ بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے مولانا مہر نپولین کو سامنے لانا چاہتے ہیں ۔ اس کا ثبوت اُس وقت بھی ملتا ہے جب مالامازاں میں جوزیفین کے انتقال کے بعد بھی سوانح عمری ختم نہیں ہوتی ، بلکہ پچیس صفحات پر مشتمل مزید چار ابواب شاملِ کتاب نظر آتے ہیں ۔ جوزیفین کا غیر متوازن پن اس وقت بھی سامنے آتا ہے جب مختلف واقعات کے پس منظر میں مولانا مہر اپنے تبصرے شامل کر دیتے ہیں ۔ یہ تبصرے اور بیانات اپنی افادیت کے اعتبار سے کتنے ہی اہم ہوں ، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ سوانح عمری کی نامیاتی وحدت کو مجروح کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے سوانحی تسلسل بھی برقرار نہیں رہتا ۔ مولانا مہر نے جوزیفین کی یہ خامی غالباً خود بھی محسوس کی تھی ۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں :

”چونکہ مقصودِ تحریر یہ تھا کہ دماغ کے لیے محض تبدیلِ موضوع سے ایک گونہ تفریح و تسکین کا سامان بہم پہنچ جائے ، اس لیے میں نے فکر و قلم کو حد بندی اور احتیاط کوشی کی زنجیریں پہنانی گوارا نہ کیں ۔ جو کچھ خیال میں آتا گیا ، لکھتا گیا ۔“[۱]

دراصل مقصودِ تحریر ہی نے جوزیفین کو اعلیٰ پائے کی سوانح عمری نہیں بننے دیا ۔ بلکہ سوانح عمری ہی کیا ، اس کے مواد کے اعتبار سے اسے کسی بھی مروج صنفِ ادب کے دائرے میں شامل کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے ۔ مولانا مہر بھی جوزیفین کے اس پہلو سے واقف تھے ۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں :

”اسے نہ تاریخ کہہ سکتا ہوں ، نہ سوانح حیات اور نہ ناول ۔ تینوں کے اختلاط و آمیزش سے ایک چیز مرتب ہو گئی ہے جو ان معنوں میں تاریخ ہے کہ اس کا ایک ایک واقعہ مستند تاریخی واقعہ ہے ۔ ان معنوں میں سوانح کی صف میں آتی ہے کہ ایک شخصیت کے حالات کا مرقع ہے اور ان معنوں میں ناول ہے کہ اس میں ناول کی بیشتر خصوصیات موجود ہیں ۔“[۲]

۱۔ دیباچہ جوزیفین ، صفحہ د ۔

۲۔ دیباچہ جوزیفین ، صفحہ د ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "جوزیفین" میں مستند تاریخی واقعات کو پیش کیا گیا ہے ۔ پھر یہ ایک ایسی کہانی بھی ہے جس میں انسانی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس میں پلاٹ ، کردار ، مکالمہ اور معاشرت کی عکاسی غرضیکہ ناول کے جملہ فنی عناصر موجود ہیں ۔ پھر یہ ایک شخصیت کا مرقع بھی ہے اور اسی بنیاد پر اسے تاریخ ، ناول اور سوانح کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس کے غیر متوازن پن نے اس کی حیثیت و اہمیت کو برے طور پر متاثر کیا ہے ۔

مولانا مہر کے سوانحی خاکے

باقاعدہ سوانح عمریوں کے علاوہ مولانا مہر کی کچھ اور تصانیف بھی ہیں جن میں مختلف شخصیات کے سوانحی حالات قلمبند کیے گئے ہیں ۔ لیکن چونکہ یہ حالات یا تو بہت مختصر ہیں یا پھر ان میں ان عظیم شخصیات کی پوری زندگی کو موضوع نہیں بنایا گیا ، لہذا انھیں باقاعدہ سوانح عمریاں تصور کرنے کی بجائے سوانحی خاکے قرار دینا زیادہ مناسب ہے ، اور اسی حوالے سے ان کا تجزیہ کرنا چاہیے ۔

سوانحی خاکوں میں سب سے اہم "اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد" اور "سیرت امام ابن تیمیہ" ہے ۔ اس کے علاوہ جماعت مجاہدین اور سرگزشت مجاہدین میں بھی تحریک سید احمد شہید سے متعلق اہم علمائے کرام کے سوانحی خاکے پیش کیے گئے ہیں ۔ اگرچہ بنیادی طور پر یہ تاریخ کی کتابیں ہیں اور ان میں تحریک مجاہدین کی گم گشتہ کڑیوں کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے ، اس کے باوجود ان کتب میں مذکورہ اشخاص کے سوانحی پہلوؤں کے حوالے سے بھی ان کتابوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے ۔

"اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد" کو بنیادی طور پر جنگ آزادی ۱۸۵۷ع کا تتمہ سمجھنا چاہیے ، جیسا کہ خود مولانا مہر لکھتے ہیں :

> "۱۸۵۷ع کی ترتیب و تسوید شروع کی تھی تو اس کتاب کا خواب و خیال بھی نہ تھا جسے اب پیش کر رہا ہوں . . . نصف سے زیادہ کتاب مرتب ہو چکی تو احساس ہوا کہ اس میں افراد و رجال کے سیر و سوانح کو شامل کرنا سراسر تکلف ہوگا ، اس لیے کہ اصل کتاب

اپنے موضوع اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے تاریخی ہے اور سیر و سوانح کا دائرہ بالکل جدا گانہ ہے۔ . . بالآخر فیصلہ کرنا پڑا کہ افراد و رجال پر الگ کتاب لکھی جائے۔''۱

''اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد'' میں چالیس سے زائد افراد و رجال کی زندگیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ سب شخصیات وہ ہیں جو بلا تفریقِ مذہب جنگ آزادی میں شریک ہوئیں اور جنھوں نے ہر طرح کی قربانیاں پیش کرکے وطن عزیز کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ ان شخصیات میں حضرت محل، رانی لکشمی بائی، عظیم اللہ خاں، سید احمد اللہ شاہ مدراسی، ڈھونڈو پنت نانا، جنرل بخت خاں، شہزادہ فیروز شاہ، مولانا فضل حق خیر آبادی اور تانتیا ٹوپے وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض شخصیات کے حالات کے لیے چالیس چالیس صفحات بھی وقف کیے گئے ہیں، جبکہ بعض ایسے افراد و رجال بھی ہیں جن کے لیے نصف صفحہ بھی وقف نہیں، دراصل مولانا مہر کو جس شخصیت کے بارے میں جو معلومات حاصل ہو سکیں وہ پیش کر دی گئیں۔ ویسے یہ کام کچھ آسان بھی نہیں تھا، اس لیے کہ بہت سی شخصیات ایسی بھی ہیں جن کا نام صرف جنگِ آزادی کے سلسلے ہی میں سننے میں آیا۔ اس سے پہلے یا بعد ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملتی۔ ایسے میں سوانح نگار کیا کر سکتا ہے؟

''اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد'' میں بعض بہت اہم نام نظر نہیں آتے۔ مثلاً ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا مرکزی کردار بہادر شاہ ظفر وغیرہ۔ لیکن اس سلسلے میں مولانا مہر نے دیباچے میں خود ہی وضاحت کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بعض اہم شخصیتیں اس تذکرے میں دانستہ شامل نہ کی گئیں۔ مثلاً بہادر شاہ ظفر یا زینت محل یا بعض دوسرے اکابر۔ وہ اس لیے کہ ان کے زیادہ تر حالات تذکرۂ دہلی کے ضمن میں بیان ہو چکے ہیں اور تکرار مناسب نہ تھی۔''۲

۱۔ دیباچہ اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد، از مولانا مہر، ص ۷۔
۲۔ دیباچہ اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد، ص ۹۔

اسی طرح ''اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد'' میں بعض ایسے نام بھی نہیں ملتے جو اس موضوع پر لکھی گئی دیگر متداول کتب میں نظر آتے ہیں ۔ مثلاً مولانا محمد جعفر تھانیسری ، مولانا احمد اللہ صادق پوری اور منیر شکوہ آبادی وغیرہ ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا مہر نے اس کتاب میں صرف ان شخصیات کو شامل کیا ہے جو جنگِ آزادی میں شریک ہونے کے سلسلے میں انگریزی عتاب کا نشانہ بنی تھیں ۔

''اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہایت اختصار کے ساتھ مجاہدین کے حالاتِ زندگی پیش کر دیے گئے ہیں ۔ لیکن یہی اختصار اس کی سب سے بڑی خامی بھی ہے ، کیونکہ بعض جگہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ خاکے نامکمل لگتے ہیں ۔ بہت کم شخصیات ایسی ہیں ، جن کی زندگی کے تمام اہم واقعات کو حیطۂ تحریر میں لایا گیا ہے ، ورنہ زیادہ تر زندگی کے صرف اسی پہلو کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو عزم و عزیمت اور ہمت و حوصلے سے تعلق رکھتا ہے یا پھر ان واقعات کو بیان کیا گیا ہے جو جنگِ آزادی سے متعلق ہیں ۔ اس کا اندازہ حضرت محل کے بارے میں مولانا مہر کے اس بیان سے ہوتا ہے :

> ''نواب حضرت محل کے ابتدائی حالات کی نسبت اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ ان کا نام ''امراؤ'' تھا ۔ ۱۳ رجب ۱۲۶۱ھ ، (۱۵ دسمبر ۱۸۴۸ع) کو حضرت علی کے میلاد کی مجلس میں واجد علی شاہ نے کہ ابھی ولی عہد تھے ، امراؤ کو دیکھا اور داخلِ محل کر لیا ۔''[1]

لیکن تشنگی کے احساس کے باوجود ''اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد'' کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ اس لیے کہ ایک صدی قبل کے واقعات کی گرد میں دبے ہوئے ان چہروں کو متعارف کرانے کا کام کم اہم نہیں ہے جن کی طرف کسی نے توجہ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی ۔ اس کتاب کے توسط سے سب مجاہدین نہ سہی ، اس کے باوجود نمایاں افراد و رجال اپنی زندگی کے اہم واقعات کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتے ہیں اور ہم ان چہروں سے تعارف حاصل کر لیتے ہیں جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر قوم کو زندگی دینے کی سعی کی ۔

۱۔ اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد ، ص ۲۱ ۔

'جماعت مجاہدین' اور 'سرگزشت مجاہدین' میں کچھ شخصیات کے سوانحی خاکے بھی آ گئے ہیں۔ بلکہ 'جماعت مجاہدین' کے حصہ دوئم کو تو سید احمد شہید کے نامور رفقا کے سیر و سوانح ہی کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ 'جماعت مجاہدین' اور 'سرگزشت مجاہدین' میں پیش کردہ سوانحی خاکوں کی خوبیاں اور خامیاں تقریباً وہی ہیں جن کا ذکر ''اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد'' کے سوانحی خاکوں کے ضمن میں آ چکا ہے۔

'سیرت امام ابن تیمیہ' مولانا مہر کی ایک اہم سوانحی تصنیف ہے۔ لیکن اسے بھی باقاعدہ سوانح عمری کی بجائے خاکہ ہی کہنا چاہیے، اس لیے کہ امام ابن تیمیہ کی شخصیت اتنی عظیم تھی اور ان کی زندگی اتنی معمولی جزئیات و تفصیلات کے ساتھ محققین کے سامنے ہے کہ اس موضوع پر کئی جلدیں تصنیف کی جا سکتی ہیں، جبکہ 'سیرت امام ابن تیمیہ' میں کل ساٹھ صفحات میں حضرت امام کی زندگی کے حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس اختصار کی وجہ سے جہاں یہ سہولت پیدا ہوئی کہ تفصیلات و جزئیات میں گئے بغیر عام قاری امام ابن تیمیہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ ہو سکتا ہے، وہیں اس میں یہ خامی بھی پیدا ہو گئی ہے کہ اس عظیم شخصیت کے اعمال حسنہ سے فیض یاب ہونے کے خواہاں شخص کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ''سیرت امام ابن تیمیہ'' کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت موجود تھی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ کتاب مستقل تصنیف کے طور پر لکھنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ یہ سوانحی مضمون تو ''کتاب الوسیلہ'' کے ترجمے میں مقدمے کی حیثیت سے شامل کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت امام کے سوانحی حالات مقدمے کی بساط سے کچھ زیادہ ہو گئے تھے لہذا اس سوانحی مضمون کو کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا اور یہ مولانا مہر کی پہلی تصنیف قرار پائی۔ اس کی ترتیب و اشاعت کے ضمن میں خود مولانا مہر لکھتے ہیں:

> "لکھنا شروع کیا تھا تو پیش نظر محض مقدمہ تھا لیکن تحریر و تسوید کا سلسلہ ختم ہوا تو یہ چیز ایک مقدمے کی تنگنائے میں سما جانے کے قابل نظر نہ آئی، لہذا علیحدہ اور مستقل رسالے کی صورت میں چھپ رہی ہے۔"[1]

۱۔ مقدمہ سیرت امام ابن تیمیہ، ص ۹

'سیرت امام ابن تیمیہ' مولانا مہر کے دوسرے سوانحی خاکوں سے اس لیے مختلف ہے کہ یہ بھی دیگر سوانح عمریوں کی طرح مولانا مہر کے لیے عقیدت و محبت کا موضوع تھا اور سید احمد شہید اور غالب کی طرح سیرت امام ابن تیمیہ کے صفحات میں بھی مولانا مہر کے پارہ ہائے دل بکھرے نظر آتے ہیں۔ اپنی محبت و عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں:

"دینی علوم کے مطالعے کی ابتدا ہی میں مجھے شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہ کے وجود گرامی کے ساتھ ایک خاص عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ عقیدت تحقیق کا نتیجہ نہ تھی بلکہ محض سماعت پر موقوف تھی، یعنی میری تشنہ' معارفِ کتاب و سنت آنکھوں سے امام ممدوح کی کوئی کتاب نہ گزری تھی۔ بلکہ چند خاص اور معتمد علیہ بزرگوں کی زبان سے تعریفی الفاظ سن کر مسحور ہو گیا تھا۔"[1]

اسی عقیدت و محبت نے سیرت امام ابن تیمیہ کے لیے وہ اسلوب ایجاد کیا ہے جو شبلی اور ابو الکلام آزاد کے علمی خانوادے سے تعلق رکھنے والے مولانا مہر کی تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے اور اس شاعرانہ لیکن منطقی و استدلالی اسلوبِ بیان نے 'سیرت امام ابن تیمیہ' کی دلکشی اور دلفریبی میں یقیناً بہت زیادہ اضافہ کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

۱۔ مقدمہ سیرت امام ابن تیمیہ، ص ۵۔

پانچواں باب

مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مورخ

تاریخ کیا ہے ؟

مولانا مہر اپنی سوانحی و تحقیقی کتب اور اپنے انداز صحافت کے اعتبار سے بھی مورخین میں شمار کیے جا سکتے ہیں لیکن ان کی بعض ایسی کتابیں بھی ہیں جو باقاعدہ تاریخ نگاری کی ذیل میں آتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مہر کی نگارشات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مورخ کی حیثیت سے بھی ان کے کام کا جائزہ لیا جانا چاہیے ۔ لیکن مولانا مہر کی تاریخ نویسی کے جائزے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ خود تاریخ کیا ہے اور اردو میں تاریخ نگاری کی کیا روایت رہی ہے ؟

آج تک مختلف مورخوں نے تاریخ کی جو بھی تعریفیں کی ہیں اگر ان کا محض سرسری خاکہ بھی پیش کیا جائے تو بھی کئی دفتر درکار ہوں گے ، البتہ اجمالی طور پر اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ جہاں بعض لوگ تاریخ کو عاقلوں کی حماقتوں کا ذکر قرار دیتے ہیں وہیں بعض مورخوں کے نزدیک تاریخ ماضی کے واقعات کے مستند ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ تاریخ زمین پر انسان کی سرگزشت ہے ، جبکہ تاریخ کے بارے میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ تاریخ عام لوگوں کی بجائے صرف خواص کے کارناموں کو بیان کرتی ہے ۔ لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ یا اسی طرح کی دوسری باتیں تاریخ کے بارے میں جزوی صداقتوں کو پیش کرتی ہیں اور تاریخ کی جامع و مانع تعریف کرنے سے قاصر ہیں ۔ البتہ اگر تاریخ کے بارے میں پیش کیے گئے جملہ

بیانات کو سامنے رکھا جائے تو ان میں موجود جزئی صداقتوں کے پس منظر میں تاریخ کی ایک قابلِ قبول اور زیادہ قرین قیاس تعریف ضرور سامنے آتی ہے اور ہم مختصر طور کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ نسلِ انسانی کے اُن کارناموں کا مستند ریکارڈ ہے جو انسانی تہذیب و معاشرت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رویوں میں تبدیلی اور ارتقاء کا سبب بنے اور جن کی بدولت تاریخ کے قارئین ماضی کے نقوش کو پیش نظر رکھتے ہوئے حال و مستقبل میں پیش آنے والے نشیب و فراز سے آگہی حاصل کر سکتے ہیں ۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ مندرجہ بالا بیان میں تین چار چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں ۔ اول انسانی زندگی کے مستند ترین کارنامے ، دوم وہ کارنامے جو کسی تبدیلی اور ارتقاء کا سبب بنے ، سوم وہ کارنامے جو ماضی ، حال اور مستقبل کے بارے میں بصیرت افروز ہوں ۔ اول الذکر دو نکات کا تعلق تاریخ کی ماہیت سے ہے یعنی ان سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ تاریخ میں پیش کردہ واقعات کا انسانی زندگی سے متعلق ہونا ضروری ہے ۔ البتہ یہ پابندی نہیں کہ وہ واقعات وسیع انسانی زندگی کی کس خاص جہت کی تفصیل پیش کرتے ہیں ۔ یعنی اس نقطۂ نظر سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ تاریخ ہماری زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے ۔ اس میں وہ واقعات بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا تعلق سیاست اور امور مملکت سے ہے اور وہ واقعات بھی جو ہماری مذہبی ، تہذیبی ، معاشرتی اور ثقافتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ تاریخ میں ہماری علمی اور سائنسی ترقیوں سے متعلق واقعات بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان تمام واقعات کے سلسلے میں ایک شرط بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ یہ واقعات ماضی کے مستند ترین ریکارڈ کا درجہ رکھتے ہوں ، یعنی اول تو واقعات کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ معلوم حوالے اور شہادتیں اس پر مزید اضافہ نہ کرسکیں ، دوم پیش کردہ واقعات کو منقول و معقول یا روایت و درایت کے اصولوں کی روشنی میں چھان پھٹک کر ان کی صحت کا اندازہ کر لیا جائے اور اس طرح جو رائے قائم کی جائے وہ زیادہ سے زیادہ قرین حقیقت ہو ۔ پیش کردہ واقعات سے رائے قائم کرتے اور نتائج نکالتے ہوئے مصلحتوں کی بجائے حقائق کا سامنا کرنا بھی ضروری ہے ورنہ تاریخ تاریخ نہ رہے گی ، پروپیگنڈا بن جائے گی ۔

تاریخ کی ماہیت کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ تاریخ کا موضوع انسانی زندگی کے صرف وہی واقعات بننے چاہئیں جو کسی ارتقا یا تبدیلی کا موجب بنے ہوں۔ غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ عوام تو عوام خواص کی زندگی میں بھی اتنے واقعات پیش آتے ہیں کہ ان کو محفوظ رکھنا مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ بالفرض محال اگر یہ ممکن بھی ہو تو بھی لاحاصل ہے۔ اس لیے کہ ان سب واقعات کا بیان، جو کسی خاص شخص کی زندگی میں پیش آئے، قارئین کے لیے بصیرت افروز نہیں ہو سکتا۔ گویا اگر اس طرح کے دفاتر جمع بھی کر لیے جائیں تب بھی بیکار ہوں گے۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مورخ کو صرف انھی واقعات کا احاطہ کرنا چاہیے جو کسی تبدیلی کا موجب بنے ہوں۔ مثلاً سمندر کے راستے یورپ سے ہندوستان آنا کوئی بڑا اور نادر واقعہ نہیں۔ ہزاروں لوگ یہ سفر کرتے ہیں لیکن واسکوڈی گاما کا سفر ہندوستان ایک بڑا واقعہ ضرور ہے کہ اس سفر کے نتیجے میں وہ صورت حال پیدا ہوئی جس میں غلامی کا طوق اہلِ ہند کا مقدر بن گیا۔ اس سفر کی یہی اہمیت ہے جس کے باعث ایک مورخ کے لیے اسے نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔

تیسری اور آخری بات کا تعلق تاریخ کے جواز سے ہے، یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ ماضی کے مردہ واقعات کا بیکار پلندہ نہیں بلکہ یہ وہ منارۂ نور ہے جو ماضی میں ہمارے اسلاف کے بیش بہا تجربوں نے جنم دیا ہے اور جس کی روشنی میں ہم حال اور مستقبل میں اپنی راہِ عمل کا تعین کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ آیا انسان تاریخ سے کوئی سبق سیکھتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ ہماری بصیرت میں اضافے کا سبب ضرور بنتی ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے یہ مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ زوالِ بغداد کے بارے میں مورخ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ واقعہ اس دور میں پیش آیا جب مسلمان قومی و ملی مفادات پر ذاتی سود و زیاں کو ترجیح دینے لگے تھے اور اس معاملے میں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ بغداد کا ہر دسواں آدمی مخالف قوتوں کا ایجنٹ بن گیا تھا۔ اس کے علاوہ فرقہ بندی اور قبائلی عصبیت نے بھی مسلمانوں کی تباہی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ مورخ ہمیں بتاتا ہے کہ زوالِ بغداد کے اہم ترین اسباب میں یہ سبب بھی شامل تھا کہ

قصرِ خلافت میں فروکش ہونے والے اپنے واجبات و فرائض سے نہ صرف غافل تھے بلکہ انھیں اپنی حدود کا علم بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ مورخ کی پیش کردہ اس تصویر سے قاری جان سکتا ہے کہ مفاد پرستی ، غداری ، فرقہ بندی ، قبائل پرستی اور نااہلی کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں اور اگر یہ بھی اسی راستے پر گامزن ہونے تو خود ان کے بارے میں بھی تاریخ کا فیصلہ کیا ہوگا؟ گویا اس طرح تاریخ بھی ان علوم کے دائرے میں شامل ہو جاتی ہے جو جمع و تفریق کے ذریعے سے تو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے لیکن انسانی بصیرت میں ایسی وسعت ضرور پیدا کرتے ہیں جس کے باعث انسان ذرۂ نا چیز ہو کر بھی ستاروں کو زیر قدم لانے میں کامیاب ہوا ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اجتماعی زندگی میں تاریخ کی وہی اہمیت ہے جو انفرادی زندگی میں انسانی حافظے کی ہوتی ہے۔ جس طرح حافظہ افراد کے تمام تر اعمال کا ضامن اور اس کی تمام تر ترقیوں کا سبب ہے اسی طرح تاریخ اقوام کی تمام تر ترقیوں کی ذمہ دار ہے۔ مثلاً اگر مورخ اس تجربے کو محفوظ نہ کر لیتا جس کے توسط سے انسان نے پہلی بار غبارے کی مدد سے ہوا میں مختصر سی پرواز کی تھی تو آج انسان ان کامیابیوں سے بھی محروم رہتا جو اسے خلاؤں اور فضاؤں کی لامحدود وسعتوں میں اڑائے پھرتی ہیں۔ تاریخ ہی بتاتی ہے کہ گزشتہ زمانوں میں انسان کس حد تک قدم آگے بڑھا چکا تھا اور اس علم کی بنیاد پر آنے والی نسلیں ، ترقیوں اور ایجادات کے میدان میں قدم آگے بڑھانے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ گویا اس طرح تاریخ کی افادیت مسلم ہو جاتی ہے اور ماضی کے واقعات کا بیان یا مطالعہ ضیاعِ وقت نہیں رہتا۔

تاریخ کی تعریف متعین کر لینے کے بعد اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ آخر مورخ کو واقعات کی پیش کش کس انداز میں کرنی چاہیے؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ مختلف تاریخوں میں واقعات کی پیشکش کے بارے میں حد سے زیادہ تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد اُس وقت مزید کھٹکتا ہے جب ایک ہی عہد کے بارے میں دو مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے مورخ ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد تصویر پیش کرتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ مورخ صحیح طور پر اپنے واجبات و فرائض ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مختلف واقعات کے بطن

سے نتائج اخذ کرنے کی بجائے پہلے سے طے کیے گئے نتائج کو درست ثابت کرنے کے لیے واقعات تلاش کرتے ہیں اور اس طرح مختلف تعصبات کا شکار ہو کر جو تصویر پیش کرتے ہیں ، اکثر اوقات اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ تمام وقائع نویسوں کے ہاں یہی انداز پایا جاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ وقائع نویسوں کی تاریخیں ، تاریخ کم اور قصائد کا ناپاک دفتر زیادہ قرار پاتی ہیں - دراصل مورخ کو تاریخ لکھتے ہوئے بالکل غیر جانبدار ہونا چاہیے - تاریخ نویسی کو اس لیے غیر شخصی فن قرار دیا جاتا ہے کہ مورخ واقعات میں اپنے جذبات و تعصبات کے باعث ہر طرح کی رنگ آمیزی سے گریز کرتا ہے - ویسے یہ بات اپنے طور پر ایک الگ حقیقت ہے کہ کیا انسان بحیثیت انسان ایسا کر بھی سکتا ہے ؟ کیا یہ بات اس کے بس میں بھی ہے کہ اپنے آبا و اجداد اور اسلاف کا تذکرہ کرتے ہوئے غیر جانبدار مبصر کی حیثیت اختیار کر لے ؟ اس بات کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوگا کہ مورخ کی غیر جانبداری کے نظریے کے مبلغِ اول ابن خلدون بھی عرب اور بربر قبائل کی طبعی خصوصیات کا احاطہ کرتے ہوئے بے تعصبی اور غیر جانبداری کے رویے کو نبھانے میں ناکام رہے ۔ دراصل انسان کے لیے پتھر ہونا ناممکن ہے - یہ بات یقینی ہے کہ گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں ہر شخص اپنے مطالعے کی بناء پر پہلے ہی سے اچھی یا بری رائے رکھتا ہے اور ان واقعات کو پیش کرتے ہوئے اپنی ذاتی رائے سے کلیتاً بے تعلق نہیں رہ سکتا - یہ مشکل اُس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب کوئی مورخ کسی ایسے دور یا شخص کے بارے میں لکھ رہا ہو جس سے اس کا بھی کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہو - بہر حال ان حقائق کے باوجود وہی مورخ مستحسن قرار پانے کا جو واقعات کی پیش کش میں زیادہ سے زیادہ غیر جانبدار بننے کی کوشش کرے گا - ابن خلدون کو اسی چیز نے اہم مورخ اور فلسفۂ تاریخ کا مشہور و معروف ماہر بنا دیا کہ وہ نظری اور علمی اعتبار سے عرب و بربر قبائل کے قضیے کے علاوہ ہر معاملے میں غیر جانبدار نظر آتا ہے ۔

اس سلسلے کی آخری بات مورخ کے اسلوب کے بارے میں ہے - مورخ کے اسلوب کے ضمن میں یہ امر بہت اہم ہے کہ تاریخ ماضی کے بارے میں آگہی بخشنے کے لیے معرض تحریر میں لائی جاتی ہے ، لہذا اسے پورے طور پر ابلاغ کے وسیلوں کو کام میں لانا چاہیے - گویا مورخ کو سیدھی سادی زبان لکھنی چاہیے جس میں شاعرانہ وسیلوں سے کم سے کم کام لیا گیا ہو ، بلکہ بالکل نہ

لیا گیا ہو، اور جس طرح مورخ مختلف واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اسی طرح اس کا اسلوب بھی تجزیاتی ہونا چاہیے - یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخ بھی سائنس کے مرتبے پر فائز ہوتی نظر آتی ہے - لیکن اس اصول کو تسلیم کر لینے میں دقت یہ ہے کہ اگر ماضی کے مردہ اور خشک واقعات کو پیش کرنے کے لیے خشک اسلوب اختیار کر لیا جائے تو کیا عام قاری اس میں دلچسپی لے سکے گا ؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ تاریخ کے قاری کے لیے اسلوب کی دلکشی اور اور رنگینی میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کی دلچسپی کا مرکز تو علت و معلول کے رشتوں میں جکڑے ہوئے وہ واقعات ہیں جو انسانی زندگی میں مختلف تبدیلیوں اور انقلابوں کی بنیاد بن رہے ہیں - اس کے علاوہ اس سے بھی صرفِ نظر محال ہے کہ رنگین و شاعرانہ اسلوب تاریخ کے سچے اور مستند واقعات میں جس طرح کی افسانوی کیفیت پیدا کر دے گا وہ خود تاریخ کے اصل مقصد کے لیے زہرِ قاتل ہے - گویا تاریخ کے لیے وہی استدلالی ، منطقی اور تجزیاتی اسلوب ہونا چاہیے جس کا تقاضا خود تاریخ کر رہی ہے -

اردو میں تاریخ نویسی کی روایت اور مولانا مہر

تاریخ کے بارے میں بنیادی مباحث پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ اردو میں تاریخ نویسی کی روایت کیا رہی ہے ؟ ظاہر ہے اردو میں تاریخ نگاری کی روایت عربی فارسی اور دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی طرح نہ تو قدیم ہے اور نہ مستحکم - اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ خود اردو بھی ان زبانوں کی طرح قدیم نہیں ہے - پھر یوں بھی اردو میں ابتدا میں نظم کی طرف توجہ دی گئی اور نثر کی ابتدا اول تو بہت بعد میں ہوئی - پھر ویسے بھی اس کا آغاز تمثیلی قصوں اور داستانوں سے ہوا - ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں ہمیں تاریخ کی مستقل اور خشک کتابوں کی توقع کم ہی کرنی چاہیے - البتہ اگر ہم مثنویوں اور قصائد میں شاہانِ وقت اور آئمۂ مذاہب کے جنگی کارناموں کے بیان کو کسی طرح تاریخ نگاری کی روایت کا حصہ قرار دے سکیں تو دکن میں اردو کے آغاز کے ساتھ ہی اس نوعیت کی نظمیں ملنے لگتی ہیں - اس سلسلے میں سب سے پہلے رستمی کا ذکر کرنا چاہیے جس نے ''خاور نامہ'' کے نام سے ایک طویل نظم لکھی - اس نظم کے بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

''رستمی نے خدیجہ سلطانہ شہر بانو بیگم کی فرمائش سے ۱۰۵۹ھ میں ''خاور نامہ'' کا فارسی سے نظم دکنی میں ترجمہ کیا - خاور نامہ میں

جناب امیر علیہ السلام کے محاربات مذکور ہیں اور فردوسی کے ''شاہنامہ'' کی طرز پر لکھا ہے۔''[1]

اسی عہد میں نصرتی نے ایک اور منظوم تاریخ تصنیف کی جس میں علی عادل شاہ کے عہد کے جنگی واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

''نصرتی نے ایک طویل مثنوی لکھی جس کا نام ''علی نامہ'' ہے، جس میں اپنے محسن علی عادل شاہ کے اکثر واقعات نظم ہیں۔ اس میں علی عادل شاہ کے سوانحات و فتوحات اور مجالسِ عیش و طرب کے واقعات کا بھی ذکر ہے۔ اس کے ضمن میں مختلف واقع پر قصائد مدحیہ بھی درج ہیں۔''[2]

نظم میں تاریخ نگاری کی اولین کوششیں اسی نوعیت کی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ نہ تو بحیثیت تاریخ ان کو کسی بلند مرتبے پر فائز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی محض تاریخی حیثیت کے علاوہ ان کا کوئی مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔ البتہ دیگر نثری اصناف کی طرح تاریخ نویسی کے سلسلے میں بھی باقاعدہ کامیاب کوششیں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تصانیف قرار دی جا سکتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کے موضوعات کا خاکہ پیش کرتے ہوئے حامد حسن قادری لکھتے ہیں :

''کالج کی تالیفات میں مختلف ضروری، مفید اور دلچسپ موضوع کی کتابیں شامل ہیں۔ یعنی فسانہ، تذکرہ، صرف و نحو، تاریخ، اخلاق، فقہ اسلام، ترجمۂ قرآن مجید، ترجمہ انجیل مقدس۔''[3]

لیکن فورٹ ولیم کالج کی تالیفات میں اول تو صرف و نحو اور افسانوی ادب کے مقابلے میں تاریخ کی کتابیں بہت ہی کم ہیں، اور جو دو چار کتابیں ہیں وہ

۱۔ تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ، مترجم محمد عسکری، ص ۹۲، حصہ نظم، اشاعتِ اول، مطبوعہ نامی پریس لاہور۔

۲۔ تاریخِ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ، ص ۹۳۔

۳۔ تاریخِ داستان اردو، از حامد حسن قادری، حصہ نثر، ص ۱۶۲۔

بھی سب کی سب ترجمہ ہیں ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ جو کتابیں لکھی گئیں وہ اب نایاب ہو چکی ہیں ۔ تاریخ سے متعلق فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کی تالیفات میں ''تاریخ نادری'' ترجمہ حیدر بخش حیدری (۱۸۰۹ع)، تاریخ آسام نامہ مترجمہ میر بہادر علی حسینی (۱۸۰۵ع) ، تاریخ شیر شاہی (۱۸۰۵ع) اور جہانگیر نامہ مترجمہ مظہر علی خاں ولا اور تاریخ فرشتہ مترجمہ کاظم علی جوان شامل ہیں ۔ ان تراجم میں ایک کتاب ایسی بھی ہے جسے طبع زاد تاریخ کی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے ۔ یعنی ''آرائش محفل'' جو میر شیر علی افسوس نے تصنیف کی ۔ اس کے بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

''۱۸۰۴ع میں انھوں نے آرائش محفل لکھنا شروع کی ، جس میں علاوہ ہندوستان کے جغرافیائی حالات کے فتح اسلام تک ہندو راجاؤں کی ایک مختصر تاریخ بھی ہے ۔ اس کی تصنیف میں اکثر تاریخوں سے مدد لی گئی ، مگر اس کا اصل ماخذ منشی سوجن رائے پٹیالوی''[1] کی خلاصۃ التواریخ ہے ۔''[2]

اس عہد میں فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی بعض تاریخیں لکھی گئیں ۔ ان میں مختصر تاریخ وزارت شاہی اودھ از رجب علی بیگ سرور ، سلسلۂ ملوکِ ہند اور آثار الصنادید از سرسید احمد خاں ، تاریخ رشید الدین خانی ۱۸۵۴ع اور تاریخ خورشید جاہی ۱۸٦۸ع از غلام امام خاں ترین حیدر آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ مملکتوں اور سلطنتوں کے علاوہ زبان و ادب اور اداروں کی تاریخیں بھی لکھی گئیں ۔ ان میں للو لال جی کی ''ہندوستانی زبان کی تاریخ'' اور امام بخش صہبائی کی ''دہلی کالج کی مختصر تاریخ'' شامل ہیں ۔ ان چند کتب کے بعد تاریخ کے سلسلے میں اردو کا دامن خالی ہی نظر آتا ہے ۔ البتہ ۱۸۵۷ع کے بعد علی گڑھ تحریک جس طرح اردو ادب کی مختلف اصناف ، مثلاً شاعری ، ناول ، سوانح نگاری مضمون نویسی اور تنقید وغیرہ کے لیے زندگی کا پیغام ثابت ہوئی ، اسی طرح اس

۱- تاریخِ ادبِ اردو میں یہ نام یوں ہی لکھا گیا ہے ، لیکن شاید یہ ترجمہ و کتابت کی غلطی ہے ۔ اس لیے کہ اس نام کی صحیح املا ''سجان رائے بٹالوی'' ہے ۔

۲- تاریخِ ادبِ اردو ، از رام بابو سکسینہ ، ص ۱۷ - ۱۸ ۔

تحریک نے تاریخ کو بھی بے حد فائدہ پہنچایا - ۱۸۵۷ع کا انقلاب اور علی گڑھ تحریک اردو ادب میں جس نوعیت کی تبدیلی کا موجب بنے اس کا اظہار آثار الصنادید کی تصحیح و اشاعت سے بھی ہوتا ہے - صرف آثار الصنادید ہی کیا ، تاریخی تصالیف کے اعتبار سے سرسید اردو کے پہلے ادیب قرار پاتے ہیں جنھوں نے باقاعدہ تاریخ نویسی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا - سرسید احمد خان نے نہ صرف آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی ، بلکہ اردو میں بعض مستقل تاریخی کتب اور رسالے بھی لکھے - سرسید احمد خان کی تاریخی کتب میں تاریخِ سرکشیِ بجنور ، رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند اور ''وفادار مسلمانانِ ہند'' شامل ہیں -

سرسید احمد خان کے بعد مولانا محمد حسین آزاد نے بھی تاریخ کی طرف تھوڑی بہت توجہ کی - اس سلسلے میں مولانا آزاد کا خاص کارنامہ ''دربارِ اکبری'' ہے جس میں مغلِ اعظم اکبر بادشاہ کے ذاتی ، درباری اور آئینی حالات کے ساتھ ساتھ ارا کینِ سلطنت کے سوانح حیات بھی بڑی تفصیل سے ملتے ہیں - اگرچہ ''دربار اکبری'' کے سلسلے میں بہت سی تاریخوں سے استفادہ کیا گیا ہے ، لیکن مُلا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ زیادہ تر سامنے رکھی گئی ہے - اس عہد میں مولانا آزاد سے کہیں زیادہ مولوی ذکاء اللہ نے ایک مورخ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی - ان کی دو تاریخی کتابیں تاریخِ ہندوستان اور تاریخِ عہدِ الگلشیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں - تاریخِ ہندوستان اٹھارہ حصوں پر مشتمل ہے اور اس میں ہندوستان کی تاریخ کے تمام اہم واقعات جمع کرنے کی قابل ستائش کوشش کی گئی ہے ، جب کہ تاریخِ عہدِ الگلشیہ صرف اس دور کا احاطہ کرتی ہے جس میں ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں آئی - لیکن تاریخِ عہدِ انگلشیہ کے بارے میں کہنا پڑتا ہے کہ مولانا ذکاء اللہ غالباً اس کتاب کی تالیف تک ۱۸۵۷ع کے انقلاب کے اثرات کو نہیں بھول سکے تھے - یہی وجہ ہے کہ وہ اس کتاب میں واقعات پیش کرتے ہوئے روایت و درایت کے مسلمہ اصولوں سے انحراف کرتے نظر آتے ہیں - اور انگریزی حکومت کی غلط کاریوں کو نمایاں کرنے سے احتراز کرنے کی کوشش میں واقعات کی صورت کچھ سے کچھ ہوگئی - البتہ اس پورے عہد میں ایک نام ایسا بھی نظر آتا ہے جس نے اظہار و ابلاغ کے بہت سے وسیلوں سے واقفیت کے باوجود خود کو نہ صرف زیادہ سے زیادہ تاریخ نویسی کے لیے وقف رکھا ، بلکہ حتی المقدور اپنے

مورخانہ انداز کو ہر طرح کے الزامات سے بھی بچانے کی کوشش کی ۔ یہ نام اردو کے عظیم مورخ مولانا شبلی نعمانی کا ہے ۔ شبلی کو نہ تو کوئی ضرورت تاریخ کے میدان میں لائی تھی اور نہ ہی کوئی مجبوری عنان گیر ہوئی تھی ۔ وہ صرف اپنے شوق اور مورخانہ اندازِ فکر کے باعث تاریخ کی طرف مائل ہوئے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخی تصانیف نہ صرف زیادہ سے زیادہ تاریخی اصولوں پر پوری اترتی نظر آتی ہیں ، بلکہ واقعات کی پیش کش کا انداز اور بعض جگہوں پر ان کے خیالات کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نظری طور پر فلسفۂ تاریخ سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے تھے ۔ اس کے علاوہ شبلی کی اصل اہمیت اس میں ہے کہ وہ اسلامی ادب کے حوالے سے اصولِ تاریخ کی قدر و قیمت متعین کرتے نظر آتے ہیں ۔ اردو میں تاریخ نویسی کی روایت اور اس پر مولانا شبلی نعمانی کے قابلِ قدر اضافے کا جائزہ لیتے ہوئے عبداللطیف اعظمی لکھتے ہیں :

''شبلی سے قبل تاریخ کی کتابیں تحقیق سے بالکل خالی تھیں اور جدید ذوق و رجحان کا ان میں مطلق خیال نہیں کیا گیا تھا ۔ یا تو اتنی خشک تھیں کہ کوئی پڑھنے کی ہمت نہ کر سکے یا دلچسپی کا اس قدر سامان بہم پہنچا دیا گیا تھا کہ وہ تاریخ کے پائے سے گرگئیں ۔ مولانا شبلی نے ان تمام نقائص کو دور کیا اور تاریخ کا معیار قائم کیا ۔''[1]

اس میں شک نہیں کہ شبلی کی تصانیف تاریخ نویسی کے ہر معیار پر پوری اترتی ہیں ۔ ان میں مباحث کا نیا انداز بھی ہے اور محققانہ اور مورخانہ اندازِ فکر بھی ۔ روایت کے اصول بھی کارفرما نظر آتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ درایت کے مطابق عقلی دلائل کے انبار بھی نظر آتے ہیں ۔ منقول کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اور معقول سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا گیا ۔ انھوں نے اپنی تاریخی تصانیف میں صرف ماضی کے مردہ واقعات ہی کو پیش نہیں کر دیا ، بلکہ احوال و ظروف کی وہ حقیقی صورت بھی پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی جس میں یہ واقعات وقوع پذیر ہوئے تھے ۔ صرف موضوع شخصیات کی سوانح حیات ہی کو سامنے

۱- شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں ، از عبداللطیف اعظمی ، ص ۸۷ ، اشاعت دوم ۱۹٦۷ء ، صفیہ اکیڈمی کراچی ۔

نہیں لایا گیا بلکہ عام لوگوں کی زندگی کو بھی کسی نہ کسی حد تک پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ اسلوب ایسا اختیار کیا گیا ہے جو نہ تو اس قدر خشک ہے کہ قارئین اُکتا جائیں اور نہ اس حد تک رنگین کہ تاریخ افسانے کا لبادہ اوڑھ لے ۔ گویا شبلی اردو کے پہلے کامیاب مورخ کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ان میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کا کسی بھی اچھے مورخ سے تقاضا کیا جا سکتا ہے ۔ البتہ ایک بات شبلی کے ہاں بھی کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ وہ بھی کارلائل کی طرح تاریخ کو زیادہ تر عظیم المرتبت اشخاص کے کارناموں کے بیان تک محدود سمجھتے تھے ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے تمام موضوع اشخاص تاریخ کے مشہور و معروف نام ہیں ۔

اردو تاریخ نویسی میں مولانا شبلی کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ آج تک ہمارے مورخ تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ انہی کے بنائے ہوئے راستے پر گامزن نظر آتے ہیں ۔ اس راستے پر چلنے والوں میں مولانا مہر کا نام نمایاں نظر آتا ہے ۔ البتہ ان دونوں مورخین میں مزاج کے اعتبار سے فرق ضرور ہے اور مزاج کا یہی فرق ان کو بحیثیت تاریخ نویس انفرادیت عطا کرتا ہے ۔ اگر شبلی اور مولانا مہر کی تصانیف کا تقابلی مطالعہ کیا جائے ، تو سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کو ان تاریخی شخصیات سے دلچسپی ہے جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے نخل اسلام کی آبیاری کی ۔ البتہ یہ ہے کہ شبلی مزاجاً اور طبعاً سوانح نگار سے زیادہ مورخ تھے ، جبکہ مولانا مہر اپنے مزاج کے اعتبار سے مورخ سے زیادہ سوانح نگار قرار پاتے ہیں ۔ اگرچہ شبلی بھی معروف مورخین کے برعکس بعض جگہ قلم روک کر چلے ہیں اور واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے جواز بھی پیش کرتے ہیں ، لیکن مولانا مہر تاریخ نویسی کے مسلمہ اصولوں کے برعکس موضوع شخصیات سے والہانہ عقیدت و محبت میں مبتلا نظر آتے ہیں اور ان شخصیات کی کسی معمولی سے معمولی لغزش کا ذکر بھی گوارا نہیں کرتے ۔ مزاجوں کا یہ فرق ''الفاروق'' اور ''سید احمد شہید'' ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے ۔ اردو کے ان دونوں مایۂ ناز مورخوں کے مزاج کے اس رخ کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

''یہ سوال بھی فیصلے کا طلب گار ہے کہ مہر کو مزاج کے اعتبار سے مورخ کہا جائے یا سیرت نگار ۔ شبلی کے بارے میں یہ فیصلہ تقریباً متفق علیہ ہے کہ وہ طبعاً سوانح نگار نہ تھے ، مورخ تھے ۔ کیونکہ

انھوں نے سوانح نگاری کے ذریعے تاریخ کی خدمت کی ۔ وہ سوانح نگار کا دل و دماغ لے کر نہیں آئے تھے ۔ سوانح نگار کی تحریک شخصی جذبے سے ہوتی ہے اور مورخ کا فن غیر شخصی ہوتا ہے اور وہ تاریخی حقائق کی جستجو میں قدم یا قلم اٹھاتا ہے کہ شخص سے اسے شخصی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ یہ شخصی اور غیر شخصی فن کا فرق ہے اور یہ بہت بڑا فرق ہے ۔"[1]

مولانا مہر کی تاریخی و سوانحی کتب دیکھ کر سید صاحب کی رائے کی صحت و وقعت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے ۔ مولانا مہر نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے ، ان کے ساتھ تو مولانا کی جذباتی وابستگی اور اس کا اظہار اظہر من الشمس ہے ، لیکن وہ کتب جو سراسر تاریخی ہیں اور جن میں کسی ملک یا خطے کے مخصوص دور کے سیاسی ، تاریخی ، جغرافیائی ، معاشی اور معاشرتی حالات قلمبند کیے گئے ہیں ، ان میں بھی مولانا مہر واقعات و حقائق کی چھان پھٹک کے ساتھ ساتھ مختلف شخصیات کو خراج تحسین پیش کرتے نظر آتے ہیں ۔ اس کی سب سے بڑی مثال "تاریخِ سندھ" ہے جس میں کلھوڑا خاندان کے دورِ حکومت کی تاریخ پیش کی گئی ہے ۔ لیکن "تاریخ سندھ" کو سرسری طور پر دیکھ کر بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر کو تاریخی حقائق سے زیادہ شخصیات سے دلچسپی ہے ۔ مثلاً وہ کلھوڑا خاندان کے نامور حکمران یار محمد خاں پر لگائے گئے ایک الزام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میاں یار محمد خاں کے خلاف ایک رنج افزا الزام سید غلام علی آزاد بلگرامی کی مشہور کتاب "مآثر الکرام" میں نظر سے گزرا ۔ یعنی یہ کہ امتیاز خاں خالص جب ہندوستان سے ایران جا رہا تھا تو اسے قتل کرا کے مال و دولت پر خود قبضہ کر لیا ۔

سید غلام علی آزاد کے متعلق قطعاً شبہ نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے دانستہ کوئی غلط بات بیان فرما دی ہو ۔ انھیں یہ قصہ سید عبدالجلیل بلگرامی سے معلوم ہوا . . . یقین ہے کہ سید عبدالجلیل کو غلط اطلاعات ملی ہوں گی ۔"[2]

۱۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مصنف ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، ص ۲۱ فنون ۔

۲۔ تاریخ سندھ ، از مولانا مہر ۔ جلد اول ، ص ۳۰۱ ۔ اشاعت اول ۱۹۵۸ع ۔ مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ کراچی ۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ بیان ایک مورخ کا نہیں ہے ، کیونکہ اس میں تحقیق و تفتیش کے مرحلوں سے گزرے بغیر ہی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ مولانا شبلی کی کتاب "اورنگ زیب عالمگیر" پر مولانا مہر کا مقدمہ بھی اس پہلو سے خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہے ۔ ''اورنگ زیب عالمگیر'' پر شبلی نے جو چند ایک اعتراض کیے تھے ، ان کا جواب دیتے ہوئے مولانا مہر نے اورنگ زیب کو اس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اندازہ ہو کہ اورنگ زیب ایک عام انسان نہیں بلکہ مافوق الفطرت بادشاہ تھا ۔

شخصیات سے مولانا مہر کی یہی دلچسپی انھیں مورخ سے زیادہ سوانح نگار بنا دیتی ہے ، لیکن جس طرح مولانا شبلی مورخ ہونے کے باوجود سوانح نگار اور سیرت نویس بھی تھے ، اسی طرح سیرت و سوانح سے دلچسپی رکھنے کے باوجود مہر بھی مورخین کی صف میں شامل ہیں اور ان کے قلم نے تاریخ کی بھی اتنی ہی خدمت کی ہے جتنی سوانح نگاری کی ۔

مولانا مہر نے تاریخ میں جو اسلوب اختیار کیا ، اسے محققانہ تاریخ نویسی قرار دینا چاہیے ، اس لیے کہ بہت سے مورخین کی طرح انھوں نے محض منقولات و روایات پر ہی بھروسہ نہیں کیا ، بلکہ وہ جس دور کو اپنا موضوع بناتے ہیں اس کے بارے میں مختلف حوالوں اور مآخذ کی مدد سے تحقیق و کاوش کی روشنی میں ایک ایسی تصویر تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرین حقیقت بھی ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ مکمل اور جامع بھی ۔ ''سید احمد شہید'' سے ''رسول رحمت'' تک میں یہی انداز کارفرما ہے ۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ مولانا مہر صرف مورخ نہیں ہیں ، بلکہ شدید جذباتی وابستگیوں والے انسان ہیں ، لہذا یہ تحقیق و تنقیح نہ تو بے لطف ہوتی ہے اور نہ لاحاصل۔ مولانا مہر موضوع شخصیات کے بارے میں ہر طرح کی معلومات فراہم کرنے کے باوجود ، اپنی وابستگی کے باعث ، ان کے بعض متنازعہ اعمال و افعال کی مناسب تاویلیں بھی پیش کرتے چلے جاتے ہیں ، اور یہ واحد مقام ہے جہاں وہ تاریخ نویسی کے عام نقطہ نظر سے سچے اور غیر جانبدار مورخ نہیں رہتے ۔ لیکن ان کے اس اندازِ فکر کی وجہ خود امتِ مسلمہ کی زبوں حالی اور درماندگی میں پوشیدہ ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہ دورِ زوال میں مجرد واقعات کو پیش کر کے اور قومی ابطال کی غلطیوں کو اچھال کر قوم و ملت کی کوئی اہم خدمت انجام

نہیں دے سکتے تھے ۔ اُن کی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا محرک قوم و ملت کی تربیت تھا ، جیسا کہ تاریخ کے بارے میں ان کے تصورات سے واضح ہوتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''تاریخ محض ماضی کے واقعات کے کھتونی نہیں ہوتی ۔ قوم کی تربیت کا ایک نہایت موثر وسیلہ اور ذریعہ بھی ہوتی ہے ۔ اخلاف میں اسلاف کے اوصاف و فضائل پیدا کرنے اور ان کے دلوں میں عظیم الشان کارناموں کے لیے ہمت کے چراغ جلانے کی ایک اہم تدبیر یہ بھی ہے کہ انھیں اسلاف کے کارناموں سے ٹھیک ٹھیک آگاہی کا موقع بہم پہنچایا جائے ۔''[۱]

بحیثیت مورخ مولانا مہر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ حالات و واقعات کے بہاؤ کا تقریباً درست اندازہ کرکے پیچیدہ اور الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں ۔ تاریخ میں جہاں جہاں سقم رہ جاتے ہیں ان کو دور کرکے مکمل اور صحیح تصویر بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ متنازعہ مسائل کا حتمی حل پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں اور اس کے لیے ایسا واضح اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں کہ بات دل میں اتر جاتی ہے ۔ یوں تو اس کے لیے بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اس سلسلے میں ''سید احمد شہید'' کے بعض مباحث خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ مثلاً یہ امر بہت متنازعہ تھا کہ سید احمد شہید کی تحریک جہاد اصلاً کس کے خلاف تھی ۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ سید احمد شہید کا حقیقی ہدف انگریز تھے جبکہ کچھ مورخین یہ رائے رکھتے ہیں کہ سید احمد شہید صرف سکھوں کے مظالم کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے ۔ لیکن مولانا مہر نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس مسئلے کو واضح طور پر حل کر دیا اور یہ بات ثابت کر دی کہ انگریز ہی سید احمد شہید کا حقیقی ہدف تھے ۔ اسی طرح سید صاحب کی شہادت کے بارے میں بھی مورخین اختلاف رائے کا شکار تھے ۔ بعض کے نزدیک سید صاحب شہید ہو گئے تھے جبکہ کچھ مورخین کے نزدیک مسئلہ غیبوبت ہی درست تھا ۔ مولانا مہر نے حقائق و واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے منطقی اور استدلالی انداز کے ساتھ

۱- مقدمہ تاریخ سندھ ، جلد اول ، ص ۲ ۔

ثابت کردیا کہ سید احمد شہید نے بالا کوٹ کے مقام پر لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا ۔

مہر صاحب کی تاریخ نویسی کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ہر واقعے کی حقیقی صورت سامنے لانے کے لیے ہر طرح کے حوالوں کو کام میں لاتے ہیں ۔ مولانا مہر کی تاریخ نویسی کے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے یوسف طاہر لکھتے ہیں :

''مہر صاحب کے انداز تحقیق و ترتیب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کسی واضح نتیجے تک پہنچنے کے لیے مخالف اور موافق دونوں قسم کی آرا کا تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے موقف کی حمایت کے لیے عموماً مخالفین کے حوالوں سے استفادہ کرتے ہیں ۔''[۱]

اس سلسلے میں جنگ آزادی کے موضوع پر لکھی گئی کتابیں دیکھنے کے لائق ہیں یا پھر ''سید احمد شہید'' کے وہ حصے جن میں مولانا مہر نے اصل حقائق کو بے نقاب کرنے کے لیے مخالف و موافق آراء کا تجزیہ کرکے نتائج نکالے ہیں ۔ مولانا مہر کا عام طریق کار یہ ہے کہ وہ زیر بحث مسئلے کے بارے میں سامنے آنے والی جملہ روایات پیش کر دیتے ہیں اور پھر منطقی و استدلالی انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے اصل حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یوں نہ صرف قابلِ اعتماد اور قرینِ قیاس روایات سامنے آ جاتی ہیں بلکہ افسانوی روایات کی قلعی بھی کھل جاتی ہے ۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مولانا مہر پیش کردہ روایات میں سے بغیر کسی ترجیحی قرینے کے کسی ایک روایت کو قبول کر لیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر سید احمد شہید کی والدہ کے نام کے بارے میں دو مختلف روایات کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو مولانا مہر نے پیش کی ہیں ، لیکن آگے چل کر ان میں سے ایک روایت کو کسی سند کے بغیر قبول کر لیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ بحیثیت مورخ یہ ان کے تساہل کی دلیل ہے ۔

مولانا مہر کی تاریخی تصانیف میں بعض جملے بڑے تواتر کے ساتھ ملتے ہیں مثلاً ''کچھ معلوم نہیں'' ، ''کچھ معلوم نہ ہو سکا'' اور ''واللہ اعلم بالصواب'' وغیرہ ۔ ان جملوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ گویا مولانا مہر نے

۱۔ مولانا غلام رسول مہر ، از یوسف طاہر ، ص ۱۱۴ ۔

زیر بحث واقعات کے بارے میں حتمی اور یقینی طور پر کچھ کہنے سے معذرت کر لی ہے - ظاہر ہے کہ یہ ایک اچھے مورخ کے شایاں نہیں کیونکہ اس طرح کے جملوں سے تفصیلات کے خواہاں قارئین کو مایوسی ہوتی ہے - البتہ اس سے ایک بات ضرور سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اول تو مولانا مہر کو زیر بحث واقعے کی اہمیت کا پوری طرح احساس ہے ، دوسرے انھوں نے اپنے طور پر تحقیق و جستجو بھی کی ہے لیکن کافی حوالوں کی عدم موجودگی کے باعث اصل حقائق تک نہ پہنچ سکنے کے باوجود وہ غیر محتاط مورخین کی طرح اپنے قارئین کی غلط سمت میں رہنمائی نہیں کرتے - البتہ غلط سمت میں رہنمائی کی ایک اور صورت موجود ہے اور وہ یہ کہ مولانا مہر سنین کا تعین کرنے کے لیے تقویم پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ کرتے ہیں ، جبکہ معلوم ہے کہ تقویم کے ماہر تاریخوں کے تطابق کے سلسلے میں صد فی صد درست نتائج پیش کرنے سے قاصر ہیں -

مولانا مہر کی تاریخی کتب میں تکرار کا نقص بھی پایا جاتا ہے - اس سلسلے میں تحریک ِ مجاہدین اور جنگ آزادی پر لکھی گئی کتابوں کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے - مثلاً ''سرگزشت ِ مجاہدین'' کا زیادہ تر مواد ایسا ہے جو پہلے ہی ''سید احمد شہید'' میں پیش کیا جا چکا ہے - یہی کیفیت ''۱۸۵۷ع'' اور ''۱۸۵۷ کے مجاہد'' کی ہے -

مورخ کے طریق ِ کار کے بارے میں یہ بات بطور خاص کہی جاتی ہے کہ اسے واقعات کو پیش کرتے ہوئے غیر جانبدار رہنا چاہیے ، لیکن بعض اوقات مولانا مہر اس حد تک جانبدار ہو جاتے ہیں کہ ان کی تحریروں کو تاریخ کی بجائے پروپیگنڈے کا نام دینا زیادہ مناسب لگتا ہے - اس سلسلے میں ''آزادی کی جنگ'' کے مباحث کو پیش کیا جا سکتا ہے -

بہر حال بعض خامیوں کے باوجود مولانا مہر اردو کے قابل ِ ذکر مورخ قرار پاتے ہیں اور مورخانہ مزاج نہ رکھنے کے باوجود اردو تاریخ نویسی کے ضمن میں ان کی خدمات قابل ِ قدر ہیں - لیکن ان کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے ان کی تاریخ نویسی کے مختلف شعبوں اور ان کی مختلف تاریخی کتب کا جائزہ بہت ضروری ہے - اس سلسلے میں سب سے پہلے تحریک ِ مجاہدین کے بارے میں مولانا مہر کی تصانیف کا جائزہ لینا چاہیے اس لیے کہ یہی وہ کام ہے جس کو انھوں نے اپنے شوق سے انجام دیا تھا اور اس پر بے انتہا محنت کی تھی اور یہی کام تاریخ نویسی میں ان کے بنیادی کام کی حیثیت رکھتا ہے -

۱۔ سید احمد شہید :

''سید احمد شہید'' تحریک مجاہدین کے سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ بنیادی طور پر یہ ایک سوانح عمری ہے لیکن ہر اچھی سوانح عمری کی طرح موضوع شخصیت کے عہد کی مستند تاریخ کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس کے اوراق سید احمد شہید کی پیدائش و وفات ہی کو پیش نہیں کرتے، بلکہ اُن حالات کا مرقع بھی پیش کرتے ہیں جن میں زوال آمادہ ہندی مسلمانوں نے آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کی خواہش کے اظہار کے طور پر ایک ولولہ انگیز تحریک کا آغاز کیا تھا۔ مولانا مہر تحریکِ مجاہدین پر کام کرنے کے بنیادی محرکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''شروع ہی سے میری یہ خواہش تھی کہ ان بہادروں کی تاریخ مرتب کی جائے جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آزادی کا پرچم بلند کیا۔ دین سے ایک گونہ لگاؤ کی وجہ سے میری طبیعت کا زیادہ تر میلان سید احمد شہید کی طرف تھا۔ مختلف اصحاب سے جب اس تحریک کے بارے میں سنا تو آتشِ شوق اور تیز ہو گئی۔ پھر اس تحریک کے بارے میں متضاد باتیں سنی گئیں، جس کی وجہ سے تحقیق کا خیال اور پختہ ہوگیا۔ جب خود آزادی کی جد و جہد میں شامل ہوا تو سید احمد شہید کی عظمت کا احساس اور بھی شدید ہوگیا۔''[1]

آتشِ شوق کو مذہبی مسلک کی یکسانی نے بھی ہوا دی ہوگی جبکہ اس سلسلے میں اس عہد نے بھی خاص کردار ادا کیا جو اکتوبر ۱۹۳۴ء کی چھٹی یا ساتویں تاریخ کو کابل میں مولانا محمد بشیر شہید سے کیا گیا تھا اور جس کی رو سے مولانا مہر نے سید احمد بریلوی کے سوانح اور مجاہدین کی تاریخ مرتب کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔''[2] یہی محرکات تھے جنھوں نے ''سید احمد شہید'' کو قابلِ قدر اور لائق توجہ تاریخ بنا دیا۔

سید احمد شہید میں مولانا مہر کی تاریخ نویسی کے جملہ معائب و محاسن پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مولانا کی دیگر تاریخی کتب کی طرح سید احمد شہید بھی

۱۔ انٹرویو از الطاف حسن قریشی، ص ۲۹، اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۶۱ء۔
۲۔ سید احمد شہید، ص ۵۔

محققانہ تاریخ نویسی کی نادر مثال ہے ۔ اگرچہ سید احمد شہید ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں منارۂ نور کی حیثیت رکھتے تھے ، اس کے باوجود بد قسمتی سے ان کی حیات اور کارناموں پر تاریکی کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے ۔ مصلحتوں کی صورت خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر حلقے کے مورخین نے سید احمد شہید کے کارناموں کو من و عن پیش کرنے سے گریز کیا ۔ اس صورت میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر کو واقعات کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں کس قدر مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہوگا ۔ بہرحال انھوں نے معاصر تاریخوں ، روزنامچوں ، اخبارات و رسائل اور مکتوبات کے ذخیروں اور منظوم شعری سرمائے پر مشتمل تقریباً تیس مختلف مآخذ پر بیس برس محنت کی ۔ اس کے علاوہ حقائق کی تلاش میں ان تمام علاقوں کے متعدد دورے کیے جہاں مختلف اوقات میں سید احمد شہید نے قیام کیا تھا یا انھیں جنگیں پیش آئی تھیں یا جہاں سے سید احمد شہید کے بارے میں معلومات ملنے کی توقع ہو سکتی تھی ۔ اسی بیس سالہ انتھک محنت کا نتیجہ ہے کہ سید احمد شہید کا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جس کے لیے ثبوت و اسناد کے انبار نہ لگا دیے گئے ہوں ۔ دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ مولانا مہر منطق و استدلال کو بھی کام میں لاتے ہیں اور منقول و معقول سے کام لیتے ہوئے اپنے قارئین کے ذہنوں کو اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں ۔ یہ انداز یوں تو سید احمد شہید کے ہر صفحے میں نظر آتا ہے لیکن اس سلسلے میں چند واقعات کا ذکر بطور خاص کیا جانا چاہیے ۔ مثلاً سید شہید کی شہادت یا غیبوبت کا معاملہ ۔ ثبوت و اسناد کے ساتھ اس منطقی و استدلالی انداز کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخی واقعات کی توجیہات یا مختلف اشخاص کے بارے میں افسانوی روایات کی قلعی کھل جاتی ہے ۔ اس سلسلے میں سید احمد شہید کی تاریخِ ولادت کے بارے میں اختلاف اور اس سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کے علاوہ سید شہید کے علم و فضل کے بارے میں مشہور افسانوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے ۔

سید احمد شہید میں بھی یہ صورت ملتی ہے کہ کسی واقعے کے بارے میں سامنے آنے والی تمام مختلف روایات کو پیش کر دیا جاتا ہے اور پھر حوالوں کی کثرت اور منطق و استدلال کے ذریعے ان کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور آخرکار زیادہ قرین قیاس روایت کو قبول کر لیا جاتا ہے ۔ مثلاً دہلی کا سفر کرتے ہوئے سید شہید کو پیش آنے والے واقعات کے سلسلے

میں مرزا حیرت کی ''حیات طیبہ'' کی بعض روایات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ان میں سے کوئی بات بھی غیر اغلب نہیں ، لیکن اس روایت کی تصدیق کسی ذریعے سے نہ ہو سکی ۔ اور جب یہ ثابت ہے کہ سید صاحب لکھنو سے نہیں بلکہ کھیری لکھیم پور کے اطراف سے دہلی گئے تھے تو انھیں کان پور جانے کی کیا ضرورت تھی جو ان کی جائے روانگی سے دور جنوب میں واقع تھا . . . میرے نزدیک اس روایت کے لیے کوئی بنیاد اساس موجود نہیں ۔''[1]

یہ صورت ان روایات کے ضمن میں پیش آتی ہے جو بالکل متضاد و متصادم ہوں ۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو بظاہر مختلف روایات میں توافق کی صورت تلاش کر لی جاتی ہے اور اس صورت میں جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ زیادہ قرین قیاس اور قابل یقین ہوتا ہے ۔ مثلاً سید شہید کے جدامجد شاہ علم اللہ کے سفر حج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''شاہ علم اللہ نے ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ع) میں دائرے کی بنیاد رکھی ۔ خاصی دیر گزر جانے کے بعد حج کا ارادہ کیا ۔ اس سفر کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ۔ ''نتائج الحرمین'' کے مصنف نے ۱۰۷۵ھ (۱۶۶۵ - ۱۶۶۴ع) میں انھیں مکہ معظمہ میں دیکھا تھا ۔ ''تذکرۃ الابرار'' میں مرقوم ہے کہ شاہ علم اللہ حج کے لیے گئے تھے تو آپ کے تیسرے فرزند سید ابو حنیفہ بھی ساتھ تھے ۔ سید ابو حنیفہ بتیس برس کی عمر پا کر ربیع الاول ۱۰۸۸ھ میں فوت ہوئے ۔ اسی بنا پر سفر حج ۶۵ - ۱۰۶۴ھ میں گئے ۔ پھر کئی برس حرمین میں مقیم رہے ، ورنہ دونوں میں سے ایک کو غلط جانے بغیر چارہ نہیں ۔''[2]

ایک معاملے کے متعلق مختلف روایات کا ذکر اس لیے کیا جاتا ہے تا کہ قاری زیادہ سے زیادہ معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے منطق و استدلال کے ذریعے خود بھی ان کی صحت و عدم صحت کے بارے میں ایک صحیح نتیجے تک پہنچ سکے ۔ لیکن دقت وہاں پیش آتی ہے جہاں مولانا مہر مختلف و متضاد روایات تو پیش کر دیتے ہیں لیکن ان کی صحت و عدم صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ

۱۔ سید احمد شہید ، ص ۷۳ ۔

۲۔ سید احمد شہید ، ص ۴۴ ۔

کیے بغیر ان میں سے کسی ایک روایت کو قبول کر لیتے ہیں ۔ مثلاً مولانا مہر سید احمد شہید کی والدہ کے نام کے بارے میں دو مختلف روایات کا تذکرہ کرتے ہیں اور حاشیے میں لکھتے ہیں :

''خاندانی روایتوں میں دونوں نام آئے ہیں ۔ یقینی طور پر کوئی صاحب نہ بتا سکے کہ کس نام کو ترجیح حاصل ہے ۔''[1]

لیکن آگے چل کر سید احمد شہید کے والد کا ذکر کرتے ہوئے بلا سند ایک نام قبول کر لیا جاتا ہے ۔ مولانا مہر لکھتے ہیں :

''سید محمد عرفان نے مدت تک دوسری شادی نہ کی ۔ سیدہ نجیبہ بالغ ہوئیں بلکہ ان کی شادی بھی ہوگئی تو انھوں نے خود والد کی شادی اپنے نانا کے حقیقی بھائی سید ابو سعید کی صاحبزادی سے کرائی جن کا نام سیدہ نجیبہ عرف ناجیہ تھا ۔ بعض نے عافیہ لکھا ہے جو صحیح نہیں ۔''[2]

''سید احمد شہید'' بیس سالہ تحقیق و جستجو کا حاصل ہے اور اس سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس میں ہر معاملے اور ہر مسئلے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ قرینِ صحت معلومات مہیا کی گئی ہوں گی ، اور ایسا ہے بھی ، لیکن اس کے باوجود اکثر موقعوں پر سید احمد شہید میں بھی مولانا مہر کے مخصوص جملے نظر آتے ہیں ۔ مثلاً غالباً ، معلوم نہیں ، معلوم نہیں ہو سکا ، صحیح تاریخ معلوم نہیں اور جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہوں وغیرہ ۔ اگرچہ اس قسم کے جملوں سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مولانا مہر کو زیر بحث مسئلے کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور انھوں نے اس کی طرف توجہ بھی کی ہے لیکن ناکافی حوالوں کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مولانا مہر غیر محتاط مورخین کی طرح قارئین کو غلط معلومات فراہم کرنے کی بجائے ایک دیانت دار مؤرخ کی حیثیت سے اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے معذرت کر لیتے ہیں ۔ اس کے باوجود اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ یہ جملے سید احمد شہید میں تشنگی کا احساس دلاتے ہیں اور بہت سے پہلو اس قدر مبسوط کتاب کے باوجود پردۂ اخفا میں رہتے ہیں ۔

۱۔ سید احمد شہید ، ص ۵۴ ۔

۲۔ سید احمد شہید ، ص ۵۶ ۔

اس کے علاوہ بعض اوقات یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ مولانا مہر تاریخ کے حقیقی تقاضوں کو فراموش کر کے سوانح نگار کے عام طریق کار کے مطابق غیر جانبداری کو نبھانے میں ناکام رہے ہیں ۔ اس سلسلے میں سید احمد شہید کی بعض سیاسی غلطیوں کے بارے میں اختیار کیا جانے والا انداز بیان قابل دید ہے ، جہاں مولانا مہر غلطیوں کو غلطی قرار دینے کی بجائے ان کے جوازات تلاش کرنے لگتے ہیں ۔ بہرحال اپنی چند خامیوں کے باوجود سید احمد شہید ایک اچھی سوانح عمری کے علاوہ ایک قابل قدر تاریخ بھی ہے اور اس کی ترتیب و تدوین کی مشکلات کو پیش نظر رکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ مولانا مہر نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جو اس موضوع پر کام کرنے والے کسی دوسرے محقق کے حصے میں نہیں آیا ۔

۲- جماعت مجاہدین :

تحریک مجاہدین کے سلسلے کی دوسری کتاب ''جماعت مجاہدین'' ہے ۔ اس کے پہلے حصے میں تحریک سے متعلق بعض بنیادی مباحث پیش کیے گئے ہیں جبکہ دوسرے حصے میں تحریک سے متعلق ان اکابر کے سوانحی خاکے پیش کیے گئے ہیں جو معرکۂ بالاکوٹ میں شہید ہوگئے ، تحریک کی کامیابی سے مایوس ہوکر کنارہ کش ہوگئے یا پھر انتظامی امور کی انجام دہی کے سلسلے میں اندرون ہند کے علاقوں میں آ گئے ۔

پہلے حصے میں ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے تحریک کے بنیادی خد و خال بالوضاحت سامنے آ جاتے ہیں ۔ اس سلسلے میں بعض مباحث تو ایسے ہیں جو اگرچہ ''سید احمد شہید'' میں بھی تفصیل کے ساتھ پیش کیے جا چکے ہیں لیکن کچھ مباحث ایسے بھی ہیں جن کا ذکر سید احمد شہید میں محض ضمناً آیا ہے ۔ اول الذکر مباحث کے سلسلے میں سب سے اہم موضوع یہ ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک اصلاً کس کے خلاف تھی ؟ جماعت مجاہدین میں کچھ نئے مآخذ کی روشنی میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے ۔ اس سلسلے میں سلطان ہرات ، شہزادہ کامران اور ہندو راؤ کے نام سید صاحب کے خط بطور سند پیش کیے ہیں ۔ اس کے علاوہ مومن کے ایک نعتیہ قصیدے کے دعائیہ اشعار پیش کر کے بھی یہی نتیجہ نکالا گیا ہے کہ تحریک مجاہدین صرف سکھوں کے خلاف نہ تھی بلکہ اس کا مقصد تمام ہندوستان کو آزاد کرانا تھا ۔

لئے مباحث تحریک کے تنظیمی امور سے متعلق ہیں اور ان کا کچھ ذکر سید احمد شہید میں بھی آیا ہے لیکن جماعت مجاہدین میں تنظیم کے مختلف پہلوؤں کو پوری تفصیل کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے ۔ مثلاً یہ بتایا گیا ہے کہ تحریک کو کس طرح منظم کیا گیا ؟ تنظیم کی مالی ضروریات کی کفالت کا کیا طریقہ تھا ؟ وغیرہ ۔ اس سلسلے میں مولانا مہر نے تحقیق کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھتے ہوئے تمام ضروری تفاصیل پیش کر دی ہیں ؛ مثلاً خفیہ خط و کتابت جس کے لیے مرموز پیرایۂ بیان اختیار کیا جاتا تھا ، کی وضاحت کے لیے مرموز خطوط کے نمونے پیش کیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ مرموز خطوط کے لیے زیادہ تر عربی زبان اختیار کی جاتی تھی اور خطوط پر مکتوب نویس اور مکتوب الیہ کا نام بھی نہیں لکھا جاتا تھا ۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا تھا ۔ مثلاً اگر چار سو روپے کی رسید بھیجنا ہوتی تو لکھا جاتا :

''مرتبۂ ثالثہ میں خلفائے راشدین کی تعداد کے مطابق ۔''[1]

"جماعت مجاہدین" کا دوسرا حصہ تحریک کے اکابر کی سوانح پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں جتنے مجاہدین کے حالات پیش کیے گئے ہیں ، ان کا ذکر سید احمد شہید میں بھی ہو چکا ہے ۔ البتہ کچھ مجاہدین کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے اور کچھ کا اختصار کے ساتھ ۔ لیکن یہ صورت حال ''جماعت مجاہدین'' کے سوانحی خاکوں کی بھی ہے ۔ بعض بزرگوں کے حالات کئی کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ، مثلاً مولانا عبدالحئی ، شاہ اسماعیل شہید اور مولانا محمد یوسف پھلتی وغیرہ ، جبکہ کچھ مجاہدین کا تذکرہ صرف چند سطور میں کیا گیا ہے جس کے باعث اکثر موقعوں پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ مولانا مہر کے پاس اس کے سوا چارۂ کار بھی کیا تھا ؟ اس لیے کہ تحریک میں ایسے بے شمار لوگ بھی شامل تھے جو تحریک میں شمولیت سے قبل بھی غیر معروف تھے اور شہادت یا تحریک سے علیحدگی کے بعد بھی گوشۂ گمنامی ہی میں رہے - اس صورت میں یہ کام بھی قابل قدر ہے کہ جس حد تک حالات مل سکے وہ پیش کر دیے گئے -

---

۱- جماعت مجاہدین ، ص ۵۵ -

۳۔ سرگزشتِ مجاہدین :

"سرگزشت مجاہدین" تحریک کے سلسلے کی تیسری اور آخری کتاب ہے۔ اس میں سید احمد شہید کی شہادت سے لے کر تقسیمِ ہند تک تحریک کے تقریباً تمام مراحل کو ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ موضوع ایسا ہے کہ مولانا مہر سے قبل کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا تھا، اس کے باوجود مولانا مہر حالات و واقعات کی گم گشتہ کڑیوں کو تلاش کرنے میں کامیاب رہے۔ اگرچہ سرگزشت مجاہدین میں تمام ضروری تفاصیل آ گئی ہیں، اس کے باوجود اسے معرکۂ بالاکوٹ کے بعد تحریک کا مکمل نقشہ قرار دینا بہت مشکل ہے، جیسا کہ خود مولانا مہر بھی اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "جو کچھ میں نے لکھا ہے، مجھے پورا احساس ہے کہ یہ حرفِ آخر نہیں اور انسان کی کون سی کوشش کسی کام میں حرفِ آخر سمجھی جا سکتی ہے؟ ابتدائی ادوار کی سرگزشت میں بھی بعض خلا محسوس ہوتے ہیں جنھیں میں پُر نہ کر سکا اور آخری دور کے تو سینکڑوں افراد و رجال ہیں جن میں سے اکثر کے نام بھی معلوم نہ ہو سکے، اور بعض کے نام معلوم ہوئے تو حالات نہ مل سکے۔ تاہم ایک خاکہ تیار ہو گیا ہے جس کا ہر حصہ تاریخی شواہد پر مبنی ہے۔"[1]

اگرچہ جماعتِ مجاہدین اور سرگزشتِ مجاہدین میں کچھ خلا ملتے ہیں اور ان دونوں کتابوں میں کچھ خامیاں بھی ہیں، اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں کہ مولانا مہر نے ایک دیانت دار مؤرخ کے فرائض کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے اور وہ منقول و معقول سے کام لے کر تحریکِ مجاہدین کے ہر اہم پہلو کو سامنے لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

تحریکِ مجاہدین کے بعد مولانا مہر کا دوسرا بڑا موضوع اٹھارہ سو ستاون کی جنگِ آزادی ہے۔ اٹھارہ سو ستاون کی جنگِ آزادی اور تحریکِ مجاہدین میں یوں تو کئی پہلوؤں سے مماثلت پائی جاتی ہے لیکن اس سلسلے میں یہ بات حد درجہ اہم ہے کہ جنگِ آزادی کے ضمن میں دی گئی قربانیاں بھی ماضی

۱۔ سرگزشتِ مجاہدین، ص ۱۱۔

کے دبیز پردوں میں دفن ہو کر رہ گئیں ۔ انگریز مؤرخین نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ، وہ یک طرفہ پروپیگنڈے کے سوا کچھ نہ تھا ، جبکہ ہندوستانی مؤرخین بھی برطانوی حکومت کے مؤقف کی تائید میں دلائل فراہم کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے ۔ اگر بعض لوگوں نے کچھ لکھنے کی کوشش کی تو اسے عام قارئین تک پہنچنے نہیں دیا گیا ۔ اس صورت حال میں آزادی کے متوالوں کے کارناموں کو وقتی ہنگامہ آرائی اور اسی مناسبت سے غدر کا نام دے دیا گیا ، حالانکہ حالات و واقعات کے حقیقی پس منظر میں جو تصویر بنتی ہے وہ اس تصویر سے بہت مختلف ہے ، جسے مخصوص مقاصد کے تحت پیش کیا جاتا رہا ہے ۔ مولانا مہر کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو میں پہلی بار حقیقی تصویر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ۔

جنگِ آزادی کے سلسلے کی مولانا غلام رسول مہر کی دو کتابیں یعنی ''۱۸۵۷ء'' اور ''۱۸۵۷ء کے مجاہد'' ملتی ہیں ۔ پہلی کتاب میں نہ صرف برعظیم کے مختلف شہروں اور علاقوں میں آزادی کے سلسلے میں کی گئی کوششوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے ، بلکہ اُن اسباب و محرکات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو اس محاربۂ عظیم کا سبب بنے تھے ، جبکہ ''اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد'' میں ان افراد و رجال کے سوانحی حالات قلم بند کیے گئے ہیں جنہوں نے جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا ۔

۳- ''۱۸۵۷ء'' :

''۱۸۵۷ء'' میں مولانا مہر کی تاریخ نویسی کی جملہ خوبیاں موجود ہیں جبکہ وہ خامیاں بہت کم ہیں جن کا ذکر ''سید احمد شہید'' ، ''جماعتِ مجاہدین'' اور ''سرگزشت مجاہدین'' کے ضمن میں کیا گیا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مولانا مہر نے سوانح نگار کی بجائے ایک مؤرخ کی حیثیت سے قلم اٹھایا ہے اور ایک سچے مؤرخ کی طرح واقعات کو غیر جانب دارانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اگرچہ بعض مقامات پر یہاں بھی ایسا لگتا ہے کہ مولانا مہر مجاہدین سے ہمدردی رکھتے ہیں ، اس کے باوجود انہوں نے غیر جانبداری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے صرف انگریزوں ہی کے ظلم و جور کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا بلکہ جہاں جہاں ضرورت محسوس کی ، مجاہدین کی کوتاہیوں کا ذکر بھی برملا کیا ہے ۔ مثلاً مولانا مہر جہاں مغل شہزادوں کے بے دردانہ

قتل کو ظالمانہ فعل قرار دیتے ہیں وہیں کان پور اور جھانسی وغیرہ میں معاہدہ طے ہو جانے اور انگریزوں کی طرف سے حوالگی کے باوجود مجاہدین کے بے جا غضب و جوش انتقام کے سبب پیش آنے والے واقعات کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ مثلاً کان پور میں انگریزوں کے قتلِ عام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''قرآن مجید کا واضح اصول ہے کہ ایک کی ذمہ داری کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ ایک کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لینا نہ شرعاً درست ہے نہ اخلاقاً۔ اور جو کچھ ستی چوڑا گھاٹ پر ہوا، اس پر یقیناً ہر شخص کو افسوس ہونا چاہیے۔''[۱]

اسی طرح مجاہدین کی سرفروشانہ سرگرمیوں سے ہمدردی رکھنے کے باوجود مولانا مہر موقع بہ موقع بادشاہ، شہزادوں اور مجاہدین پر تنقید کرتے ہیں۔ مثلاً جب وہ چار ماہ چار دن پر محیط آزادی کے دنوں میں دہلی کے نظم و انصرام کا نقشہ کھینچتے ہیں تو بہادر شاہ ظفر اور شہزادوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اسے سامنے رکھ کر دل پر یہ اثر نہیں پڑتا کہ اربابِ اختیار کے دل و دماغ کو نظم و ترتیب سے کوئی مناسبت تھی یا وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے تھے یا انھیں خیال تھا کہ عوام کو انگریزی دور کے مقابلے میں زیادہ آرام پہنچائیں، یا اتفاق کی بنا پر انگریزی دور سے نجات کی جو صورت پیدا ہوگئی تھی اس میں استقلال و استحکام پیدا کرنے کی کوشش کریں۔''[۲]

مولانا مہر کی تاریخ نویسی کی نمایاں ترین خوبی ان کا محققانہ انداز ہے جو ''۱۸۵۷ء'' میں بھی بدرجۂ احسن موجود ہے۔ اول تو مولانا مہر نے اپنے مؤقف کو ثابت کرنے کے لیے معمولی سے معمولی جزئیات و تفصیلات کے لیے بھی تاریخی اسناد اور حوالے پیش کیے ہیں، دوسرے کوشش کی ہے کہ مجاہدین کے کارناموں کو اجاگر کرنے کے لیے زیادہ تر انگریز اور ان سے ہمدردی رکھنے والے مؤرخین کی تحریروں سے حوالے پیش کیے جائیں۔ اس سلسلے میں یوں تو

۱- ''۱۸۵۷ء''، از مولانا غلام رسول مہر، ص ۳۲۶-

۲- ''۱۸۵۷ء''، از مولانا غلام رسول مہر، ص ۱۵۸-

۱۸۵۷ء کے کئی مباحث کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ، لیکن وہ بحث خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے کہ اسے غدر کہنا چاہیے یا جنگِ آزادی ۔ جن مؤرخین نے اسے غدر قرار دیا ان کے پیشِ نظر صرف یہ امور تھے کہ انگریزی حکومت کے خلاف یہ وقتی ہنگامہ آرائی تھی جو صرف دیسی افواج کی طرف سے ہوئی ، اس میں عوام شامل نہیں تھے ۔ یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ یہ بغاوت ناکام ہوگئی لہذا اسے غدر کہنا چاہیے ۔ مولانا مہر نے نہ صرف ان تمام دلائل کا تجزیہ کیا بلکہ مختلف مؤرخین کے حوالے سے یہ بات بھی ثابت کی کہ نہ تو جنگِ آزادی وقتی ہنگامہ آرائی تھی اور نہ اس میں صرف دیسی افواج کا ایک حصہ شامل تھا بلکہ افواج اور عوام میں انگریزی حکومت کے خلاف ناراضی کے اسباب مختلف وجوہ کی بنا پر آہستہ آہستہ فراہم ہو رہے تھے ۔ جب یہ اپنی انتہا پر پہنچ گئے تو انقلاب فرانس کی طرح ایک معمولی سے واقعے کی وجہ سے نفرت کا شدید جذبہ سرکشی اور بغاوت کی صورت اختیار کر گیا ۔ اور یہ بغاوت صرف دیسی افواج کی طرف سے نہیں ہوئی تھی اور نہ صرف ان لوگوں تک محدود تھی جن کی جاگیریں اور ریاستیں چھنی تھیں بلکہ اس میں ہندوستانی باشندوں کے تقریباً ہر طبقے نے حتی المقدور حصہ لیا ۔ مثلاً جنگِ آزادی میں علمائے کرام کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "واضح رہے کہ سینکڑوں دوسرے کارکنوں کے علاوہ ایک ایسا گروہ بھی موجود تھا جس نے جنگِ آزادی میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا لیکن ان کے سامنے ذاتی اغراض کوئی نہ تھیں ۔ نہ ان میں سے کسی کی ریاست چھنی تھی ، نہ کسی کی پنشن ضبط ہوئی تھی ، نہ کوئی اور شکایت تھی . . . ان کا نصب العین آزادی وطن کے سوا کچھ نہ تھا ۔ وہ اسی غرض سے انگریزوں کے خلاف لڑے ۔"[۱]

مولانا مہر اس قسم کے ضروری مباحث کو بڑی خوبی سے واضح کرتے ہیں اور اپنے موقف کی تائید میں دلائل و براہین کے انبار لگا دیتے ہیں ۔ لیکن انھوں نے بے معنی اختلافات پر بحث کرنے سے گریز کیا ہے ۔ اس سلسلے میں

۱- "۱۸۵۷ء" ، ص ۳۷ ۔

بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ مثلاً میرٹھ میں سرکشی اور بغاوت کے بعد دیسی افواج نے جو کچھ کیا اس کے بارے میں خاصے تضادات ہیں ۔ خاص طور پر قیدیوں کو رہا کرانے کی کوشش کے ضمن میں مختلف مؤرخین نے متضاد واقعات بیان کیے ہیں لیکن مولانا مہر اس نوعیت کے کم اہم تضادات کو حل کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے اور صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں :

"ہمیں اختلافات پر بحث کرنے میں وقت صرف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ قیدیوں کو رہا کرا لیا گیا اور جنگ آزادی شروع ہو گئی ۔"[1]

لیکن بعض مقامات پر خود مولانا مہر کی تحریروں میں تضادات آ گئے ہیں جن کی بنا پر قاری کے لیے اصل حقیقت تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر کے کردار کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔ یہ تو طے ہے کہ وہ پیرانہ سالی اور ضعف و ناطاقتی کے باعث کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکا لیکن یہ سوال بھی بہت اہم ہے کہ آیا وہ اس بغاوت میں شامل ہونے کے لیے تیار بھی تھا یا محض میرٹھ اور گرد و نواح سے آنے والی افواج کی بنا پر کوئی دوسرا چارۂ کار نہ پاتے ہوئے بغاوت پر مجبور ہو گیا ۔ مولانا مہر انگریزوں سے بہادر شاہ ظفر کی ناراضی کے اسباب اور جنگ آزادی میں اس کی شمولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ بہادر شاہ اصولاً بھی انگریزوں کا خیرخواہ نہیں ہو سکتا تھا اور مذکورہ بالا دو شکایتوں کی وجہ سے اس کے ملال و ناراضی میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا ۔ وہ خود اپنے بڑھاپے ، طبعی کاہلی ، آرام طلبی یا فقدان سامان کے باعث کوئی مؤثر قدم اٹھا سکتا یا نہ اٹھا سکتا لیکن جو ہنگامہ اس کی خواہش یا کوشش کے بغیر بپا ہو گیا تھا اس سے فائدہ اٹھانے میں اسے قطعاً تامل نہیں ہو سکتا تھا ۔"[2]

۱- "۱۸۵۷ء" ، ص ۱۰۲ ۔
۲- "۱۸۵۷ء" ، ص ۱۱۶ ۔

اسی طرح کے بیانات سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر بغاوت کا نہ صرف خواہاں تھا بلکہ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے اختیارات واپس لینے کی خواہش بھی اس کے دل میں موجود تھی ۔ لیکن دوسری جگہ مولانا مہر جو کچھ لکھتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر اس بغاوت میں خوش دلی سے شامل نہیں ہوا تھا ۔ وہ لکھتے ہیں :

''بادشاہ یا اس کے مشیروں کو اس ہنگامے کے آغاز یا اس کے بارے میں ساز باز سے قطعاً کوئی علاقہ نہ تھا بلکہ جب تک میرٹھ کی سپاہ دہلی نہ پہنچ گئی کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ کوئی ہنگامہ بپا ہو چکا ہے ۔ اس وقت تک اکثر لوگوں کو یقین ہوگا کہ انگریز جلد سے جلد تعاقب میں پہنچیں گے ، اس لیے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ لوگ سرکش سپاہ کے خیرمقدم کے لیے بھی دل سے تیار نہ ہوں گے ۔ تاہم جب تک معاملات کی باگ ڈور سپاہ کے ہاتھ میں تھی ان کے لیے عافیت کی راہ یہی تھی کہ اپنی دلی بے اطمینانی یا نا رضامندی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے ۔''[1]

مولانا مہر کی دیگر تاریخی کتابوں کی طرح ''۱۸۵۷ع'' میں بھی یہ صورت نظر آتی ہے کہ بعض اوقات وہ کسی واقعے کے بارے میں کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے ، البتہ اس سلسلے میں سامنے آنے والی تمام روایات کو پیش ضرور کر دیتے ہیں ؛ مثلاً بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

''بادشاہ کی گرفتاری کو عموماً ۲۱ ستمبر کا واقعہ بتایا گیا ہے ۔ بعض بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرفتاری ۲۲ ستمبر کو ہوئی ۔''[2]

اگرچہ مولانا مہر نے جنگِ آزادی کے واقعات کو پیش کرتے ہوئے ایک غیرجانب دار مؤرخ کی حیثیت سے اپنا فرض انجام دینے کی کوشش کی ہے اور انگریزوں کے ساتھ ساتھ مجاہدین کے ناروا اقدامات کی بھی مذمت کی ہے ، اس کے باوجود تحریک سے ہمدردی کے باعث بعض اوقات مولانا مہر غیر جانب داری

۱- ''۱۸۵۷ع'' ، ص ۱۳۰ ۔
۲- ''۱۸۵۷ع'' ، ص ۱۹۵ ۔

کو نبھانے میں ناکام رہے ہیں ۔ اور ایسے مواقع پر خود انھیں بھی احساس ہوگیا ہے کہ تاویلات و جوازات کا یہ سلسلہ ان کے دائرۂ کار میں نہیں آتا ، جیسا کہ وہ دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل کے واقعات کو پیش کر چکنے کے بعد لکھتے ہیں :

”عورتوں اور بچوں یا اُن لوگوں کے قتل کی کوئی وجہ نہ تھی جو جنگ کے قابل نہ تھے یا جن کے ذریعے کسی تادیبی کاروائی کا امکان نہ تھا ۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ عام ہنگامہ بھی ہوتا ہے تو اکثر آدمی حق و ناحق کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں اور ان پر ایک خاص قسم کی جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ سرکشوں پر بھی ایک جنونی کیفیت طاری تھی ۔“[1]

مولانا مہر کی تاریخی کتب میں پائے جانے والے بعض مخصوص جملے ”۱۸۵۷ء“ میں بھی نظر آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ ان امور کی طرف مولانا مہر کی توجہ تھی لیکن سو سال پیشتر گزرے ہوئے واقعات کے ضمن میں ضروری تفصیلات فراہم نہ ہو سکیں ۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولانا مہر نے اس کتاب میں اپنی دیگر تاریخی کتب کے مقابلے میں قیاس سے بہت زیادہ کام لیا ہے اور ہر جگہ تخیل و تصور سے واقعات کے نقوش ابھارنے کی کوشش کی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ”۱۸۵۷ء“ میں ”ہوگیا ہوگا“ قسم کے جملے بہت ملتے ہیں ۔

۵- ۱۸۵۷ء کے مجاہد :

جنگِ آزادی کے سلسلے کی دوسری کتاب ”۱۸۵۷ء کے مجاہد“ ہے جس میں تحریکِ آزادی میں حصہ لینے والے مجاہدین کے حالاتِ زندگی پیش کیے گئے ہیں ۔ ابتدا میں یہ کتاب لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور خیال تھا کہ ”۱۸۵۷ء“ میں ہی موقع بموقع مجاہدین کے حالات بھی آ جائیں گے ۔ لیکن بعد ازاں یہ خیال ترک کر دیا گیا ، جیسا کہ خود مولانا مہر ”۱۸۵۷ء“ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱- ”۱۸۵۷ء“ ، ص ۱۲۵ ۔

''نصف سے زیادہ کتاب مرتب ہو چکی تو احساس ہوا کہ اس میں افراد و رجال کے سیر و سوانح کو شامل کرنا سراسر تکلف ہوگا ، اس لیے کہ اصل کتاب اپنے موضوع اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے تاریخی ہے اور سیر و سوانح کا دائرہ بالکل جداگانہ ہے ۔ دونوں میں پیوند کی حیثیت وہی ہوگی جیسے دو مختلف المزاج جنسوں میں امتزاج پیدا کیا جائے ۔''[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ''اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد'' تاریخ کی کتاب نہیں ہے ، بلکہ سیر و سوانح کی ہے ، اگرچہ مختلف تاریخی شخصیات کے حالاتِ زندگی کی پیش کش کی وجہ سے اسے تاریخ کے دائرے میں بھی لایا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں جو امور بطور خاص پیشِ نظر رہنے چاہئیں ، ان میں اولین بات تو یہ ہے کہ ''۱۸۵۷ء کے مجاہد'' میں تحریک کے بعض نامور رہنماؤں کے حالاتِ زندگی نہیں ملتے ، مثلاً بہادر شاہ ظفر اور زینت محل وغیرہ ۔ اگرچہ ان رہنماؤں کے سوانحی حالات شامل نہ کرنے کے بارے میں مولانا مہر نے ایک جواز پیش کر دیا ہے ، یعنی یہاں پر یہ حالات اس لیے شامل نہیں کیے گئے کہ ''۱۸۵۷ء'' میں تفصیل سے آ چکے ہیں ۔ لیکن اول تو اگر وہ یہاں بھی دے دیے جاتے تو کتاب زیادہ مکمل ہو جاتی اور اس کا دائرۂ افادیت بڑھ جاتا ۔ دوسرے زینت محل کے حالاتِ زندگی ''۱۸۵۷ء'' میں بھی یک جا اور مفصل نہیں ملتے ۔ غالباً یہ حالات زیرِ نظر کتاب میں اس لیے نہیں دیے گئے کہ دونوں کتابوں میں تکرار نہ ہو ، لیکن اس احتیاط کے باوجود تکرار موجود ہے ۔ مثلاً رانی لکشمی بائی کے جو حالات ''اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد'' میں پیش کیے گئے ہیں ، ان میں سے زیادہ تر ''۱۸۵۷ء'' میں جھانسی میں جنگِ آزادی کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے معرضِ بیان میں آ چکے ہیں ۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگرچہ نامور شخصیات کے حالات کی فراہمی ایک قابلِ قدر کوشش ہے ، اس کے باوجود حد سے زیادہ اختصار کے باعث تشنگی کا احساس ہوتا ہے ۔ یوں لگتا ہے جیسے مولانا مہر اس کتاب پر زیادہ محنت نہیں کر سکے ۔ اس سلسلے میں صرف جنرل بخت خاں سے متعلق باب کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔ جنرل بخت خاں کا شمار جنگِ آزادی کی انتہائی

۱- ''۱۸۵۷ء کے مجاہد'' ، ص ۷

معروف شخصیات میں ہوتا ہے ، لیکن اس کے حالات زندگی آٹھ دس اوراق میں سما گئے ہیں ۔ ان میں بھی صورت یہ ہے کہ بیس سے زائد مرتبہ اس قسم کے جملے نظر آتے ہیں کہ ''تفصیل نہیں مل سکی'' ''کچھ معلوم نہ ہو سکا'' ''وثوق سے نہیں کہہ سکتے'' ، ''یہ معلوم نہیں'' ''ممکن ہے یہ رائے درست ہو'' ، ''حالات معلوم نہ ہو سکے'' یا ''یقینی طور پر معلوم نہیں'' وغیرہ وغیرہ ۔ اس کے علاوہ بخت خاں کی مختلف سرگرمیوں کے بارے میں متضاد بیانات کو بھی جوں کا توں پیش کر دیا گیا ہے ۔ مثلاً بخت خاں کے دہلی پہنچنے کے بعد انگریزوں سے پہلی جنگ کے بارے میں مورخین کے متضاد بیانات ملتے ہیں ۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ جنرل بخت خاں خود فوج لے کر علی پور کی طرف بڑھا تھا تاکہ محاصرہ کرنے والی انگریز افواج کی رسد کا راستہ کاٹ سکے ، جبکہ بعض مورخین اس جنگ میں جنرل بخت خاں کی شمولیت کو نہیں مانتے ۔ مولانا مہر نے دونوں روایات پیش کر دی ہیں اور قاری کو جوں کا توں الجھن میں چھوڑ دیا گیا ہے ۔ یہ تو اس شخصیت کے سوانحی حالات کا ذکر ہے جو اس عہد کی نامور ترین شخصیات میں شامل تھی ۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دیگر مجاہدین کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں کیا صورت رہی ہوگی؟ بعض مجاہدین کے حالات میں تو صرف چند سطور پر اکتفا کیا گیا ہے ۔ بہرحال ان تمام پہلوؤں کے باوجود یہ امر لائق توجہ ہے کہ تشنہ اور مختصر ہی سہی لیکن مولانا مہر نے تحریکِ آزادی کے نامور مجاہدین کے حالات یکجا کر دیے ہیں ۔

٦- تاریخِ سندھ :

اپنے مخصوص موضوعات کے بعد مولانا مہر کی سب سے اہم تاریخی کتاب ''تاریخِ سندھ'' ہے ۔ سندھی ادبی بورڈ نے صوبہ سندھ کی تاریخ مرتب کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا ، یہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے ، جس میں مولانا مہر نے کلہوڑا خاندان کے طویل دورِ حکومت کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ناکافی مواد کے باوجود عرق ریزی اور محنت سے کام لیتے ہوئے تقریباً ایک ہزار صفحے کی دو جلدیں تیار کر دیں ۔ مولانا مہر کی کاوش کا اعتراف کرتے ہوئے حسام الدین راشدی لکھتے ہیں :

''مولانا مہر نے بڑی سعی و کاوش سے کلہوڑا دور کی سرگزشت مرتب کی ہے اور سراسر غیر متوقع مصادر سے منتشر مواد فراہم کرکے واقعات

ایک سلک میں پروئے اور مسلسل داستان اس طرح تیار کر دی کہ ایک سرسری نظر ڈال لینے سے کلہوڑوں کے عہد کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ۔''[1]

''سید احمد شہید'' اور ''۱۸۵۷ع'' کی طرح ''تاریخ سندھ'' میں بھی مولانا مہر کی تاریخ نویسی کے جملہ معائب و محاسن پائے جاتے ہیں ۔ یہ محققانہ اور سائنٹیفک تاریخ نویسی کا شاندار مرقع ہے ۔ یوں تو مولانا مہر نے ماضی کی گرد میں لپٹے ہوئے تقریباً سبھی واقعات کو روایت و درایت کے اصوں کی روشنی میں چھان پھٹک کر مرتب کیا ہے ، لیکن بعض امور میں حقیقت تک رسائی کا انداز خاص طور پر قابلِ داد ہے ۔ اس سلسلے میں کلہوڑا خاندان کے مختلف شجرہ ہائے نسب کے بارے میں مولانا مہر کی بحث کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔ مولانا مہر نے ان تمام شجروں کی تغلیط میں دلائل کے جو انبار لگائے ہیں ، وہ قابلِ تحسین ہیں اور بحیثیت مورخ ان کی وسعتِ نظر کا ثبوت پیش کرتے ہیں ۔

تحقیق و تفتیش کے اصولوں کے مطابق واقعات کو پیش کرتے ہوئے مولانا مہر کو اکثر مقامات پر واقعات کی کڑیوں کا سراغ نہ ملنے کے باعث قیاس سے کام لینا پڑا ۔ جیسا کہ وہ خود اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں :

''اس موضوع پر یہ پہلی مفصل و مستند کتاب ہے ۔ کہیں کہیں قیاس سے بھی کام لینا پڑا ۔ لیکن یہ قیاس محکم حقائق پر مبنی تھا ۔ اس لیے اُمید ہے انشاء اللہ درست ثابت ہوگا ۔''[2]

یہ ضروری نہیں کہ مولانا مہر کا قیاس ہر جگہ درست ثابت ہو ، لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ بحیثیت مورخ انھوں نے جملہ مصادر و ماخذ کھنگالنے کے بعد نتائج اخذ کیے اور جہاں جہاں خلا موجود تھے ان کو اس انداز میں پورا کیا ہے کہ اب موجود مصادر کی روشنی میں ان پر کسی طرح کا اضافہ مشکل ہے ۔ اور غالباً تاریخی واقعات کے سلسلوں کی مختلف کڑیوں کی عدم موجودگی میں ایک مورخ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتا ۔

۱۔ تاریخِ سندھ ، از مولانا مہر ، ص ۴ ۔
۲۔ تاریخِ سندھ ، از مولانا مہر ، ص ۴ ۔

کچھ مواقع ایسے بھی آئے ہیں جب کسی معاملے کے بارے میں مولانا مہر کے سامنے ایک سے زیادہ روایات موجود تھیں اور ان میں سے ہر ایک روایت کی تائید یا تردید کے لیے کچھ حوالے بھی موجود تھے ۔ ایسی صورت میں مولانا مہر نے تمام روایات کو پیش کرکے قرائن کی بنا پر قرین قیاس روایت کو قبول کر لیا ہے ۔ اس سلسلے میں کلہوڑا خاندان کی وجہ تسمیہ کے ضمن میں بحث قابلِ ذکر ہے ۔ اس بارے میں دو مختلف روایات ملتی ہیں ۔ ایک روایت کے مطابق خاندان کو یہ نام اس وجہ سے ملا کہ خاندان کا ایک بزرگ ''کلور'' نام ایک پہاڑ میں مقیم رہا ۔ دوسری روایت کے مطابق یہ نام خاندان کے ایک بزرگ کو ترک و تجرید میں کمال حاصل کرنے کے باعث ملا ۔ مولانا مہر نے دلائل و براہین اور قیاس سے کام لے کر موخر الذکر روایت کو قبول کر لیا ۔ مولانا مہر دونوں روایات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''دونوں توجیہوں میں سے کسی ایک کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے ۔ لیکن حکیم صاحب کی توجیہ ہرہیچ ہونے کے باوجود زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے ۔ پہلی توجیہ کو قبول کرنا ، اس وجہ سے بھی ممکن نہیں کہ یہاں بحث خاندان کے اس بزرگ سے نہیں جو پہلے سندھ میں وارد ہوا اور اس نے حیدر آباد کے شمال میں ''کلور'' نام کسی مقام پر سکونت اختیار کی ۔ اس وجہ سے کلوڑ یا کلہوڑا مشہور ہوا ۔ یہاں سوال محمد مہدی ابن جام چینے خاں کا ہے جو یقیناً کلور نام کسی پہاڑی میں مقیم نہ ہوا اور اس نے کلہوڑے خاں کا لقب پایا ۔ اگر پہلے بزرگ سے یہ لقب ملا تو پورے خاندان کو کلہوڑا کہنا چاہیے ، نہ کہ اس کی صرف ایک شاخ کو ۔''[1]

لیکن بعض اوقات کسی ایک معاملے کے متعلق ایسی مختلف و متضاد روایات بھی مل جاتی ہے جن کی تردید یا تائید کے لیے کوئی قرینہ نہیں ملتا ۔ اس صورت میں مولانا مہر دونوں روایات پیش کر دیتے ہیں ۔ اس ضمن میں بختیار خاں ہنی کے انجام کے بارے میں مختلف روایات کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایسے مواقع پر صرف انہی روایات کو پیش کیا جا سکتا ہے جو متضاد ہونے کے باوجود عقلی طور پر قرین قیاس معلوم

۱۔ تاریخِ سندھ ، ص ۱۲۴ ۔

ہوں ۔ افسانوی اور ناقابلِ اعتبار روایات کے لیے "تاریخِ سندھ" میں کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ اس سلسلے میں خود مولانا مہر لکھتے ہیں :

"مختلف کتابوں سے قرین قیاس اور ممکن الوقوع حالات چن چن کر یہ داستان مرتب کر دی گئی ۔ غیر اغلب باتوں اور بعید از عقل افسانہ طرازیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ۔"[1]

مولانا مہر ماضی کے مردہ واقعات کا ذکر ہی نہیں کرتے بلکہ وضاحت کے ساتھ واقعات کا پس منظر بھی بیان کر دیتے ہیں تاکہ وہ تاریخ ساز محرکات و عوامل بھی قارئین کے سامنے آ سکیں جو کلہوڑوں کے عروج و زوال میں اہم کردار ادا کرتے رہے ۔ مثلاً کلہوڑوں کے عروج کا آغاز مغلوں کے ضعف و ناتوانی سے ہوا ۔ اسی طرح ہندوستان پر ایرانیوں اور افغانیوں کے حملوں کے باعث کلہوڑے بھی مشکلات کا شکار ہوئے ۔ مولانا مہر نے ان تمام حالات و واقعات کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ پیش کر دیا ہے ۔

ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ تاریخِ سندھ میں مولانا مہر کی تاریخ نویسی کے معائب بھی موجود ہیں ۔ مثلاً اس کتاب میں بھی جگہ جگہ ''معلوم نہیں'' ''معلوم نہ ہو سکا'' اور ''وثوق سے نہیں کہا جا سکتا'' وغیرہ جملے ملتے ہیں ۔ اس کے علاوہ بہت مفصل اور مستند تاریخ ہونے کے باوجود تاریخِ سندھ میں بھی بہت سے خلا نظر آتے ہیں ۔ مثلاً کلہوڑا خاں سے محمد آدم شاہ تک تقریباً نو پشتوں کا حال انتہائی اختصار کے ساتھ چند صفحات میں پیش کیا گیا ہے ۔

مولانا مہر کی بیشتر تاریخی کتب کی طرح تاریخ سندھ کے بارے میں بھی ایک سوال بار بار سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ تاریخ سندھ کو تاریخ کی کتاب سمجھا جائے یا سوانح عمری ؟ اس لیے کہ خالصتاً تاریخ ہونے کے باوجود مولانا مہر کی افتاد طبع کے باعث اس پر بھی سوانح عمری کا انداز غالب نظر آتا ہے ۔ بلکہ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خود مولانا مہر پر بھی واضح نہیں تھا کہ وہ تاریخ لکھ رہے ہیں یا سوانح عمری کی ترتیب میں مصروف ہیں ، جیسا کہ اس موضوع پر ماخذ و مصادر کی کمیابی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱- تاریخِ سندھ ، ص ۹۸ ۔

''میاں داؤد ہی نہیں بلکہ اس خاندان کے اکثر بزرگوں کے حالات ترتیب و تفصیل سے کسی نے نہیں لکھے ۔ لہذا سوانح نگار کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو کچھ بھی متفرق تاریخی دفاتر میں مرقوم ہے ، اسے چن چن کر ترتیب سے جمع کر دے اور ہر بیان کی حقیقت عام تاریخی احوال و سوانح کی روشنی میں واضح کرتا جائے ۔''[1]

صرف یہی نہیں بلکہ مولانا مہر واقعات کی پیش کش کے انداز کے اعتبار سے بھی مورخ سے زیادہ سوانح نگار قرار پاتے ہیں ، اس لیے کہ مختلف شخصیات کے بیان میں انھوں نے تاریخ کی غیر جانبداری کو نظر انداز کرکے شخصیت کے نقوش کو اس انداز میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ذہن پر ثبت ہو جائیں ۔ خاندان کلہوڑا کے مختلف افراد و رجال کے محاسن کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتے ہوئے ان کے معائب اور کوتاہیوں کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مثلاً یار محمد خاں پر ''امتیاز خان خالص'' کے قتل کے الزام میں مولانا مہر نے جو رویہ اختیار کیا ہے ، وہ مورخ کی بجائے سوانح نگار کے طریق کار سے مناسبت رکھتا ہے ۔

اس کتاب میں ایک نقص ایسا بھی ہے جس کا اعتراف خود مصنف نے بھی کیا ہے ۔ مثلاً مولانا مہر تاریخ سندھ کے مقدمے میں لکھتے ہیں :

''ایک کمی کا مجھے بخوبی احساس ہے اور وہ یہ کہ تعمیرات کے متعلق میں جو کچھ لکھنا چاہتا تھا اس کے لیے حسب دلخواہ معلومات مہیا کرنے کا موقع نہ ملا ۔''[2]

اس نقص کو دور کرنے کے لیے مولانا مہر نے تین مرتبہ سندھ کا سفر اختیار کیا اور کوشش کی کہ اس سلسلے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں ، لیکن ہر بار بعض موانعات کے باعث وہ کلہوڑا دور کی آبادیوں اور تعمیرات تک رسائی حاصل نہ کر سکے ۔

اس کے علاوہ ایک بہت اہم سوال یہ بھی ہے کہ کیا زیر نظر کتاب کو

۱- تاریخ سندھ ، ص ۱۵۲ -
۲- مقدمہ تاریخ سندھ ۔

تاریخِ سندھ کا نام دینا مناسب ہوگا ؟ یہ سوال اس لیے سامنے آتا ہے کہ کتاب کی دونوں جلدوں کا مطالعہ کرنے کے بعد قارئین کلہوڑا خاندان کے عروج و زوال کی داستان سے تو واقف ہو جاتے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جب کلہوڑا خاندان کے مختلف افراد رشد و ہدایت کی مسند اور معمولی زمینداری سے بڑھ کر عنان حکومت ہاتھ میں لینے کی کوشش کر رہے تھے ، اُس وقت سندھ کے ان حصوں کا کیا عالم تھا جو کلہوڑا خاندان کی جاگیر اور زمینداری میں شامل نہیں تھے ۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو زیرِ نظر کتاب کلہوڑا خاندان کی تاریخ ہے اور اسے صوبہ سندھ کی تاریخ قرار دینے میں تامل ہوتا ہے ۔ بہرحال اپنے معائب و نقائص کے باوجود ''تاریخِ سندھ'' اپنے موضوع کا احاطہ کرنے کے باعث کامیاب تاریخ قرار پاتی ہے اور کافی مآخذ و مصادر نہ ہونے کے باوجود ایک خاص عہد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مفصل اور مستند معلومات بہم پہنچاتی ہے ۔

۷۔ مختصر تاریخِ اسلام کامل :

ایک مورخ کی حیثیت سے مولانا غلام رسول مہر کو تحریک مجاہدین اور جنگِ آزادی سے تو خصوصی دلچسپی تھی ، جبکہ تاریخ سندھ پر بھی انھوں نے نہایت محنت اور توجہ سے کام کیا تھا ۔ لیکن اس کے علاوہ ان کی دیگر تاریخی کتابیں ، جنھیں متفرقات کے ذیل میں شمار کرنا چاہیے ، اس قابل نہیں ہیں کہ انھیں ایک بلند پایہ مورخ کے شایانِ شان قرار دیا جا سکے ، اور غالباً اس نقطۂ نظر سے وہ لکھی بھی نہیں گئیں ۔ اس نوعیت کی کتابوں میں سب سے پہلے ''مختصر تاریخِ اسلام'' کا ذکر آنا چاہیے ۔ جیسا کہ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے ، اس میں انتہائی اختصار کے ساتھ اسلامی تاریخ کے چیدہ چیدہ اور اہم واقعات کو پیش کر دیا گیا ہے ۔ اس کے اختصار کا یہ عالم ہے کہ خود مولانا مہر اسے مفصل اسلامی تاریخ کا محض مقدمہ قرار دیتے ہیں ۔''[۱] اس کی وجہ یہ ہے کہ ''مختصر تاریخِ اسلام'' مستقل تصنیف کی حیثیت سے مرتب نہیں کی گئی تھی ، بلکہ اسے مختلف جماعتوں کی نصابی ضروریات کے تحت تین حصوں میں لکھا گیا تھا جنھیں بعد ازاں استفادۂ عام کے نقطۂ نظر سے یکجا کرکے شائع کر

۱۔ مقدمہ مختصر تاریخ اسلام ، از مولانا مہر ، ص ۹ ۔

دیا گیا ۔ چونکہ ''مختصر تاریخِ اسلام'' نصابی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی تھی ، لہٰذا اس میں کسی مستقل اور بلند پایہ تاریخ کی خصوصیات بھی تلاش نہیں کرنی چاہییں ۔ البتہ اس میں ایک خوبی ضرور ہے اور وہ یہ کہ ایک نظر میں پوری تاریخِ اسلام کے چیدہ چیدہ واقعات سامنے آ جاتے ہیں ، اگرچہ بعض پہلوؤں سے اپنے بے تکے پن کے باعث ''مختصر تاریخِ اسلام'' اس ضرورت کو بھی پورا کرنے سے قاصر نظر آتی ہے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک طرف تو اس میں مصر ، بابل ، نینوا ، کنعان اور یونان و روم کی قدیم تہذیبوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن دوسری جانب بہت سی اسلامی مملکتوں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا ۔ مثلاً ''مختصر تاریخِ اسلام'' میں برصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور ان کی حکمرانی کا ذکر تک نہیں کیا گیا ۔ اسی طرح اگرچہ اس کتاب میں سابق شاہ ایران محمد رضا شاہ پہلوی کے ۱۹۵۰ء کے دورۂ پاکستان کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اسلامی ملک کی حیثیت سے پاکستان کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں لکھا گیا اسی طرح اور بہت سی نو آزاد مسلم مملکتوں کے بارے میں یہ تاریخ کچھ نہیں بتاتی ۔ گویا ''مختصر تاریخِ اسلام'' میں اختصار اور اس کے سبب تشنگی کے علاوہ بے تکے پن اور بے اعتدالی کا نقص بھی موجود ہے ۔

۸- آزادی کی جنگ :

مولانا مہر کی ایک اور تاریخی کتاب ''آزادی کی جنگ'' ہے ۔ یہ کتاب مولانا مہر اور مولانا عبدالمجید سالک نے مل کر مرتب کی تھی ۔ ''آزادی کی جنگ'' میں دوسری عالمی جنگ کے اسباب و محرکات اور پس منظر کے علاوہ جنگ کے ابتدائی دنوں کی کیفیت بھی پیش کی گئی ہے ۔ لیکن اس کتاب کے مندرجات کو دیکھتے ہوئے جو سوال سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا ایسے تاریخ کی کتابوں میں شامل کرنا مناسب ہوگا ؟ اس لیے کہ اس میں نہ صرف غیر جانبداری کے ساتھ واقعات و حالات کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ جو انداز اور اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے اس کی بنیاد پر اسے صاف لفظوں میں ہٹلر اور جرمنی کے خلاف اتحادی قوتوں کے پروپیگنڈے کا ایک حصہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔ یہ بات صرف واقعات کی پیش کش کے انداز اور اسلوب بیان ہی سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک بین ثبوت یہ بھی ہے کہ ''آزادی کی جنگ'' کا مقدمہ اُس وقت کے وزیر اعظم پنجاب سر سکندر حیات نے

تحریر کیا تھا ۔ ظاہر ہے کہ ادب و تاریخ سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں اور غالباً سر سکندر حیات کی انگریز پرستی اور مہر و سالک سے ان کی دوستی اس کتاب کی تالیف کا سب سے بڑا محرک ہے اور اسی پس منظر میں اس کی قدر و قیمت بھی واضح ہو جاتی ہے ۔

۹- سیاسیاتِ اسلامیانِ ہند :

''سیاسیاتِ اسلامیانِ ہند'' بھی اسی نوعیت کا کتابچہ ہے جس میں برعظیم کے فرقہ واری مسئلے کو مسلم لیگ اور اسلامیانِ ہند کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اسے بھی باقاعدہ تاریخ کی کتاب قرار دینا بہت مشکل ہے ۔

☆ ☆ ☆

چھٹا باب

مولانا غلام رسول مہر بحیثیت محقق

اردو میں تحقیق کا آغاز و ارتقاء اور مولانا مہر

تحقیق کے لغوی معنی صداقت ، حقیقت اور اصلیت تلاش کرنے کے ہیں ۔ گویا محقق تفتیش و جستجو سے کام لے کر مختلف اور بسا اوقات متضاد معلومات کی موجودگی میں حقیقت اور اصلیت کا کھوج لگاتا ہے اور روایت و درایت کے اصولوں کو سامنے رکھ کر کھوٹے سے کھرے کو الگ کرتا ہے ۔ یوں تو انسانی زندگی کے ہر شعبے میں تحقیق و تفتیش کی اہمیت مسلّم ہے لیکن علوم و فنون کے میدان میں اس کی رہنمائی کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھنا ناممکن ہے ۔ علم و فن کی کسی بھی شاخ کو لے لیجیے ، جب تک محقق کی پیش کردہ معلومات کو راہ نما نہ بنایا جائے گا ، اُس وقت تک صحیح اور مثبت نتائج کی توقع عبث اور فضول ہوگی ۔ اور چونکہ مختلف فنون میں ادب بھی شامل ہے لہذا اس کی رنگین و دیدہ زیب عمارت کی تعمیر و تشکیل بھی محقق ہی کے خونِ جگر کی مرہون منت ہے ۔

تخلیقی ادب کے مقابلے میں تحقیق ایک خشک اور بے رنگ چیز ہے ۔ لیکن یہ تحقیق ہی ہے جو مختلف اصنافِ ادب کو وہ رنگ و آہنگ عطا کرتی ہے کہ دیکھنے والی نگاہیں خیرہ ہو جائیں ۔ دراصل تخلیقی فنکار بھی اپنی تمام تر توانائیوں کے باوجود محقق کی جانفشانی کا محتاج ہوتا ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ بعض اصنافِ ادب مثلاً اردو میں غزل وغیرہ کے فنکار کے لیے محقق کی خدمات کی ضرورت نہیں ، لیکن یہ محض ایک مفروضہ ہی ہے ، اس لیے کہ لفظ و معانی کے رشتہ و ربط سے لے کر معاشرتی ، مذہبی اور شعری روایات تک کی پیش کش میں خود شاعر کا تنقیدی اور محققانہ ذہن کارفرما ہوتا ہے ۔ یہی ذہن و رجحان شاعر کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کے بہترین اور مؤثر اظہار کے لیے

تحقیق و جستجو کے بعد عمدہ سے عمدہ لفظ منتخب کرے ۔ اگر شاعری میں یہ عمل کارفرما نہ ہو تو کوئی شخص شاعر تو بن سکتا ہے لیکن اچھا شاعر ہرگز نہیں بن سکتا ۔

یہ تو ایسی اصناف کی بات تھی جن کی رنگینی و رعنائی کو تحقیق کی خشکی اور بے رنگی سے بظاہر دور کا بھی واسطہ نہیں ، جبکہ بعض ایسی اصنافِ ادب بھی ہیں جن کے رنگ و روپ کی تمام تر ذمہ داری صرف تحقیق کے خون گرم پر منحصر ہے ۔ اس ضمن میں تاریخِ ادب اور سوانح نگاری وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں ۔ جبکہ تنقید بھی ، جو بجائے خود صداقت و حقیقت کی متلاشی ہوتی ہے ، تحقیق سے بے اعتنائی نہیں برت سکتی ۔ بلکہ اکثر اوقات محقق کا ذرا سا مختلف فیصلہ تنقید کی پوری عمارت کو تہ و بالا کر دیتا ہے اور ناقدین ادب کی وقیع آراء کی تبدیلی کا سبب بن جاتا ہے ۔ لیکن یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ تحقیق اگرچہ ایک جداگانہ فن کی حیثیت رکھتی ہے ، اس کے باوجود اس کا اظہار اکثر و بیشتر کسی نہ کسی صنفِ ادب کے حوالے سے ہوتا ہے ۔ اپنے اصول و ضوابط اور قوانین و قواعد رکھنے کے باوجود تحقیق سوانح عمری یا ناول اور افسانے وغیرہ کی طرح سے کوئی الگ صنفِ ادب نہیں ہے ۔ بلکہ کبھی یہ تاریخ کے پردے میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کبھی سوانح عمری وغیرہ کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے ۔

اردو میں بہت سی دوسری اصناف کی طرح تحقیق کا آغاز بھی بہت بعد میں ہوا ۔ اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو سرسید کا نام اردو کے اولین محقق کے طور پر سامنے آتا ہے ۔ اگرچہ سرسید احمد خان سے پہلے بھی اردو میں محققانہ مزاج کارفرما نظر آتا ہے ، لیکن اول تو اس کا اظہار صرف تاریخی کتب کے حوالے سے ہوتا ہے جن کی تعداد بہت ہی کم ہے ، دوسرے ان مورخین کے ہاں صداقت کی تلاش کا کچھ زیادہ رجحان بھی نظر نہیں آتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی بیشتر تاریخیں بھی افسانے سے قریب تر نظر آتی ہیں ۔ اس دور میں جس نوعیت کی تحقیقی کاوشیں ملتی ہیں ، ان کی ایک مثال مرزا علی لطف کا تذکرہ ''گلشنِ ہند'' ہے جو ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما پر ۱۸۰۱ع میں تصنیف کیا گیا ۔ ''گلشنِ ہند'' کے بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

''یہ تذکرہ نہایت دلچسپ ہے ۔ اس وجہ سے کہ اس زمانے کا طرزِ

تحریر ، اس وقت کے مشہور مشہور شاعروں کے دلچسپ حالات جن سے کہ مصنف سے ملاقات ہوئی اور اس وقت کی سوسائٹی کے مرقعے اس میں موجود ہیں ، ہر چند کہ صحت واقعات کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ قابل وثوق نہیں اور عبارت بھی ضرورت سے زیادہ پر تکلف و پر تصنع ، مسجع و مقفیٰ ہے ۔''۱

یہ صرف ایک مثال ہے ورنہ اس دور کی تمام تاریخوں اور تذکروں کی یہی کیفیت ہے ۔ لیکن سرسید اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے تاریخ سے متعلق اپنی تحریروں میں تلاش و جستجو سے کام لیتے ہوئے حقیقت و صداقت کو بے نقاب کرنے کی سعی کی ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی پہلی کتاب ''آثار الصنادید'' کا نام لیا جا سکتا ہے جس میں دہلی کے مشہور مقامات اور آثارِ قدیمہ نیز اپنے زمانے کی دلی کے تمام کاملین ، فقرا ، علماء اور شعرا وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اور اس ذکر میں حقیقت و اصلیت سے سرمو انحراف نہیں کیا گیا ۔ البتہ پہلے ایڈیشن میں اس کا اسلوب ایسا تھا جو کسی تاریخی و تحقیقی کتاب کے لیے موزوں قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ لیکن دوسرے ایڈیشن میں پرتکلف اسلوب کی جگہ بھی سادہ اور آسان عبارت نے لے لی ۔ ''آثار الصنادید'' کے علاوہ تاریخ و تحقیق کے میدان میں سرسید کی کچھ اور تصالیف بھی قابلِ قدر ہیں ۔ مثلاً تاریخِ ضلع بجنور ، تاریخ سرکشی بجنور ، رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند ، سیرت فریدیہ اور آئینِ اکبری وغیرہ ۔ آئینِ اکبری کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ وہ سرسید کی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے ۔ بلکہ انھوں نے اس کی تصحیح کی ہے اور ضروری مقامات پر حواشی لکھے ہیں ۔ ان کی محنت کا اعتراف کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

''آئینِ اکبری کی تصحیح و تحشی کا فخر بھی سید صاحب کو حاصل ہے ۔ مسٹر بلاکمین جنھوں نے آئینِ اکبری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ، سید صاحب کی کاوش کے معرف اور ان کی تصحیح کے معترف ہیں ۔''۲

۱۔ تاریخِ ادب اردو ، از رام بابو سکسینہ ، حصہ نثر ، ص ۲۵ ۔
۲۔ تاریخِ ادب اردو ، از رام بابو سکسینہ ، حصہ نثر ، ص ۲۵ ۔

سرسید کے علاوہ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی بھی بحیثیت محقق خاص اہمیت کے حامل ہیں ۔ مولانا آزاد کی آبِ حیات کی تاریخی و تحقیقی حیثیت تو خاصی مجروح ہو چکی ہے البتہ دربارِ اکبری میں جلال الدین اکبر کے عہد کی جو جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئی ہیں ، وہ قابلِ توجہ ہیں ۔ اس کے علاوہ لسانی تحقیق بھی مولانا آزاد کو اردو زبان کے اولین محققوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے ۔ مولانا الطاف حسین حالی اردو کے پہلے سوانح نگار ہیں ۔ انھوں نے حیاتِ سعدی ، یادگار غالب اور حیاتِ جاوید میں بڑی کاوش اور تحقیق سے کام لیا ہے اور اپنے موضوعات کے دائرے میں مولانا حالی کی فراہم کردہ معلومات آج بھی نہایت اہم ہیں اور بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں ۔

اس دور میں ایسے کچھ اور مورخ بھی ہیں جنھوں نے تاریخ و تحقیق میں خصوصی شہرت حاصل کی ۔ لیکن اس سلسلے میں جو شہرت شبلی کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی ۔ مولانا شبلی نے اپنی سوانحی اور تاریخی کتابوں میں تحقیق و تفتیش کا جو اعلیٰ معیار مقرر کیا اور روایت و درایت کے اصولوں کے پیشِ نظر جس انداز میں موجود حوالوں سے نتائج کا استنباط کیا وہ قابل تحسین ہے ۔

اب تک جن ادیبوں کا ذکر ہوا ہے اگرچہ وہ اپنی تحقیقی کاوشوں کے باعث محقق بھی تھے ، لیکن ان کی شہرت و ناموری کا سبب تحقیق کی بجائے ان کی تنقید و سوانح اور دیگر علمی و ادبی کارنامے قرار پائے ۔ البتہ دور سرسید کے بعد کچھ محققین ایسے بھی ہیں جن کی شہرت ان کے تحقیقی کارناموں کی رہینِ منت ہے ۔ اس سلسلے میں بہت سے نام لیے جا سکتے ہیں ۔ لیکن برجموہن دتاتریہ کیفی ، مولوی عبدالحق ، نصیر الدین ہاشمی ، حافظ محمود شیرانی ، سید سلیمان ندوی ، محی الدین قادری زور ، حامد حسن قادری ، سید مسعود حسن رضوی ادیب ، مالک رام اور شیخ محمد اکرام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

اردو کے ان تمام محققین کا جائزہ لیا جائے تو ایک بات ان سب میں تقریباً مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ایک آدھ استثنائی صورت کو چھوڑ کر اکثر محققین کی توجہ اردو زبان کی ابتداء و ارتقاء کی طرف رہی ہے ، لیکن مولانا مہر کا شمار چند مستثنیٰ محققین ہی میں ہوتا ہے ۔ انھوں نے تحقیقِ لسانیات کی بجائے زیادہ تر تحقیقِ واقعات کی طرف توجہ کی اور یوں ایک ایسے محقق کی حیثیت سے

متعارف ہوئے جس کے کام کا بنیادی حصہ واقعات کی تحقیق سے متعلق ہے۔ دراصل یہ ان کی افتاد طبع اور طبعی رجحان کا بنیادی تقاضا بھی تھا۔ وہ مدت العمر صحافت سے وابستہ رہے جس میں واقعات کی چھان بین ہی بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور پھر روزنامہ انقلاب کی تو اولین خصوصیت بھی یہی تھی۔ اس کے علاوہ سوانح نگار اور مورخ کی حیثیت سے بھی وہ زیادہ تر واقعات کے رد و قبول ہی کی طرف متوجہ رہے۔ اس ضمن میں ان کے متعدد تحقیقی کارنامے ہمارے سامنے ہیں، جن میں تحریکِ مجاہدین، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، سیرت النبی، تاریخ سندھ، غالب اور دیگر تصانیف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن چونکہ سوانح و تاریخ سے متعلق ابواب میں ان کتب کا تفصیلی ذکر آ چکا ہے لہذا پیشِ نظر باب میں مولانا مہر کے صرف ان تحقیقی کارناموں کا ذکر ہوگا جو تحقیق و تاریخ ادب سے متعلق ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مولانا مہر، مولانا محمد حسین آزاد، رام بابو سکسینہ یا حامد حسن قادری وغیرہ کی طرح کے مورخ و محققِ ادب بھی قرار نہیں دیے جا سکتے بلکہ انھیں مولوی عبدالحق کے ورثے کا امانت دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے بھی اپنے پسندیدہ دوائر میں مختلف مصنفین کی تحریریں فراہم و مرتب کرکے مبسوط مقدمات کے ساتھ شائع کیں، متن کی درستی کی طرف توجہ دی، حواشی تحریر کیے اور خطوط و منظومات کے سلسلے میں ان کے سنین متعین کرنے کی کوشش کی۔ البتہ مولوی عبدالحق اور مولانا مہر میں ایک فرق بھی تھا اور وہ یہ کہ مولوی صاحب نے دکنیات کو اپنا بنیادی موضوع بنانے کے باوجود تلاش و تحقیق کے بعد تقریباً ہر طرح کی تحریریں شائع کیں جبکہ مولانا مہر کا دائرہ مولوی عبدالحق کے مقابلے میں خاصا محدود تھا۔ مولانا مہر نے زیادہ تر غالب اور ابوالکلام آزاد کی متفرق تحریروں کو مرتب کیا اور تحقیق میں یہی ان کا مخصوص میدان بھی تھا۔ اس کے علاوہ سرود رفتہ اور تاریخ ارادت خان کی ترتیب و اشاعت کو ان کے متفرق تحقیقی کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، مولانا مہر نے زیادہ تر مرزا غالب اور ابوالکلام آزاد کی تحریروں کو جمع کرکے شائع کرایا۔ ان دونوں شخصیات کے ساتھ بھی مولانا مہر کی وابستگی جذباتی نوعیت کی تھی۔ مرزا غالب وہ پہلی شخصیت ہے جس کے وسیلے سے مولانا مہر ابتدائی تعلیم کے دوران میں شعر و ادب کی طرف

متوجہ ہوئے جبکہ آزاد کو مولانا مہر کا مذہبی و روحانی پیشوا اور زمانۂ طالب علمی کا سیاسی رہنما کہا جا سکتا ہے ۔ مولانا مہر نہ صرف ''الہلال'' کے مضامین کے حوالے سے مولانا آزاد سے متاثر ہوئے بلکہ آگے چل کر یہ اثرات اس صورت میں بھی ظاہر ہوئے کہ انھوں نے باقاعدہ مولانا آزاد سے بیعت کر لی ۔ لہٰذا غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد سے اس وابستگی کا حق ادا کرنے کے لیے مولانا مہر ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریریں جمع کرکے مرتب کرتے رہے ۔

مرزا غالب پر تحقیقی کام کے سلسلے میں مرزا کا اردو دیوانِ عکسی ، خطوطِ غالب ، قصائد و مثنویاتِ فارسی اور قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مخمس کی ترتیب و اشاعت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے ۔ اس ضمن میں ''غالب'' کا نام بھی لیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ اس کتاب پر سوانح سے متعلق باب میں مفصل بحث ہو چکی ہے لہٰذا یہاں اس کا ذکر غیر ضروری ہوگا ۔

۱۔ عکسی دیوانِ غالب مکمل :

اردو دیوان میں کلامِ غالب کو جس ترتیب سے شامل کیا گیا ہے اس میں پہلے متداول و متعارف غزلیات ہیں ۔ اس کے بعد قصائد ہیں ، جبکہ سہرا اور مثنوی در صفت انبہ کے لیے الگ عناوین دے کر الگ الگ حصے بنائے گئے ہیں ۔ اس کے بعد اردو قطعات و رباعیات سے متعلق حصے ہیں جبکہ آخر میں تین ضمیمے شامل کیے گئے ہیں ۔ پہلے ضمیمے میں وہ شعر درج ہیں جو غالب کے عام اور متداول دواوین میں شامل نہیں ہو سکے تھے ۔ ضمیمۂ دوم میں نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب ہے جبکہ تیسرے اور آخری ضمیمے میں مرزا غالب کی مثنوی ''قادر نامہ'' ہے ۔ اس کے علاوہ پنج آہنگ کے سلسلے میں شائع ہونے والا منظوم اشتہار بھی اسی حصے میں شامل کیا گیا ہے ۔

سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دیوانِ غالب عکسی میں تقریباً وہ سارا کلام شامل ہے جسے اردو کلام کی شرح کی بنیاد بنایا گیا ۔ البتہ ایک چیز نوائے سروش میں نہیں ہے اور وہ دیوانِ غالب عکسی کا تیسرا ضمیمہ ہے جس میں قادر نامہ اور پنج آہنگ کے اشتہار کو شامل کیا گیا ہے ۔ اس ایک فرق کے علاوہ کہیں متن تک کی تبدیلی بھی نظر نہیں آتی ۔ یوں لگتا ہے جیسے دیوانِ غالب عکسی کا آخری حصہ چھوڑ کر باقی سارے دیوان کی

شرح کر دی گئی ہے ۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جو شعر اور مصرعے دیوان میں موجود نہیں ہیں وہ نوائے سروش میں بھی نہیں ہیں ۔ مثلاً دیوان کے صفحہ ۳۸ پر ایک شعر دیا گیا ہے جس کا مصرع اول محذوف ہے اور حاشیے میں وضاحت کی گئی ہے کہ مصرع پڑھا نہیں جا سکا ۔ اسی انداز میں یہ شعر نوائے سروش کے صفحہ ۹۲۹ پر موجود ہے اور نوائے سروش میں بھی مصرع اول محذوف ہی ہے ۔

دیوانِ غالب عکسی میں جو غزلیات و قصائد دیے گئے ہیں ، حواشی میں ان کے سنین متعین کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے ۔ جیسا کہ مولانا مہر نے اپنے مقدمے میں وضاحت کر دی ہے ، غالب کی تمام شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کر دیا گیا ہے ۔ پہلا دور ابتدا سے ۱۸۳۱ع تک کے عرصے پر محیط ہے جبکہ دوسرا دور ۱۸۶۱ع تک کے عرصے سے تعلق رکھتا ہے ۔ پہلے دور کی غزلیات و قصائد کی تاریخیں متعین کرنے کے لیے نسخۂ حمیدیہ ، تذکرۂ گلشنِ بیخار اور دیوانِ غالب اردو ، مطبوعہ ۱۸۴۱ع کے نسخے سے مدد لی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ خطوطِ غالب اور دیگر داخلی و خارجی شہادتوں کو بھی بنیاد بنایا گیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ کلام کا سنہ متعین ہو سکے ۔ لیکن چونکہ داخلی و خارجی شہادتیں حتمی طور پر باوثوق نہیں ہیں لہذا کہنا چاہیے کہ غزلیات کے سنین متعین کرتے ہوئے بھی زیادہ تر قیاس سے کام لیا گیا ہے ۔ مثلاً ایک غزل ع ''حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد'' کا سنہ متعین کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

> ''اسی زمین میں معروف کی بھی ایک غزل ہے (مطبوعہ دیوان ، ص ۵۰) ۔ ممکن ہے معروف و غالب نے ایک ہی وقت میں غزلیں کہی ہوں ، اس لحاظ سے اسے ۱۸۲۰ع کے قریب کی سمجھنا چاہیے ۔''[1]

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولانا مہر نے جن قرائن کے باعث محولہ بالا غزل کو ۱۸۲۰ع کے قریب کا قرار دیا ہے وہ صحت کے عین قریب ہیں اس لیے کہ اس غزل کے شعر ''گلشنِ بیخار'' میں بھی موجود ہیں جو ۱۸۳۴ع میں مرتب ہوا اور نسخۂ حمیدیہ میں بھی ملتے ہیں جس میں ۱۸۲۲ع تک کا کلام شامل ہے ۔

۱۔ عکسی دیوانِ غالب مکمل ، مرتبہ مولانا مہر ، ص ۸۳ ، مطبوعہ ۱۹۶۷ع ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ۔

اس کے علاوہ بہت سی غزلیات و قصائد کے ضمن میں تاریخیں حتمی طور پر طے کر دی گئی ہیں اور ان کے لیے جو ثبوت پیش کیے گئے ہیں وہ ناقابلِ تردید ہیں۔ مثلاً ع "کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے" کے بارے میں مولانا مہر لکھتے ہیں :

اس زمین میں بہادر شاہ ظفر نے بھی غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ تھا :

یا آئے اجل یا صنمِ عربدہ جو آئے
ایسا نہ ہو یا رب کہ نہ یہ آئے نہ وو آئے

شیخ ابراہیم ذوق نے یہ غزل مولوی محمد باقر کو دی اور انہوں نے اسے "دہلی اردو اخبار" کی اشاعت مورخہ ۲۹ جون ۱۸۵۱ع (۲۸ شعبان ۱۲۶۷ھ) میں شائع کیا۔ خود مرزا غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو یہ غزل اپنے مکتوب کے ساتھ بھیجی تھی تو لکھا تھا کہ جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں۔ نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ آج دوپہر کو ایک غزل کہی ، کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا۔ یہ مکتوب اپریل ۱۸۵۱ع کا ہے اور یہ غزل "دہلی اردو اخبار" میں ۱۱ مئی ۱۸۵۱ع (۸ رجب ۱۲۶۷ھ) کو چھپی۔ بہرحال یہ اپریل ۱۸۵۱ع کی ہے۔"[1]

اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگرچہ مولانا مہر نے تمام حوالوں کو سامنے رکھ کر حتی المقدور غالب کے مطبوعہ کلام کی تاریخیں متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس سلسلے میں انھیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ زیر نظر دیوان میں ایسا بے شمار کلام موجود ہے جس کے سنہ متعین کرنے کے بارے میں قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا اور اسی وجہ سے مولانا مہر مجبور ہوئے کہ دیوان کو تاریخی ترتیب کی بجائے مروجہ اور متعارف ترتیب کے ساتھ ہی شائع کریں ، جیسا کہ وہ مقدمے میں لکھتے ہیں :

"میں چاہتا تھا کہ ہر ردیف کی غزلیات تاریخی* ترتیب کے لحاظ سے مرتب کر دوں لیکن کلام کا خاصا بڑا حصہ چونکہ ایسا ہے جس کی معین تاریخ تا حال معلوم نہیں ہو سکی ، لہٰذا ایک حصے کے متعلق

۱۔ عکسی دیوانِ غالب مکمل ، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ، ص ۲۱۵ -

معلومات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے متداول ترتیب میں رد و بدل مناسب نظر نہ آیا ۔"[1]

دیوانِ غالب کی ترتیب میں ایک اور اہتمام بھی کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر اشعار میں افراد و رجال کے نام آئیں تو حاشیے میں ان کے بارے میں وضاحت کر دی جائے تاکہ قارئین کو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو ۔ دیوانِ غالب میں اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں ۔ مثلاً : ع

دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

کے بارے میں لکھتے ہیں :

"علی بہادر یعنی نواب باندہ ۔ یہ نواب ذوالفقار بہادر کے فرزند تھے اور غالب سے ان کی رشتہ داری بھی تھی ۔ اگست ۱۸۴۹ع میں مسند نشین ہوئے ۔ "غدر" میں انگریزوں کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کی مگر گرد و پیش سے جو طوفان متواتر چلے آ رہے تھے ، ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور حکومت کے مخالفوں کا ساتھ دینا پڑا اس لیے معزول ہوئے ، ریاست چھن گئی ۔ صرف تین سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا ۔ باقی عمر الدور میں گزری ۔ وہیں ۱۸۷۳ع میں انتقال ہوا ۔"[2]

مولانا مہر کے پیشِ نظر یہ کام بھی تھا کہ تمام مشکل الفاظ کے صحیح تلفظ کی ادائیگی کے لیے الفاظ پر اعراب لگا دیے جائیں ۔ اسی طرح علامات اوقاف پر توجہ کرنے کا مسئلہ بھی پیشِ نظر تھا اور پورے دیوان میں یہ کوشش کی گئی ہے جس سے یقینی طور پر کلامِ غالب کی تفہیم میں آسانی پیدا ہو گئی ہے اور اعراب و اوقاف کی موجودگی میں غلطی کا امکان بہت کم رہ گیا ہے ۔

اس مجموعے میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اختلافاتِ متن کی طرف خصوصیت سے توجہ دی گئی ہے ۔ بہت سے شعر ایسے بھی ہیں جو مختلف دواوین میں مختلف متون کے ساتھ ملتے ہیں ۔ مولانا مہر نے اس قسم کے اشعار نقل کرتے ہوئے دوسرے متون کے حوالے بھی دے دیے ہیں ۔ مثلاً یہ مصرع "منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی" لکھنے کے بعد حاشیے میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ دیوانِ غالب کے ایک نسخے میں نور کی جگہ "طور" بھی ملتا ہے ۔ اسی طرح :

۱۔ عکسی دیوانِ غالب مکمل ، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ، ص ۱۸ ۔

۲۔ عکسی دیوانِ غالب مکمل ، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ، ص ۲۲۸ ۔

''کوہ کے ہوں بار ِ خاطر گر صدا بن جائیے'' کے ساتھ یہ وضاحت موجود ہے کہ ایک نسخے میں "صدا" کی جگہ ''ہوا'' بھی ملتا ہے ۔ اختلافات متن کے بارے میں یہ امر قابل ِ ذکر ہے کہ مولانا مہر نے جو متن دیوان میں اختیار کیا ہے اسے نوائے سروش میں بھی قبول کر لیا ہے ۔ لیکن بعض اختلافات ایسے بھی ہیں جو دیوان اور شرح میں بھی موجود ہیں ۔ مثلاً یہ شعر :

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخور عقد ِ گہر انگشت

دیوان میں اس شعر کے ساتھ حاشیے میں یہ عبارت درج ہے :

''بعض نسخوں میں "دیداں" ہے بہ معنی کیڑے ۔ دونوں صورتوں میں شعر درست ہے ۔ یعنی یوں بھی درست ہے کہ جو انگلی گوہروں کی لڑی کے لائق تھی ، وہ کیڑوں کا رزق بنی اور یوں بھی درست ہے کہ اسے حسرت و افسوس کے عالم میں دانتوں سے کاٹا جاتا رہا ۔''۱

لیکن دیوان کے برعکس نوائے سروش میں ''دیداں'' کو ترجیح دی گئی اور ترجیح کے لیے کوئی وجہ جواز بھی پیش نہیں کی گئی ۔ اس کے علاوہ دیوان میں اکثر جگہ غالب کی لسانی اغلاط کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور اس کی تاویل بھی کر دی گئی ۔ مثلاً ع : ''نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا'' میں اثبات کے مؤنث باندھے جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اثبات مذکر ہے ۔ سمجھ میں نہ آیا کہ یہاں اسے مؤنث کیوں باندھا گیا ۔ خود غالب نے دوسری جگہ اسے مذکر ہی باندھا ہے :

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''کرتا'' لکھتے تو الف گرتا تھا اور غالب اسے سخت ناپسند کرتے تھے لہذا مؤنث باندھا ۔''۲

۱- عکسی دیوان ِ غالب مکمل ، مرتبہ مولانا مہر ، ص ۷۷ ۔
۲- عکسی دیوان ِ غالب مکمل ، مرتبہ مولانا مہر ، ص ۱۴۲ ۔

دیوانِ غالب میں مولانا مہر نے بعض ایسی غزلیات بھی شامل کر دی ہیں جو خود ان کے نزدیک بھی مرزا غالب سے نسبت کے معاملے میں مشکوک ہیں ۔ یہ غزلیات ضمیمہ اول میں شامل ہیں جس میں زیادہ تر وہ شعر ہیں جو متداول دیوان میں نہیں اور مولانا مہر نے غزلیات مکمل شرح غالب آسی سے لی ہیں اور ان کے بارے میں خود ہی تصریح بھی کر دی ہے :

''اہلِ نظر مجموعہ' آسی میں شائع شدہ پورے غیر مطبوعہ کلام کا انتساب صحیح نہیں سمجھتے ۔''[۱]

بہرحال ''عکسی دیوان غالب مکمل'' اپنی خوبیوں کے باوصف اور اپنی ایک دو خامیوں کے باوجود غالب شناسوں کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ اس نے تفہیمِ غالب کے امکانات کو نسبتاً وسیع کرنے میں مدد دی ہے ۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ مولانا مہر نے اس دیوان کی ترتیب میں پیشتر تجربوں سے استفادہ کیا ہے جیسا کہ خود اپنے مقدمے میں مالک رام اور امتیاز علی خاں عرشی کے مرتبہ دواوین کا ذکر کرتے ہوئے صراحت کرتے ہیں ۔ مالک رام کے نسخے کو دیکھنے کے باوجود انھوں نے اپنا مرتبہ دیوان شائع کرنا ضروری سمجھا ، البتہ امتیاز علی خاں عرشی کے دائرے کی وسعت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''فاضلِ جلیل ، محب محترم مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا مرتبہ دیوان شائع ہو گیا جس کا دائرہ میرے مجوزہ دیوان کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے اور اسے دیوانِ غالب کے بجائے کلیاتِ غالب قرار دینا چاہیے ۔''[۲]

۲- کلیاتِ غالب فارسی :

مولانا مہر نے مرزا غالب کے اردو دیوان کے علاوہ فارسی کلام کو بھی مرتب کیا ۔ اس سلسلے میں مولانا مہر کے مرتب کردہ دو مجموعوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے ؛ یعنی قصائد و مثنویاتِ فارسی اور قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند ،

۱- عکسی دیوان غالب مکمل ، مرتبہ مولانا مہر ، ص ۳۲۳ ۔
۲- عکسی دیوان غالب مکمل ، مرتبہ مولانا مہر ، ص ۱۷ ۔

ترجیع بند ، مخمس - یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اکثر یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ مولانا مہر نے مرزا غالب کا فارسی کلیات بھی ایڈٹ کیا ہے لیکن کلیات کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ مولانا مہر نے صرف کلیات کا مقدمہ لکھا ہے - اور چونکہ کلیات پر کسی بھی شخص کا نام درج نہیں لہٰذا اسے مولانا مہر سے منسوب کر دیا گیا حالانکہ اس کی ترتیب میں ان کا کوئی دخل نہیں - اس خیال کو تقویت دینے کے لیے بعض داخلی و خارجی شواہد موجود ہیں - مثلاً یہ کلیات اپنے انداز ترتیب ہی کے اعتبار سے مولانا مہر کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا - اول کلیاتِ غالب فارسی اپنے گٹ اپ کے اعتبار سے مولانا مہر کی تصانیف سے مختلف ہے - مولانا مہر کی بیشتر تصانیف کے سر ورق پر ان کا نام چھپا ہوتا ہے جبکہ کلیاتِ غالب فارسی کے سر ورق پر نہیں چھپا - دوسرے کلیاتِ غالب فارسی میں مولانا مہر کے مقدمے کے علاوہ یادگارِ غالب کے اقتباسات بھی دیے گئے ہیں - ظاہر ہے کہ مولانا مہر کو اس نوعیت کی تحریریں شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی - اس لیے کہ جو باتیں یادگارِ غالب میں لکھی گئی ہیں وہ مولانا مہر اپنے مقدمے میں بخوبی بیان کر سکتے تھے - پھر مولانا مہر صرف مرتب نہیں تھے، ان کی زیادہ بڑی حیثیت سوانح نگار ، مؤرخ اور بطور محقق ہے - اور پھر غالبیات کے ایک ماہر کی حیثیت سے ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مختلف شعر پاروں کے سنین متعین کریں اور اشعار میں آنے والے افراد و رجال کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر دی جائیں تاکہ اشعار کی تفہیم میں آسانی ہو اور قارئین ان شخصیات سے غیر متعارف نہ رہیں - لیکن کلیاتِ غالب فارسی میں اس قسم کی کوئی خوبی موجود نہیں -

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ مولانا مہر نے اپنے مقدمے میں ''کلیات نظم فارسی'' کی ترتیب کے ضمن میں بعض نہایت ضروری امور کی طرف اشارے کرتے ہوئے جو اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے وہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ یہ مجموعہ مولانا مہر کا مرتب کردہ نہیں - مثلاً وہ فارسی کے سارے کلام کی یک جائی ، تاریخی تعین اور افراد و رجال کے تعارف کی اہمیت واضح کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

''امید ہے کلیات فارسی کے آئندہ ایڈیشن میں یہ دونوں ضروری کام بھی پورے ہو جائیں گے -''[۱]

۱- مقدمہ کلیات غالب فارسی ، ص ۱۰ ، اشاعت اول ۱۹۶۵ع ، مطبوعہ شیخ مبارک علی اینڈ سنز ، لاہور -

غور کیجیے کہ جن امور کی ضرورت و اہمیت مسلّم ہے اور جن کی انجام دہی خود مولانا مہر کے لیے دشوار بھی نہیں تھی ، ان کو اگلے ایڈیشن کی اشاعت تک ملتوی رکھنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں ؟ صاف ظاہر ہے کہ آئندہ ایڈیشن کے لیے یہ مولانا مہر کا فیصلہ نہیں بلکہ گمنام مرتب کے لیے مشورے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کی وضاحت کے لیے مقدمے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے ۔ مولانا مہر لکھتے ہیں :

''ان (غالب) کا کلیاتِ نظم فارسی ناپید ہو رہا تھا ۔ اس کی اشاعت کا انتظام ہو گیا ہے ۔ دعا ہے کہ اس کی آئندہ اشاعت بہتر اور جامع تر ہو ۔''[۱]

اس کے علاوہ ایک اور بین ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۶۹ء میں مولانا مہر نے مجلس یادگار غالب ، پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام دو کتابیں ''قصائد و مثنویات فارسی'' اور ''قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مخمس'' مرتب کیں جن میں ان اصناف سے متعلق غالب کا سارا فارسی کلام سمیٹ لیا گیا اور یوں ان دونوں کتابوں کی ضخامت بڑھ گئی ہے ۔ اس کا اندازہ صرف اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ کلیاتِ غالب فارسی میں صرف چھیاسٹھ قطعات ہیں جبکہ مجلس یادگار غالب کی طرف سے شائع کردہ مجموعے میں قطعات کی تعداد ایک سو پچپن ہے ۔ یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ کلیات کی ترتیب کے وقت یہ اضافی مواد مولانا مہر کے علم میں نہیں تھا ، البتہ اس صورت حال کا بدیہی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ کلیات غالب فارسی کی ترتیب کا کام مولانا مہر نے نہیں کیا ۔ یہ تمام دلائل قابلِ توجہ ہونے کے باوجود حتمی طور پر قابلِ قبول نہیں ہو سکتے تھے ، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا مہر کی بعض تحریریں بھی ان دلائل کی تصدیق کرتی ہیں ۔ مثلاً سید قدرت نقوی کی طرف سے کلیاتِ غالب فارسی کے بارے میں استفسارات کا جواب دیتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

''آپ کو معلوم ہے شیخ مبارک علی کے ساتھ میرے پچاس برس کے تعلقات ہیں ۔ ان کے ایک عزیز نے بطور خود کلیات چھاپ لی ۔ جب آخری مرحلہ آیا تو شیخ صاحب کا حکم ملا کہ چند سطریں بطور

۱۔ مقدمہ کلیاتِ غالب فارسی ، ص ۱۰ ، اشاعت اول ۱۹۶۵ء ، مطبوعہ شیخ مبارک علی اینڈ سنز ، لاہور ، ص ۱۴ ۔

دیباچہ لکھ دو ۔ میں نے کہا کہ کلیات کیوں کر چھپا ؟ اس میں کیا خوبی ہے ؟ تصحیح کا کیا انتظام ہوا ؟ معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں ہوا ۔ میں نے دو چار صفحے لکھ دیے ۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا ۔ جس روز پنڈی جا رہا تھا اس سے ایک یا دو روز پیشتر ایک کاپی مجھے دی گئی ۔ دیکھا تو سخت قلق ہوا ۔''۱

اگرچہ اس خط سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کلیاتِ غالب فارسی کی ترتیب کا کام مولانا مہر نے نہیں کیا تھا لیکن ایس جیلانی کے نام ایک خط کے مندرجات کو دیکھ کر پیش کردہ نتیجے کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے مولانا مہر لکھتے ہیں :

''یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ کو فارسی کلیاتِ غالب برا اور غلط چھپنے کا رنج ہے اور اس کے بجا ہونے میں کلام نہیں ، البتہ اس بارے میں شکوے کا صحیح محل آپ متعین نہ فرما سکے اور صرف ظواہر ہی کی بنا پر تصور فرما لیا کہ ترتیب و تہذیب اس عاجز ایچ میرز سے متعلق تھی ۔ واقعات یہ ہیں کہ شیخ مبارک علی صاحب کے ایک عزیز نے کلیات چھاپا ۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ایسا کوئی کام کرنے کے درپے ہیں ۔ کتابت کے بعد کاپیاں چھپ گئیں اور صرف جز بندی باقی رہ گئی تو ایک روز مبارک علی صاحب نے مجھ سے کہا کہ بچہ (یعنی ان کا عزیز) کہہ رہا تھا کہ مہر سے چند سطریں لکھا دیجیے ۔ میں نے پوچھا ''فارسی کلیات کے لیے ؟'' بولے ''ہاں ۔'' میں نے کہا کہ اس میں تو بے شمار کام کرنے کے تھے ۔ مثلاً تصحیح ۔ پھر غالب کے اُس کلام کو کلیات میں شامل کرنا جو ''سبد چین'' یا بعض دوسرے مجموعوں میں چھپا اور شامل نہ ہو سکا ۔ اور بھی کام تھے ۔ شیخ صاحب نے فرمایا ''اب تو اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔ چند صفحوں کا پیش لفظ باقی ہے وہ لکھ دو'' ۔ میں خاموش ہوگیا ۔ نفیاً یا اثباتاً کوئی جواب نہ دیا ۔ پھر خیال آیا کہ مبارک علی کے ساتھ پچاس سال سے نہایت گہرے اور حقیقی بھائیوں کے سے تعلقات چلے آ رہے ہیں ۔ اتنے معمولی سے کام میں تامل سے ان پر اثر نہ پڑے ۔ میں نے پوچھا ''کیا

۱۔ مکتوب بنام سید قدرت نقوی ، موصولہ یکم جنوری ۱۹۶۶ع ، غیر مطبوعہ ۔

واقعی حکم ہے کہ میں لکھ دوں؟" بولے "جیسا سمجھ لو۔" اگلے روز میں نے قلم برداشتہ اتنے صفحے پورے کر دیے جتنے مقدمے یا پیش لفظ کے لیے محفوظ تھے اور میرے مقدمے کے آخر میں اس طرف واضح اشارے موجود ہیں . . . معلوم نہیں آپ نے کس بنا پر تصور فرما لیا کہ کلیات کی ترتیب و تہذیب میری ہے اور تمام کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہوئیں۔ اگرچہ میں اپنے آپ کو سراپا خطا سمجھتا ہوں لیکن اس باب میں تو میرا گناہ کوئی نہیں۔"[۱]

۳- قصائد و مثنویات فارسی :

مولانا مہر نے غالب کے فارسی کلام پر مشتمل دو مجموعے مرتب کیے ہیں جو ۱۹۶۹ع میں غالب صدی کے موقع پر مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئے۔ پہلا مجموعہ مرزا غالب کے فارسی قصائد اور مثنویوں پر مشتمل ہے۔ اس میں متداول دیوان فارسی کے چونسٹھ قصیدوں کے علاوہ چھ دوسرے قصیدے بھی شامل ہیں جو "سبد چین" اور "باغ دودر" میں شائع ہوئے تھے۔ اسی طرح مثنویوں کے حصے میں بھی متداول گیارہ مثنویوں کے علاوہ وہ مثنویاں بھی شامل ہیں جو کلیات غالب فارسی کی اشاعت اول کے بعد لکھی گئیں اور جن کا انتخاب اہل نظر کے نزدیک مستند ہے۔ یوں مثنویوں کی کل تعداد چوبیس ہو جاتی ہے۔

"قصائد و مثنویات فارسی" کو مولانا مہر نے اپنے عام طریق کار کے مطابق مرتب کیا ہے، یعنی ان منظومات کے جہاں تک ممکن ہوا سنین متعین کرنے کی کوشش کی، قصائد و مثنویات کا مختصر تعارف پیش کیا گیا اور ان میں مذکورہ افراد و رجال کے ضروری حالات دے دیے گئے۔ اس کے علاوہ تصحیح کے ساتھ ساتھ ضروری مقامات پر مشکل الفاظ کے معانی بھی لکھ دیے گئے تاکہ فارسی کلام کی تفہیم میں زیادہ سے زیادہ آسانی پیدا ہو۔ البتہ اس کتاب میں ایک کام ایسا بھی ہے جو ضرورت محسوس کرنے کے باوجود نہیں کیا گیا اور وہ یہ کہ قصیدوں کے سنین طے کرنے کے باوجود ان کو زمانی ترتیب سے مرتب نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں خود مولانا مہر لکھتے ہیں :

۱- مکتوب بنام الیس جیلانی، مرقومہ ۳۱ اگست ۱۹۶۶ع، غیر مطبوعہ۔

"میں نے یہ تمام قصیدے پیش نظر مجموعے میں یکجا کر دیے ہیں - بہتر ہوتا کہ انہیں تا بحد امکان تاریخی ترتیب میں رکھا جاتا لیکن میں نے خاصے غور و فکر کے بعد رد و بدل مناسب نہ سمجھا کیونکہ جو ترتیب ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزر جانے کے باعث خاصی متعارف ہو چکی ہے وہ یک قلم غیر متعارف اور اجنبی ہو جاتی -"[1]

۴- قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مخمس :

یہی کیفیت "قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مخمس" کی ہے - اس میں بھی مختلف اصناف سخن کی ترتیب کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا اور اس کی وجہ بھی وہی ہے کہ مولانا مہر متعارف ترتیب بدل ڈالنے کے حق میں نہیں تھے - اس کے علاوہ اس کے متن میں تصحیح بھی کی گئی ہے اور ضروری نوٹ بھی دیے گئے ہیں - مشکل الفاظ کے معانی بھی لکھ دیے گئے ہیں اور مذکور افراد و رجال کے ساتھ ساتھ منظومات کا تعارف بھی پیش کر دیا گیا ہے - اہم بات یہ ہے کہ مذکورہ اصناف کے کل سرمائے کو یکجا کر دیا گیا ہے - اس سلسلے میں مولانا مہر کے پیش نظر نہ صرف ۱۸۶۳ع میں چھپنے والا کلیات نظم فارسی رہا بلکہ سبد چین اور باغ دودر کے علاوہ کلیات نثر میں جا بجا بکھرا ہوا کلام بھی جمع کر لیا گیا - پیش نظر مجموعے میں منظومات کی ترتیب بھی یہی رکھی گئی - ہر صنف سخن سے متعلق اشعار کے سلسلے میں پہلے کلیات نظم فارسی میں شائع شدہ چیزیں لے لی گئیں ، بعد ازاں سبد چین اور باغ دودر کی نظموں کو شامل کیا گیا اور آخر میں کلیات نثر میں بکھری ہوئی منظومات کو اصناف کے اعتبار سے یکجا کر دیا گیا -

۵- خطوط غالب :

غالبیات کے سلسلے میں مولانا مہر کا سب سے اہم کام "خطوط غالب" کی ترتیب و اشاعت ہے - مولانا مہر نے غالب کے اردو مکاتیب کو اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کی طرح محض جمع کرکے شائع ہی نہیں کر دیا ، بلکہ مختلف لوگوں کے نام لکھے گئے خطوط کو یکجا کرکے ان میں تاریخی ترتیب

۱- دیباچہ قصائد و مثنویات فارسی ، مرتبہ مولانا مہر ، صفحہ الف -

بھی قائم کی ۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف مباحث اور مطالب تاریخی ترتیب کے ساتھ سامنے آ کر زیادہ حظ انگیز اور دل پذیر ہو گئے ۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ اکثر خطوط کو تاریخی ترتیب کے ساتھ یکجا کرنا آسان تھا ، اس لیے کہ مرزا غالب اپنے خطوط میں بالالتزام تاریخیں درج کرنے کے عادی تھے ، لیکن بعض خطوط کو تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کرنے میں دشواری بھی پیش آئی ، اس لیے کہ یا تو ان پر غالب نے خود ہی تاریخ درج نہیں کی یا پھر نقل کرنے والوں نے اسے غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ۔ ایسے مکاتیب میں بھی کچھ خطوط ایسے تھے ۔ جن کی تاریخیں داخلی شہادتوں کی بنا پر قیاس سے کام لے کر طے کی جا سکتی تھیں جبکہ کچھ خطوط کی تاریخیں متعین کرنے کا کوئی واضح قرینہ موجود نہیں تھا ۔ لہذا مولانا مہر نے ان خطوط کو ہر مکتوب الیہ کے نام خطوط کے آخر میں درج کر دیا ۔ لیکن ایسے خطوط تعداد کے اعتبار سے بہت کم ہیں ۔

مولانا مہر نے نہ صرف تمام مکتوبات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ یکجا کر دیا ، بلکہ جملہ مکتوب الیہم کے حالات بھی اختصار کے ساتھ پیش کر دیے ، تاکہ مرزا غالب کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت واضح ہو سکے اور قارئین خطوط کے حقیقی پس منظر سے واقف ہو جائیں ۔ ''خطوطِ غالب'' کی انھی خصوصیات کے باعث ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں :

> ''مہر صاحب نے مکتوب الیہم کے حالات ، تاریخوں کی تقسیم و اندراج اور بعض خطوط کے حواشی لکھ کر اور خطوط کو از سر نو تاریخ وار ترتیب دے کر پیش کیا ۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ خطوطِ غالب زیادہ قابلِ قدر اور غالب کی اردو نثر کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے مفید ہے ۔''[1]

''خطوط غالب'' کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ مولانا مہر نے ضروری مقامات پر خطوط کی شرح بھی کر دی ہے ۔ شرح کی ضرورت اس لیے تھی کہ بعض اوقات مرزا غالب مکتوب الیہ کے علم و نظر کی روشنی میں تفصیلات

۱۔ محاسنِ خطوطِ غالب ، از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ص ۱۰ ۔ اشاعت اول ۱۹٦۹ع ۔ مطبوعہ مکتبہ خیابان ادب ، لاہور ۔

سے گریز کرتے ہوئے معاملات کے بارے میں محض اشارے کافی سمجھتے تھے یا بعض مقامات پر تاریخی و جغرافیائی اور علمی و ادبی تلمیحات آ گئیں ۔ ان تلمیحات اور اشاروں کو مکتوب الیہ تو خوب سمجھتے تھے ، لیکن عام قاری کے لیے ان سے لطف اندوز ہونا بہت مشکل تھا ۔ مولانا مہر نے شرح پیش کرکے ان کے ابہام کو دور کر دیا اور حواشی میں شرح و تفصیل پیش کرکے خطوط کو عام قاری کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنا دیا ۔

نقل کرنے والوں کی بے احتیاطی اور کتابت کی غلطیوں کے باعث رقعات میں متن کی بے شمار غلطیاں بھی راہ پا گئی تھیں ۔ ان کی درستی کا بہترین طریقہ تو یہ تھا کہ مرزا کے اصل خطوط سے تقابل کیا جاتا ، لیکن تقسیم ملک کے باعث مولانا مہر کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ ہندوستان جا کر اصل ماخذ سے استفادہ کر سکتے ۔ لہذا انھوں نے ''عود ہندی'' اور ''اردوے معلیٰ'' کے مختلف ایڈیشن سامنے رکھ کر غلطیوں اور فروگزاشتوں کا سراغ لگانے کی سعی کی اور جگہ جگہ متن کی تصحیح کی ۔ تصحیح کے ضمن میں بعض ایسی مثالیں بھی ہیں کہ مولانا مہر نے تمام مطبوعہ ایڈیشنوں سے اختلاف کیا اور متن کی ایک نئی صورت پیش کی ۔

اس مجموعے کی ایک اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں مرزا غالب کے اردو خطوط یکجا مل جاتے ہیں اور شائقین کو ان کی تلاش میں مختلف مجموعوں کی طرف رجوع نہیں کرنا پڑتا ۔ ''خطوطِ غالب'' میں نہ صرف عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں شامل رقعاتِ غالب کو جمع کر لیا گیا ہے بلکہ منشی مہیش پرشاد کے شائع کردہ مجموعے میں شامل نئے خطوط کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ نادر خطوطِ غالب اور مختلف اوقات میں اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے خطوط کو بھی جمع کر دیا گیا ۔ آخر میں نامۂ غالب اور تقریظیں شامل کر دی گئی ہیں تا کہ مرزا غالب کی زیادہ سے زیادہ نثر یکجا ہو سکے ۔ اسی خواہش کے نتیجے میں ''خطوطِ غالب'' کے ہر نئے ایڈیشن کی ضخامت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا ، یہاں تک کہ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے موقع پر خطوطِ غالب کا ایک ایڈیشن مجلس یادگار غالب کے زیر اہتمام دو جلدوں میں شائع ہوا ۔ اس ایڈیشن میں خطوط کے علاوہ مرزا کی دیگر اردو نثری تحریریں بھی شامل کر دی ہیں ، جس کے نتیجے میں یہ ایڈیشن اپنی جامعیت اور اپنی دیگر خصوصیات کی بنا پر کسی بھی مجموعۂ خطوط پر سبقت

لے گیا ہے۔ جیسا کہ سید قدرت نقوی اس ایڈیشن کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''غالب کی تحریرات کا اتنا ضخیم مجموعہ اور کوئی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں مولانا مہر کے حواشی نے اس کی افادیت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ مکتوب الیہم کا تعارف ایک گراں قدر کام ہے۔ مولانا مہر کا یہ کام غالبیات میں بہت اہم اضافہ ہے۔''[۱]

غالباً ضخامت بڑھ جانے کے سبب مولانا مہر نے خطوط کے پہلے ایڈیشنوں میں شامل مقدمے کو قلمزد کر دیا حالانکہ یہ مقدمہ خطوط کے شائقین کے لیے حد درجہ مفید و سودمند تھا۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں چند اور تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ مثلاً اس مجموعے کی ابتدا میں خاندان لوہارو کے مختلف افراد کے نام خطوط کی بجائے ہرگوپال تفتہ، شیو نرائن اور مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام خطوط کو جگہ دی گئی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ تعداد کے اعتبار سے زیادہ تر خطوط انھی کے نام ہیں۔

یہ ایڈیشن اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ اس میں دیگر ایڈیشنوں کے مقابلے میں مکتوب الیہم اور دیگر افراد و رجال کے تعارف و سوانحی حالات زیادہ تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن اس ایڈیشن میں بھی ''مکاتیبِ غالب'' اور ''نادرات غالب'' میں شامل خطوط کو شامل نہیں کیا گیا۔

۶۔ نقشِ آزاد :

غالبیات کے بعد مولانا مہر نے سب سے زیادہ توجہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریرات پر مبذول کی۔ ابوالکلام آزاد کی جن کتابوں کو مرتب کیا گیا، ان میں ''نقشِ آزاد'' اولین اہمیت کی حامل ہے۔ ''نقشِ آزاد'' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مولانا آزاد کے وہ خطوط شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً مولانا مہر کے نام لکھے گئے۔ آزاد سے مہر کا رشتۂ مودت و عقیدت ۱۹۱۴ء میں اس وقت قائم ہوا تھا جب مولانا مہر ابھی طالب علم ہی تھے۔ اسی دور میں خط و کتابت شروع ہوئی اور اس وقت تک جاری رہی جب تک

۱۔ مجلہ اردو، کراچی، ص ۱۸۱۔ شمارہ اول، ۱۹۷۰ء۔

مولانا آزاد حیات رہے ۔ یہ عرصہ تقریباً چوالیس سال پر محیط ہے ۔ لیکن اس کے مقابلے میں ''نقش آزاد'' میں شامل خطوط ، جو تعداد میں ۱۸۵ ہیں ، بہت کم ہیں ۔ یقین ہے کہ خطوط بہت زیادہ تعداد میں لکھے گئے ہوں گے لیکن بے احتیاطی اور تقسیم کے زمانے میں جالندھر سے رشتہ منقطع ہونے کے باعث خطوط ضائع ہو گئے ۔ لیکن جیسا کہ مولانا مہر نے مقدمے میں خود بھی دعویٰ کیا ہے ، خطوط کی یہ تعداد بھی اتنی ہے کہ کسی اور شخص کے پاس اتنے خط بھی شاید ہی مل سکیں ۔ بہرحال یہی خطوط ''نقش آزاد'' کے پہلے حصے کے طور پر شائع ہوئے ۔

''نقش آزاد'' کا دوسرا حصہ مولانا آزاد کی ان تحریرات پر مشتمل ہے جو مولانا آزاد نے ''غالب'' کے سلسلے میں رقم کی تھیں ۔ ہوا یہ کہ جب پہلی اشاعت کے بعد ''غالب'' مولانا آزاد کو بھیجی گئی تو انھوں نے کتاب دیکھنے کے بعد مہر کو لکھا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مفصل سوانح عمری لکھنے کا ارادہ ہے تو میں بہت سی باتیں لکھ بھیجتا ۔ اس کے جواب میں مولانا مہر نے غالب کے ایک نسخے میں سادہ اوراق لگوائے اور وہ مولانا آزاد کو بھیج دیا ۔ مولانا آزاد ان سادہ اوراق پر وقتاً فوقتاً مرزا غالب کے سوانحی پہلوؤں سے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ۔ اگرچہ یہ سب تحریریں مرزا غالب سے متعلق نہیں تھیں ، بہرحال مولانا مہر نے ''نقش آزاد'' کے دوسرے حصے میں انھی تحریرات کو شامل کیا ہے ۔

''نقش آزاد'' کے تیسرے حصے میں وہ تحریریں شامل ہیں جو مولانا مہر کے نام نہیں لکھی گئی تھیں لیکن کسی طرح مولانا مہر کے پاس پہنچ گئی تھیں ۔ اس کے علاوہ اس حصے میں مولانا آزاد کے وہ مکتوبات بھی شامل ہیں جو خواجہ حسن نظامی ، ملا واحدی اور نیاز فتح پوری کے نام لکھے گئے ۔

''نقش آزاد'' میں شامل خطوط اور تحریروں کو محض شائع کرنے سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے تھے ، بلکہ ضروری تھا کہ مختلف مقامات کی وضاحت کے لیے توضیحی حواشی بھی لکھے جاتے ، تاکہ عام قارئین ان تحریروں سے صحیح طور پر استفادہ کر سکیں ۔ اسی خیال سے مولانا مہر نے یہ ضروری کام بھی انجام دیا ۔ ان حواشی سے نہ صرف خطوط میں آنے والی تلمیحات اور بعض مبہم اشاروں کی وضاحت ہو گئی ہے ، بلکہ خطوط میں مذکور افراد و

رجال کا تعارف بھی آ گیا ہے جس کی بدولت مکتوب نگار ، مکتوب الیہ اور افراد و واقعات کے باہمی تعلقات کی نوعیت بھی واضح ہو جاتی ہے ۔

اس کے علاوہ مولانا مہر نے حواشی کے ذریعے مولانا آزاد کے بعض تسامحات کی درستی بھی کر دی ہے ۔ اس کی ضرورت صرف ایسے مقامات پر پیش آئی جہاں کسی شخص کا نام وغیرہ لکھنے میں مولانا آزاد سے سہو ہوا ۔ ایسے تمام مواقع پر مولانا مہر نے اپنے حاشیوں میں حقیقی صورت حال واضح کر دی ۔ ان حواشی کا ایک اور ضمنی لیکن اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ ان کے ذریعے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مہر کی حیات کے بہت سے گوشے روشن ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً ''نقش آزاد'' کے حواشی میں مہر و سالک کی ''زمیندار'' سے علیحدگی اور روزنامہ ''انقلاب'' کے اجرا کی داستان کے بیشتر حصے آ گئے ہیں ۔

''نقشِ آزاد'' کی ترتیب میں ایک نقص بھی کھٹکتا ہے اور وہ یہ کہ مولانا مہر نے خطوط میں سے بعض معاصر شخصیات کے نام حذف کر دیے ہیں ۔ یہ درست کہ بسا اوقات عصری شخصیات کا ذکر اور ان کے ناموں کی اشاعت کچھ پیچیدگی کا سبب بن جایا کرتی ہے ، لیکن اس صورت میں زیادہ بہتر یہ ہوتا ہے کہ اس نوعیت کی ذاتی اور نجی تحریریں شائع ہی نہ کی جائیں اور جب پیچیدگیوں کے اسباب ختم ہو جائیں تو ان کو منظرِ عام پر لایا جائے ، تا کہ اخلاف کو ان کا ترکہ اصالت داری کے ساتھ منتقل ہو سکے ۔ ویسے بھی عظما و مشاہیر کے خطوط اپنے عہد کی تاریخ ہوتے ہیں ۔ لیکن اس طرح کی احتیاطی تدابیر سے ان کی افادیت کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے ۔

۷۔ تبرکاتِ آزاد :

ابوالکلام آزاد کی کتب کے سلسلے میں ''تبرکاتِ آزاد'' دوسری اہم کتاب ہے ۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو تبرکاتِ آزاد ، نقشِ آزاد کا دوسرا حصہ قرار پاتی ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ نقشِ آزاد میں زیادہ تر وہ خطوط و مکاتیب اور تحریریں شامل ہیں جو مولانا مہر کے لیے لکھی گئیں ، جبکہ تبرکاتِ آزاد میں جن تحریرات کو شامل کیا گیا ہے ، ان میں سے کسی کا تعلق مولانا مہر سے نہیں تھا ۔ لیکن تبرکاتِ آزاد کی ترتیب و اشاعت میں بھی وہی جذبہ کارفرما تھا جو نقشِ آزاد کی ترتیب کا محرک بنا تھا ، یعنی مولانا آزاد سے رشتۂ عقیدت اور اس کا اظہار ۔

تبرکاتِ آزاد کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے - پہلے حصے میں تقریباً ۹۹ خطوط ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں کے نام لکھے گئے تھے ، جبکہ دوسرے حصے میں سات مضامین و مقالات شامل ہیں - تبرکات آزاد کے خطوط و مضامین پر بھی مولانا مہر نے توضیحی حواشی لکھے ہیں جبکہ مضامین سے پہلے ان کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے - ان حواشی کے باعث نہ صرف خطوط و مضامین کی تفہیم آسان ہو گئی ہے بلکہ خطوط و مقالات میں آنے والے اشارات و تلمیحات کو بھی واضح کر دیا گیا ہے - اس کے علاوہ خطوط اور مضامین میں مذکور افراد کے بارے میں ضروری تعارف بھی پیش کر دیا گیا ہے -

ان حواشی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ ان کی وجہ سے مولانا مہر کی زندگی کے بہت سے واقعات کھل کر سامنے آ جاتے ہیں اور اس طرح کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے - لیکن تبرکات کے حواشی بعض اوقات الجھن کا سبب بھی بن جاتے ہیں ، اس لیے کہ مولانا مہر اپنے مقدمے اور دیباچے میں پیش کردہ خیالات کو پیشِ نظر رکھے بغیر ان حواشی اور تعارف میں بالکل متضاد رائے پیش کر دیتے ہیں - مثلاً انھوں نے تبرکاتِ آزاد کے مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مضمون ''دیش بندھو چترنجن داس'' کے بارے میں اپنے دیباچے میں لکھا ہے :

''مضامین و مقالات میں سے صرف ایک یعنی ''چترنجن داس'' جولائی ۱۹۲۷ع کے الہلال میں اس موقع پر شائع ہوا تھا . . .''[۱]

لیکن اس مضمون کے تعارف میں مولانا مہر نے بالکل مختلف رائے دی ہے - وہ لکھتے ہیں :

''یہ مقالہ مولانا نے دیش بندھو داس کی وفات پر لکھا تھا اور اگست ۱۹۲۵ع کے زمیندار کی دو اشاعتوں میں چھپا تھا -''[۲]

اس کے علاوہ پوری کتاب میں تصریحات و حواشی کا انداز یکساں نہیں رہا - مثلاً کہیں تو عربی عبارات ترجمے کے ساتھ دی گئی ہیں اور کہیں ترجمے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی - اس نوعیت کے بعض تسامحات کے باوجود تبرکاتِ

۱- دیباچہ تبرکاتِ آزاد ، از مولانا مہر ، ص ۷ -
۲- تبرکات آزاد ، ص ۳۷۰ -

آزاد قابلِ قدر تصنیف ہے جس کے ذریعے مولانا آزاد کے نقطۂ نظر اور اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔

۸- باقیاتِ ترجمان القرآن :

تحریراتِ آزاد کے سلسلے کی تیسری کتاب "باقیاتِ ترجمان القرآن" ہے ۔ اس میں وہ مقالات شامل ہیں جن میں قرآن شریف کی تفسیر پیش کی گئی ہے ۔ یہ وہ تحریریں ہیں جنھیں مولانا آزاد ترجمان القرآن جلد سوم کے نام سے مرتب کرکے کتاب کی صورت دینے کے خواہاں تھے ۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا مہر نے اس کام کو انجام دیا اور مولانا آزاد کی متفرق تحریروں کو جمع کرکے کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ۔ ''باقیاتِ ترجمان القرآن'' کے ساتھ اگرچہ ضروری تصریحات مولانا آزاد ہی کی ہیں لیکن مولانا مہر نے بھی مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے جس سے ''باقیات'' کے دائرۂ افادیت میں اضافہ ہوا ہے ۔

اس سلسلے کی سب سے اہم کتاب "رسولِ رحمت" ہے ۔ لیکن چونکہ سیرت النبی پر مولانا آزاد کے مقالات و مضامین کو مربوط کرنے اور تشنہ پہلوؤں کو مکمل کرنے کے سلسلے میں مولانا مہر نے بھی بہت کام کیا ہے، اسی لیے یہ تالیف و ترتیب ہونے کی بجائے تصنیف بن گئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر تنقید و تبصرہ سوانح و سیرت سے متعلق باب میں کیا گیا ہے ۔ البتہ "رسولِ رحمت'' کے بعد مولانا مہر نے آزاد کے مضامین کا ایک اور مجموعہ شائع کیا تھا جو ''انبیائے کرام'' کے نام سے متعارف ہے ۔ ''انبیائے کرام'' میں مختلف پیغمبروں کے سوانحی حالات اور ان کی دعوت و تبلیغ کے بارے میں مضامین شامل ہیں ۔ یہ وہ مضامین ہیں جنھیں مولانا آزاد کی ان کوششوں کی کڑی سمجھنا چاہیے جن کے توسط سے وہ تبلیغ و دعوت کے ذریعے ہندی مسلمانوں کو اسلامی زندگی کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے ۔

ابتدا میں مولانا مہر چاہتے تھے کہ ''رسولِ رحمت'' کی طرح ''انبیائے کرام'' میں بھی خلا پُر کر دیے جائیں اور جن پیغمبروں کے حالات نہیں آ سکے ان کا اضافہ کر دیا جائے ۔ لیکن اس اہم کام کو مکمل کرنے کی بجائے اسے اگلے ایڈیشن کے لیے اٹھا رکھا ۔ مگر وہ پہلی اشاعت سے بھی پہلے انتقال فرما گئے اور یہ ضروری کام رہ گیا ۔

''انبیائے کرام'' میں جمع و ترتیب کے علاوہ مولانا مہر نے اور کوئی کام نہیں کیا ۔ البتہ مختلف مضامین میں نقل کی جانے والی قرآنی آیات کا اردو ترجمہ ضرور کر دیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ حواشی میں نہ تصریحات ہیں اور نہ ہی مضامین کے سلسلے میں اس نوعیت کے تعارفی نوٹ جو تبرکات آزاد میں ملتے ہیں ۔

۹۔ سرودِ رفتہ :

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کے علاوہ مولانا مہر نے علامہ اقبال کے منظوم کلام کو بھی جمع کیا ہے ۔ اگرچہ انھوں نے کلیاتِ اقبال اردو و فارسی کی ترتیب و تدوین میں بھی تعاون کیا تھا ، جیسا کہ کلیاتِ اقبال کے اعتذار میں جسٹس جاوید اقبال لکھتے ہیں :

''سب سے کٹھن منزل صحتِ کلام کی تھی ۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ، بار بار کی سنگ سازی کے باعث طباعت کی کچھ غلطیاں رو پذیر ہو گئی تھیں جنھیں اولین نسخوں سے مقابلہ کرکے درست کیا گیا ۔ اس کے باوجود بعض مقامات ایسے تھے جن کی تصحیح کے لیے مجھے خاصی سرگردانی کرنی پڑی ۔ بالآخر میں نے علامہ مرحوم کے دیرینہ رفیق اور مخلص ہم نشیں مولانا غلام رسول مہر سے رجوع کیا ۔ مولانا نے نہ صرف ان مقامات کی تصحیح میں میرا ہاتھ بٹایا بلکہ شروع سے لے کر کتابت کے آخری مرحلے تک جس شفقت اور محبت سے میری رہنمائی کی اس کا بیان الفاظ کی گرفت سے باہر ہے ۔''[۱]

لیکن اقبالیات کے سلسلے میں مولانا مہر کا قابلِ قدر کام ''سرود رفتہ'' کی ترتیب و اشاعت ہے جس میں وہ سارا کلام شامل ہے جو علامہ اقبال نے ''بانگِ درا'' میں اشاعت کے وقت قلمزد کر دیا تھا ۔ اردو کلام کے علاوہ اس میں کچھ حصہ فارسی شاعری کا بھی ہے ۔ خاص طور پر ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' کے قلمزد یا ترمیم شدہ اشعار کی اولین صورت ''سرودِ رفتہ'' میں پیش کی گئی ہے ۔

۱۔ کلیاتِ اقبال فارسی ؛ 'اعتذار' از جاوید اقبال ، صفحہ الف ۔ اشاعت اول ۱۹۷۳ع شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ۔

''سرودِ رفتہ'' کا جائزہ لینے پر اسے تحقیق و ترتیب کی بلند پایہ کتاب قرار دینا پڑتا ہے ۔ اس میں وہ تمام محاسن موجود ہیں جن کا تقاضا اس نوعیت کی کسی بھی کتاب سے کیا جا سکتا ہے ۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مولانا مہر نے وہ تمام رسائل و اخبارات جمع کیے جن میں وقتاً فوقتاً اقبال کا کلام شائع ہوتا رہا تھا ۔ اس کے علاوہ انجمن حمایت اسلام کی طرف سے چھپنے والی نظموں کی کاپیاں حاصل کرکے بڑی دقت نظر سے اقبال کے مجموعوں اور اس خام مواد کا تقابلی جائزہ لیا ، اور جہاں بھی حذف و ترمیم کی صورت نظر آئی اسے پیش کر دیا ۔

اس کے علاوہ مولانا مہر نے ہر نظم کی ابتدا میں تمہیدی تعارفی نوٹ بھی لکھا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف نظم کا پس منظر سامنے آ جاتا ہے بلکہ ان امور کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ زیرِ نظر نظم کب لکھی گئی ؟ پہلی مرتبہ کس اخبار یا رسالے میں شائع ہوئی ؟ اس کے علاوہ نظم کے دیگر متعلقات بھی سامنے آ جاتے ہیں ۔ مثلاً مولانا مہر ''نالۂ یتیم'' کے تعارفی نوٹ میں لکھتے ہیں :

''یہ پہلی نظم ہے جو اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ اجلاس (منعقدہ ۲۳ ، ۲۴ ، ۲۵ فروری ۱۹۰۰ء) میں پڑھی اور جس سے ان کی شاعرانہ شہرت کا آغاز ہوا ۔ یہ نظم ۲۴ فروری کے تیسرے اجلاس میں بعد نمازِ عصر پڑھی گئی تھی ۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد خاں اس اجلاس کے صدر تھے ۔ انجمن کی روئیداد مظہر ہے ۔

''شیخ محمد اقبال صاحب نے ''نالۂ یتیم'' جو چھپا ہوا تھا ، پڑھنا شروع کیا ۔ اس کے ہر شعر پر تحسین و آفرین کے نعرے چاروں طرف سے بلند ہو رہے تھے اور سینکڑوں آنکھیں تھیں جو دریائے اشک بہا رہی تھیں ۔ اس کے پڑھنے کے دوران میں تین سو روپے سے کچھ اوپر چندہ ہو گیا اور کل کاپیاں اس نظم کی اسی وقت فروخت ہو گئیں ۔ نظم ایسی مقبول ہوئی کہ چار چار روپے کو بھی ایک ایک کاپی بکی . . . .''

مولانا نذیر احمد خاں شاعروں کی حوصلہ افزائی کے عادی نہ تھے ، لیکن نظم سن چکنے کے بعد انھوں نے فرمایا :

"میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سنی ہیں مگر واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی . . . ۔"

واضح رہے کہ یہ نظم یتیم کی زبان سے ادا ہوئی ہے ، جیسا کہ اس کے نام "نالۂ یتیم" سے ظاہر ہے ۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ نظم اگرچہ فارسی تراکیب سے لبریز ہے اور عام لوگ اسے آسانی سے نہیں سمجھ سکتے ، تاہم خیالات کی ندرت اور حسن بیان کے اعتبار سے یہ حد درجہ پسند کی گئی ۔ سچ یہ ہے کہ یتیم کی داستانِ درد اس سے پہلے کسی نے ایسے پر تاثیر انداز میں بیان نہ کی تھی ۔"[1]

تمام نظموں کے تعارفی اور تمہیدی نوٹوں میں یہی بات موجود ہے جس کی وجہ سے نظم کے متعلقات بھی معلوم ہو جاتے ہیں اور چند جملوں میں نظم کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ مولانا مہر نے ضروری مقامات پر حواشی بھی درج کیے ہیں ۔ ان حواشی کے باعث نظموں میں موجود اشارات و تلمیحات کی وضاحت ہو جاتی ہے ۔ مثلاً ایک شعر کے بارے میں مولانا مہر لکھتے ہیں :

"بیگم مسعود کے مردہ بچہ پیدا ہوا تھا ۔ بیگم کے والد ماجد کی فرمائش پر ڈاکٹر صاحب نے یہ شعر لکھ بھیجا ۔"[2]

بعض مقامات پر حواشی میں ایسے اشارے بھی کر دیے گئے ہیں جن کے باعث اشعار کی تفہیم میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے ۔ مثلاً نظم "اسلامیہ کالج کا خطاب" کے ایک شعر کے بارے میں حواشی میں لکھتے ہیں :

"معمار اور سکندر سے مراد مسلمانانِ پنجاب ہیں ۔ تعمیر اور آئینے سے مراد اسلامیہ کالج ۔"[3]

جیسا کہ دوسرے باب میں ذکر آ چکا ہے ، "سرود رفتہ" کی تمام تر افادیت کے باوجود اس کے بارے میں ایک بات ضرور کہنا پڑتی ہے کہ یہ

۱۔ سرود رفتہ ، مرتبہ مولانا مہر ، ص ۹ ۔

۲۔ حواشی سرود رفتہ ، ص ۲۱۰ ۔

۳۔ حواشی سرود رفتہ ، ص ۲۰۰ ۔

مجموعہ بہت مفید ہونے کے باوجود مکمل اور جامع نہیں ہے اور اس کا اعتراف خود مولانا مہر کو بھی تھا ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح نہیں ہوتی کہ ''سرودِ رفتہ'' کی ترتیب کے سلسلے میں مولانا مہر نے کس قدر کام کیا اور صادق دلاوری کا اس میں کتنا کام ہے ؟ بہرحال ''باقیاتِ اقبال'' کے سلسلے میں یہ کتاب جامع نہ ہونے کے باوجود اہم ہے ۔

۱۰۔ تاریخِ ارادت خاں :

اپنی پسندیدہ موضوعات اور اردو کی ان چند کتب کے علاوہ مولانا مہر نے فارسی کی ایک کتاب بھی ایڈٹ کی ۔ یہ کتاب مبارک اللہ واضح کی ''تاریخِ ارادت خاں'' ہے ۔ مولانا مہر نے نہ صرف مختلف نسخوں کے پیشِ نظر صحتِ متن کا اہتمام کیا بلکہ متن کے ساتھ ساتھ مفید حواشی بھی لکھے ۔ اس کے علاوہ تعلیقات تحریر کی گئیں ۔ صحت متن اور حواشی و تعلیقات کے باعث ''تاریخ ارادت خاں'' کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے اور اس کی تفہیم میں آسانی پیدا ہوگئی ہے ۔

''تاریخ ارادت خاں'' میں صحت متن کی بے شمار مثالیں موجود ہیں ۔ مثلاً ایک جگہ مولانا مہر مروجہ متن سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''پنجاب پبلک لائبریری کے نسخہ الف میں تیمش کی جگہ التمش'' ہے یعنی وہ فوج جو ہراول اور سالار اعظم کے درمیان ہوتی ہے ۔ غالباً یہی صحیح ہے ۔''[1]

حواشی میں مصنف کی غلطیوں اور تسامحات کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں ۔ مثلاً مبارک اللہ واضح نے بعض واقعات پیش کرتے ہوئے ان کی تاریخیں نہیں لکھیں ۔ مولانا مہر نے ان تاریخوں کا اضافہ کیا ۔ اس کے علاوہ بعض واقعات کے ضمن میں مبارک اللہ واضح کی رائے قابلِ قبول نہ تھی ، لہذا مولانا مہر نے حاشیے میں حقیقی صورت حال کی وضاحت کر دی تا کہ عام قاری کے لیے کوئی الجھن پیدا نہ ہو ۔ مثلاً ایک جگہ مبارک اللہ واضح نے مغل شہزادوں کی باہمی جنگ و جدل کے سلسلے میں لکھتے ہوئے اورنگ زیب کی مثال دیتے ہوئے

۱۔ حاشیہ تاریخِ ارادت خاں ، مرتبہ مولانا مہر ، ص ۴۵ ۔

کہا گیا اس نے اپنے باپ کے ساتھ کیا گیا تھا ؟ مولانا مہر حاشیے میں اصل واقعہ پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

''صحیح راہِ عمل بظاہر وہی تھی جو اورنگ زیب نے اختیار کی تھی لیکن باپ کو کوئی گزند نہ پہنچا ۔ البتہ اسے قلعہ آگرہ میں رہنا پڑا ۔ پیشِ نظر جو صورت ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے ۔''[1]

اس کے علاوہ متن میں مذکور شخصیات کے مختصر سوانحی حالات بھی حواشی اور تعلیقات میں دیے گئے ہیں ۔ اگرچہ حواشی بھی کافی واضح اور مفید ہیں لیکن تعلیقات نے ''تاریخِ ارادت خاں'' کے دائرۂ افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۱- حاشیہ تاریخِ ارادت خان ، ص ۷۶ ۔

مولانا غلام رسول مہر بحیثیت شارح

اردو میں شرح نویسی کا آغاز و ارتقا

شرح کے لغوی معنی کھولنے اور کھول کر کہنے کے ہیں، یعنی کسی بات کو اس انداز میں پیش کرنا کہ کوئی پہلو تشنہ اور عسیرالفہم نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ نہ ہر بات ایسی ہوتی ہے کہ اسے ہر ذہنی سطح کا آدمی اس کے تمام قرینوں کے ساتھ بخوبی سمجھ لے اور نہ ہی ہر شخص اتنی فہم و بصیرت کا مالک ہوتا ہے کہ ہر سطح کی بات اس کی سمجھ میں آ جائے۔ ایسی صورت میں ایک ایسے رہنما کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اپنے علم و فضل اور وسعتِ نظر کے باعث مشکلات کو اس انداز میں پیش کرے کہ وہ آسان اور سہل ہو جائیں۔ اس رہنما کو شارح یا مفسر کا نام دیا جاتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شارح میں دو چیزوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ جس فن کا نکتہ تشریح طلب ہے، شارح اس پر کامل عبور رکھتا ہو۔ اس فن کے بارے میں تقریباً تمام پہلو اس کے علم میں ہوں۔ اسے تشریح طلب نکتے کی حدود و امکانات کی وسعت کا بخوبی اندازہ ہو اور وہ اس کے حسن و قبح سے پورے طور پر باخبر ہو۔ مثلاً موسیقی کے رموز و اسرار کی وضاحتِ و صراحت کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو بلند پایہ موسیقار نہ بھی ہو تو بھی موسیقی کے فن کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہو۔ اسی طرح کسی شعر کی شرح کرنے کے لیے کوئی ایسا ہی شارح زیادہ مناسب رہے گا جو شاعر نہ بھی ہو تو بھی فن شعر سے کامل واقفیت رکھتا ہو۔ لیکن یہاں یہ بات بھی واضح کر دینی چاہیے کہ شارح کے لیے محض یہ ہی کافی نہ ہوگا کہ وہ فن شعر میں دستگاہ رکھتا ہو بلکہ اس کے لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ اس دور کے جملہ علوم و فنون سے بھی واقف ہو۔ خاص طور پر ان علوم و فنون سے واقفیت

ضروری ہوگی جو تشریح طلب شاعری کا موضوع بنے ہیں ۔ مثلاً کوئی ایسا شارح کلام اقبال کی شرح کا حق ادا نہیں کر سکے گا جو مسلمانوں کے مذہبی سرمائے اور اسلامی تاریخ اور قدیم و جدید فلسفے سے واقفیت نہ رکھتا ہو ۔ آج استاد ذوق کے کلام کی تفہیم اسی لیے مشکل ہو گئی ہے کہ عام قاری ان علوم سے محض نا آشنا ہے جن کی اصطلاحات کو ذوق نے اپنی شاعری میں برتا ۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شارح نے شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لیے ان علوم کا وسیع مطالعہ کیا جن کی اصطلاحات شاعری میں استعمال ہوئی تھیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ جس طرح شعر گوئی کا ملکہ زیادہ تر اکتسابی نہیں ہوتا ، اسی طرح شعر فہمی کی صلاحیت بھی محض مطالعے اور علم و فضل کی بنا پر پیدا نہیں کی جا سکتی ۔ معلوم ہے کہ بعض اوقات اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی شعر کے معاملے میں اچھے مذاق کا ثبوت نہیں دیتے ، جبکہ بسا اوقات بعض معمولی تعلیم رکھنے والے لوگ شعر فہمی کے معاملے میں حیران کن صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ دراصل جس طرح شعر گوئی کا تعلق علم و فضل سے زیادہ انسانی دل میں موجزن جذبات اور نازک احساسات سے ہوتا ہے اسی طرح شعر فہمی کے لیے بھی الھی دلی جذبات اور نازک احساسات کی اہمیت اولین ہے ۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ شعر کی بنیاد کوئی نہ کوئی جذبہ یا احساس ہی ہوتا ہے اور شارح کا کام یہی ہے کہ وہ شعر میں موجود جذبات و احساسات کو ان کی تمام نزاکتوں کے ساتھ محسوس کرے اور پھر آسان اسلوب میں ان کی وضاحت کر دے ۔

شارح کے لیے ایک اور اہم بات یہ ہے کہ وہ اظہار و ابلاغ کے تمام پیرایوں سے بھی واقف ہو ، اس لیے کہ اس کا کام نہ صرف کلام کو سمجھنا ہے بلکہ اس کے معنی و مطالب کو اس انداز میں بیان کرنا بھی ہے کہ ہر سطح کے قاری کے لیے آسانی پیدا ہو جائے اور وہ بھی اشعار میں موجود نکات اور محاسن و خوبیوں کو بہ طریق احسن سمجھ سکے ۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض شارحین کے رشحات فکر اشعار کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہو جاتے ہیں اور خود شرح کو سمجھنے کے لیے مزید شارحین کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت پسندیدہ اور مستحسن نہیں ۔ لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی شاعری ہے جس کی شرح کی ضرورت پیش آتی ہے ؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شارحین لا تعداد شعراء میں سے ہر ایک کی

طرف متوجہ نہیں ہوتے بلکہ چند ہی شاعر ہوتے ہیں جن کے کلام کی شرح کی جاتی ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شارحین ان شعرا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن کے کلام کی تفہیم میں عام قاری کچھ دقتیں محسوس کرتا ہو۔ مثلاً میر کو لیجیے جن کو خدائے سخن اور شہنشاہ غزل تک کے خطابات سے نوازا گیا لیکن چونکہ ان کا کلام آسان اور سریع الفہم ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے قاری کسی واسطے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اس لیے ان پر بے شمار مستقل تنقیدی کتب اور لاتعداد مقالات کے باوجود شرح نویسی کی ذیل میں کوئی خاص کام نظر نہیں آتا۔ اس کے مقابلے میں کلام غالب کی کم و بیش پچاس ساٹھ کے قریب قابلِ ذکر شرحیں لکھی گئی ہیں، اس لیے کہ چند غزلوں کو چھوڑ کر تمام عمر غالب اس انداز میں شعر کہتا رہا جو عام لوگ تو درکنار اکثر خواص کے لیے بھی عسیر الفہم تھا۔ لیکن یہاں پر ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا شرح نویسی کے لیے کلام کا مشکل ہونا شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ اگر شرح کے لیے بنیادی شرط یہی ہوتی تو پھر غالب کے ساتھ ساتھ سودا، انشا اور شیخ ابراہیم ذوق کے قصائد کی طرف بھی توجہ کی جاتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ غالب کے بعد جس دوسرے شاعر کی طرف شارحین متوجہ ہوئے وہ علامہ اقبال ہیں۔ اس سے بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارحین اس شاعر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کا کلام قدرے مشکل ہو اور جس کے پاس نسلِ انسانی کے لیے کوئی پیغام بھی ہو۔ ایسا شاعر جس نے مردہ علوم کی مردہ اصطلاحات سے اپنی شاعری کو گرانبار کرنے کی بجائے عام انسانی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اپنا موضوع بناتے ہوئے زندگی کے بارے میں بصیرت افروز نقطۂ نظر پیش کیا ہو اور چونکہ پوری اردو شاعری میں اس کسوٹی پر صرف غالب اور اقبال پورے اترتے ہیں، لہذا شارحین کی توجہ کا مرکز بھی یہی دو شاعر قرار پائے۔

درج بالا بحث سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے اور وہ اردو میں شرح نویسی کی روایت اور تاریخ سے متعلق ہے۔ جب یہ بات کہہ دی جاتی ہے کہ غالب اور اقبال ہی ایسے شاعر ہیں جو اردو شارحین کی توجہ کا مرکز بنے تو اس امر کی صراحت خود بخود ہو جاتی ہے کہ غالب سے پہلے اردو میں شرح نویسی

کی روایت سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ دراصل غالب سے پہلے اردو میں کوئی بھی ایسا شاعر نہیں گزرا جس نے انسانی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہو اور ایسے اسلوب میں شاعری کی ہو جو عام قاری کی ذہنی سطح سے بلند تر چیز ہو۔ اردو شعر کی تاریخ میں غالب پہلا شاعر ہے جس کی نمایاں خصوصیت مشکل پسندی قرار پائی۔ غالب جس انداز بیان پر فخر کرتا ہے وہ صرف اس کے معاصرین ہی کے لیے اجنبی اور نامانوس نہیں تھا بلکہ آج کا قاری بھی اسے عسیر الفہم تصور کرتا ہے۔ غالب نے طرز بیدل میں فکر و فلسفہ کی آمیزش کرکے اپنی فارسی دانی کے بل پر جو اسلوب ایجاد کیا، اس کو سمجھنے کے لیے بھی اجزائے حواس میں ربط اور عناصر میں اعتدال کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری اپنے زوال پذیر عہد کے لیے ناشنیدہ ہی رہی اور اپنی معنوی تہہ داری اور لفظی صناعی کے باوجود غالب کی شاعری ستائش اور صلے سے محروم ہی رہی اور غالب کو سخنور ہونے کے باوجود خاموشی میں فائدہ اخفائے حال نظر آیا۔ کسی شاعر کے لیے غالباً سب سے مشکل وقت وہی ہوتا ہے جب اس کے کلام پر داد دینے کی بجائے اس سے شعروں کے معنی پوچھے جائیں۔ لیکن غالب کو اس مرحلے سے بھی گزرنا پڑا اور غالب کے لیے یہی تکلیف دہ عمل خود اس کی شاعری کی تفہیم کا نقطۂ آغاز بھی بن گیا اور اردو شرح نویسی کی روایت کی بنیاد و اساس بھی۔

غالب نے اپنے دوستوں عزیزوں اور شاگردوں کے نام جو خطوط لکھے، ان میں کچھ خط ایسے بھی ہیں جن میں انھوں نے خود اپنے اشعار کی شرح کی ہے۔ اس سلسلے میں عبدالرزاق شاکر کے نام غالب کے خطوط کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ''نقش فریادی'' اور ''کاغذی پیراہن'' کے بارے میں جو کچھ غالب نے لکھا ہے اس کے بغیر شعر کی حقیقی معنویت کی تفہیم کا حق ادا کرنا بہت دشوار تھا۔

مرزا غالب نے اپنے مکاتیب ہی میں اشعار کی شرح نہیں کی بلکہ عام گفتگوؤں میں بھی ان کے شاگرد اکثر اشعار کے معنی پوچھتے رہتے تھے اور مرزا غالب نکتہ آفرینیاں کرتے تھے۔ انھی کی بنیاد پر شارحین کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے بہتر مواقع میسر آئے۔ مثلاً مولانا حالی نے یادگار غالب میں اشعار کی تشریح کے سلسلے میں خود مرزا غالب کے بہت سے حوالے دیے ہیں۔ مثلاً ایک شعر کی تشریح کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں:

"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے فرمایا 'اے' کی جگہ 'جز' پڑھو، معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے ۔ شعر کا مطلب یہ ہے. . ."۱

یادگار غالب میں اور بھی کئی مقامات ہیں جہاں شعر کی تشریح کرتے ہوئے مولانا حالی نے غالب کی تصریحات کا سہارا لیا ہے ۔ اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ غالب فہمی کا آغاز بھی خود غالب سے ہوا ۔

ایک مدت تک یہ تصور کیا جاتا رہا ہے کہ مرزا غالب کے اولین شارح مولانا حالی ہیں ، لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مرزا غالب کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد کچھ اور سخن شناس بھی اس اہم کام کی طرف متوجہ ہو گئے تھے ۔ ان شارحین میں پہلا نام "درگا پرشاد نادر دہلوی" کا ہے ۔ اگرچہ انھوں نے بطور خاص کلامِ غالب کی شرح کی طرف توجہ نہیں دی اور ان کے پیشِ نظر کام کی نوعیت بھی کچھ اور تھی ۔ لیکن انھوں نے ضمناً غالب کے اشعار کی شرح بھی کر دی ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نادر دہلوی نے ۱۸۷۹ء میں اقسام شاعری کے اعتبار سے ایک تذکرہ "چار چمن" مرتب کیا اور اس سلسلے میں جو شعر حوالے کے طور پر پیش کیے گئے، تذکرے میں ان کی شرح بھی کر دی۔ اور چونکہ شاعری کی مختلف اقسام کی وضاحت کرتے ہوئے غالب کے اشعار بھی نقل کیے گئے تھے لہذا ان اشعار کی شرح بھی کر دی گئی ۔ بہرحال کلام غالب کی جزوی شرح کرنے والوں میں درگا پرشاد نادر دہلوی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے ۔ جیسا کہ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں :

"کلام غالب کی جزوی شرح کرنے والوں میں مرزا غالب کے ہم عصر منشی درگا پرشاد نادر دہلوی بھی ہیں ۔"۲

۱- یادگار غالب ، از مولانا حالی، ص ۱۱۹ - کشمیر کتاب گھر، اردو بازار لاہور ۔
۲- کلام غالب کا ایک ہم عصر شارح ، مشمولہ تلاشِ غالب ، از نثار احمد فاروقی ، ص ۱۶۰ - اشاعت اول ۱۹۶۹ء ، مطبوعہ مکتبۃ العلمیہ پریس ، لاہور ۔

درگا پرشاد نادر دہلوی کے برعکس خواجہ قمر الدین راقم نے باقاعدہ طور پر کلام غالب کی شرح کی طرف توجہ دی ۔ راقم کی تصانیف میں ''شرح دیوان غالب'' کا ذکر بھی ملتا ہے ۔ لیکن یہ شرح بوجوہ زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکی ، بلکہ ایک عرصے تک کسی کو اس کا علم بھی نہ ہو سکا اور جب اس کا مسودہ ملا تو وہ اس حد تک کرم خوردہ ہو گیا تھا کہ اشاعت کے قابل بھی نہیں رہا تھا ۔ ان امور کا ذکر کرتے ہوئے مرزا رفیق بیگ نبیرۂ راقم لکھتے ہیں :

''راقم نے غالب کے دیوان کی شرح لکھی تھی . . . اس شرح کا سب سے پہلا مسودہ جو بہت کٹا پھٹا ہے ، اب نکلا ہے ۔ لیکن افسوس کہ وہ بالکل کرم خوردہ ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ شائع کیا جا سکے ۔''[1]

اگرچہ شائقین غالب اس شرح کے شائع نہ ہونے کے باعث غالب کے ایک عزیز اور شاگرد کے رشحات فکر سے محروم ہوگئے لیکن مولانا حالی نے یادگار غالب لکھ کر اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ۔ یہاں یہ امر بھی واضح کر دینا چاہیے کہ خواجہ حالی کے پیش نظر بھی محض شرح دیوان کا کام نہیں تھا ۔ وہ تو اپنے استاد کی سوانح حیات قلمبند کر رہے تھے اور چونکہ استاد کے کمالات فن کا اظہار بھی مقصود تھا لہذا اردو فارسی دواوین کے چیدہ چیدہ اشعار کی شرح بھی کر دی گئی ۔ یہ الگ بات کہ اس ضمنی کام نے حالی کو سوانح نگار، شاعر اور نقاد کے علاوہ ایک اہم شارح کی حیثیت سے بھی متعارف کرایا اور خود ''یادگار غالب'' بھی اعلیٰ درجے کی سوانح عمری ہونے کے ساتھ ساتھ اردو میں شرح نویسی کی پہلی باقاعدہ مطبوعہ کتاب قرار پائی ۔

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ، حالی سے پہلے بھی کچھ شرحیں لکھی گئی تھیں لیکن یا تو وہ شائع نہ ہو سکیں اور یا پھر اتنی مختصر تھیں کہ انھیں شرح نویسی کی روایت میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی ۔ مثلاً محمد عبدالعلی والہ دکنی کی شرح "وثوق صراحت" کے نام سے ۱۸۹۵ع میں شائع ہوئی لیکن یہ اتنی مختصر

۱۔ خواجہ قمر الدین راقم ، مشمولہ احوال غالب ، مرتبہ مختار الدین احمد ، اشاعت جون ۱۹۵۳ع ، مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ۔

تھی کہ اسے باقاعدہ شرح کہنے کی بجائے ایسی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے جس میں محض درسی ضرورت کے تحت کچھ اشعار کے بارے میں اجمالی اشارے کر دیے گئے ہوں ۔ اس نوعیت کی شرحوں کے مقابلے میں اول تو یادگار غالب اشاعت پذیر ہوئی ۔ پھر اس کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ جزوی طور پر ہی سہی ، کلام غالب کی تفصیلی شرح پیش کی گئی ۔

اگرچہ بعد کے شارحین نے کلام غالب کی شرح کے سلسلے میں ہزارہا نکتہ طرازیاں کیں لیکن حالی کی انفرادیت اس میں ہے کہ اس نے کلام غالب کے حقیقی امکانات کو پہلی بار وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ، اور یہ بات کامل یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگرچہ غالب کے بعض اشعار کی معنویت آج بالکل سامنے کی بات معلوم ہوتی ہے ، تاہم اگر حالی کی رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو بہت سے شعر اتنے پرلطف نہ ہوتے جتنے کہ وہ اب تصور کیے جاتے ہیں ۔ مثال کے طور پر غالب کے صرف اس شعر کو پیش کرنا ہی کافی ہوگا :

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

شاعر اپنی شہرت اور مقبولیت کے لیے شارحین کا محتاج نہیں ہوتا ، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انشا اور ذوق زدہ طبائع پر غالب کی حقیقی قدر و قیمت کو حالی اور یادگار غالب ہی نے منکشف کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کے بعد غالب کے شارحین کی صف میں ایک دو نہیں ، بے شمار نام نظر آتے ہیں جن میں مندرجہ ذیل شارحین اور تشاریح بطورِ خاص اہمیت کی حامل ہیں :

(۱) حلِ کلیاتِ غالب ، از شوکت میرٹھی ۔

(۲) شرح دیوان اردو غالب ، از نظم طباطبائی ۔

(۳) دیوانِ غالب مع شرح ، از حسرت موہانی ۔

(۴) ہدیۂ سعید ، از قاضی سعید الدین ۔

(۵) گنجینۂ تحقیق ، از بیخود موہانی ۔

(۶) مراۃ الغالب ، از بیخود موہانی ۔

(۷) مکمل شرح دیوانِ غالب از آسی ۔

(۸) بیان غالب ، از آغا محمد باقر ۔

(۹) رموزِ غالب ، از احسان دانش ۔

(۱۰) مطالعۂ غالب ، از اثر لکھنوی ۔

(۱۱) فکر غالب ، از خلیفہ عبدالحکیم ۔

(۱۲) مشکلات غالب ، از نیاز فتح پوری ۔

(۱۳) شرح دیوانِ غالب ، از یوسف سلیم چشتی ۔

(۱۴) دیوانِ غالب مع شرح ، از جوش ملسیانی ۔

(۱۵) مطالب غالب ، از سہا مجددی ۔

(۱۶) عنقائے معنی ، از شیر علی خان سرخوش ۔

(۱۷) دیوانِ غالب مع شرح ، از عبدالرشید علوی ۔

(۱۸) شرحِ دیوانِ غالب ، از ناطق لکھنوی ۔

(۱۹) روح غالب ، از نشتر جالندھری ۔

(۲۰) مفہوم غالب ، از احسن علی خان ۔

(۲۱) روح المطالب فی شرح دیوان غالب ، از شادان بلگرامی ۔

(۲۲) نوائے سروش ، از مولانا غلام رسول مہر ۔

یہاں صرف چند اہم شارحین کے نام دیے گئے ہیں ورنہ ذرا سی کوشش سے یہ فہرست کئی گنا بڑھ سکتی ہے ۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شارحین کی اس منتخب فہرست میں بھی بہت سے نام ایسے ہیں جن کی شہرت اور ناموری کا سارا دارو و مدار محض شرحِ غالب پر ہے ۔

غالب کے بعد کچھ دوسرے شعرا پر بھی توجہ دی گئی ، لیکن اول تو سودا ، میر تقی میر ، مومن اور ذوق وغیرہ کے صرف منتخب کلام کی شرحیں لکھی گئیں ، دوسرے ان کی طرف زیادہ شارحین بھی متوجہ نہیں ہوئے ۔ البتہ غالب کے بعد علامہ اقبال ایسے شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے جن کے کلام کی خاصی شرحیں مل جاتی ہیں ۔ البتہ ان کے سارے کلام کی شرح کرنے والے صرف یوسف سلیم چشتی ہیں ، جیسا کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں :

"میرے علم کے مطابق یوسف سلیم چشتی ہی واحد شخص ہیں جنھوں نے اقبال کی تمام فارسی اور اردو شعری تصانیف کی شرحیں لکھی ہیں۔"[۱]

کلام اقبال کے دیگر شارحین میں ڈاکٹر محمد باقر، آقائے رازی، عبدالرشید فاضل، نشتر جالندھری، مولانا مہر اور عارف بٹالوی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

شارح غالب و اقبال کے بعد اردو میں شرح نویسی کی روایت کا دامن خالی ہی نظر آتا ہے اور جس روایت کا آغاز مرزا غالب کے خطوط سے ہوا تھا وہ دم توڑتی نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اب شعر کے بارے میں جس نوعیت کے نظریات متعارف ہوئے ہیں ان کی بنا پر شرح نویسی کو ایک ادنیٰ درجے کا عمل قرار دیا جاتا ہے، اور یہ بات بالعموم سنی جاتی ہے کہ شرح سے شعر میں لطیف جذبات و احساسات کا خون ہو جاتا ہے اور شعر کا تاثر زائل ہو جاتا ہے۔ یہ بات درست ہو یا نہ ہو لیکن یہ طے ہے کہ ان خیالات نے شرح نویسی کی خاصی حوصلہ شکنی کی ہے۔ اب صرف درسی ضروریات کے تحت شرحیں لکھی جاتی ہیں اور وہ بھی اکثر ادنیٰ اور ناقص۔

مولانا مہر کی شرح نویسی

مولانا غلام رسول مہر کو شرح نویسی سے طبعی مناسبت تھی۔ اس کا اندازہ ان کے خطوط و مکاتیب کے مختلف مجموعوں کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ مولانا مہر اپنے خطوط میں موقع محل کی مناسبت سے شعر استعمال کرنے کے عادی تھے اور اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ اشعار مکتوب الیہ کی حدود علم کے احاطے میں نہیں آتے تو مولانا ان اشعار کی تشریح بھی کر دیتے تھے۔ اس نوعیت کی سب سے اچھی مثالیں تو خود مولانا مہر کے صاحب زادے عبدالسلام اسلم کے نام مکتوبات میں موجود ہیں لیکن دوسرے مکتوب الیہم کے نام خطوط میں بھی یہ صورت موجود ہے۔ بعض اوقات مولانا مہر نے خطوط میں اشعار کے معانی

۱۔ اقبال کے شارحین، مشمولہ اقبال کا ادبی مقام، از ڈاکٹر محمد زکریا، ص ۱۲۵۔ اشاعت اول ۱۹۷۷ء، مطبوعہ مکتبہ عالیہ لاہور۔

پوچھے جاتے تو بھی مولانا مہر اپنے خطوط میں اشعار کی تشریح کر دیا کرتے تھے ۔ اس سلسلے میں بھی ان کے خطوط میں بے شمار مثالیں ملتی ہیں ۔ مثلاً اپنے ایک خط میں بیدل کے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''بہ انگشتِ عصا ہر دم اشارت می کند پیری
کہ مرگ ایں جاست یا ایں جاست یا ایں جاست یا ایں جاست

پیری میں انسان عصا کے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتا اور عصا قدم قدم پر ٹیکا جاتا ہے ۔ بیدل کہتا ہے کہ پیری عصا کی انگلی سے ہر دم اشارہ کرتی جا رہی ہے کہ موت یہاں ہے یا یہاں ہے یا یہاں ہے ۔ ''ایں جاست'' کو آپ ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں یا میری زبان سے سنیں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ عصا کے سہارے بوڑھے کے چلنے کی تصویر کھینچ دی ہے ۔ اس کی تصویر کون اتارے گا ؟ بالکل یہی کیفیت مرزا غالب کے اس شعر کی ہے :

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تصویر تو ساکن و غیر متحرک ہوتی ہے ۔ اب متحرک تصاویر بھی کمال پر پہنچ گئی ہیں ، لیکن غالب کے اس شعر کی تصویر کھینچنا ممکن نہیں'' ۔[۱]

اسی طرح ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

''اقبال کے شعر میں کوئی پیچیدگی تو معلوم نہیں ہوتی ۔ صاف و سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایسے انداز میں زندگی بسر کرنی چاہیے جس کے بعد موت مرگِ دوام نہ بنے اور اگر بنے تو یہ امر خالقِ حیات و موت کے لیے باعثِ شرم ساری ہو ۔

غالباً آخری مصرعے کی جسارت نے اُلجھن پیدا کی ، حالانکہ یہ شاعرانہ استدلال ہے جو منطقی اور فلسفیانہ استدلال سے بالکل مختلف ہوتا ہے ۔ شاعر داعی ہوتا ہے ۔ وہ عقلی دلائل کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے اختیار کردہ مقدمات کی بنا پر حقائق سامع یا قاری کے دل میں اتارتا ہے ۔

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، مرقومہ ۵ نومبر ۱۹۶۵ع ، غیرمطبوعہ ۔

اقبال کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ انسان یا کہنا چاہیے مرضیاتِ باری تعالیٰ پر کاربند انسان کی موت مرگِ دوام ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کی حیات میں انقطاع پیدا ہو۔ یہاں کی زندگی ختم ہوتے ہی دوسری زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے انسان ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا جائے۔ اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوتا تو موت و حیات کا پورا خانہ اللہ تعالیٰ کے لیے باعثِ ننگ مانا جاتا حالانکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ زور پہلے مصرع پر ہے۔ دوسرا مصرع ناممکن کو مبالغے سے ناممکن ثابت کرنے کے لیے کہا گیا یعنی حیات بعد الموت کا یقین دلانے کے لیے ایک ایسی صورت فرض کر لی گئی جو کسی مسلمان یا انسان کے لیے ممکن القبول نہیں۔ شاعر کے نزدیک متبادل صورت ممکن ہی نہیں، لہذا دوسرے مصرعے کی عملاً نوبت ہی نہ آئے گی۔"[1]

اس طرح کی بے شمار مثالیں مولانا مہر کے مکاتیب میں بکھری پڑی ہیں جن میں انھوں نے مختلف شعرائے اردو و فارسی کے اشعار کی کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی شرح لکھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مولانا مہر نہ صرف خود اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے بلکہ انگریزی، عربی، فارسی اور اردو کے شعری و نثری سرمائے سے بھی انھیں خاصی واقفیت تھی۔ خاص طور پر اردو اور فارسی کے دامن میں جو کچھ ہے اس کا بڑا حصہ ان کی نظر میں تھا اور ان دونوں زبانوں کی شعری روایات اور اسلوب سے وہ 'کماحقہ' واقف و آگاہ تھے جس کی بنا پر شعر کی تشریح و توضیح میں دوسرے شارحین کے مقابلے میں انھیں زیادہ آسانیاں حاصل تھیں۔ خاص طور پر مولانا مہر نے جن شعرا کے کلام کی شرحیں لکھیں ان سے وہ پورے طور پر واقف تھے۔ مثلاً مرزا غالب کے سلسلے میں کون سا پہلو ہے جو مولانا مہر کی نظر میں نہیں تھا۔ وہ نہ صرف ان کی سوانح عمری لکھ چکے تھے بلکہ ان کے خطوط اور اردو فارسی کلام بھی مرتب کر چکے تھے۔ اسی طرح انھیں اقبال کی ہم نشینی اور ہم مجلسی کے مواقع بھی میسر آئے اور ان کے کلام کے علاوہ مولانا مہر اقبال کے خیالات و افکار سے بھی واقف تھے۔

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق، مرقومہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۳ع، غیرمطبوعہ۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولانا مہر جانتے تھے کہ شرح نویسی کی روایت کے ضمن میں اردو کس حد تک پُر دامن ہے؟ اور کن کن شارحین سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ اور کس کس شارح نے اپنی شرحوں میں کیا انداز شرح اختیار کیا؟ مثلاً اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''غالب کے اشعار کی شرحیں بہت لکھی جا چکی ہیں ۔ مثلاً حسرت موہانی کی شرح ، بے خود کی شرح ، طباطبائی کی شرح ، باقر کی شرح ''وثوق صراحت'' (ایک حیدر آبادی کی شرح) ، جوش ملسیانی کی شرح ، سہا کی شرح وغیرہ . . . ہاں ایک شرح بھول ہی گیا یعنی نشتر جالندھری کی شرح ۔ پھر خود مرزا غالب بھی اپنے بعض اشعار کی شرح لکھ چکے ہیں جو ان کے مکاتیب میں موجود ہے . . . . . مرحوم عبد الرحمٰن بجنوری نے نسخۂ حمیدیہ کے لیے جو مقدمہ لکھا تھا وہ بھی ایک لحاظ سے بعض اہم اشعار کی شرح ہی تھی . . . . پھر شرح میں مختلف مدارج اور اس کے بھی مختلف اسالیب ہیں ۔ مثلاً بعض لوگ صرف اتنا کافی سمجھتے ہیں کہ بعض ضروری اشارے کر دیے تاکہ شعر میں کوئی تلمیح یا کوئی خاص پیچیدگی ہو تو اس کی تصریح ہو جائے اور جو شخص غالب کا کلام پڑھے گا اس کے لیے اتنی تصریح بہمہ وجوہ کفایت کرے گی ۔ حسرت موہانی نے یہی کیا ہے ۔ بعض اصحاب شرح میں ہر قسم کے مباحث لے آتے ہیں ۔ مثلاً طباطبائی مرحوم . . . خواجہ حالی مرحوم نے ''یادگار'' میں بعض اہم اشعار کی شرح کر دی ۔ بعض لوگ شرح کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے اشعار میں سے وہ الفاظ چنے جائیں جن کی لغوی تصریح ضروری ہو ، پھر معانی کی بحث چھیڑی جائے ۔ غالباً شوکت میرٹھی نے یہی کیا تھا جو ''مجدد السنہ شرقیہ'' مشہور تھے ۔''[۱]

صرف یہی نہیں بلکہ اس خط میں آگے چل کر مولانا مہر نے شرح نویسی کے اصول و مبانی پر بھی لکھا ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس فن کی باریکیوں سے وہ پوری طرح آشنا تھے ۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :

۱۔ مکتوب بنام انیس جیلانی ، مرقومہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۶ع ، غیر مطبوعہ ۔

"شعر کو ایک خاص دماغی و ذہنی حالت کا کرشمہ سمجھتا ہوں ۔ یہ حالت اپنے اوپر طاری کرنے کے لیے انسان کو دوسرے مشاغل سے دست بردار ہو جانا چاہیے ۔ جس طرح ہر فن کے آغاز میں ایک خاص نوع کی ریاضت ضروری ہوتی ہے ، اسی طرح شعر بھی ایک ریاضت کا طلب گار ہے اور وہ ریاضت بڑی کٹھن اور بے حد دشوار ہوتی ہے ۔ جب دماغ کو مناسبت میسر آ جائے تو پھر نہ شعر کہنے میں چنداں دقت پیش آتی ہے اور نہ سمجھنے میں ۔ یہ دراصل الہام و القا کا ایک شعبہ ہے اور خاص ریاضت کے بغیر اس کے لیے دماغ میں صلاحیت پذیرائی پیدا نہیں ہو سکتی ۔ ایسی ہی کیفیت طاری ہو جائے تو معارف شعر سامنے آتے ہیں ۔ محض زور علم سے شرح کر لینے میں لطف قطعاً نہیں اور یہ بات الھی افراد پر واضح ہو سکتی ہے جو طباطبائی یا اس جیسی دوسری شرحیں دیکھ چکے ہیں ۔"[1]

یہ امر مستزاد ہے کہ مولانا مہر مدت العمر ایسے پیشے سے وابستہ رہے جس کے بنیادی تقاضوں میں یہ امر بھی شامل تھا کہ حالات و واقعات اور مسائل کی اس انداز میں تشریح و توضیح کی جائے کہ معمولی علم رکھنے والا قاری بھی بات کو اچھی طرح سمجھ لے ۔ ان سب امور کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر کو شرح نویسی سے طبعی مناسبت تھی اور اسی بنا پر ان میں ایک اچھے شارح کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں اور بعض اوقات مولانا مہر کی ان صلاحیتوں کا اظہار بھی ہوا ۔ مثلاً مولانا مہر نے افکار کراچی کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں اشعار غالب کی جس طرح شرح کی تھی وہ خاصے کی چیز تھی ۔ لیکن شرح نویسی کے ساتھ طبعی مناسبت کے باوجود مولانا مہر اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے ۔ بعض اصحاب نے توجہ دلائی بھی تو انھوں نے اسے کار فضول قرار دیا اور وقت کی قلت اور معاش کی مجبوریوں ایسے عذر کرکے طرح دے گئے ۔ مثلاً اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"آپ کی محبت کا ممنون ہوں لیکن خدارا اس کے بدلے میں مجھے خار زار پر چلنے کی دعوت نہ دیجیے ۔ یہ عاجز تا بحد امکان خدمت احباب سے گریزاں نہیں لیکن میرے حالات ایسے مشاغل کے لیے ساز گار نہیں ۔

۱۔ مکتوب بنام انیس جیلانی ، مرقومہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۶ء ، غیر مطبوعہ ۔

ہاں البتہ اللہ تعالیٰ معاش کی طرف سے فارغ البالی عطا کرتا تو ایسے مشاغل اختیار کیے جا سکتے تھے ۔''[1]

مولانا مہر معاش کی مجبوریوں کے باعث شرح نویسی سے گریز کر رہے تھے لیکن پھر معاش کی مجبوریاں ہی انہیں اس خارزار میں لے آئیں اور انھوں نے غالب اور اقبال کے کلام کی شرحیں لکھیں ، اس لیے کہ یہ شرحیں اپنی خواہش کی بجائے پبلشرز کے اصرار کی وجہ سے لکھی گئیں ۔ مثلاً مولانا مہر اپنے ایک خط میں ''نوائے سروش'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میرے پیشِ نظر رموز و اوقاف اور اعراب تھے ۔ مدت سے خیال تھا کہ اگر یہ کام ہو جائے تو شرح کی ضرورت نہیں رہتی ۔ چنانچہ دیوان اسی غرض سے مرتب کیا تھا اور اس پر عرصہ گزر چکا ۔ پھر ضمیمہ نمبر ۱ میں وہ اشعار جمع کیے جو متفرق ہو کر چھپتے رہے ۔ ضمیمہ دوم میں انتخاب حمیدیہ تھا ۔ میرے پبلشرز کی خواہش یہ تھی کہ غالب کا مروجہ دیوان الگ چھاپا جائے اور ضمیموں والا الگ ۔ پھر اس نے بہ اصرار شرح لکھوائی ، وہ الگ چھپے گی ۔''[2]

بہرحال وجوہ کچھ بھی رہی ہوں لیکن مولانا مہر شرح نویسی کی طرف مائل ہو گئے اور اقبال اور غالب کے کلام کی کل پانچ شرحیں ان کی یادگار کے طور پر قارئین کے سامنے ہیں ۔ چونکہ مولانا مہر نے اقبال کے کلام کی شرحیں پہلے لکھیں لہذا ان پر تنقید و تبصرہ بھی پہلے ہونا چاہیے ۔

تشاریحِ اقبال

کلامِ غالب کے شارحین کے مقابلے میں اقبال کے شارحین کی تعداد بہت کم ہے بلکہ سارے کلام کی شرح کرنے والے تو صرف یوسف سلیم چشتی ہی ہیں ۔ اس کے علاوہ جتنے لوگ ہیں انھوں نے کسی ایک آدھ مجموعے کی شرح کر دی ہے ۔ مثلاً آغائے رازی ، ڈاکٹر محمد باقر ، نشتر جالندھری اور عارف بٹالوی وغیرہ ۔ البتہ یوسف سلیم چشتی کے بعد مولانا مہر ایسے شارح ہیں جنھوں نے اقبال کے

۱۔ مکتوب بنام الیس جیلانی ، مرقومہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۶ع ، غیر مطبوعہ ۔
۲۔ مکتوب بنام سید قدرت نقوی ، مرقومہ دسمبر ۱۹۶۶ع ۔

کئی مجموعوں کی شرح لکھی ہے۔ انھوں نے بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ایک فارسی مجموعے "اسرار و رموز" کی شرح کی ہے۔ پر لطف بات یہ ہے کہ جس طرح یوسف سلیم چشتی نے اپنی شرحوں کے لیے ایک مخصوص نام منتخب کر رکھا ہے، اسی طرح مولانا مہر نے بھی اپنی شرحوں کے لیے ایک خاص نام مختص کر دیا تھا۔ مثلاً "مطالب بانگ درا" اور "مطالب بال جبریل وغیرہ۔ یعنی انھوں نے اقبال کے مجموعے سے قبل صرف "مطالب" کا اضافہ کرکے اپنی شرح کا نام رکھ لیا اور ناموں کا یہی سلسلہ ہے جو بظاہر مولانا مہر کی شرحوں کو دوسرے شارحین کی تالیفات سے منفرد کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی مولانا مہر کی شرحوں میں کچھ ایسی خصوصیات ملتی ہیں جو انھیں دوسرے شارحین سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ مثلاً مولانا مہر دیگر شارحین کے برعکس نظموں کے آغاز میں نظموں کا ضروری تاریخی پس منظر بھی بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً "خضر راہ" کی شرح سے قبل اپنے تمہیدی نوٹ میں لکھتے ہیں:

"یہ نظم اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سینتیسویں سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی جو اپریل ۱۹۲۲ء میں اسلامیہ ہائی سکول اندرون شیرانوالہ دروازہ میں منعقد ہوا تھا۔ عالم اسلام کے لیے وہ وقت بے حد نازک تھا۔ قسطنطنیہ پر اتحادی قابض تھے۔ سلطنت عثمانیہ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ اتحادیوں کے ایما پر یونانیوں نے اناطولیہ میں فوجیں اتار دی تھیں۔ شریف حسین جنگ کے زمانے میں انگریزوں کے ساتھ مل کر سلطنت عثمانیہ سے بغاوت کر چکا تھا۔ اس وجہ سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو عرب کے مختلف حصوں میں براہ راست مداخلت کا موقع مل گیا تھا۔ اس طرح مسلمانوں پر رنج و قلق کی گھٹائیں چھا گئیں۔ ہمارے ملک میں ہجرت کی تحریک جاری ہوئی۔ پھر خلافت اور ترک موالات کا دور شروع ہوا۔ ہزاروں مسلمان قید ہو گئے۔ ادھر دنیائے اسلام کے روبرو نئے نئے مسائل آ گئے۔ اقبال نے انھی میں سے بعض اہم مسائل کے متعلق حضرت خضر کی زبان سے مسلمانوں کے سامنے صحیح روشنی پیش کی اور نظم کا نام 'خضر راہ' اسی وجہ سے رکھا کہ یہ مشکلات و مصائب کے نہایت نازک دور میں راہنمائی کا مینار تھی۔

یہ نظم سننے کے لیے بے شمار آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اندازہ کیا گیا

ہے کہ پورا مجمع بیس ہزار سے کم نہ ہوگا ۔ بعض اشعار پر اقبال خود بھی بے اختیار روئے اور مجمع بھی اشک بار ہو گیا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اقبال پر جتنی رقت خضر راہ پڑھنے کے دوران میں طاری ہوئی اتنی کسی نظم کے دوران میں نہیں ہوئی ۔ ابتدا میں نظم میں صرف دو عنوان تھے ۔ پہلے دو بندوں کا عنوان ''شاعر'' تھا ، یعنی شاعر کا خطاب حضرتِ خضر سے ۔ باقی بندوں کا عنوان تھا ''جوابِ خضر'' ۔ نظر ثانی میں اقبال نے مختلف مسائل پر الگ الگ عنوان قائم کر دیے ۔ خضر راہ اقبال کی مختلف نظموں میں بعض وجوہ سے یگانہ حیثیت کی مالک ہے ۔ مثلاً . . . .''[1]

اس کے علاوہ وہ نظمیں جو مختلف شخصیات پر لکھی گئیں یا جن میں مختلف تاریخی شخصیات کا ذکر آ گیا ، مولانا مہر نے اپنے تمہیدی نوٹ یا پھر حسبِ موقع ان کے بارے میں ضروری معلومات تحریر کر دیں ۔ مثلاً وہ ضربِ کلیم کی ایک نظم ''کارل مارکس کی آواز'' کی شرح کی ابتدا میں لکھتے ہیں :

''کارل مارکس جرمنی کا یہودی تھا ۔ ابتدا میں وہ جرمنی کے مشہور فلسفی ہیگل کا پیرو تھا ۔ پھر اس کے خیالات میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ۔ وطن سے اسے نکلنا پڑا ۔ عمر کے آخری ایام انگلستان میں بسر کیے ، وہیں ۱۸۸۳ء میں وفات پائی ۔ ''سرمایہ'' اس کی مشہور کتاب ہے جسے کمونسٹوں میں بہت مقبولیت حاصل ہے ۔ مارکس ہی دراصل موجودہ زمانے کی اشتراکیت یا کمیونزم کا بانی ہے ۔''[2]

''مطالب'' کا یہی وہ پہلو ہے جو انھیں شرح نویسی کے ادنیٰ درجے سے اٹھا کر تحقیق کے دائرے میں لے جاتا ہے ۔ مولانا مہر کی شرحوں کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد زکریا لکھتے ہیں :

۱۔ مطالب بانگِ درا ، ص ۳۰۶ ، اشاعت پنجم ۱۹۵۶ء ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ۔

۲۔ مطالب ضربِ کلیم ، ص ۱۶۲ ، اشاعت ششم ۱۹۵۶ء ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔

"نظموں کے بارے میں اختصار سے بعض تحقیقی باتیں بھی تحریر کر دیتے ہیں جو بے حد مفید ہوتی ہیں ۔ مثلاً اکثر نظموں کا سیاسی ، سماجی اور تہذیبی پس منظر بھی ضروری سمجھیں تو لکھ دیتے ہیں ۔"[۱]

صرف نظموں کا پس منظر ہی نہیں بلکہ اشعار میں آنے والے تاریخی واقعات اور تلمیحات کو بھی ضروری تفصیلات کے ساتھ واضح کر دیا جاتا ہے ۔ مثلاً نظم "غرۂ شوال" کے ایک شعر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آخری مصرع میں ایران کے اُن درد ناک واقعات کی طرف اشارہ ہے جو محمد علی شاہ قاچار کی معزولی کے بعد پیش آئے ۔ ایران میں دستوری حکومت کی بنیاد سید جمال الدین افغانی نے رکھی تھی ۔ قاچار بادشاہوں کو قوم و ملک کا کوئی خیال نہ تھا ۔ اپنے عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں لگے ہوئے تھے ۔ ناصر الدین شاہ قاچار نے یورپ کے کئی سفر کیے ۔ ان میں بہت روپیہ صرف ہوا اور یورپی فرموں کو اس نے کئی ٹھیکے دے دیے ۔ وہ ۱۸۹۶ء میں سید جمال الدین افغانی کے ایک شاگرد محمد رضا کرمانی کے ہاتھ سے مارا گیا ۔ مظفر الدین شاہ اس کا جانشین بنا ۔ اس نے قوم کے مطالبے سے مجبور ہو کر دستوری حکومت کا انتظام کر دیا ، لیکن اس میں برابر روڑے اٹکاتا رہا ۔ اس کا بیٹا محمد علی روسیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن گیا اور وہ سب کچھ انھی کی مرضی کے مطابق کرتا تھا ۔ روسیوں نے ایران کو اپنے قبضے میں لانے کے لیے جال پھیلا رکھے تھے ۔ قوم نے ۱۹۰۹ء میں محمد علی شاہ کو معزول کر دیا اور اس کے کم سن فرزند احمد شاہ کو بادشاہ بنا لیا ۔ محمد علی شاہ اور اس کے بھائی سالار الدولہ نے دیر تک روسیوں کی مدد سے ایران پر حملے جاری رکھے ۔ روسی فوجیں جہاں جہاں قابض ہوئیں ، انھوں نے آزادی کے علم داروں خصوصاً دینی عالموں کو پھانسی کی سزائیں دیں اور مشہد مقدس پر گولہ باری بھی کی ۔ اقبال نے انھی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ محمد علی اور سالار الدولہ کی وفات نے ایران کی مصیبتوں میں ایک حد تک کمی کی ۔ یہی زمانہ ہے جب برطانیہ اور روس نے ایک خفیہ معاہدے کی بنا پر ایران کو

۱- اقبال کا ادبی مقام ، از ڈاکٹر محمد زکریا ، ص ۱۲۹ ۔

باہم تقسیم کر لیا تھا اور اپنے الگ الگ حلقے بنا لیے تھے - پہلی جنگ یورپ میں زاروں کی حکومت ختم ہوئی تو بالشویکوں نے تمام خفیہ معاہدے ختم کر دیے - اس وقت ایران کو آزادی کا سالس لینا نصیب ہوا - پھر احمد شاہ اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلنے لگا - ۱۹۲۵ع میں قوم نے اسے معزول کرکے رضا شاہ پہلوی مرحوم کو بادشاہ بنایا -"[۱]

چونکہ مولانا مہر کے سامنے کلامِ اقبال کے زیادہ تر ماخذ تھے ، لہذا انھوں نے مطالب کے سلسلے کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی ہے - اس کے لیے وہ اپنے مطالب واضح کرتے ہوئے جہاں ضروری سمجھتے ہیں علامہ اقبال کے لظرثانی ہونے والے یا قلمزد اشعار بھی لکھتے جاتے ہیں تا کہ لظم کے مضامین کی بہتر طور پر وضاحت ہو جائے - مثلاً ایک لظم کے تمہیدی لوٹ میں لکھتے ہیں :

"اس لصیحت کا جو جواب اقبال نے دیا تھا وہ سننے کے قابل ہے :

سن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا
شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ لواز
مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر
ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش لہ راز
ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی"[۲]

مولانا مہر صرف کلامِ اقبال کی شرح ہی نہیں کرتے بلکہ تضمین ہونے والے اشعار اور قرآنی آیات کا ترجمہ و تشریح بھی کرتے جاتے ہیں - البتہ بعض اوقات یہ نہیں بتاتے کہ تضمین ہونے والا شعر یا مصرع کس شاعر کا ہے ؟ اس کے علاوہ مولانا مہر کی شرح کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ مختلف اشعار کی وضاحت کے لیے ہم معنی اشعار ، قرآنی آیات اور احادیث پیش کرتے جاتے ہیں - اس کے علاوہ قرآنی آیات و احادیث کا ترجمہ بھی کر دیتے ہیں تا کہ عربی زبان سے ناآشنا قاری بھی استفادہ کر سکے - "مطالب" میں حسب ضرورت اردو فارسی کے تقریباً سبھی معروف و مشہور شعراء کے شعر آ گئے ہیں ، لیکن خود اقبال

۱- مطالبِ بانگِ درا ، ص ۲۳۲ - ۲۳۳ -
۲- مطالبِ بانگِ درا ، ص ۲۲۵ -

اور غالب کے اردو فارسی شعروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے ۔ مولانا مہر فارسی اشعار کا ترجمہ بھی کر دیتے ہیں تا کہ استفادہ کرنے والوں کو کسی طرح کی دقت پیش نہ آئے ۔ لیکن اگر اس کے باوجود تشریح میں کسی اور پہلو کا احتمال موجود ہو تو حاشیے میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے اختیار کردہ معنی کی توجیہ پیش کر دیتے ہیں ۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :

''اس مصرع میں لفظ منزل کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ۔ اول منزل مقصود لیکن اس موج کی کوئی خصوصیت نہیں ۔ ہر رہرو کو منزل مقصود سے محبت ہوتی ہے اور رہروی کا مدعا ہی یہ ہوتا ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ جائے ۔ دوسرے معنی مسافت یا چلنے کے ہیں ۔ ''منزل'' اردو زبان میں یہ معنی بھی دیتا ہے اور یہی معنی ہم نے مراد لیے ہیں ۔''[1]

مولانا مہر کوشش کرتے ہیں کہ قارئین زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ معنی سمجھ لیں اور انھیں کسی طرح کی دقت پیش نہ آئے ۔ اس کے لیے وہ تشریح سے پہلے عام اصول شرح کے مطابق اشعار میں آنے والے مشکل الفاظ کے معنی لکھ دیتے ہیں ۔ اس کے لیے مولانا مہر یہاں تک احتیاط برتتے ہیں کہ بعض لفظوں پر اعراب تک لگا دیتے ہیں ۔ اس لیے کہ بسا اوقات اعراب بدل جانے سے لفظوں کے معنوں میں بھی تغیر آ جاتا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگرچہ مولانا مہر نے لغت پر خاصی محنت کی ہے لیکن بعض جگہ پھر بھی غلطیاں رہ گئی ہیں ۔ صرف الفاظ کے معنوں ہی میں نہیں بلکہ اشعار کی تشریح میں بھی مولانا مہر سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے ۔ مثلاً ''بانگِ درا'' کی ایک نظم شمع کے اس شعر :

گوہر کو مشت خاکِ میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے مضموں بلند ہے

کی شرح کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

''اگرچہ میں گہر ہوں لیکن مجھے زمین کی خاک ہی میں رہنا پسند

۱۔ مطالبِ بانگِ درا ، ص ۶۵ ۔

ہے ۔ شعر کی اصطلاحات میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ میری بندش اگرچہ چست نہیں لیکن مضمون بہت اونچا ہے ۔ اس شعر میں خاک کو بندش کی سستی اور گوہر کو مضمون کی بلندی سے تعبیر کیا ہے ۔''[1]

لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس شعر میں گوہر سے مراد انسانی روح اور مشتِ خاک سے مراد انسانی جسم ہے اور اسی حوالے سے شعر کے معنی متعین کیے جانے چاہییں ۔

مولانا مہر نے اپنی شرحوں میں یہ کام بھی کیا ہے کہ اقبال کے مجموعوں میں کتابت اور متن کی غلطیوں کی طرف جابجا اشارے کر دیے ہیں تاکہ عام قارئین غلطی کا شکار نہ ہو جائیں ۔ مثلاً ایک جگہ حاشیے میں لکھتے ہیں :

''بانگِ درا میں ''مزرع'' کو کاتب نے ''مزرعہ'' بنا دیا ہے جو غلط ہے ۔ اس سے مصرع کا وزن غلط ہو جاتا ہے ۔''[2]

اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

''بانگِ درا میں اس بند کے پانچویں مصرع میں 'درد' کے نیچے غلطی سے کاتب نے اضافت لگا دی ۔ اس صورت میں مصرع کے معنی کچھ نہیں بنتے ۔ اضافت کٹ جانی چاہیے ۔''[3]

حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا مہر کاتب کی غلطیوں کی نشان دہی تو کرتے ہیں لیکن ضرورتِ شعری کے تحت خود اقبال نے اصول و قواعد کی جو خلاف ورزیاں کیں ، ان کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے اور نہ ان کی فنی لغزشوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں ۔ مولانا مہر کلامِ اقبال کی فنی خوبیوں کی طرف بھی اشارہ نہیں کرتے ۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا مہر کے پیشِ نظر مفصل شرحیں لکھنے کا کام تھا ہی نہیں ، بلکہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ اقبال اور کلامِ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایسے معاون تیار کر دیے

۱۔ مطالبِ بانگِ درا ، ۴۴ ۔
۲۔ مطالبِ بانگِ درا ، ص ۶۴ ۔
۳۔ مطالبِ بانگِ درا ، ص ۱۷ ۔

جائیں جن میں ضروری تصریحات موجود ہوں۔ جیسا کہ وہ خود ''بانگِ درا'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

"غور و فکر کے بعد یہی مناسب سمجھا گیا کہ معاون اپنے جائز حدود سے تجاوز نہ کرے ۔ یعنی وہ صرف اعانت و امداد کا فرض ادا کرے ۔ اس میں بعض ان چیزوں کی اجمالی تشریح ہو جو پڑھنے والے پر واضح نہیں ہوتیں ۔''[1]

اسی طرح اپنے ایک خط میں اپنی شرحوں کی حقیقی حیثیت اور اپنے دائرۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میں نے تو شرح نہیں لکھی تھی ۔ کوشش کی تھی کہ عام فارسی خواں ان کتابوں کے مطالعے سے بہ آسانی بہرہ ور ہو سکیں ۔ شرح میں مسائل و مباحث کی تفصیل ضروری تھی اُدھر متوجہ ہوتا تو جو مرحلۂ تشریح میرے سامنے تھا اس سے تجاوز کیے بغیر چارہ نہ تھا ۔''[2]

بظاہر مولانا مہر نے یہ حدود ''مطالبِ اسرار و رموز'' کے بارے میں بیان کی ہیں لیکن دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اختصار ''مطالب'' کے سارے سلسلے کا عام نقص بن گیا ہے جسے تقریباً ہر شخص محسوس کرتا ہے ۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد زکریا لکھتے ہیں :

''بعض جگہ وہ تشریح میں اس قدر اختصار سے کام لیتے ہیں کہ زبردست تشنگی کا احساس ہوتا ہے ۔''[3]

صرف عام قاری اور فاضل نقاد ہی نہیں بلکہ ان تشاریح کے پبلیشرز بھی اختصار و تشنگی کے شاکی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بہت عرصے سے ضرورت کے باوجود تشاریح کے نئے ایڈیشن نہیں چھپ رہے ۔''[4] بہرحال اس اختصار کا نقصان تو یہ ہوا کہ پڑھنے والا تشنگی محسوس کرتا ہے ، لیکن اس کا ایک فائدہ بھی

۱۔ دیباچہ مطالب بانگِ درا ، ص ہ ۔
۲۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۱۵ جولائی ۵۴ ۔
۳۔ اقبال کا ادبی مقام ، از ڈاکٹر محمد زکریا ، ص ۱۲۹ ۔
۴۔ انٹرویو از شیخ نیاز احمد ۔

ہوا اور وہ یہ کہ ان مباحث و موضوعات کے متعلق مناسب رہنمائی مل جاتی ہے جن کا شعر سے تعلق ہو ، ورنہ دیگر شرحوں کی کیفیت تو یہ ہے کہ ان میں تفصیل و اطناب کے پیش نظر اکثر غیر متعلق اور لایعنی مباحث شامل کر دیے گئے ہیں اور شارحین کھینچ تان کر اپنے نظریات و معتقدات کو اشعار کی تشریح کے پردے میں ظاہر کرتے ہیں ، جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ قاری الجھ کر رہ جاتا ہے اور اکثر اوقات شعر کے حقیقی معنوں تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی ۔ مولانا مہر کی شرحیں اس نقص سے پاک ہیں ۔ اس سلسلے میں جو رہنما اصول ان کے سامنے تھا ، اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ”پوری احتیاط ملحوظ رہی ہے کہ اقبال کے مفہوم میں اپنی طرف سے کوئی آمیزش نہ ہو ۔ نہ اسے کھینچ تان کر انفرادی تصورات کے مطابق بنایا جائے ، نہ کسی ایسی تصریح کا اضافہ کیا جائے جسے نظموں کے اوقات و مواقع سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی ۔“[1]

”مطالب“ سمیت کلام اقبال کی تمام شرحوں کو دیکھ کر یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ ان میں صرف شرح دی گئی ہے ، اشعار کا متن درج نہیں کیا گیا ۔ لیکن یہ ایسا نقص ہے جو کاپی رائٹ کے قاعدوں کی مجبوریوں کے باعث یوسف سلیم چشتی سے لے کر عارف بٹالوی تک کی شرحوں میں موجود ہے ۔ بہرحال اپنی چند خامیوں کے باوجود مولانا مہر کی شرحیں اب تک شائع ہونے والی تشاریح کے مقابلے میں زیادہ وقیع اور قابل قدر ہیں اور قاری ان کے اختصار کے باوجود ان سے زیادہ بہتر طور پر استفادہ کر سکتا ہے ۔ لیکن جس طرح وہ ایک عرصے تک علامہ اقبال کی صحبت میں رہے تھے اور جس طرح قدرت نے انھیں عقابانہ دماغ عطا کیا تھا اس کے پیش نظر مولانا مہر سے بہترین شرحوں کی توقعات وابستہ تھیں جن پر وہ پورے نہیں اتر سکے ۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد زکریا ، مولانا مہر کی شرحوں کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ”مولانا مہر میں یقیناً اس سے بہتر شارح اقبال بننے کی صلاحیتیں موجود تھیں ، مگر افسوس ہے کہ ان کی توجہ مختلف منصوبوں میں بٹی ہوئی تھی ، اس لیے نتیجہ حسب دلخواہ نہ نکل سکا ۔“[2]

۱- دیباچہ بانگ درا ، ص ۵ ۔

۲- اقبال کا ادبی مقام ، از ڈاکٹر محمد زکریا ، ص ۱۲۹ ۔

شرحِ دیوانِ غالب (نوائے سروش) :

کلامِ اقبال کے بعد مولانا مہر نے غالب کے اردو دیوان کی شرح لکھی جس کا نام غالب ہی کی ترکیب کے مطابق "نوائے سروش" تجویز کیا گیا ۔ یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ "نوائے سروش" میں مطالبِ اقبال کے برعکس غالب کا کلام بھی شامل ہے اور کلام کی ترتیب میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو مولانا مہر کے مرتب کردہ "مکمل دیوانِ غالب اردو عکسی" کا طرۂ امتیاز ہیں ۔ البتہ "نوائے سروش" میں کلامِ غالب کی شرح بھی موجود ہے ۔

مولانا مہر چونکہ غالبیات کے متخصص تھے لہٰذا ان سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ ان کی شرح غالبیات میں اہم اضافہ ہوگی ۔ لیکن جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے ، مولانا مہر نے "نوائے سروش" اپنی خواہش کے بناء پر نہیں بلکہ معاشی مجبوریوں اور پبلشرز کے اصرار پر لکھی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اس میں بعض بہت اہم خوبیاں موجود ہیں ، وہیں اسے کلامِ غالب کی ایسی شرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا جو حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہو ۔ دراصل شرح کے اصول و مبانی سے واقفیت کے باوجود مولانا مہر پرانے اصولِ شرح سے دامن نہیں بچا سکے اور نئے اصولِ شرح کے مطابق شرح نویسی ان کے پیشِ نظر بھی نہیں تھی ۔ انھوں نے چند معروف شرحیں اپنے سامنے رکھیں اور شرح میں اپنی طرف سے بعض اضافے کیے ۔ کہیں دوسرے شارحین سے اتفاق کیا اور کہیں اختلاف اور اس طرح ایک نئی شرح تیار کر دی ۔ جیسا کہ وہ خود اپنے پیشِ نظر مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "میں نے ذہن میں شرح کا جو ہیولہ تجویز کیا تھا وہ نہ زیادہ مختصر تھا اور نہ زیادہ مفصل ۔ آرزو یہ تھی کہ مرزا کے اشعار ایسے انداز میں پیش کیے جائیں جس سے ان کی معنوی اہمیت و عظمت بخوبی واضح ہو جائے اور خوانندگانِ کرام اندازہ فرمالیں کہ مرزا کو شعر و ادب میں یکتائی کا جو درجہ ملا ، اس کی بنیاد و اساس کیا ہے ؟ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ ہر شعر کی شرح خواہش و اطمینان کے مطابق کر سکا ہوں لیکن اسے ملاحظہ فرما لینے کے بعد یہ یقین ضرور ہو جائے گا کہ میں نے شارحین کی قابلِ قدر نکتہ نوازیوں سے استفادہ کے ساتھ جابجا فکر و نظر کے نئے پہلو بھی پیش کیے ہیں اور

کوشش برابر یہ رہی کہ مرزا کی شعر گوئی میں بیان و تخیل کے جن کمالات کی جلوہ آرائیاں بکثرت نمایاں ہیں، ان تک رسائی زیادہ سے زیادہ سہل ہو جائے۔ میں ان شرحوں پر نقد و تبصرہ کا رشتہ سنبھال نہیں سکتا۔ اتنا عرض کر دیتا ہوں کہ پوری صف میں خواجہ حالی مرحوم اور مولانا طباطبائی مرحوم ہی کے ارشادات زیادہ تر محکم و استوار نظر آئے۔"[1]

چونکہ "نوائے سروش" کی تالیف کے وقت دیگر شارحین کی شرحیں بھی مولانا مہر کے سامنے رہی تھیں، یہی وجہ ہے کہ "نوائے سروش" میں جابجا دوسرے شارحین کے حوالے نظر آتے ہیں۔ کہیں ان شارحین سے اتفاق کیا گیا ہے اور کہیں اختلاف۔ لیکن چونکہ مولانا مہر وضعدار آدمی تھے لہذا جہاں کسی شارح سے اتفاق کیا ہے، وہاں تو اس کا نام لکھ دیا ہے ورنہ صرف بعض افراد اور بعض اصحاب وغیرہ لکھ کر اختلاف رائے ظاہر کر دیا ہے۔ مثلاً غالب کے ایک شعر کی شرح کر دینے کے بعد لکھتے ہیں :

"بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ غالب کا شعر بیدل کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ ہے۔"[2]

اس کے بعد اختلافِ رائے ظاہر کرتے ہوئے بیدل اور غالب کے شعر کا فرق واضح کر دیا ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، مولانا مہر نے خطوطِ غالب اور تمام اہم شارحین مثلاً حالی، طباطبائی، حسرت موہانی، عبدالرحمن بجنوری، بیخود دہلوی اور محمد عبدالعلی وغیرہ سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن ایسے شارح صرف حالی ہیں جن کی شرح پر بعض اوقات کسی اضافے کی گنجائش نہیں سمجھی گئی۔ "نوائے سروش" میں ایسے بہت سے شعر نظر آتے ہیں جن کے بارے میں یادگار غالب کے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اگرچہ نوائے سروش میں مشکل الفاظ کے معانی اور پھر شعر کی شرح کر دینے کا پرانا اصول کارفرما نظر آتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ لغت کے سلسلے میں دیگر شارحین کے مقابلے میں مولانا مہر نے زیادہ محنت کی ہے۔ اس سلسلے میں

۱- نوائے سروش، از مولانا مہر، ص ۱۴ - ۱۵ -

۲- نوائے سروش، ص ۱۱۳ -

خاص بات یہ ہے کہ اگر اشعار میں تلمیحات ، تاریخی واقعات یا مختلف افراد و رجال کا ذکر آیا ہے تو مولانا مہر نے ان کی پوری وضاحت کر دی ہے ۔ مثلاً شہزادہ خضر سلطان کے بارے میں لکھتے ہیں :

''بہادر شاہ ظفر کا ایک بیٹا جسے ظالم ہاڈسن نے ۱۸۵۷ع میں شہزادہ مرزا مغل اور شہزادہ مرزا ابوبکر کے ساتھ دہلی دروازے کے باہر گولی سے شہید کر دیا ۔ ''خمخانہ جاوید'' اور مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ شہادت کے وقت چھبیس سال کی عمر تھی ۔ گویا خضر سلطان ۱۸۳۱ع کے آس پاس پیدا ہوا ۔

فخرو مرزا کی طرح خضر سلطان بھی مرزا غالب کا شاگرد تھا ۔ اچھے شعر کہتا تھا ۔ مجموعۂ کلام ۱۸۵۷ع کے ہنگامے میں تلف ہو گیا ۔ صرف چند شعر تذکروں میں رہ گئے ۔''[1]

اسی طرح بعض غزلوں میں آنے والے اشعار کی بنا پر ناقدین و شارحین نے اپنی طرف سے افسانے گھڑ لیے ، لیکن مولانا مہر اس نوعیت کے افسانوں کی قلعی بھی کھول دیتے ہیں ۔ مثلاً غالب کے ایک مقطع :

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

کی تشریح کرنے کے بعد مولانا مہر لکھتے ہیں :

''اس غزل کے سلسلے میں ایک افسانہ تیار کر لیا گیا ہے کہ قلعے میں کسی شہزادے کے مکان پر مشاعرہ ہوا تھا ۔ مرزا نے طرح میں غزل نہیں کہی تھی ۔ اصرار ہوا تو غیر طرح غزل پڑھ دی ۔ مقطع پہلے سے اس مضمون کا کہہ لیا تھا ، جیسا کہ خود واضح کر دیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بداہتاً افسانہ ہے . . . ۔''[2]

۱- نوائے سروش ، ص ۵۷۷ - ۵۷۸ ۔
۲- نوائے سروش ، ص ۱۱۱ ۔

مولانا مہر شعر کے معانی اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ شعر کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے ۔ لیکن 'مطالب' کی طرح 'نوائے سروش' میں بھی مولانا مہر مرزا غالب کی شاعری کے فنی اسقام کی طرف اشارہ نہیں کرتے ۔ اگرچہ ان کی توجہ فنی محاسن کی طرف بھی نہیں ہے لیکن محاسن کا ذکر بہرحال پھر بھی کہیں نہ کہیں آ جاتا ہے ۔

مولانا مہر اشعار کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے شعرا یا خود غالب کے قریب المعنی اشعار بھی لکھ دیتے ہیں تاکہ قارئین زیادہ وضاحت کے ساتھ شعر سمجھ سکیں ۔ اس سلسلے میں نوائے سروش میں بہت سے اردو فارسی شعرا کے اشعار نظر آتے ہیں ۔ ان شعرا میں حافظ ، عرفی ، ظہوری ، بیدل ، غنی کاشمیری ، نظیری ، سعدی ، امیر خسرو ، نعمت خاں عالی ، کمال اصفہانی ، میر تقی میر ، میر درد ، میر حسن اور اقبال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ ان اشعار سے صرف یہی کام نہیں لیا گیا کہ اشعار غالب کی وضاحت ہو جائے ، بلکہ اکثر شارحین کے اس قسم کے جملوں کی حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے جن میں کہا جاتا ہے کہ غالب کا شعر فلاں شاعر کے فلاں شعر سے ماخوذ ہے ۔ مولانا مہر نے اس قسم کے اشعار پیش کرکے ثابت کیا ہے کہ اگر غالب دوسرے شعرا سے متاثر ہوئے ہیں تو بھی انھوں نے اپنے شعر میں مضمون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے ۔

مولانا مہر نے نوائے سروش میں صرف اشعار کی شرح نہیں کی بلکہ کوشش کی ہے کہ غالب کے اشعار کو زندگی کے عام احوال و ظروف کے مطابق دیکھنے کی کوشش کی جائے اور اس میں شک نہیں کہ غالب کے کلام میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ مولانا مہر اشعار کو زندگی کے مختلف واقعات پر منطبق کرتے چلے جاتے ہیں ۔ مثلاً اس شعر میں :

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

کی شرح کر چکنے کے بعد لکھتے ہیں :

''شعر کا اسلوب ایسا ہے کہ اسے مضامین غزل کے بجائے زندگی کی ہر صورتِ حال پر ڈھال سکتے ہیں ۔ مثلاً سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ

لوگوں نے قوموں اور ملکوں کی بہتری و برتری کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیا اور انھی لوگوں کی نظروں میں بے وقعت اور ذلیل ہوئے جن کی خاطر قربانیاں کی تھیں۔ غرض شعر میں عمومیت ہے اور اس کا اطلاق مختلف معاملات پر ہو سکتا ہے۔"[1]

انھی انھی خوبیوں کے باعث نوائے سروش غالبیات کے ذخیرے میں ایک اہم اضافے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اگرچہ اس کی خوبیوں کے باوجود اسے شرحِ غالب کے ضمن میں حرفِ آخر قرار دینا بھی درست نہ ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا مہر خود بھی اس شرح سے مطمئن نہیں تھے اور اس میں جابجا ترمیم و اضافوں کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ اس کا اندازہ مولانا مہر کے ذاتی نسخۂ نوائے سروش سے کیا جا سکتا ہے جو جابجا نشان زدہ ہے۔

☆ ☆ ☆

۱- نوائے سروش ، ص ۳۴۴ -

آٹھواں باب

مولانا غلام رسول بحیثیت مترجم

ترجمہ نگاری کا فن

دنیا میں متعدد ایسے انسانی گروہ بستے ہیں جن کی تہذیب و معاشرت ہی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتی بلکہ مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے ان اقوام کے افراد جو زبانیں بولتے ہیں ، وہ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں ۔ پوری دنیا یا کسی ایک براعظم کا تو ذکر ہی کیا ، اکثر اوقات کسی ایک ملک اور جغرافیائی خطے میں بھی مختلف زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور اگر کوئی رابطے کی زبان موجود نہ ہو تو ایک زبان بولنے والوں کے لیے کسی دوسری زبان بولنے والوں کی بات سمجھنا اور ان کو اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے ، حالانکہ معاشرتی ، معاشی ، ادبی ، سیاسی اور مذہبی امور و مسائل کے سلسلے میں ان کو اس امر کی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی بات سمجھیں تاکہ معاملات کے بارے میں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کی روشنی میں مناسب فیصلے کیے جا سکیں ۔ ایسے میں اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ کوئی ایسا شخص ہو جو بیک وقت دونوں زبانوں پر عبور رکھتا ہو تا کہ اس کے توسط سے دو مختلف زبانیں بولنے والی اقوام کے افراد ایک دوسرے کے قریب آ سکیں ۔ اسی ضرورت نے مترجم یا ترجمان کو وجود بخشا ۔

ترجمان کے لغوی معنی اُس شارح یا مفسر کے ہیں جو کسی ایک زبان میں لکھی یا کہی گئی بات کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرے ۔ اس طرح ترجمہ وہ تحریر یا تقریر کہلائے گی جسے ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا گیا ہو ۔ آج کل جب علمی اور سائنسی ترقیوں کے باعث یہ بات ممکن ہوگئی ہے اور کچھ ایسی زبانیں پیدا ہوگئی ہیں جو مختلف زبانیں بولنے والوں کے

درمیان رابطے کا کام دے سکیں تو شاید ترجمان کی حقیقی اہمیت کا اندازہ نہ کیا جا سکے ، لیکن اگر ماضی کا جائزہ لیا جائے تو ترجمے اور ترجمان کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے ، اس لیے کہ ماضی میں مختلف قوموں اور ملکوں سے تجارتی و سماجی امور کی انجام دہی جیسے اہم اور نازک معاملات ترجمانوں ہی کے مرہونِ منت ہوتے تھے اور بسا اوقات محض ترجمان کے طرزِ عمل سے قوموں کی تقدیر کے فیصلے ہو جایا کرتے تھے ۔

فنِ ترجمہ کے بارے میں یوں تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ مترجم کو دیانت دار ہونا چاہیے ۔ یعنی ترجمے کو مصنف یا متکلم کے حقیقی خیالات و جذبات کی سچی تصویر پیش کرنی چاہیے ۔ اگر اس بنیادی اصول کو پیشِ نظر رکھ لیا جائے تو باقی سب باتیں فروعی نوعیت کی ہیں اور ان کا تعلق ترجمے کی تزئین اور آرائش سے ہے ۔ رہی یہ بات کہ اچھا مترجم کون ہو سکتا ہے تو اس سلسلے میں بھی طویل مباحث کی ضرورت نہیں ۔ صاف اور سیدھی سی بات یہ ہے کہ اچھا مترجم وہی ہوگا جو ہر دو زبانوں پر کامل عبور رکھتا ہو اور جس کی نظر میں دونوں زبانوں کے تمام تر امکانات بھی ہوں ، لیکن صرف زبانوں سے واقفیت کے سہارے مترجم کا کام نہیں چل سکتا ۔ بلکہ زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ مترجم دونوں اقوام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بھی واقف ہو ۔ اس کے علاوہ ان قوموں کی تاریخ ، ملکی جغرافیہ ، معیشت ، تہذیب و معاشرت ، سیاسی مسائل ، علمی و ادبی روایات ، مذہب اور مختلف معاملات کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر اور ان کے اندازِ فکر سے ضروری واقفیت کے بغیر بھی مترجم کے لیے کامیابی مشکل ہے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی مترجم مولانا حالی کے مندرجہ ذیل شعر :

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

کا ترجمہ کرنا چاہے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس شعر میں ''چاہ یوسف'' سے کیا مراد ہے ، تو ظاہر ہے کہ وہ ترجمے کا حق ادا نہیں کر سکے گا ۔ اسی طرح اگر کوئی مترجم غالب کے اس شعر :

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گزر ہے ، کیا کہیے

کا ترجمہ کرنا چاہے اور وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اسلام میں راستے کے حقوق کا ذکر بھی آیا ہے اور عام مسلمان راستے میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے کو معیوب تصور کرتے ہیں ، تو ظاہر ہے کہ اس کا ترجمہ کسی صورت میں بھی قابل توجہ نہیں ہو سکتا ۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ آخر وہ کون سی تحریریں ہیں جن کو ترجمے کے لیے زیادہ موزوں تصور کیا جاتا ہے ؟ اس سلسلے میں مترجم پر کوئی پابندی نہیں ہے ۔ یہ مترجم کا اپنا کام ہے کہ وہ کس فن پارے کا ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے ۔ البتہ اس سلسلے میں مختلف تراجم کو دیکھ کر جو اصول متعین کیے جا سکتے ہیں ، ان میں اولین بات یہ ہے کہ ہر زبان کے کلاسیکی ادب کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً شیکسپیئر کے ڈراموں اور ٹالسٹائی کے ناولوں کا ترجمہ بھی کیا جا سکتا ہے اور ہیر وارث شاہ ، کلیات غالب و اقبال اور خواجہ فرید کے سرائیکی کلام کا بھی ۔

اس سلسلے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عموماً زیادہ ترقی یافتہ قوموں کی کتابیں مترجمین کی توجہ کا مرکز رہی ہیں اور ان کتابوں کے ترجمے اُن اقوام کی زبانوں میں ہوتے رہے جو کم ترقی یافتہ یا پس ماندہ تھیں ۔ مثلاً جب عربوں نے تیغ و سناں کے ساتھ طاؤس و رباب کی طرف بھی توجہ دی اور صحرا نشینوں میں علمی ذوق پیدا ہوا تو عربی میں ہزاروں یونانی کتب کے ترجمے ہوئے ۔ لیکن جب عرب تہذیبی ، معاشرتی ، سیاسی ، ادبی اور علمی سطح پر ترقی یافتوں قوموں کی صف میں شامل ہو گئے تو عربی کتب یورپی مترجموں کے لیے قابلِ توجہ قرار پائیں ۔ اسی طرح زیادہ ترقی یافتہ زبانوں کا علمی و ادبی سرمایہ ہمیشہ کم‌ترقی یافتہ زبانوں میں منتقل ہوتا رہا ہے ۔ اس حقیقت کا اندازہ اس امر سے ہوگا کہ اردو ، عربی فارسی اور انگریزی زبانوں کے مقابلےمیں بہت چھوٹی اور نو مولود زبان تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان زبانوں کی بے شمار کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا گیا ۔ لیکن اس سلسلے میں ایک امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ ترجمہ بعض اوقات ان قوموں کا مسئلہ ہوتا ہے جو کم ترقی یافتہ ہوں ۔ وہ ترقی کی منازل طے کرنے کے لیے ترقی یافتہ اقوام کی علمی ، ادبی اور سائنسی کتب کے ترجمے کرتی ہیں تاکہ ان کے علمی کارناموں سے استفادہ کرتے ہوئے آگے بڑھ سکیں ۔ لیکن بسا اوقات ترجمہ خود ان قوموں کا مسئلہ بھی بن جاتا ہے جو زیادہ ترقی یافتہ

ہوں ۔ یہ صورت زیادہ تر اُس دور میں پیدا ہوتی ہے جب ترقی یافتہ ممالک اپنے لٹریچر کے ذریعے دوسری اقوام میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانا چاہیں ۔ مثلاً جنگ عظیم دوم کے بعد دنیا دو مختلف سیاسی گروہوں میں تقسیم ہو گئی تو ہر گروہ کے سرخیل ممالک نے ترجمے کو سیاسی پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنا لیا اور اپنی سیاسی ، ثقافتی اور معاشرتی یلغار کے لیے اپنی ترجمانی کرنے والی کتب کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرانا شروع کر دیا ، تا کہ ان کا موقف اور نقطہ نظر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے اور اس طریقے سے وہ زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکیں ۔

اب جبکہ سائنسی ایجادات ، ذرائع حمل و نقل اور رسل و رسائل کی بے پناہ ترقیوں کے باعث اور عالمگیر انسانی برادری کے تصور نے ترقی یافتہ اور پس ماندہ اقوام کا تصور مٹا کر ساری دنیا کو ایک گھر کی صورت دے دی ہے ، لیکن تاحال کوئی ایک بھی ایسی زبان معرض وجود میں نہیں آ سکی جو روئے ارض پر بسنے والے انسانوں کے جذبات و خیالات کے اظہار کا وسیلہ بن سکتی ہو ، تو ترجمے کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے اور ترقی کرتی ہوئی دنیا نہ صرف اس کی اہمیت کو سمجھ رہی ہے بلکہ اس ضرورت کا ساتھ بھی دے رہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی کسی زبان میں کوئی اہم کتاب تصنیف ہوتی ہے ، ویسے ہی مختلف اور اہم زبانوں میں اس کے تراجم بھی قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ جاتے ہیں ۔ خصوصاً سائنسی اور معاشرتی علوم میں جو پیش رفت ہو رہی ہے ، ان کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک کے لوگ بھی ایک دوسرے کی تحقیق سے واقف ہونا چاہتے ہیں ۔

لیکن جس طرح مشینی ترقی نے زندگی کے دیگر شعبوں سے انسان کو تقریباً خارج کر دیا ہے ، اسی طرح ترجمے کے عمل میں بھی مترجم اور ترجمان کے وجود کی ضرورت نہیں رہی ۔ اس لیے کہ اب ایسی مشینیں بن چکی ہیں جو کسی تقریر کو ایک ہی وقت میں مختلف زبانیں سمجھنے والوں کے لیے ترجمہ کر کے پیش کر دیتی ہیں ۔

اردو میں ترجمے کی روایت اور مولانا مہر

دنیا میں ترجمے کی تاریخ اور روایت اتنی ہی قدیم ہونی چاہیے جتنا کہ دو مختلف زبانیں بولنے والوں کے میل جول کی تاریخ پرانی ہے اور چونکہ اس کے

بارے میں کوئی حتمی بات ہمارے سامنے نہیں ہے لہذا یقین کے ساتھ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ دنیا کا پہلا ترجمہ کون سا تھا؟ کس نے کیا تھا؟ اور کس ایک زبان سے کس دوسری زبان میں ہوا تھا؟ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ زمانۂ قبل از تاریخ میں پیش آیا ہوگا۔ لیکن چونکہ اردو زبان کی عمر زیادہ نہیں ہے لہذا اس میں ترجمے کی روایت بھی پرانی نہیں۔ تاریخ زبان و ادبِ اردو پر سرسری نظر ڈال کر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مشائخ کے چند ہندی آمیز جملوں کو چھوڑ کر اردو نثر کا آغاز ترجمے ہی سے ہوا۔ جیسا کہ آٹھویں صدی ہجری کے تقریباً تمام رسالوں پر، جنھیں اردو نثر کے ابتدائی نمونے قرار دیا جاتا ہے، تبصرہ کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''یہ رسالے اکثر فارسی اور عربی کتابوں کے ترجمے ہیں اور زیادہ تر مذہبی رنگ میں ہیں۔''[1]

ان رسالوں میں شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز، سید محمد عبداللہ الحسینی، میراں جی شمس العشاق اور میراں یعقوب وغیرہ کی تصانیف شامل ہیں۔ اگر ان مذہبی نوعیت کے رسائل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح اردو زبان کا آغاز مذہبی و سیاسی تقاضوں کے پیشِ نظر ہوا، اسی طرح اردو نثر کے آغاز و ارتقاء میں بھی مذہب اور سیاست ہی بنیادی عامل کی حیثیت سے برسرکار آئے۔ ایک طرف علماء و صوفیاء نے عربی و فارسی کی مذہبی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا، دوسری طرف ہندوستان میں حکمرانی کے خواب دیکھنے والی یورپی اقوام کے مذہبی مبلغوں نے اس زمین میں اپنے زیادہ سے زیادہ حلیف پیدا کرنے اور انھیں اپنے مذہبی رنگ میں رنگنے کے لیے اپنی مذہبی کتب کے اردو ترجمے کیے۔ اس دور میں انجیل مقدس کے تمام تراجم کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ جیسا کہ حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

''اہلِ یورپ نے ہندوستان میں تجارت و حکومت کی کوشش کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب کی تبلیغ کا کام بھی بڑے زور و شور سے کیا اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں انجیل کے ترجمے کیے۔ . . . اٹھارھویں صدی میں چند ترجمے ہو گئے تھے۔ انیسویں صدی میں اردو کے ٹائپ

۱۔ تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ، حصہ نثر، ص ۱۰۔

اور لیتھو کے چھاپے خانے جاری ہونے سے بائیبل کی اشاعت بڑی کثرت سے ہونے لگی ۔''[1]

اگرچہ اس دور میں زیادہ تر مذہبی کتابوں کے ترجمے ہوئے ، اس کے باوجود بعض طبع زاد داستانوں اور افسانوی نثر کی کتابوں کے ترجمے بھی نظر آتے ہیں ۔ طبع زاد یا ماخوذ داستانوں کے ضمن میں ملا وجہی کی ''سب رس'' قابلِ ذکر ہے جبکہ تراجم میں ''طوطی نامہ'' کا ذکر بطور خاص آنا چاہیے ۔ اس نوعیت کی بعض کتابوں کے باوجود اس پورے دور کو مذہبی تراجم کا دور قرار دیا جا سکتا ہے ۔ یہ دور سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی پر محیط ہے ۔ اگرچہ مذہبی تراجم کی روایت بعد کے ادوار میں بھی قائم رہی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے ، لیکن ۱۸۰۰ع میں فورٹ ولیم کالج کے قیام نے اردو نثر کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کا دورانیہ بہت مختصر ہے ، اس کے باوجود اس کے علمی کارنامے اودو نثر کی تاریخ میں ناقابلِ فراموش ہیں ۔ فورٹ ولیم کالج میں بعض طبع زاد اور ماخوذ کتابیں بھی لکھی گئیں ۔ اس کے باوجود یہاں کے مصنفین کی توجہ بھی زیادہ تر تراجم ہی کی طرف رہی ۔ کالج کے مصنفین میں جان گلکرائسٹ سے لے کر عام منشیوں تک کی تصانیف کی فہرست میں جہاں اور بہت سی کتابیں ملتی ہیں وہیں مختلف زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی کتابیں بھی نظر آتی ہیں ۔ مثلاً جان گلکرائسٹ نے ''قصص مشرق'' کے نام سے کچھ انگریزی کہانیوں کو اردو میں ترجمہ کیا ۔ اسی طرح میر امن نے مُلا حسین واعظ کاشفی کی ''اخلاقِ محسنی'' کا ''گنج خوبی'' کے نام سے ترجمہ کیا ۔ میر امن کے علاوہ حیدر بخش حیدری ، میر شیر علی افسوس ، بہادر علی حسینی ، مظہر علی خاں ولا ، مرزا کاظم علی جوان ، مولوی امانت اللہ شیدا ، خلیل علی خاں اور نہال چند لاہوری وغیرہ نے بھی مختلف زبانوں کی کتابوں کو ، جن میں زیادہ تر فارسی کتب تھیں ، اردو میں ترجمہ کیا ۔ فورٹ ولیم کالج کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کے ترجمے صرف مذہبی نہیں ہیں بلکہ اس میں ادبیات اور مختلف علوم و فنون کی کتب کے ترجمے بھی شامل ہیں ۔ اردو نثر کی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج پہلا ادارہ ہے جس میں دار الترجمہ قائم کیا گیا ۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے حامد حسن قادری لکھتے ہیں :

۱۔ داستان تاریخ اردو ، از حامد حسن قادری ، ص ۹۱ ۔

"یہاں ایک محکمہ اردو کے ترجمہ و تالیف کا انھوں نے قائم کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کے لیے ڈاکٹر صاحب نے اردو کی کتابیں، لغات، قواعد، تاریخ وغیرہ کے متعلق، خود بھی لکھیں اور ہندوستان کے لائق اہلِ قلم مسلمان اور ہندوؤں کو جمع کرکے ان سے کتابیں اردو میں ترجمہ و تالیف کرائیں۔"[1]

اس دور میں کچھ لوگ فورٹ ولیم کالج سے باہر رہ کر بھی ترجمہ و تالیف کا کام کرتے رہے۔ مثلاً مولوی کریم الدین، محمد حسین کلیم اور حکیم شریف وغیرہ۔ اسی طرح اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی کچھ مترجمین کی سرپرستی کی۔ اس سبب سے فورٹ ولیم کالج سے باہر اردو میں ہر قسم کے علوم و فنون کی بہت سی کتابیں ترجمہ و تالیف ہو گئیں۔ صحیح معنوں میں یہی دور ہے جس میں اردو نثر مذہبی رسالوں سے آگے بڑھ کر تاریخ، جغرافیہ، سائنس، نجوم و ہیئت، منطق، طبیعیات، زراعت، معاشیات اور تعلیمات و درسیات وغیرہ کی کتب پر محیط ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اگرچہ براہِ راست فورٹ ولیم کالج سے متعلق نہیں تھا، اس کے باوجود اسے فورٹ ولیم کالج ہی کا اثر قرار دینا پڑے گا۔

تراجم کے سلسلے میں اس عہد میں ایک اور قابلِ توجہ کام یہ ہوا کہ صوبجات مغربی و شمالی کی طرف سے دیوانی و مالگزاری قوانین کا اردو ترجمہ کیا گیا۔ مجموعۂ قوانین کے ترجمے کے مختلف مراحل کا تذکرہ کرتے ہوئے حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

"۱۸۳۲ء میں اردو عدالتی و سرکاری زبان مقرر کی گئی لیکن اس سے پہلے اہلِ ہند کی آسانی کے لیے دیوانی و فوجداری و مالگزاری کے قوانین کا اردو میں ترجمہ شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء و ۱۲۱۷ھ میں گورنمنٹ مغربی و شمالی (جس میں موجودہ یو۔پی شامل تھی) کی طرف سے "ہدایت نامۂ مالگزاری" اردو میں مرتب ہوا۔ یہ قانون کی سب سے پہلی کتابوں میں ہے جو اردو میں لکھی گئی۔"[2]

۱۔ داستان تاریخ اردو، از حامد حسن قادری، ص ۸۲۔
۲۔ داستان تاریخ اردو، از حامد حسن قادری، ص ۲۰۲ - ۲۰۳۔

قدیم دلی کالج کا ذکر بھی اسی عہد میں ہونا چاہیے جہاں کے اساتذہ نے اپنے طالب علموں کو اردو زبان کے توسط سے مغربی علوم سکھانے کے لیے بہت سی کتابوں کے ترجمے کیے ۔ ان اساتذہ میں ماسٹر رام چندر اور ماسٹر امام بخش صہبائی کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے کالج میں ایک ادبی انجمن بنائی اور پیشِ نظر مقاصد کے حصول کی خاطر بہت سی انگریزی اور کچھ فارسی کتب کے اردو ترجمے کرائے ، لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ کالج کے ان لائق اساتذہ کے لیے پیامِ مرگ لایا ۔ البتہ ان کے کارنامے اردو نثر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئے ۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید تحریک نے اردو ادب کی ترقی و اصلاح کے لیے ناقابلِ فراموش کام کیا ۔ سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے جہاں نظم و نثر کی دیگر بہت سی اصناف میں کارہائے نمایاں انجام دیے ، وہیں تراجم کے ضمن میں بھی ان کی خدمات قابلِ ستائش ہیں ۔ اس سلسلے میں سر سید احمد خاں نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹیفک سوسائٹی بنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ اہل یورپ کی بہترین کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ اہل ہند علوم و فنون جدیدہ سے مستفید ہو سکیں ۔ جیسا کہ رام بابو سکسینہ سائنٹیفک سوسائٹی کی غرض و غایت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ”اس سوسائٹی کے قیام کی غرض یہ تھی کہ مشہور اور مستند انگریزی کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ اہل اسلام یورپ کے خیالات اور وہاں کے تمدن سے واقف ہوں ۔“¹

اگرچہ سرسید احمد خاں ملازمت کے باعث ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے لیکن انھوں نے سوسائٹی کے بنیادی مقصد کو فراموش نہیں کیا ، بلکہ جب وہ علی گڑھ آئے تو یہاں سے سائنٹیفک سوسائٹی کا ایک ماہانہ رسالہ ”علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ“ کے نام سے جاری کیا ، جس میں وہ خود بھی مضامین لکھا کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ اس رسالے میں انگریزی اخبارات میں شائع ہونے والے اچھے اچھے مضامین کے ترجمے بھی شائع کیے جاتے تھے ۔

۱۔ تاریخ ادب اردو ، از رام بابو سکسینہ ، ص ۵۳ ۔

سائنٹیفک سوسائٹی کی حقیقی اہمیت اس میں ہے کہ یہ پہلا ادارہ ہے جو کسی ہندوستانی کی طرف سے اس غرض سے قائم کیا گیا کہ ہندوستانیوں کے نقطۂ نظر سے انگریزی کی مشہور و مستند کتابوں کا اردو ترجمہ کیا جائے۔ اس کے بعد نہ صرف ہندوستان کے طول و عرض میں ترجمے کی روایت کو آگے بڑھانے کے لیے بہت سے اداروں کا قیام عمل میں آیا بلکہ انفرادی طور پر بھی بہت سے اہل قلم ترجمہ نویسی کی طرف مائل ہوئے۔ انفرادی طور پر کام کرنے والوں میں سب سے اہم نام خود سرسید احمد خان ہی کے ایک رفیق کار ڈپٹی نذیر احمد کا ہے جو اگرچہ ناول نگار کے طور پر زیادہ مشہور ہوئے لیکن جنھوں نے تعزیرات ہند اور دیگر قانونی کتب کا اردو ترجمہ کرکے ایک مترجم کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے قرآن شریف کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔

اس کے علاوہ اگرچہ انفرادی سطح پر بھی بہت سی زبانوں کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا گیا اور اردو نثر کی تاریخ میں ترجمے کی روایت بہت مستحکم ہو گئی، لیکن یہاں پر اس غرض سے قائم کیے گئے کچھ اداروں کا ذکر ضروری ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلا ادارہ "انجمن ترقی اردو" ہے۔ یہ انجمن حیدرآباد دکن میں قائم کی گئی۔ انجمن کے سیکرٹری مولوی عبدالحق کی کوششوں سے انجمن نے اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے ہمہ جہت کام کیا اور اس سلسلے میں بہت سی انگریزی، فرانسیسی، عربی اور فارسی کتابوں کے اردو ترجمے بھی کیے گئے۔ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ اہل ہند کو ان کی مادری زبان یعنی اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ جس طرح قدیم دلی کالج کے پیش نظر مقصد کے حصول کے لیے بھی ایک ادبی انجمن قائم کی گئی تھی، اسی طرح عثمانیہ یونیورسٹی میں بھی دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ دارالترجمۂ عثمانیہ یونیورسٹی کے سپرد نہ صرف ضرورت کے مطابق تمام نصابی کتب کے اردو ترجمے کا کام تھا بلکہ مختلف مضامین مثلاً تاریخ، فلسفہ، اقتصادیات، کیمیا، طبیعیات، ریاضی، قانون، انجینئری، طب اور تعلیم کے شعبوں سے متعلق بلند پایہ کتب کے ترجمے کا کام بھی اس کے سپرد تھا جو اس نے نہایت ذمہ داری سے انجام دیا اور اردو ادب کی تاریخ میں اپنے نام کے لیے جگہ پیدا کر لی۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا تو یہاں کی قومی زبان اردو قرار پائی لیکن

بعض اہل علم کا خیال تھا کہ اردو کا دامن ابھی اس قدر فراخ نہیں کہ اس میں مختلف علوم کی اصطلاحات کو منتقل کیا جا سکے ۔ اس خیال کے پیش نظر وہ اردو کو قومی زبان تسلیم کرنے کے باوجود اسے ذریعہ تعلیم بنانے کے خلاف تھے ۔ اس خیال کو غلط ثابت کرنے اور اگر اس میں کچھ حقیقت تھی تو اس خامی کا ازالہ کرنے کے لیے بہت سے اداروں نے کام شروع کیا ۔ اس سلسلے میں ہم دو طرح کے اداروں کا ذکر کر سکتے ہیں ۔ اول وہ ادارے جو گورنمنٹ کی سرپرستی میں قائم کیے گئے ۔ دوم وہ ادارے جن کو انفرادی سطح پر منظم کیا گیا ۔ البتہ ضرورت پڑنے پر ان کی اعانت حکومت نے بھی کی ۔ اول الذکر اداروں میں ترقی اردو بورڈ ، دارالترجمہ کراچی یونیورسٹی اور ادارۂ تالیف و ترجمہ جامعہ پنجاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، جبکہ موخر الذکر اداروں میں انجمن ترقی اردو پاکستان اور پاکستان سائنٹیفک سوسائٹی کے نام اہم ہیں ۔ ان اداروں نے نہ صرف مختلف اصطلاحات علمیہ کو اردو کا قالب عطا کیا بلکہ مختلف علوم و فنون کی کتب کو بھی اردو میں ترجمہ کیا اور اس خیال کو غلط ثابت کردیا کہ اردو کم مایہ زبان ہے اور جدید علوم کی تعلیم و تدریس کے لیے موزوں نہیں ۔

پاکستان میں قائم ایسے ہی اداروں میں سے ایک ادارہ مطبوعات فرینکلن تھا ، جس نے بہت سی انگریزی کتب کو اردو میں ترجمہ کرایا ۔ مطبوعات فرینکلن ایک امریکی ادارہ تھا جس کی شاخیں مختلف ملکوں میں قائم کی گئی تھیں اور اس کی طرف سے امریکہ میں چھپنے والی مختلف کتابوں کو ان ممالک کی قومی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا ۔ پاکستان میں اس ادارے نے ۱۹۵۴ع سے کام شروع کیا اور اپنے چند سالہ دور میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور کے تعاون سے بے شمار امریکی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرایا ۔ یوں تو اس ادارے نے بہت سے مترجمین کی خدمات حاصل کیں لیکن کچھ مترجمین ایسے بھی تھے جنھوں نے اس ادارے کے لیے بہت زیادہ کام کیا ۔ مولانا مہر کا شمار بھی ایسے ہی مترجمین میں ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مولانا مہر کو مترجم کی حیثیت سے اسی ادارے نے متعارف کرایا ۔ اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر کے چالیس کے قریب تراجم میں صرف دو کتابیں یعنی آزادی ہند کی کہانی اور ''طبقات ناصری'' ایسی ہیں جن کی اشاعت میں فرینکلن کا تعاون شامل نہیں ۔ باقی سب کتابیں مطبوعات فرینکلن ہی کی

طرف سے ترجمہ کرائی گئیں ۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً یہ ہے کہ پاکستان میں مطبوعات فرینکلن کے ڈائریکٹر مولانا حامد علی خان تھے جن کے ساتھ مولانا مہر کے مراسم اُس وقت سے قائم تھے جب مولانا مہر نے روزنامہ زمیندار کے توسط سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا ۔ لیکن اس سے بھی بڑا اور زیادہ قابل توجہ سبب خود مہر کی معاشی مجبوریاں تھیں ۔ اخبار کی بندش کے بعد مولانا مہر کا ذریعۂ معاش صرف تصنیف و تالیف تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور چونکہ یہ ادارہ مترجمین کو معقول معاوضہ ادا کرتا تھا لہٰذا مولانا مہر اپنے پیش نظر تصنیفی منصوبوں کو نظر انداز کر کے ترجمے کا کام لے لیتے تھے ۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ مولانا مہر کا صرف ایک ترجمہ ایسا ہے جو ان کے علمی ذوق اور ان کی جذباتی وابستگیوں سے متعلق ہے ، یعنی مولانا آزاد کی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' کا ترجمہ اور یہی واحد ترجمہ ہے جو انھوں نے کسی معاوضے کے بغیر کیا ، ورنہ ان کے تمام تراجم کسی نہ کسی ادارے کے توسط سے شائع ہوئے اور مولانا مہر نے ان کا معاوضہ وصول کیا ۔ اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ مولانا مہر کے تراجم کی فہرست میں بعض ایسی کتابیں بھی ملتی ہیں جن کو مولانا مہر کے علمی و فنی قد کاٹھ سے کوئی مناسبت نہیں ۔ مثلاً ''خود اعتمادی بڑھائیے'' ، ''میرے اندر کیا ہے'' ، ''خلا میں سفر کی پہلی کتاب'' ، ''طیاروں پر پہلی کتاب'' اور ''موٹروں پر پہلی کتاب'' وغیرہ ۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے تمام تراجم مولانا مہر کے شایانِ شان نہیں تھے اور انھوں نے یہ سب کام محض معاشی مجبوری کے باعث کیے ۔ اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ مولانا مہر اپنی مجبوری کو چھپانے کی بجائے اس کا اعتراف کرتے ہیں ۔ مثلاً محمد عالم مختار حق کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

> ''اور بھی کئی چیزیں آج کل سامنے ہیں ۔ ذرا معاش مجبور کرے تو تراجم کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ورنہ جی نہیں چاہتا کہ اپنے کام چھوڑ کر . . . کسی دوسری طرف جاؤں ۔''[۱]

مولانا مہر کے مکتوبات میں اس نوعیت کے اور بھی بہت سے جملے مل جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تراجم کا کام صرف بدرجۂ مجبوری کرتے

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ۔ تاریخ درج نہیں ، غالباً مئی ۱۹۶۳ع ۔ غیر مطبوعہ ۔

تھے ورنہ انھیں اس سے کوئی خاص شغف نہیں تھا ۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ مولانا مہر تراجم کا کام صرف معاش کے لیے کرتے تھے تو یہ بھی ضروری قرار پایا کہ پیش نظر مقصد حاصل کرنے کے لیے کام کو زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ نمٹایا جائے ۔ اور چونکہ عام حالات میں مولانا مہر کے لیے یہ ممکن نہیں تھا ، لہذا انھوں نے اپنے ساتھ کئی لوگوں کو بطور معاون رکھا اور معاوضے پر ان سے کام لیتے رہے ۔ لیکن مولانا مہر کے ساتھ جس شخص نے سب سے زیادہ کام کیا وہ نشتر جالندھری تھے جیسا کہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''مجھے اخبار نویسی چھوڑ کر محنت و مشقت کرنی پڑی اور آدمی بھی رکھے ۔ نشتر صاحب (عبد الحکیم صاحب نشتر جالندھری) زیادہ دیر تک میرے ساتھ وابستہ رہے ۔ وہ میرے ہم وطن تھے ۔ سکول کے زمانے سے دوستانہ تعلقات تھے ۔ انھیں کتابیں بھی لکھواتا رہا اور ترجمے بھی ۔ ترجمے سہل تھے ۔ کتاب سامنے رکھی اور بولتا گیا ۔ البتہ سخت کتابیں میں ایک روز پیشتر اس حد تک مطالعہ کر لیتا ، جس حد تک لکھوانا ہوتا ۔''[1]

درج بالا اقتباس سے اس امر کی وضاحت تو ہو ہی جاتی ہے کہ تراجم کے لیے مولانا مہر نے دوسرے لوگوں کا تعاون حاصل کیا لیکن اس بات کی صراحت بھی ہو جاتی ہے کہ تراجم کے لیے وہ اتنی کاوش نہیں کرتے تھے جتنی کہ ان کی دوسری تصانیف میں نظر آتی ہے ۔ جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ عام طور پر وہ کتاب سامنے رکھ کر ترجمہ بولتے جاتے تھے ۔ البتہ اگر کسی مشکل کتاب کا ترجمہ کرنا ہوتا تو ایک روز پہلے کچھ مطالعہ کر لیا کرتے تھے ۔ یہ صورت حال ایک مترجم کے کام کی حیثیت و اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی ہے ۔ لیکن مولانا مہر کی خوبی یہ ہے کہ معاش کی مجبوری اور سرسری انداز میں کام کرنے کے باوجود ان کے تراجم کسی بھی طرح معیار سے گرنے نہیں پائے ۔ یہ درست ہے کہ ان کے ہاں موضوعات اور کتابوں کے انتخاب میں رطب و یابس پایا جاتا ہے ، یعنی انھوں نے بعض بہت عمدہ کتب کے تراجم بھی کیے اور کچھ ایسی کتابیں بھی ترجمہ کیں جو ان کے شایان شان نہیں تھیں ۔ اس کے

۱۔ مکتوب بنام ابو سلمان شاہ جہان پوری ، مرقومہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ع ، غیر مطبوعہ ۔

باوجود انھوں نے تقریباً ہر موضوع کے ساتھ انصاف کیا اور فن ترجمہ کے نقطۂ نگاہ سے مولانا مہر کے کام کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا مہر ترجمہ نگاری کے اصولوں اور ان کے اچھے بُرے پہلوؤں سے بخوبی واقف تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ اچھا مترجم وہی ہوتا ہے جو ہر قیمت پر متن کی پیروی کرتا ہے اور کسی بھی صورت میں اس سے سرمو تجاوز یا انحراف نہیں کرتا ۔ جیسا کہ وہ اپنے تراجم کے بارے میں لکھتے ہیں :

''میں ترجمہ کرتے ہوئے حتی الامکان دوسری زبان کے الفاظ کی پابندی کرتا ہوں ، بلکہ اسلوب تک باقی رکھنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا ۔ میں اسے جائز نہیں سمجھتا کہ دوسری زبان کے صرف مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کر دیا جائے ۔ اس میں قباحت یہ ہے کہ عین ممکن ہے مترجم مصنف کے مفہوم کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکا ہو ۔''[1]

اسی طرح اپنے ایک خط میں اصولِ ترجمہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر مصنف کے مطالب و خیالات سے مترجم کو اختلاف ہو تو بھی کسی طرح کے رد و بدل اور ترمیم کو مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ مولانا مہر لکھتے ہیں :

''غالباً آپ نے یہ حقیقت نظر انداز فرما دی کہ ترجمہ مطالبِ کتاب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں بہ پابندیِ الفاظ منتقل کرنے ہی کو کہتے ہیں اور اگر کوئی شخص ترجمہ کرے گا تو یہی کرے گا کہ جو کچھ اصل مصنف نے لکھا ہے وہ بے حذف و اضافہ دوسری زبان میں قلمبند کر دے ۔ باقی رہی یہ بات کہ مصنف کے بعض مطالب سے اسے اختلاف کی گنجائش نظر آئی تو اس کے لیے کتاب میں خفیف سے رد و بدل کے لیے بھی جواز کی بناء پیدا نہیں ہو سکتی ۔ یہ سب کچھ اسے جداگانہ حواشی میں پیش کرنا چاہیے ۔''[2]

لیکن اگر مولانا مہر کے تراجم کا جائزہ لیا جائے تو صرف اردو تراجم کے عناوین دیکھنے سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ شاید ترجموں کے

۱۔ غلام رسول مہر ، انٹرویو از الطاف حسن قریشی ، اردو ڈائجسٹ ، ص ۲۷ ۔
۲۔ مکتوب بنام ایس جیلانی ، مرقومہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۹ء ، غیر مطبوعہ ۔

ضمن میں مولانا مہر جن اصولوں کو بار بار پیش کرتے ہیں ، ترجمہ کرتے ہوئے خود ان کا خیال نہیں رکھتے ۔ یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ان کے تراجم کے عناوین اصل کتابوں کے عنوانات کے متن سے بالکل مختلف ہیں ۔ مثلاً "India Wins Freedom" کا ترجمہ "آزادیِ ہند کی کہانی" اور "The Rise and fall of the third Reich" کا ترجمہ "ہٹلر کا عروج و زوال" کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان ترجموں کے عناوین میں متن کی پیروی کا دعویٰ درست معلوم نہیں ہوتا ۔ لیکن یہ بات محض کتابوں کے عناوین تک محدود ہے ورنہ اگر تراجم کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مولانا مہر کے بیشتر تراجم کی نمایاں ترین خوبی الفاظ اور اسلوب کی پابندی ہی قرار پاتی ہے ۔ اور چونکہ مولانا مہر انگریزی کے ساتھ ساتھ عربی فارسی سے بھی پوری طرح واقفیت رکھتے تھے لہٰذا ترجمہ اس انداز میں کیا ہے کہ وہ بار خاطر بھی نہیں ہوتا اور مصنف کے لہجے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی چاشنی بھی برقرار رہتی ہے ۔ اس کے لیے کچھ اقتباسات کا تقابلی مطالعہ ضروری ہوگا ۔ انگریزی متن اور اس کا ترجمہ درج ذیل ہے :

"In the present age, the poet seems to propose to himself as his main object---new and striking images with incidents that interest the affections or exite the curiosity. Both his characters and his descriptions he renders as much as possible, specific and individual, even to degree of portraiture. In his diction and metre, on the other hand, he is a comparatively careless."[1]

"دور حاضر میں شاعر کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نئی اور نظروں کو کھینچنے والی تصویریں پیش کرے ۔ ایسے واقعات سامنے لائے جو مالوفات کو دلکش معلوم ہوں یا حسِ تعجب کو انگیخیت دیں ۔ شاعر اپنے کرداروں اور توضیحات کو زیادہ سے زیادہ محدود اور انفرادی بنانے کی کوشش کرتا ہے ، بلکہ کہنا چاہیے وہ ہو بہو تک پہنچ جاتا

۱۔ A History of Civilization, Vol. II, Page 150 -

ہے ۔ البتہ اپنے اسلوب بیان اور وزن میں مقابلۃً لاپروائی سے کام لیتا ہے ۔''[۱]

"On Saturday, January 28, 1933, he had been abruptly dismissed by the ageing[۲] President of the Republic, Feild Marshal Von Hinden burg. Adolf Hitler, leader of the National Socialists, the largest political party in Germany, was demanding for himself the chancellorship of the democratic republic, he had sworn to destroy."[۳]

''۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو شنبہ کے دن جمہوریت کے سال خوردہ صدر فیلڈ مارشل فن ہینڈن برگ نے اچانک فن شلائشر کو برطرف کر دیا تھا ۔ پارلیمنٹ میں نیشنل سوشلسٹ (نازی) پارٹی جرمنی میں سب سے بڑی پارٹی تھی ۔ اس کا لیڈر ایڈولف ہٹلر اس جمہوری نظام کی چانسلری کا مطالبہ کر رہا تھا جسے تباہ کرنے کا اس نے دل میں حلف اٹھا رکھا تھا ۔''[۴]

اسی طرح انڈیا ونز فریڈم اور ''آزادی ہند کی کہانی'' کے اقتباسات بھی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مولانا مہر زیادہ تر الفاظ و اسلوب کی پابندی کو ترجیح دیتے تھے ۔ اقتباسات درج ذیل ہیں :

"As I surveyed the political situation in India in February 1946, it was clear to me that the country, had undergone a complete transfermation. An absolutely new India had been born. The people, whether official, or non-official were fired with a new desire for freedom. There was also a change of spirit on the British side. As I had expected

---

۱۔ تاریخ تہذیب ، جلد دوم ، ص ۲۱۳ ۔

۲۔ جیسا کہ متن میں ہے ۔

۳۔ The Rise and fall of third Reich, page 15 .

۴۔ ہٹلر کا عروج و زوال ، جلد اول ، ص ۱۴ ۔

from the beginning, the labour cabinet was studying the Indian situation from the right angle. Soon after the assumption of power, it sent a parlimentary delegation to India. The delegation visited the country in the winter of 1945-6."[1]

"فروری ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کے سیاسی حالات کا میں نے جائزہ لیا تو مجھ پر واضح ہو گیا کہ ملک کی حالت یک قلم بدل چکی ہے اور بالکل ایک نیا ہندوستان معرض وجود میں آ گیا ہے۔ عوام، خواہ وہ سرکاری افسر تھے یا غیر سرکاری، آزادی کی نئی گرم جوشیوں سے معمور تھے۔ خود حکومت برطانیہ کے اسلوب و روش میں بھی تبدیلی آ گئی تھی جیسا کہ مجھے شروع ہی سے امید تھی۔ لیبر پارٹی کی وزارت ہندوستان کے مسئلے کا مطالعہ صحیح زاویۂ نگاہ سے کر رہی تھی۔ حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی اس وزارت نے ایک پارلیمانی وفد ہندوستان بھیجا، جس نے ۱۹۴۵ - ۴۶ء کے موسم سرما میں ملک کے مختلف حصوں کے حالات دیکھے۔"[2]

درج بالا اقتباسات کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مولانا مہر حتی الامکان پابندیٔ الفاظ کے ساتھ بامحاورہ ترجمے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس انداز کو ہر طرح کے ترجموں میں برقرار رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ خاص طور پر ان تراجم میں جن میں علمی اور فلسفیانہ نوعیت کے مباحث ہوں یا جن میں تاریخ کے کسی قدیم عہد کی تلمیحات وغیرہ کا بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہو۔ مولانا مہر بھی اس طرح اور اس نوعیت کے تراجم میں پابندیِ الفاظ کے ساتھ بامحاورہ زبان کی قید نبھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مولانا مہر کے اس طرح کے ترجموں میں "ذہن انسانی کا ارتقاء" اور "سکندرِ اعظم" وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن مولانا مہر کی خوبی یہ ہے کہ جہاں وہ الفاظ کی پابندی کے ساتھ ترجمہ نہ کر سکیں، وہاں انہی

۱- India wins freedom, page 138.

۲- آزادیِ ہند کی کہانی، ص ۲۳۱۔

دشواریوں کا ذکر کرکے برملا اعتراف کر لیتے ہیں ۔ جیسا کہ ''سکندرِ اعظم'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''ترجمے میں حتی الامکان مصنف کے اسلوبِ بیان کی پابندی کی گئی ہے ، لیکن جہاں انگریزی اسلوب بجنسہ اپنی اصل صورت میں اردو کا لباس اختیار نہ کر سکتا تھا ، وہاں فقروں کو توڑا بھی گیا ہے ۔ تاہم میرا خیال ہے کہ پوری کتاب میں ایسے مواقع بہت کم آئے ہوں گے ۔''[۱]

مولانا مہر کے تراجم کی ایک اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ صرف اس اس پر اکتفا نہیں کرتے کہ پیشِ نظر کتاب کا ترجمہ کر دیں بلکہ جابجا اپنی جانب سے مفید حواشی بھی لکھتے جاتے ہیں ، جس سے ترجمے کی افادیت بڑھ جاتی ہے ۔ مولانا مہر کے تراجم میں یہ حواشی عموماً تین چار قسم کے ہوتے ہیں ۔ حواشی کی ایک قسم وہ ہے جن میں مولانا مہر نے اپنے علم اور حقیقتِ واقعہ کی بنا پر مصنف سے اختلاف کیا ہے ، جیسا کہ وہ طبقاتِ ناصری کے تعارف میں لکھتے ہیں :

''میں نے پوری کوشش کی ہے کہ ترجمہ صاف اور ملجھا ہوا ہو ۔ جہاں جہاں میرے ناچیز علم کے مطابق مصنف سے لغزشیں ہوئیں ، میں نے حواشی میں ان کی تصریح کر دی ہے اور حتی الامکان کوئی توضیح طلب معاملہ توضیح کے بغیر نہیں چھوڑا ۔''[۲]

اس نوعیت کے حواشی کی مثالیں زیادہ تر اُن کتابوں میں ملتی ہیں جو مذہبیات و تاریخ سے متعلق ہیں اور جن میں مورخین نے عدم واقفیت یا پھر کسی تعصب کی بنا پر حقائق سے صرف نظر کیا ہے اور تاریخی واقعات کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مولانا مہر نے ایسے تقریباً تمام مقامات پر مصنف سے اختلاف کرتے ہوئے حواشی کے ذریعے اصل صورتِ حال واضح کر دی ہے ۔ مثلاً ''تاریخ شام'' کے مصنف فلپ کے ۔ حتی جنگ موتہ کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ سکندر اعظم ، دیباچہ از مولانا مہر ، ص ۸ ۔
۲۔ طبقاتِ ناصری ، جلد اول ، تعارف از مولانا مہر ، ص ۱۹ ۔

''حملے کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ رسول اللہ (صلعم) نے جو قاصد بصرہ بھیجا تھا ، غسانی امیر نے اسے شہید کر دیا تھا ، لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ جو لوگ دین میں نئے نئے وارد ہوئے تھے ، ان کے لیے مالِ غنیمت حاصل کیا جائے ۔ اس مال غنیمت میں وہ تلواریں بھی شامل تھیں جو ''مشرفیہ'' کہلاتی تھیں اور موتہ ہی کے نواح میں بنتی تھیں ۔''[1]

ظاہر ہے کہ جنگ موتہ کا حقیقی سبب یہ نہ تھا اور اگر اصل صورت حال واضح نہ کی جائے تو عام قاری غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے ۔ لہذا مولانا مہر مصنف کے اس بیان سے اختلاف کرتے ہوئے حاشیے میں اصل واقعات کی اس طرح صراحت کر دیتے ہیں کہ کسی نوعیت کی غلط فہمی کا امکان باقی نہیں رہتا ۔ وہ لکھتے ہیں :

''مصنف نے یہ واقعہ ایسے انداز میں بیان کیا ہے جس سے عام خواندگانِ کتاب غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں ۔ رسول اللہ صلعم نے ایک قاصد کو اسلام کا دعوت نامہ دے کر بصرہ کے حاکم شرجیل بن عمرو کے پاس بھیجا تھا ۔ متعدد دوسرے سلاطین و امراء کے پاس بھی اس طرح کے دعوت نامے بھیجے گئے تھے ۔ شرجیل نے تمام بین الاقوامی قواعد و آداب پس پشت ڈالتے ہوئے قاصد کو شہید کر دیا ۔ یقیناً اسے خیال ہوگا کہ اول شہنشاہ قسطنطنیہ اس پر خوش ہوگا ، حالانکہ خود اس نے اسلامی قاصد کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا ۔ دوسرے وہ سمجھ رہا ہوگا کہ اسلامی حکومت کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکے گا ۔ اس کی تادیب کے لیے فوج بھیجی گئی تھی . . . مالِ غنیمت کا قصہ بالکل لغو ہے ۔''[2]

تاریخ و مذہبیات سے متعلق دیگر کتابوں میں بھی حواشی کی یہی صورت ہے ۔ مولانا مہر نے جہاں کہیں دیالتداراانہ اختلاف کی ضرورت سمجھی بلا تامل حواشی میں اس کا اظہار کر دیا ۔ ''انڈیا ونز فریڈم'' میں جب مولانا ابوالکلام

۱- تاریخ شام ، ص ۳۲۵ - ۳۲۶ -

۲- حاشیہ تاریخ شام ، ص ۳۲۶ -

آزاد نے پاکستان کو قائداعظم کے لیے سودے بازی کا آخری وسیلہ قرار دیا تو مولانا مہر نے حقیقتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے مطالبۂ پاکستان کو ایک درست اقدام قرار دیتے ہوئے لکھا :

"یہ صرف تعبیر کا اختلاف ہے ۔ اگر متحدہ ہندوستان میں لیگ کے تصور کے مطابق مسلمانوں کے حقوق محفوظ ہوتے تو تقسیم پر اصرار کی کوئی وجہ نہ تھی ۔ معلوم ہے ، وزارتی مشن کی سکیم اس وجہ سے قبول کی گئی تھی کہ اس میں حفاظت کے ممکنات نظر آتے تھے ۔ کانگرس نے اس سکیم میں رخنہ اندازی شروع کی تو یقین ہو گیا کہ وہ کسی بھی ایسی سکیم کو خوش دلی سے ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی جو مسلمانوں کے جائز حقوق پر مبنی ہو ۔ پھر بدرجۂ مجبوری حفاظت کی آخری تدبیر اختیار کرنی پڑی ۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس واضح طرزِ عمل کو سودا بازی سمجھا جائے ۔"[۱]

اس نوعیت کے اختلافی و توضیحی حواشی کے باعث نہ صرف قارئین پر معاملے کی حقیقی صورت واضح ہو جاتی ہے بلکہ اس سے ترجمے کی اہمیت و افادیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے ۔ جیسا کہ مولانا مہر اپنے اس طرح کے حواشی کی افادیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میں نے ترجمے کے دوران میں صرف توضیحی حواشی پر اکتفا نہیں کیا ، بلکہ جہاں جہاں ہمارے موقف کی بنیاد و اساس پر اعتراضات سامنے آئے ، وہاں مفصل بحث بھی کی تا کہ ہمارا نقطۂ نگاہ پوری طرح واضح ہو جائے اور اس میں ابہام کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح کتاب کا ترجمہ اصل سے کہیں زیادہ اہم اور ہمارے قارئین کے لیے کہیں زیادہ مفید و نافع بن گیا ہے ۔"[۲]

مولانا مہر کے تراجم میں حواشی کی ایک اور صورت بھی ملتی ہے اور وہ یہ کہ حواشی معلومات افزا ہوتے ہیں ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مصنفِ کتاب اپنے

۱۔ حواشی آزادی ہند کی کہانی ، ص ۳۰۶ ۔
۲۔ آزادی ہند کی کہانی ، مقدمہ از مولانا مہر ، صفحہ و ۔

قارئین کی معلومات پر بھروسہ کرتے ہوئے بہت سی باتوں کو تشنہ چھوڑ جاتا ہے ۔ لیکن مولانا مہر مترجم ہونے کی حیثیت میں ان پہلوؤں کی مکمل وضاحت کر دیتے ہیں اور ترجمے میں آنے والے اسمائے رجال و اماکن کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مثلاً "تاریخ شام" کے مصنف نے ایک جگہ مشہور مسلم سپہ سالار مہلب بن ابی صفرہ کا ذکر کیا ہے ۔ اس کے بارے میں مولانا مہر حاشیے میں لکھتے ہیں :

"یہی سالار ہے جس نے امیر معاویہ کی حکومت کے ابتدائی دور (۶۵ - ۶۶۴ع) میں ہندوستان کی طرف پیش قدمی کی تھی اور وہ کابل و ملتان پہنچا تھا ۔ حجاج اس کا داماد تھا ۔"۱

اسی طرح "سکندر اعظم" میں ایک مقام پر "کروئسس" کا ذکر آیا ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

"یہ وہی شخص ہے ، جسے ہمارے ہاں "قارون" کہتے ہیں یا سمجھ لینا چاہیے کہ قارون نے یونانی زبان میں کروئسس کی صورت اختیار کر لی ہے اور مثال بن گئی "قارون کی طرح دولت مند" ۔ کروئسس یا قارون نے لڑائی شروع کرنے سے پیشتر دو مرتبہ کاہنوں سے انجام کے بارے میں استفسار کیا تھا ۔ دونوں مرتبہ جواب ملا کہ اس کے ہاتھوں ایک بڑی سلطنت تباہ ہوگی ۔ بلا شبہ سلطنت تباہ ہوئی لیکن یہ خود اس کی سلطنت تھی ۔"۲

اس کے علاوہ اگر مولانا مہر یہ محسوس کریں کہ متن میں کسی مخصوص تہذیب یا عہد تاریخ کی تلمیحات آ گئی ہیں اور عام قاری کے لیے ان کی تفہیم دشوار ہوگی ، تو مولانا مہر حاشیے میں ان تلمیحات کی وضاحت بھی کر دیتے ہیں ۔ اس نوعیت کے حواشی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں :

"مصنف نے کتاب میں یونانی افسانوں کی تلمیحات بہ افراط استعمال کیں ۔ ظاہر ہے کہ ان تلمیحات کے متعلق ضروری تصریحات کے بغیر عام اردو

۱- حاشیہ تاریخ شام ، ص ۳۶۸ -
۲- حاشیہ سکندر اعظم ، ص ۱۷۶ -

خواہ (اردو خواں) اصحاب مطالب کتاب سے پوری طرح محظوظ نہ ہو سکتے تھے - میں نے اس امر کا خاص خیال رکھا کہ ساتھ ساتھ تلمیحات کی مختصر سی کیفیت بیان کرتا جاؤں تا کہ کوئی حصہ غیر واضح نہ رہے -''۱

معلوم ہے کہ مولانا مہر نے مختلف تہذیبوں اور تاریخی ادوار سے متعلق کتب کے ترجمے کیے ، جن میں اکثر اوقات افراد و اماکن کے ایسے نام بھی آتے ہیں جن کو انگریزی یا ان مخصوص تہذیبوں میں قدرے مختلف نام دیا گیا ہے اور اُردو میں ان کا تلفظ و املا بالکل مختلف ہے - اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا تھا لہذا مولانا مہر نے اس امکان کو ختم کرنے کی یہ صورت پیدا کی کہ ایسے اسماء کو اپنے حواشی میں انگریزی میں بھی لکھ دیا ہے- یوں تو اس قسم کی مثالیں ان کے بہت سے تراجم میں ملتی ہیں لیکن اس کے سب سے عمدہ نمونے ''ہٹلر کا عروج و زوال'' میں ملتے ہیں ، جن میں یورپ کی اکثر اقوام اور ان کی زبانوں کے ایسے اسماء کا ذکر آتا ہے جن کا اردو تلفظ و املاء مختلف ہے -

''طبقاتِ ناصری'' کے حوالے سے مولانا مہر کے تراجم کی ایک اور خوبی بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ مورخین کے لکھے ہوئے غیر متعارف سنین کو متعارف اور مانوس سنین سے بدل دیتے ہیں - اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ طبقاتِ ناصری میں مختلف واقعات پیش کرتے ہوئے قمری کیلنڈر کو سامنے رکھا گیا ہے - لیکن چونکہ آج کل زیادہ تر عیسوی کیلنڈر رائج ہے اور اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے کیلنڈر کے باعث الجھن پیدا ہو سکتی ہے لہذا مولانا مہر نے طبقاتِ ناصری کا ترجمہ کرتے ہوئے ہجری تاریخوں کے ساتھ ساتھ عیسوی کیلنڈر کے مطابق بھی تاریخیں درج کر دی ہیں - اپنے اس کام کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں :

''تمام ہجری سنین کے ساتھ ساتھ عیسوی سنین بھی درج کر دیے کیونکہ جو تاریخیں مدت سے یہاں رائج چلی آتی ہیں ، ان میں عیسوی سنین ہی دیے گئے تھے اور دورِ حاضر کے خوانندگانِ کرام کو عیسوی سنین

۱- سکندر اعظم ، مقدمہ از مولانا مہر ، ص ۸ -

پیش نظر رکھ کر حالات سمجھ لینے میں زیادہ سہولت رہتی ہے ۔"[1]

اب تک مولانا مہر کے تراجم کی جن خوبیوں کا ذکر آیا ہے وہ ان کے تمام تراجم میں پائی جاتی ہیں ۔ لیکن ان کے بعض ترجمے ایسے بھی ہیں جن کو صرف ترجمہ قرار دینا مشکل ہے ، اس لیے کہ مولانا نے ان تراجم میں صرف متن کو اردو میں منتقل نہیں کیا بلکہ عام قارئین کی آسانی اور سہولت کے لیے نیز کتاب کی افادیت میں اضافہ کرنے کی خاطر جابجا اپنی طرف سے اضافے بھی کیے ۔ اس کے علاوہ مصنفین نے اپنی کتابوں کو جس ترتیب کے ساتھ پیش کیا تھا ، مولانا مہر نے ضرورت کے مطابق اس میں بھی تبدیلیاں کیں ۔ اس قسم کی کتابوں میں انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم ، سو تاریخی واقعات اور قسطنطنیہ ایسے تراجم کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔

موخر الذکر کتاب ترکی کے شہر قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کی تاریخی سرگزشت پیش کرتی ہے ۔ لیکن کتاب کے مصنف ہیرلڈ لیم نے صرف ۱۶۶۵ع تک کے حالات تحریر کیے تھے اور ان کی پیش کش میں بھی اس قدر اطناب و تفصیل سے کام لیا تھا جو عام قارئین کے لیے زیادہ مفید و نافع نہیں تھے ۔ لہذا مولانا مہر نے اول تو یہ کیا کہ ہیرلڈ لیم کی کتاب کی تلخیص کر دی اور شہر کے بسنے سے لے کر ۱۶۶۵ع تک کے تمام اہم واقعات کا اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا ۔ گویا قسطنطنیہ کا پہلا حصہ اصل کتاب کی تلخیص کی حیثیت رکھتا ہے ، جبکہ دوسرا حصہ ، جو ۱۶۶۵ع سے لے کر ۱۹۲۳ع تک کے اہم واقعات پر مشتمل ہے ، مولانا مہر نے خود لکھا ہے ۔ اسی طرح تیسرا حصہ بھی جس میں قسطنطنیہ کے مناظر وغیرہ کا ذکر آیا ہے ، مولانا مہر نے تصنیف کیا ہے ۔ یوں یہ کتاب صرف ترجمہ نہیں رہی بلکہ تلخیص و تالیف بھی بن گئی ہے ۔

"سو تاریخی واقعات" ولیم اے ڈیوٹ کی کتاب ہے جس میں یورپ کی تاریخ کے سو ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو مصنف کے نزدیک نسل انسانی کے ارتقاء میں معاون ثابت ہوئے یا جن کی نسل انسانی کی تاریخ میں کسی بھی طرح کوئی اہمیت بنتی ہے ۔ ان میں سیاسی واقعات بھی ہیں اور سائنسی ایجادات سے متعلق واقعات کا ذکر بھی کیا گیا ہے ۔ مولانا مہر نے کتاب کا ترجمہ شروع

۱۔ طبقات ناصری ، جلد اول ، تعارف از مولانا مہر ، ص ۱۹ - ۲۰ ۔

گیا تو اس کتاب سے صرف پچاس واقعات منتخب کیے ۔ اس کے علاوہ مشرق ، خاص طور پر اسلامی تاریخ، سے پچاس واقعات اپنے طور پر منتخب کیے اور ترجمے میں شامل کر دیے ۔ یہ تمام واقعات سیاسی نوعیت کے ہیں ۔ بہرحال اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو سو تاریخی واقعات کو بھی محض ترجمہ قرار دینا ممکن نہیں ۔ یہ کتاب بھی ترجمہ و تالیف کے زمرے میں شامل ہو جاتی ہے لیکن اس سلسلے میں سب سے نمایاں کتاب ''انسائیکلو پیڈیا تاریخِ عالم'' ہے جس کی پہلی جلد تاریخ اسلام سے متعلق ہے ۔ اگرچہ اس کی ترتیب کے لیے بھی ولیم ایل لینگر ہی کے انسائیکلو پیڈیا کو بنیاد بنایا گیا ہے ۔ لیکن اول تو یہ انسائیکلو پیڈیا بہت تشنہ تھا ، پھر اس میں اسلامی تاریخ سے متعلق واقعات کو پیش کرتے ہوئے زمانی تسلسل کا بھی خیال نہیں رکھا گیا تھا ۔ لہٰذا مولانا مہر نے اپنے ترجمے میں تاریخی ترتیب قائم کی ۔ اس سلسلے میں جو تبدیلیاں کی گئیں ان میں سے ایک مثال کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر خود لکھتے ہیں :

''انسائیکلو پیڈیا میں ہسپانیہ کو پہلے رکھا گیا تھا لہٰذا مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہسپانیہ کی تاریخ پہلے بیان کر دی گئی اور خود عرب کو بعد میں رکھا جہاں سے اسلام کا چشمہ ابلا ۔ میرے نزدیک خالص اسلامی نقطۂ نگاہ سے طبعی ترتیب یہ تھی کہ ظہور اسلام کو پہلے لایا جاتا اور اس سے دنیا کی مختلف سرزمینوں میں جو انقلابات بپا ہوئے ، ان کا ذکر بعد میں کیا جاتا ۔''[۱]

اسی طرح مصنف نے اہم واقعات کے انتخاب میں بھی احتیاط نہیں برتی تھی ، جس کے سبب سے بعض اہم واقعات نظر انداز ہو گئے تھے اور کچھ غیر اہم واقعات کا ذکر کر دیا گیا تھا ۔ مولانا مہر نے اس نوعیت کی تبدیلیاں بھی کیں اور جہاں جہاں ضرورت محسوس کی اہم واقعات کا اضافہ کر دیا ۔ اسی طرح واقعات کی موزونیت اور ان کی ترتیب کے اعتبار سے بھی مولانا مہر نے جابجا تبدیلیاں کیں ، خاص طور پر ایسے مقامات میں جہاں انہیں مصنف کے نقطۂ نظر سے اختلاف تھا ۔ مولانا مہر نے مسلم مورخین کے نقطۂ نظر کے مطابق واقعات کو پیش کیا ۔

۱۔ انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم ، جلد اول ، مقدمہ از مولانا مہر ، صفحہ ی ۔

انسائیکلو پیڈیا میں کیے گئے اضافوں کے ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر حصہ وہ ہے جو جنگِ عظیم دوم کے بعد اسلامی ممالک کے تاریخی وقائع سے تعلق رکھتا ہے ۔ ولیم ایل لینگر نے اس جنگ کے بعد اسلامی ملکوں کے حالات کو تقریباً نظر انداز کر دیا تھا ۔ مترجم نے اس ضمن میں ضروری واقعات کا اضافہ کر دیا ۔ اس سلسلے کی نمایاں ترین مثال قیامِ پاکستان کا واقعہ ہے ۔ مولانا مہر نے اس واقعے کو ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کر دیا ۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ انسائیکلو پیڈیا جلد اول کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں طبع ہوا تھا ۔ اس وقت اس میں ۱۹۵۶ء تک کے اہم واقعات درج تھے ۔ لیکن جب ۱۹۶۸ء میں انسائیکلو پیڈیا کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں اوائل ۱۹۶۸ء تک پیش آنے والے واقعات بھی شامل کر دیے گئے ۔

انسائیکلو پیڈیا جلد اول میں مولانا مہر نے اپنی طرف سے اقوامِ متحدہ کی سرگزشت بھی شامل کر دی ۔ اس کے علاوہ مختلف مسلم حکمران خاندانوں کے شجرے اور اسلامی ممالک کے نقشے بھی کتاب میں شامل کر دیے گئے تا کہ انسائیکلو پیڈیا کو زیادہ سے زیادہ مفید و نافع بنایا جا سکے ۔

انسائیکلو پیڈیا جلد اول میں یہ ترامیم و اضافے صرف تاریخی واقعات تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ جیسا کہ مولانا مہر خود لکھتے ہیں ، انھوں نے ترجمہ کرتے ہوئے طریقِ خطاب اور اسلوبِ بیان میں بھی جابجا تبدیلیاں کر دیں ۔ مولانا مہر اس ضمن میں لکھتے ہیں :

> ''کہیں کہیں طریقِ خطاب اور اسلوبِ بیان میں بھی ترمیم کر دی تا کہ واقعہ ٹھیک ٹھیک واضح ہو جائے ۔ نیز طریقِ خطاب وہ رہے جو ہمارے ہاں رواج پا چکا ہے اور وہ اہلِ عرب کے طریقِ خطاب سے ایک حد تک مختلف ہے ۔''[1]

انسائیکلو پیڈیا کی دوسری اور تیسری جلد میں بھی اسی نوعیت کی تبدیلیاں کی گئی ہیں ، اگرچہ وہ بہت کم اور معمولی ہیں ۔ ان دونوں جلدوں میں ولیم ایل لینگر کے پورے متن کا ترجمہ کرنے کی بجائے صرف نہایت اہم واقعات کو

۱۔ انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم ، جلد اول ، مقدمہ از مولانا مہر ، صفحہ ی ۔

منتخب کیا ہے اور جہاں مصنف کی تحریر میں تشنگی محسوس کی وہاں اپنی طرف سے اضافے بھی کر دیے ہیں ۔ تیسری جلد کے آخری ابواب مولانا مہر نے خود لکھے ہیں جس سے انسائیکلو پیڈیا کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ ہوا ۔

ان تفصیلات کی روشنی میں انسائیکلو پیڈیا خاص طور پر اس کی جلد اول کو صرف ترجمہ نہیں کہا جا سکتا اور ایک طرح سے یہ تالیف ہی قرار پاتی ہے۔ لیکن چونکہ اسے مرتب کرنے کے لیے ولیم اہل لینگر کے انسائیکلو پیڈیا کو بنیاد بنایا گیا اور جابجا اس کی عبارات کے ترجمے کیے گئے لہذا اسے ترجموں ہی کے ذیل میں شمار کرنا پڑے گا ۔

مولانا مہر کے تراجم اور ان کی فنی خصوصیات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ مولانا مہر نے ترجمے کا کام زیادہ تر معاشی مجبوریوں کی وجہ سے کیا ، اس کے باوجود انھوں نے ترجمے کا اعلیٰ معیار برقرار رکھا ۔ مولانا مہر نے نہ صرف کتابوں کا ترجمہ کیا بلکہ حواشی ، تعلیقات اور اپنی طرف سے حذف و اضافہ جات کی وجہ سے اکثر ترجموں کو تصنیف کے درجے پر پہنچا دیا ۔ یہی چیز مولانا مہر کو اردو مترجمین میں ممتاز مقام پر فائز کرتی ہے۔

☆ ☆ ☆

نواں باب

متفرقاتِ مہر

مولانا مہر کے نمایاں ترین ادبی کارناموں کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے ، اور اگر دیکھا جائے تو یہی وہ کام بھی ہے جس کے باعث مولانا غلام رسول مہر نے دنیائے ادب میں اپنے لیے ایک ممتاز اور قابلِ ذکر مقام پیدا کیا - لیکن صحافت ، سوانح عمریاں ، تاریخ ، تحقیق ، شرح نویسی اور تراجم کے علاوہ بھی ان کی ادبی شخصیت کے بعض ایسے پہلو ہیں ، جن کی اہمیت تو کوئی خاص نہیں لیکن چونکہ ان کا تعلق مولانا مہر کی ذات سے ہے لہذا ان کا بھی تھوڑا بہت ذکر ہونا چاہیے - اس سلسلے میں مولانا مہر کی شاعری ، مکاتیب ، سفرنامے اور نصابی کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں -

۱- شاعری :

مولانا مہر کا شمار بھی اُن ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی ادبی تحریروں کا آغاز شعرگوئی سے ہوا اور بعد ازاں وہ شعر و شاعری کا میدان چھوڑ کر نثر کی طرف مائل ہوگئے - مولانا مہر بھی دوسرے بڑے شاعروں کی طرح اوائل عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے ، جیسا کہ وہ خود شعرگوئی کے آغاز کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میں مشن ہائی سکول میں پڑھتا تھا جب شعرگوئی کا شوق پیدا ہوا (۱۹۰۹ء) - ضامن علی ضامن کا دیوان کہیں سے ہاتھ آ گیا تھا - اس کی غزلوں پر طبع آزمائی کرکے شوق کی پیاس بجھاتا رہا - یقین ہے کہ جو کہتا تھا وہ قابلِ توجہ تو کیا ، غالباً صحیح بھی نہ ہوگا - تاہم خوب یاد ہے کہ اپنی ہر غزل کئی کئی مرتبہ صاف کاغذوں پر لکھ لکھ کر خوش ہوتا تھا - گویا ''طفلِ خود نما'' کا سا معاملہ تھا -

یکن حرف خوانده ایم و بصد جا نوشته ایم''[1]

اسی زمانے میں مولانا مہر دوستوں کی رائے کے مطابق بستی غذاں کے حکیم محمد سلیم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں اپنا کلام دکھانے لگے - یہی استاد تھے جنھوں نے مولانا مہر کو دیوان غالب کے مطالعے کی ترغیب دی اور ان کے لیے مہر تخلص تجویز کیا -[2] اس دور میں مولانا کس پائے کے شعر کہتے ہوں گے ، اس کا اندازہ خود مولانا مہر کے پیش کردہ اقتباس سے ہو جاتا ہے - یعنی خود بقول مہر وہ لائق توجہ تو کیا غالباً صحیح بھی نہ ہوں گے - اس کے باوجود شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا اور مولانا مہر بزعم خود اپنے آپ کو ایک ایسا شاعر تصور کرتے تھے جس کو خدا نے شعر و شاعری کے لیے پیدا کیا ہو - جیسا کہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میں نیا نیا کالج سے نکلا تھا - اس زمانے میں شعر گوئی کا زور تھا اور بلا شائبہ خود ستائی میرا احساس یہ تھا کہ خدا نے مجھے شعر گوئی کے لیے پیدا کیا ہے -''[3]

مولانا مہر بغرض ملازمت حیدر آباد دکن گئے تو وہاں کے حلقوں میں بھی شاعر کے طور پر ہی متعارف ہوئے اور غالباً اسی بنا پر انھیں ملازم بھی رکھ لیا گیا ، جیسا کہ وہ حیدر آباد دکن پہنچنے اور وہاں ملازمت حاصل کرنے کے واقعات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میں . . . مہاراجہ کشن پرشاد کے پاس پہنچ گیا - میں نے ایک پُرزور نظم کہتی تھی مگر اس نظم کو سنانے کے لیے خاصا وقت درکار تھا - اس کی تقریب کے لیے پندرہ بیس شعر بطور مثنوی کہہ لیے تھے جن میں کچھ حال اور اپنے افکار واضح کیے تھے - میں نے یہ شعر سنائے تو اس وقت مہاراجہ کے ایک مصاحبِ خاص ترک علی شاہ ترکی قلندر بھی موجود تھے - وہ میرے شعروں کی بہت تعریف فرماتے رہے ، یہاں تک کہ مہاراجہ سے کہا کہ دیکھیے حضور ! میرے پنجاب سے جو

۱- غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں ، ص ۱۱ -

۲- غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں ، ص ۱۳ -

۳- مکتوب بنام محمد عالم مختارِ حق ، مرقومہ ۱۲ فروری ۱۹۶۳ء ، غیرمطبوعہ -

بھی آئے گا، پیرا آئے گا۔ . . غرض میں نے مثنوی سنائی۔ قصیدہ سنانے
کی نوبت ہی نہ آئی۔ میں پائیگاہ میں ملازم ہو گیا۔''[۱]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مہر اوائل عمر میں شعر گوئی کی طرف میلان رکھتے تھے لیکن جب یہ ''زمیندار'' سے وابستہ ہوئے تو سیاست و صحافت کی مصروفیات کے سبب شعر و شاعری کی طرف توجہ نہ کر سکے اور یہ سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ اس طرح مولانا مہر جنھوں نے اپنا ادبی سفر ایک شاعر کی حیثیت سے شروع کیا تھا، نثرنگار ہو کر رہ گئے۔ البتہ اگر کبھی سیاست و صحافت کے مشاغل سے فراغت میسر آ جاتی تو مولانا مہر پھر شعر گوئی کی طرف مائل ہو جاتے۔ دراصل مولانا مہر شاعری کو ایسا فن تصور کرتے تھے جس کا بہترین اظہار محنت و ریاضت اور طبعی مناسبت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ چیزیں میسر آ جائیں اور انسان کو فراغت بھی میسر ہو تو مولانا مہر کے نزدیک شعر کہنا چنداں دشوار نہیں۔ جیسا کہ وہ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں :

''میری کیفیت یہی ہے کہ شعر کو ایک خاص دماغی و ذہنی حالت کا کرشمہ سمجھتا ہوں۔ یہ حالت اپنے اوپر طاری کرنے کے لیے انسان کو دوسرے مشاغل سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ جس طرح ہر فن کے آغاز میں ایک خاص نوع کی ریاضت ضروری ہوتی ہے، اسی طرح شعر بھی ایک ریاضت کا طلب گار ہے اور وہ ریاضت بڑی کٹھن اور بے حد دشوار ہے۔ جب دماغ کو مناسبت میسر آ جائے تو پھر نہ کہنے میں چنداں دقت پیش آتی ہے اور نہ سمجھنے میں۔''[۲]

مولانا مہر کو یہ فراغت و فرصت اُس وقت میسر آتی جب وہ لاہور سے باہر سیر و تفریح کے لیے کسی پُر فضا مقام پر تشریف لے جایا کرتے۔ مثلاً مولانا مہر آشوب چشم کے باعث ۱۹۳۴ع اور ۱۹۳۵ع میں کئی کئی ماہ سناور میں مقیم رہے۔ چونکہ یہاں پر سیاست و صحافت کی مصروفیات نہیں ہوتی تھیں لہٰذا شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہو جایا کرتا تھا۔ جیسا کہ وہ خود سناور میں اپنے قیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق، مرقومہ ۱۲ فروری ۱۹۶۳ع، غیرمطبوعہ۔
۲۔ مکتوب بنام الیس جیلانی، مرقومہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۶ع، غیر مطبوعہ۔

''میں صبح نماز پڑھ کر سیر کے لیے نکل جاتا تھا۔ اکثر خاصا حصہ (فاصلہ) طے کر کے ٹیلے پر چڑھ جاتا جو بہت اونچا تھا اور پہاڑوں کی بہار دیکھتا رہتا، خصوصاً برسات میں۔ بعض اوقات چکر لگا کر لوٹتا۔ میں نے اکثر شعر یا تو اس ٹیلے کی سڑکوں پر پھرتے ہوئے کہے یا ۱۹۳۵ء میں کڑکھل سے ذرا ادھر بجانب کسولی ایک کوٹھی لے لی تھی، جس کا نام تھا پائینز یعنی صنوبر آباد۔ اس کوٹھی سے ایک رکشا روڈ کسولی جاتی تھی۔ سڑک پر میں بھی سیر کیا کرتا تھا۔ اکثر شعر انھی مقامات پر کہے۔''[۱]

یہی زمانہ ہے جب مولانا مہر کی شاعری اپنے عروج پر تھی اور ان کی نظمیں انقلاب کے علاوہ دیگر ادبی رسائل مثلاً ''پنجاب ریویو'' وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ اس کے بعد انھیں مصروفیات و مشاغل کے ہجوم میں وہ فراغت میسر نہ آ سکی کہ وہ شعر کہہ سکتے۔

یہ تو تھی مولانا مہر کی شعر گوئی کے آغاز و انجام کی داستان۔ اس کے بعد اگر فنی اعتبار سے ان کی اُردو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی جس کی بناء پر مولانا مہر کو اردو شاعری کی تاریخ میں کوئی قابلِ ذکر مقام دیا جا سکے۔ انھیں زیادہ سے زیادہ اقبال کا مقلد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب مولانا مہر زمانۂ طالب علمی میں شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئے تھے تو ہر طرف اقبال کی شاعری کے چرچے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا مہر نے تعلیم بھی اسلامیہ کالج لاہور سے حاصل کی تھی جہاں کے طالب علم انجمن حمایتِ اسلام اور اس کے سالانہ جلسوں کے باعث علامہ اقبال سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوتے تھے۔ جیسا کہ خود مولانا مہر کالج کے طالب علموں پر اقبال کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کالج کا زمانہ تھا، ہوسٹل کی زندگی تھی، ڈاکٹر اقبال ہر سال انجمن کے جلسے میں قومی نظم پڑھا کرتے۔ ہوسٹل کی فضا زمین سے آسمان تک اقبال کے ترنم اور اقبالی روح سے معمور نظر آیا کرتی۔ کوئی وقت نہ ہوگا جب کوئی نہ کوئی شکوہ، جواب شکوہ یا شمع و شاعر گاتا

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق، مرقومہ ۱۸ فروری ۱۹۶۴ء، غیر مطبوعہ۔

سنائی نہ دیتا ہو ۔"[۱]

اس اقبالی ترنم اور اقبالی روح نے دوسرے طالب علموں کے ساتھ ساتھ مولانا مہر کو بھی متاثر کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مہر پر اقبال کے اثرات کو کئی حوالوں سے محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً اولین بات تو یہ ہے کہ علامہ اقبال اور مولانا مہر کے نظریۂ شعر و ادب میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ بنیادی طور پر دونوں مقصدی ادب کے قائل ہیں ۔ اس کے علاوہ مولانا مہر نے بھی اپنی شاعری میں علامہ اقبال کی طرح غزل اور نظم کے فرق کو مٹا دیا ۔ یعنی مولانا مہر کی نظموں میں بھی تغزل کے جملہ عناصر پائے جاتے ہیں اور ان کی غزلیات میں بھی داخلی و خارجی آہنگ موجود ہے ۔ اقبال ہی کی طرح مولانا مہر نے بھی الدرونی قوافی اور ہم وزن الفاظ کے استعمال سے اپنی منظومات کو مترنم بنایا ہے ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس طرح مولانا مہر ابتدائے شاعری میں ضامن علی ضامن کی غزلیات پر طبع آزمائی کرتے تھے ، اسی طرح بعد کے ادوار کی نظموں کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اب ضامن علی ضامن کی جگہ اقبال نے لے لی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اور مولانا مہر کی بہت سی نظموں کی زمین تک یکساں ہے ۔ مثلاً اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کے دوسرے بند کو ذہن میں رکھ کر مولانا مہر کی نظم ''عشق و عقل'' کو دیکھیے :

عشق ہے شیرِ خدا ، عشق ہے سرِ علا
عشق ہے خیبر شکن ، عشق ہے اقصیٰ خرام
عقل ہے بے کیف و ذوق ، عشق ہمہ جذب و شوق
عقل ہے بے مقتدیٰ ، عشق جہاں کا امام
اس کا نتیجہ بقا ، اُس کا نتیجہ فنا
عشق کی مستی حلال ، عقل کی مستی حرام
عقل کو خود اس کے تیر کر گئے غلطاں بخوں
عشق ہے قدرت کی ضرب ، جس کی نہیں روک تھام
عقل لئیم و رجیم ، عقل عذابِ الیم
عشق کریم الکرام ، عشق امام الانام
عقل ہے عرفاں سے دور ، منزل جاناں سے دور
عشق ہے یثرب خرام ، عشق ہے یثرب مقام

۱۔ روزنامہ انقلاب ، زبور عجم نمبر ، ۱۷ جولائی ۱۹۲۷ء ۔

اسی طرح ''بالِ جبریل'' کی غزل ''ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق'' ذہن میں رکھ کر مولانا مہر کی نظم ''قلندروں کا طریق'' ملاحظہ فرمائیے:

نہ برگ و ساز کی پروا، نہ انتظار رفیق
زمانے بھر سے نرالا قلندروں کا طریق
اگر خدا پہ بھروسا ہے، ہو یکالہ رواں
خدا سے بڑھ کے نہیں برگ و ساز کی توفیق
یہی ازل سے چلی آ رہی ہے وضع زماں
یہ بے دلوں سے ہے کج باز سر پھروں پہ شفیق

اقبال اور مولانا مہر کی شاعری کے اوزان و بحور اور تراکیب و بندشیں ہی ایک جیسی نہیں ہیں، بلکہ ان کے موضوعات میں بھی یکسانی پائی جاتی ہے۔ مثلاً پہلی نظم ''عشق و عقل'' میں نہ صرف علامہ اقبال کی مخصوص علامات مثلاً ''عقل و عشق'' نمایاں ہیں، بلکہ ان کے بارے میں رویہ بھی تقریباً وہی ہے جس نے اقبال کے ہاں معرکہ عقل و عشق کی صورت اختیار کی۔ اس کے علاوہ خودی، تہذیبِ فرنگ اور واعظِ بے بصر کے بارے میں بھی مولانا مہر نے جو کچھ لکھا، اس میں اقبال کے اثرات کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے:

تری زیست سر بہ زانو، مری زیست سر بہ خنجر
ترا کیش خانقاہی، مرا ذوق پادشاہی
اسی شبنم و صبا سے یہ چمن ہرا بھرا ہے
کوئی گریہ شبانہ، کوئی آہِ صبح گاہی
ملی شیخ کو کہاں سے رہ و رسمِ فرقہ سازی
نہ یہ سنتِ الٰہی، نہ طریقِ خانقاہی
ہے خودی بجز خدا کے نہ جھکے کسی کے آگے
نہ لبادِ دکلہ پوشی، نہ طرازِ کج کلاہی

ہو پھر عطا حرم کو جامِ مئے مغانہ
اترے سروں سے یکسر کیفِ فرنگیانہ
باقی نہیں ہے ساقی اب تیری انجمن میں
وہ رقص بے خودانہ، وہ وجد سرخوشانہ

ذوقِ سجود سے ہیں خالی اگر جبینیں
بے جذب ہو رہا ہے کیوں تیرا آستانہ

صرف یہی نہیں بلکہ مولانا مہر کی منظومات کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خواہ موضوع اور خواہ اسلوب ہر اعتبار سے اقبال کے اثرات نمایاں ہیں ۔ البتہ وہ نظمیں اس دائرے میں نہیں آتیں جو مولانا مہر نے کسی خاص واقعے سے متاثر ہو کر لکھیں ۔ مثلاً جب مولانا مہر آشوب چشم کے باعث سناور چلے گئے تھے اور وہاں قیام کے دوران میں معلوم ہوا کہ ان کے دیرینہ دوست شفاء الملک حکیم فقیر محمد کے ہاتھ پر آم کھاتے ہوئے چاقو سے زخم آ گیا ہے ، تو انھوں نے ایک نظم لکھ کر حکیم صاحب کی خدمت میں بھیجی ، جس کا ایک بند یہ تھا :

نہ یہ سبب ہو کہیں زخم کا کہ تو مجھ کو
نیازِ نو کی طلب کوشیوں میں بھول گیا
قضا نے میری تمنا کی پاسداری میں
بڑھا کے ہاتھ دیا تیرے ہاتھ پر چرکا
اگر نہ بھول گیا تھا مجھے بتا تو سہی
مزے سے نوش کیے آم کس لیے تنہا

اس صورت حال میں مولانا مہر کو اردو شاعری کی تاریخ میں کوئی خاص اور قابلِ ذکر مقام دینا ممکن نہیں ۔ اور اب تو یوں بھی ان کی شاعری کا بڑا حصہ ہمارے سامنے نہیں ہے ۔ چند نظمیں اور غزلیات ہیں جو انقلاب کے صفحات پر اس بات کی شہادت دینے کے لیے موجود ہیں کہ مولانا مہر شعر بھی کہا کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ اس دور کے ایک آدھ ادبی پرچے میں کچھ شعر بکھرے پڑے ہیں ۔ اسی طرح "شعرائے پنجاب" میں مولانا مہر کی دو غزلیں دی گئی ہیں جو محض تبرک کی حیثیت رکھتی ہیں ۔[1]

۱۔ شعرائے پنجاب ، از نسیم رضوانی ، اشاعت اول ، مطبوعہ گجرات پرنٹنگ پریس گجرات ۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا مہر اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شعر کہتے تھے ، لیکن ان کے اردو اشعار کی طرح ان کی فارسی شاعری بھی زمانے کی دستبرد اور خود مولانا مہر کی بے توجہی کا شکار ہو گئی ، اور وہ بھی اس طرح کہ اب اس کا سراغ بھی نہیں ملتا ۔ البتہ صرف وہ چند شعر محفوظ ہیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے خطوط میں لکھ دیے ۔ مثلاً محمد عالم مختارِ حق کے نام اپنے ایک خط میں اپنی فارسی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ایک غزل بھی لکھتے ہیں جس کے چند شعر درج ذیل ہیں :

خدیوِ عشقم و غم طرّۂ کلاہِ من است
فغانِ نیم شبی ، پرچمِ سپاہِ من است
مرا جہانِ دگر بخش کاین جہان کہن
ز فرق تا بقدم خستۂ نگاہِ من است
ز مرگ و زیست چہ پرسش رود چو بےدانی
نہ این گناہ من است و نہ آن گناہ من است
کجاست ارض و سمائے کہ آفریدۂ تست
ہر آنچہ سے لکرم معجز لگاہ من است

اس کے علاوہ ان کی ایک طویل فارسی نظم بھی محفوظ ہے ۔ وہ بھی اس لیے کہ یہ ''انقلاب'' کے استقلالِ افغانستان نمبر میں شائع ہو گئی تھی ۔ انقلاب میں اس نظم کی ابتداء میں مندرجہ ذیل تعارفی جملے بھی لکھے گئے تھے :

''یہ نظم اس وقت بارگاہِ خسروی میں پیش کی گئی تھی جبکہ مجھے کابل میں اعلیٰ حضرت کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا اور اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ شہید کی شہادت کا واقعہ بھی تازہ تھا ۔''[1]

اس تعارف ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں والیِ افغانستان ظاہر شاہ کی مدح بھی کی گئی تھی اور چونکہ نادر شاہ کو شہید ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے اور ان کی شہادت کا واقعہ ابھی تازہ تھا لہٰذا اس میں مرثیت کا عنصر بھی پیدا ہو گیا تھا ۔

۱- روزنامہ انقلاب ، ۱۶ اگست ۱۹۳۶ع ۔

یہ ترکیب بند نظم دس بندوں اور پچاسوے اشعار پر مشتمل ہے ۔ پہلے دو بندوں میں ظاہر شاہ کی مدح کی گئی ہے ۔ اس کے بعد تین بند اس سانحے کے بارے میں لکھے گئے ہیں جو نادر شاہ کی شہادت سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کے بعد تین بند ظاہر شاہ کے تین چچاؤں کی شان میں کہے گئے ہیں جو ظاہر شاہ کی نوعمری کے باعث اس کے سرپرست و نگران تھے ۔ آخری دو بندوں میں ظاہر شاہ کی مدح بھی ہے اور دعا بھی کی گئی ہے ۔ یوں دیکھا جائے تو مولانا مہر نے قصیدے اور مرثیے کو ملا کر ایک نئی چیز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ، جس میں مسرت و شادمانی اور غم و اندوہ دونوں جذبے پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور قاری کو متاثر کرتے ہیں ۔ اس ترکیب بند کے چند شعر بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں :

اے چشم و چراغ ملک و ملت　　اے نورِ نگاہِ شہر یاری
اے بذل جمیل رحمت حق　　اے ظل ظلیل فضل باری
اے ناصیہ جمال امید　　اے عہد جہان بختیاری

اے سرور حق گزار اسلام　　اے شوکت ملک و شان ملت
اے رونق روزگار اسلام　　اے یوسف کاروان ملت
اے تازگی بہار اسلام　　اے روشنی روان ملت

مشرق ز غروبِ او تاریک　　آں خسرو خاوراں کجا رفت
اے مجمع سروران ملت　　آں سرور سروراں کجا رفت
در پیرویِ شہِ شہیداں　　با جامہ خونچکاں کجا رفت

صد شکر خدا ترا سہ عم داد　　چوں ہاشم و شہ ولی و محمود
از دست و دل و دماغ نادر　　فیضے خاصے بہ ایں سہ کس بود
ہاشم فخر زمان پیشیں　　ہاشم صدر جہان موجود

یا رب تو رحیمی و کریمی　　پوزش بہ پذیر و جرم ما بخش
مغرور اناست سحر افرنگ　　اعجاز کلیم با عصا بخش

در ظلمت کفر زار ہستی | نورے ز چراغ مصطفیٰ بخش
بے عشق و محبتش بقا ہیچ | از عشق و محبتش ، بقا بخش

اس نظم کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ مصرعوں کی بندشیں چست ہیں اور کلام مربوط ہے ، تاہم انھیں اہم فارسی شعرا میں شمار نہیں کیا جا سکتا ہے - پس یہ ہے کہ انھوں نے اوائل عمر میں شاعری شروع کی - اس کے علاوہ مصروف زندگی میں اگر کبھی فراغت کے چند لمحے میسر آ جاتے تو شاعری کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اس دور کی کچھ منظومات تبرک کے طور پر ہمارے سامنے ہیں ، ورنہ جو کچھ اس کی ادبی حیثیت ہے اس کا اندازہ خود مولانا مہر کو بھی بخوبی تھا - جیسا کہ وہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"اب سوچتا ہوں تو اپنے تصورات پر بے اختیار ہنسی آتی ہے - شعر گوئی سے اس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا کہ معانی کے بھید ، ترکیبوں کی تراش خراش کے حسن اور الفاظ کی در و بست ، تاثیر اور بہ اعتبار مضمون مناسبت کا ایک حد تک اندازہ ہو گیا - اس کے علاوہ یہ کہ اساتذہ کے اشعار کی حقیقی حیثیت ایک حد تک ذہن نشین کر اپنے میں مدد ملی -"[۱]

۲- سفرنامے :

جب تک مولانا مہر صحافت سے وابستہ رہے ، وہ اندرون و بیرون ملک سفر بھی کرتے رہے - یہ سفر نجی مقاصد کے لیے بھی ہوتے تھے اور پیشہ وارانہ تقاضوں کے باعث بھی - مثلاً مولانا مہر حج کے لیے سعودی عرب گئے تو یہ سفر خالصتاً ذاتی نوعیت کا تھا ، جبکہ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر یورپ کا سفر صحافتی پیشے سے وابستگی کی وجہ سے تھا - بہرحال مولانا مہر نے اپنے تقریباً ہر سفر کے تجربات و مشاہدات کو قلمبند بھی کیا اور یہ تمام تحریریں مکاتیب کی شکل میں روزنامہ انقلاب میں شائع ہوتی رہیں - چونکہ ان مکاتیب کا تعلق سفر کے تجربات و مشاہدات سے تھا ، اسی لیے انھیں بڑی حد تک سفر نامے قرار دیا جا سکتا ہے - اگر ان سفرناموں کا اردو کے جدید سفرناموں سے موازنہ

۱- مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۲۳ فروری ۱۹۶۳ء ، غیر مطبوعہ -

کیا جائے تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی ۔ البتہ ان میں کچھ خوبیاں ایسی ہیں جو انھیں قابل توجہ بنا دیتی ہیں ۔ مثلاً مولانا مہر ایسے سنجیدہ ادیب نے بھی اپنے سفرناموں کو دلچسپ بنانے کے لیے ان میں طنز و مزاح کا اہتمام کرنا ضروری سمجھا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سفر نامہ' حج ہو یا سفرنامہ' یورپ ، ان دونوں میں واقعاتی مزاح کی صورتیں نظر آتی ہیں جو قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں ۔ اس سلسلے میں سفر نامہ' یورپ کا وہ حصہ دیکھنے کے لائق ہے جو مولانا مہر نے روما میں اپنے قیام سے متعلق لکھا ہے اور جس میں رابطے کی کوئی زبان نہ ہونے کے باعث پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ سفر نامہ' حج سے متعلق وہ اقتباس بھی بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جس میں حقہ پینے کی عادت کے باعث پیش آنے والے مصائب کا بیان ہے ۔ مثلاً مولانا مہر ، عبدالمجید سالک کے حسن انتظام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''آپ کے زور اہتمام کی برکت سے دوسری اشیاء کے علاوہ ایک مختصر سا حقہ بھی میرے سامان سفر میں شامل ہو گیا تھا اور یہ امر آپ کے اہتمام اور دفتر انقلاب کے بہترین کارکنوں کے اہتمام کے نتائج حسنہ کی روشن دلیل تھا ۔ مگر بے عیب ذات خدا کی ہے ۔ آپ کے مہتم بالشان انتظامات کی جو خرابیاں اور سخت دست سوز خرابیاں مجھے حقے کی طلب کے سلسلے میں معلوم ہوئیں انھیں اب کیا بیان کروں ۔ اگر اسماعیل کی رفاقت التوائے سفر کو گوارا کر سکتی اور جہاز بھی میرے التوا کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتا تو خدا شاہد ہے کہ منٹگمری یا خانیوال کے اسٹیشن پر اتر کر واپس لاہور پہنچتا ۔ انتظامی خرابیوں کی اصلاح کراتا . . . جس بے نصیب کے پاس حقہ نہ ہو وہ با دل ناخواستہ سگریٹوں پر گزارا کر سکتا ہے ۔ اگرچہ یہ گزارا کتنا ہی لب سوز ، کتنا ہی آبلہ انگیز اور کیسا ہی بے کیف کیوں نہ ہو ۔ لیکن اس شخص کے رنج و غیض کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس کے پاس حقہ تو موجود ہو ، مضبوط و پائیدار چلم موجود ہو ، تمباکو کا تھیلا موجود ہو ، مگر نہ کوئلے ہوں کہ آگ سلگا سکے اور نہ دست پناہ ہو جسے عرف عام میں چمٹا کہتے ہیں . . . . دفعتاً اس بوری پر نظر پڑی جس میں متفرق سامان رکھا ہوا تھا ۔ میں نے سوچا کہ

اگر یہ بوری آج کام نہ آئی تو اور اسے کس دن کے لیے اٹھا رکھا جائے گا ۔ چنانچہ میں نے اسماعیل سے چاقو مانگا اور بوری کی گردن کا جھٹکا کرتے ہوئے ایک اچھا خاصا ٹکڑا کاٹ لیا ۔ ٹکڑا چلم میں رکھ کر اسے دیا سلائی دکھائی ۔ اب چمٹے کی کمی محسوس ہوئی ۔ آٹھ دس منٹ ہاتھ جلا کر اور پھونکنا پھالکی کرکے حقہ پینا شروع کیا ۔ لیکن بوری کی آگ کوئلوں کی آگ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی ۔ میں اسماعیل سے باتیں کرنے لگا ۔ دو منٹ تک کوئی کش نہ لگایا ۔ بعد ازاں دیکھا تو چلم ٹھنڈی ہو چکی تھی ۔"[۱]

مولانا مہر جس ملک کا سفر اختیار کرتے ہیں ، وہاں کے باشندوں کے عام اخلاق و عادات اور طرز معاشرت کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ نہ صرف تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ، بلکہ قارئین کے لیے اس میں ترغیب کا سامان بھی ہوتا ہے اور وہ بھی انھی معاشرتی خوبیوں کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا مہر نے انگریزوں کے طرز معاشرت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :

"عام خیال ہے کہ انگریز علی العموم زیادہ ملنسار نہیں ہوتے اور یہ شاید سچ بھی ہو ، لیکن آپ بازار میں کسی مرد یا عورت یا کسی بچے یا کسی خاتون سے کوئی پتہ پوچھیے، اس توجہ، انہاک اور ہمدردی سے سب کچھ بتائے گی کہ گویا آپ کے ساتھ برسوں کے تعلقات چلے آتے ہیں ۔ میرے لیے یہ ساری زندگی بالکل نئی ہے ۔ ہر قسم کی سہولت ہے ، ہر قسم کی راحت ہے ، ہر قسم کی آسائش ہے ۔ لیکن چونکہ طبیعت اس زندگی کی عادی نہیں اس لیے شروع شروع میں بہت تکلیف ہوتی ہے ۔ ہر مکان کا بیرونی دروازہ بند رہتا ہے ۔ باہر سے آنے والے آدمی کے لیے ضروری ہے کہ گھنٹی کا بٹن دبائے ۔ مکان کے ہر کمرے کا دروازہ بند رہتا ہے ۔ باہر سے آنے والے کے لیے ضروری ہے کہ دو یا تین مرتبہ دستک دے ، اور اس رسم کو پابندی اس طرح کی جاتی ہے کہ اگر کوئی غیر آدمی ایک منٹ کے لیے کمرے سے اٹھ کر باہر

۱- روزنامہ انقلاب ، مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۰ء ۔

جائے گا تو دوبارہ آتے وقت پھر دستک دے گا ۔''۱

قوموں کے طرز معاشرت اور رہن سہن کے علاوہ مولانا مہر مختلف ممالک کی تاریخ اور جغرافیے سے بھی خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف ہر ملک کے تاریخی و جغرافیائی حالات کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں بلکہ اکثر اوقات اپنی بات کی وضاحت کے لیے مختلف مقامات کے باقاعدہ نقشے بھی بنا دیتے ہیں تاکہ قارئین جغرافیائی صورت حال کو بخوبی سمجھ سکیں ۔ اس طرح دیکھا جائے تو یہ سفرنامے خاصے دلچسپ بن جاتے ہیں ۔ لیکن ان میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کا اسلوب سفرناموں کے عام انداز بیان سے بہت مختلف ہے ۔ مولانا مہر کے سفرناموں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے جیسے کسی جلسے کی کاروائی پڑھی جا رہی ہے یا کوئی خشک تاریخی اور جغرافیائی کتاب زیر مطالعہ ہے ۔ البتہ ان سفرناموں کے وہ مقامات ضرور خیال انگیز ہوتے ہیں جہاں وہ موضوعی انداز بیان اختیار کر لیتے ہیں ۔ مثلاً مولانا مہر عدن اور باب المندب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''آپ کو معلوم ہے کہ میرے لیے عدن اور باب المندب کا نظارہ بے حد رنج افزا ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ ہند کے یہ دو مقامات کبھی اسلام کی متاع تھے ۔ آج اغیار کے قبضے میں ہیں ۔ آہ مسلمانوں کے ہاتھ سے کیسی کیسی ارضی نعمتیں نکل گئیں ۔ وہ کبھی بحر و بر کے مالک تھے ۔ یورپ ، افریقہ اور ایشیا کی تقریباً تمام قابلِ ذکر تریوں اور تمام قابلِ ذکر خشکیوں پر ان کی حکمرانی تھی ۔ مگر آج سب جگہ غیر اسلامی پرچم لہرا رہا ہے ۔ جو جزیرہ نظر آتا ہے ، انگریزوں کا ، جو ساحل دکھائی دیتا ہے ، انگریزوں کا یا یورپ کی کسی دوسری قوم کا ۔''۲

سفرناموں کے ان حصوں کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر ایک مسلمان کا دل رکھتے تھے اور حقائقِ ارضی کا مشاہدہ اسی نظر سے کرتے تھے ۔ ان کی زندگی کا اہم ترین پہلو بھی یہی ہے اور ان کے سفرناموں کا بھی ۔

۱۔ روزنامہ انقلاب ، ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء ۔

۲۔ روزنامہ انقلاب ، ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء ۔

۴۔ مکتوبات :

مولانا غلام رسول مہر عمر کے آخری حصے میں گوشہ نشین ہو گئے تھے اور تحریر و تصنیف کے علاوہ ان کی کوئی بڑی مصروفیت نہیں رہی تھی ۔ جبکہ تحریر و تصنیف کا زیادہ تر کام بھی ایسا تھا جو تسکینِ ذوق کی بجائے کسبِ معاش کے لیے کیا جاتا تھا اور جس کے لیے مولانا مہر کو اپنے اوقات کار کا بڑا حصہ قربان کرنا پڑتا تھا ۔ اسی بنا پر ان کا حلقۂ احباب بہت محدود ہو گیا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود ان کا حلقۂ مکاتبت بہت وسیع تھا ۔ جیسا کہ وہ خود بھی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

''آپ کو معلوم ہے کہ میرا حلقہ بہت محدود ہے اور بڑے حلقۂ احباب کی ذمہ داری اٹھانا میرے لیے مشکل ہے ۔ (اگرچہ حلقۂ مکاتیب خاصا وسیع ہے) ۔''[۱]

اگرچہ مشاہیر و عظماء کے نام مولانا مہر کے خطوط ہمارے سامنے نہیں ، لیکن جو خط موجود ہیں ، ان کی تعداد بھی ہزاروں تک پہنچتی ہے ۔ جبکہ یہ امر یقینی ہے کہ مولانا مہر نے ان مکتوبات کے علاوہ بھی بہت سے خطوط تحریر کیے ۔ خاص طور پر اُس دور میں جب وہ سیاست و صحافت سے وابستہ تھے اور ابوالکلام آزاد سے لے کر مولانا جوہر سمیت تقریباً تمام اکابرین سے ان کی خط و کتابت تھی ۔ بہرحال مولانا مہر کے خطوط کے جو مجموعے تلف ہونے سے بچ گئے ان کی تعداد بھی ایک درجن کے لگ بھگ ہے ۔

مکتوبات کے ان ذخیروں میں ''افاداتِ مہر'' خطوط کا ایسا مجموعہ ہے جو سب سے پہلے چھپ کر منظرِ عام پر آیا ۔ ''افاداتِ مہر'' کے تمام خط شیربہادر پنی مصنف تاریخ ہزارہ کے نام ہیں ۔ یہ خطوط ۷۷ کی تعداد میں ہیں اور فروری ۱۹۵۹ع سے نومبر ۱۹۷۱ع کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے ہیں ۔

شیر بہادر پنی اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا مہر کا تعلق بھی اعوان برادری ہی سے تھا ۔ اس کے علاوہ مولانا مہر اور شیر بہادر پنی میں رشتۂ مودت کا سبب مولانا ابوالکلام آزاد سے عقیدت تھی ۔ جیسا کہ شیر بہادر پنی خود لکھتے ہیں :

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۱۴ نومبر ۱۹۶۲ع ۔

"میرے اور مرحوم (مولانا مہر) کے تعلق کی وجہ صرف ایک مشترک چیز تھی - وہی ہمارے تعلقات کی استواری و گہرائی اور ان کی بے پناہ شفقت کا موجب تھی ، یعنی ہم دونوں مولانا آزاد کے شیدائی تھے -"[۱]

افادات مہر کل تین حصوں پر مشتمل ہے - اس کے پہلے حصے میں مولانا مہر کے خطوط سے اقتباسات منتخب کرکے ان کی مختصر سوانح عمری مرتب کی گئی ہے - اس حصے میں وہی انداز اختیار کیا گیا ہے جو مولانا مہر نے "غالب" مرتب کرتے ہوئے اپنایا ہے -

"افادات مہر" کا دوسرا حصہ اُن مضامین و مقالات پر مشتمل ہے جو مختلف اخبارات و رسائل میں مولانا مہر کی وفات کے سلسلے میں شائع ہوئے تھے - جبکہ افادات کے تیسرے حصے میں مولانا مہر کے مکاتیب شامل ہیں ، لیکن جدت یہ ہے کہ ہر خط کو مختلف موضوعات کے اعتبار سے تقسیم کرکے مختلف سرخیوں کے ساتھ درج کیا گیا ہے -

مولانا مہر کے مکتوبات کا دوسرا اہم مجموعہ ابھی حال ہی میں "خطوط" کے نام سے شائع ہوا ہے - اس مجموعے میں کل ۲۲۴ مکاتیب شامل ہیں اور یہ تمام خطوط اکتوبر ۱۹۵۵ع سے نومبر ۱۹۷۱ع کی درمیانی مدت میں ایس جیلانی ساکن محمد آباد ضلع رحیم یار خان کے نام لکھے گئے ہیں -

دیگر مجامیع کے مقابلے میں "خطوط" کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں پیش کیے گئے خیالات و نظریات اور واقعات و آراء پر مکتوب الیہ نے تنقیدی نظر ڈالی ہے اور اپنے خیالات حواشی میں لکھ دیے ہیں ، جس کے باعث نہ صرف قارئین تصویر کے ہر رخ سے آگاہ ہو جاتے ہیں بلکہ خطوط کا حقیقی پس منظر بھی سامنے آ جاتا ہے - اس کے علاوہ مکاتیب میں آنے والے تاریخی واقعات و تلمیحات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے -

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس مجموعے کے تمام خطوط مولانا مہر نے خود بھی دیکھے ہیں ، جس کی بنا پر انھوں نے نہ صرف خطوط کی اصلاح کر دی ہے بلکہ جہاں جہاں انھیں ایس جیلانی کے حواشی سے اختلاف کرنے کی

۱- افادات مہر ، ص ۲۳ -

گنجائش نظر آئی ، وہاں تنقید کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات و خیالات کی وضاحت بھی کر دی ہے جس سے ''خطوط'' کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے ۔

مکتوبات مہر کا تیسرا اہم مجموعہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو اگست ۱۹۵۷ع سے دسمبر ۱۹۷۰ع کی درمیانی مدت میں سید قدرت نقوی کے نام لکھے گئے تھے ۔ سید قدرت نقوی نے ان مکاتیب کو ''آشوب آ گہی'' کے نام سے مرتب کیا ہے ۔ لیکن تاحال اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آ سکی ، اگرچہ کچھ خطوط مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ۔

اس مجموعے کی اہم بات یہ ہے کہ اس میں شامل تقریباً تمام مکاتیب ''غالبیات'' سے متعلق ہیں ۔ چونکہ مولانا مہر اور سید قدرت نقوی کی دلچسپی کا مشترک موضوع ''غالب'' تھا ، لہذا اکثر خط اسی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں اس مجموعے میں کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جو مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے سید قدرت نقوی کے نام لکھے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہو جاتا تھا کہ غالب کی شخصیت و شاعری کے کسی موضوع پر لکھتے ہوئے مولانا مہر اور سید قدرت نقوی اختلاف کا شکار ہو جاتے ۔ ایسی صورت میں سید قدرت نقوی مولانا امتیاز علی عرشی سے رجوع کرتے ۔ ''آشوب آ گہی'' مرتب کیا گیا تو یہ خط بھی مجموعے میں شامل کر لیے گئے تاکہ قارئین متنازعہ تحقیقی مسائل کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکیں ۔

دیگر مجموعوں کے مقابلے میں ''آشوب آ گہی'' اس وجہ سے بھی منفرد ہے کہ اس میں سید قدرت نقوی نے اپنے خطوط بھی شامل کر دیے ہیں تاکہ ہر خط اپنے حقیقی پس منظر کے ساتھ پڑھا اور سمجھا جا سکے ۔

حمزہ فاروق نے مولانا مہر سے اکتوبر ۱۹۶۷ع میں اس وقت خط و کتابت شروع کی تھی جب وہ سفرنامۂ اقبال مرتب کر رہے تھے ۔ چونکہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اختیار کیے گئے سفر میں مولانا مہر بھی علامہ اقبال کے ساتھ تھے لہذا حمزہ فاروق نے مولانا مہر سے اسی سلسلے میں استفسارات کیے تھے جن کے جوابات متعدد مواقع پر لکھے گئے خطوط کی شکل میں موجود ہیں ، جنھیں حمزہ فاروق نے ضروری اور مفصل حواشی کے ساتھ مرتب کر دیا ہے ۔ اس مجموعے کی کتابت ہو چکی ہے لیکن نامعلوم اسباب کے باعث ابھی تک اس کی اشاعت عمل میں نہیں آ سکی ۔

اس مجموعۂ مکاتیب میں کل ۳۳ خطوط شامل ہیں جن میں سے ۳۱ خطوط حمزہ فاروقی کے نام ہیں ، جبکہ پہلے دو خط علی الترتیب آغا شورش کاشمیری اور عاشق حسین بٹالوی کے نام لکھے ہوئے ہیں ۔

مولانا مہر کے کچھ خطوط حسام الدین راشدی کے پاس[1] بھی محفوظ تھے جنھیں وہ شائع کرانا چاہتے تھے ۔ جیسا کہ خود مولانا مہر لکھتے ہیں :

''ایک مجموعہ سید حسام الدین راشدی (کراچی) کے پاس ہے اور وہ اسے چھپوانا چاہتے تھے ۔ غالباً نقوش والوں سے کوئی بات ہوئی تھی ۔ مجھے لکھا تھا ، میں نے کہا کہ ایک مرتبہ دکھا دو تو میں اجازت دوں ۔ اب مدت سے کوئی اطلاع نہیں آئی ۔''[1]

لیکن حسام الدین راشدی اپنی خواہش کو عملی صورت نہ دے سکے اور اب ان کے انتقال کے بعد ان خطوط کی اشاعت کی کوئی صورت شاید ہی ہو سکے۔

اب تک مولانا مہر کے مکاتیب کے جن مجموعوں کا ذکر کیا گیا ہے ، وہ یا تو شائع ہو چکے ہیں یا اُس انداز میں مرتب ہو چکے ہیں کہ کسی بھی وقت شائع ہو سکتے ہیں ۔ اس کے بعد کچھ مجموعے ایسے بھی ہیں جو اپنی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے بہت اہم ہیں لیکن ابھی تک ان کی ترتیب و اشاعت کی کوئی صورت نہیں بن سکی ۔ ان مجموعوں میں سب سے اہم مجموعہ ان مکاتیب کا ہے ، جو محمد عالم مختار حق کے نام لکھے گئے ہیں ۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ محمد عالم مختار حق لاہور کے رہنے والے ہیں اور مولانا مہر سے ان کے تعلقات کی نوعیت ایسی تھی کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار ملاقات ضرور ہو جایا کرتی تھی ۔ اس کے باوجود ان کے نام چار سو خطوط لکھے گئے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلقات کی ابتداء خط و کتابت سے ہوئی تھی ۔ بعد ازاں محمد عالم مختار حق مولانا مہر کے پاس نیازمندانہ آنے جانے لگے اور یوں خط و کتابت کے مواقع ختم ہو گئے جس کی بنا پر محمد عالم مختار حق کو مولانا مہر کے مفید و نافع اور معلومات افزا خطوط سے محروم ہو جانے کا افسوس تھا ۔ انھوں نے اس کا ذکر کیا تو مولانا مہر نے یہ صورت نکالی کہ محمد عالم مختار حق جب بھی آتے ،

۱- بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۸ع ۔

خط کی شکل میں اپنے سوالات و استفسارات پیش کر دیتے اور مولانا مہر خط ہی کی صورت میں ان کا جواب لکھ دیتے ۔ یہ سلسلہ مولانا مہر کی وفات تک جاری رہا اور یوں خطوط کی تعداد تقریباً چار سو تک پہنچ گئی ۔

مکتوبات مہر کی تقریباً اتنی ہی تعداد مولانا مہر کے بڑے صاحبزادے عبدالسلام اسلم کے پاس بھی محفوظ ہے ۔ یہ تمام خط الہی کے نام لکھے گئے ہیں اور اس تعلقِ خاطر کا منہ بولتا ثبوت ہیں جو دوسری اولاد کے مقابلے میں مولانا مہر کو عبدالسلام اسلم سے تھا ۔ مولانا مہر نے شاید اسی مجموعے کے بارے میں لکھا تھا :

''بعض اہم خطوط عزیزوں کے پاس بھی ہیں جو محض ذاتی معاملات سے متعلق نہیں ، بلکہ حسب موقع کہیں اپنی زندگی کا کوئی واقعہ کھول کر بیان کر دیا ہے ، کہیں بعض عزیزوں کی کیفیت لکھ دی ہے ۔''[1]

یہ مجموعہ مکاتیب اس لیے تمام مجموعوں سے زیادہ اہم ہے کہ ان خطوط میں وہ معمولی سا تکلف اور حجاب بھی نہیں ہو گا جو مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان عموماً ہوتا ہے ۔ ان خطوط کے ذریعے یقیناً مولانا مہر کی سوانح اور ان کے اکثر علمی و سیاسی کارناموں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ یہ خطوط ایسا آئینہ فراہم کر سکتے ہیں جس میں مولانا مہر کی شخصیت کے ایک ایک نقش کو بخوبی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے ۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ عبدالسلام اسلم ان خطوط کی ضرورت سے زیادہ حفاظت کر رہے ہیں اور معلوم نہیں یوں انھیں کن رازہائے سربستہ کی پردہ داری مقصود ہے ۔

اسی طرح مولانا مہر کے خطوط ڈاکٹر سید عبداللہ ، ڈاکٹر ایوب قادری ، مشفق خواجہ ، علامہ رحمت اللہ ارشد ، حمزہ شنواری اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے پاس بھی محفوظ ہیں ۔ ابوسلمان شاہجہانپوری کے نام خط خاصی تعداد میں ہیں اور یہ زیادہ تر ابوالکلام آزاد اور ان کے کارناموں سے متعلق ہیں اس لیے کہ ان دونوں حضرات میں دلچسپی کا مشترک موضوع یہی شخصیت تھی ۔ جبکہ ڈاکٹر ایوب قادری کے نام خطوط کا واحد موضوع تحریک مجاہدین

۱۔ مکتوب بنام محمد عالم مختار حق ، مرقومہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۸ع ، غیرمطبوعہ۔

ہے اور ان خطوط میں تحقیقی انداز میں تحریک مجاہدین کے بارے میں ایوب قادری کے استفسارات کے جواب دیے گئے ہیں ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام خطوط کی تعداد بہت کم ہے اور یہ خطوط مجلہ ''فنون'' جولائی ۔ اگست ۱۹۷۵ع کی اشاعت میں شائع ہو چکے ہیں ۔

یہ تو مولانا مہر کے خطوط کے ان چند ایک مجموعوں کا ذکر تھا جو اب تک محفوظ ہیں ۔ اس کے علاوہ جہاں تک ان کی مکتوب نگاری کی خصوصیات کا ذکر ہے تو اس ضمن میں سب سے پہلے چند بنیادی باتوں کا ذکر ہو جانا چاہیے ۔ مثلاً مولانا مہر کے خطوط میں بھی وہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ان کے اسلوبِ نگارش میں پائی جاتی ہیں ۔ مثلاً منطقی و استدلالی انداز بیان ، قطعیت ، اردو و فارسی اشعار اور قرآنی آیات کا استعمال وغیرہ ۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگرچہ اردو نثر کے سلسلے میں مولانا مہر ابوالکلام آزاد سے زیادہ متاثر تھے اور ان کی تحریرات پر آزاد کے اسلوب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے لیکن مکتوبات میں ان کے اسلوب پر مرزا غالب کے اثرات بھی نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ مولانا مہر غالب کی شاعری سے زیادہ متاثر تھے لیکن غالب کے خطوط سے بھی مولانا مہر کو حد درجہ دلچسپی تھی ۔ انھوں نے نہ صرف خطوط غالب کی مدد سے غالب کی سوانح عمری ترتیب دی بلکہ خود خطوط کو بھی مرتب کرکے شائع کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مہر کے مکتوبات میں ابوالکلام آزاد کی مشکل پسندی اشعار کی بھرمار اور بات کو قدرے پھیلا کر کرنے کا انداز پایا جاتا ہے وہیں خطوطِ غالب کی سادگی اور بے تکلفی بھی نظر آتی ہے ۔ البتہ نہ وہ قافیہ پیمائی ہے اور نہ وہ شوخی و ظرافت جو غالب کے عہد کا تقاضا اور اس کی شخصیت کا بنیادی خاصہ تھی ۔

اس کا اندازہ اُن آداب و القاب سے ہوتا ہے جو مولانا مہر اپنے مکتوب الیہم کو لکھتے ہیں ۔ مثلاً وہ اپنے خطوط میں اکثر و بیشتر عزیز مکرم ، صدیق محترم ، برادر عزیز ، برادر مکرم ، محترم ڈاکٹر صاحب ، ڈاکٹر صاحب محترم ، محترم سید صاحب ، مکرمی سید صاحب ، سید صاحب بھائی ، محب مکرم ، بھائی صاحب ، بھائی ، محبی ، مکرمی اور محترمی وغیرہ لکھتے ہیں ۔ ان القابات کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں وہ سادگی اور بےتکلفی تو ہے جو مکتوب الیہ سے مولانا مہر کے مخلصانہ تعلق کو ظاہر کرتی ہے ، لیکن ان میں وہ

شوخی اور ظرافت نام کو بھی نہیں جو خطوط غالب کا طرۂ امتیاز ہے ۔

مولانا مہر کے خطوط کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ وہ ان کی شخصیت کے عکاس اور آئینہ دار ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی طرح مہر کے خطوط سے نہ صرف ان کی سوانح عمری مرتب کی جا سکتی ہے بلکہ مولانا مہر کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو بھی بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے ۔ مثلاً اپنے علمی کارناموں کے باعث مولانا مہر کی شخصیت کے جتنے پہلو نظر آتے ہیں ، وہ ان کے خطوط میں بھی جلوہ گر ہیں ۔ یعنی خطوط کے ذریعے وہ نہ صرف شارح ، مورخ اور محقق کے طور پر سامنے آتے ہیں بلکہ ایک اچھے صحافی اور سیاست‌دان کی طرح حالاتِ حاضرہ پر بھی ان کے تبصرے دیکھنے کے لائق ہیں جن کی وجہ سے قاری ان کی وسعت علم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔ مولانا مہر اپنے خطوط میں جس انداز سے علمی موضوعات پر بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں ، اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ دنیائے علم و ادب میں کوئی اور کارنامہ انجام نہ بھی دیتے اور صرف ان کے مکاتیب شائع ہو جاتے ، تو بھی ان کی شخصیت علم و فضل کا اتنا ہی بڑا خزینہ تصور کی جاتی جتنا کہ اب خیال کی جاتی ہے ۔

۴۔ نصابی کتب :

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں روزنامہ انقلاب کی بندش کے بعد مولانا غلام رسول مہر کا ذریعۂ معاش صرف تصنیف و تالیف کا سلسلہ رہ گیا تھا جس کی وجہ سے انہیں اپنے ذوق کے کام نظر انداز کرکے نہ صرف تراجم و تشاریح وغیرہ کی طرف آنا پڑا بلکہ مختلف جماعتوں کے طالب علموں کے لیے نصابی کتب کی تالیف کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی ۔ لیکن مولانا مہر کی مرتب کردہ نصابی کتب کا جائزہ لینے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اصولوں کو متعین کر لیا جائے جو کسی بھی اچھی کتاب کو تالیف کرتے ہوئے پیشِ نظر رہنا چاہییں ۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ کسی بھی نصابی کتاب کو طالب علموں کے مذہبی عقائد اور ان کی روایات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے ۔ مثال کے طور پر پاکستان کے سکولوں اور کالجوں میں اکثریت ان طالب علموں کی ہوتی ہے جو مسلمان ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی جماعتوں ہی سے طالب علموں کو مذہب اسلام کی مبادیات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ لیکن یہاں پر ایک

سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا ہر کتاب کو پیش کردہ اصول کے مطابق مرتب کرنا ممکن ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا ۔ اس لیے کہ ہم مذہبیات ، تاریخ اور ایک حد تک زبان و ادب سے متعلق کتب کو تو یقیناً اپنے مذہبی عقائد اور روایات کے مطابق مرتب کر سکتے ہیں ، لیکن سائنس اور عمرانی علوم کی کتابوں کے ضمن میں ایسا ممکن نہیں ہوگا ۔ البتہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ ان علوم سے متعلق کتب کو اس انداز میں مرتب کیا جائے کہ ان میں کوئی بات خلافِ اسلام نہ آ سکے ۔ یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کی بنا پر پرائمری سے لے کر ایم ۔ اے کی سطح تک کے نصابات سے بہت سے اچھے شاعروں اور ادیبوں کو خارج کر دیا گیا اس لیے کہ ان کی تحریریں فنی نقطۂ نظر سے اہم اور قابلِ قدر ہونے کے باوجود مذہبی اعتبار سے اہلِ پاکستان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں ۔ اس کے علاوہ اسی اصول کی بنیاد پر ہر سطح کی تعلیم کے لیے منظوماتِ اقبال کی تدریس تقریباً ضروری تصور کر لی گئی ہے ۔

نصابی کتابوں سے دوسرا تقاضا یہ کیا جاتا ہے کہ ان میں ملک و ملت کے بنیادی نظریات کے خلاف بھی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے ۔ اس امر کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا اور یہی نظریہ اس کے وجود کا ضامن بھی ہے ، لہذا پاکستان کے طالب علموں کے لیے جو بھی نصابی کتاب مرتب کی جائے اس میں حسبِ موقع نظریۂ پاکستان کی اشاعت کا اہتمام ہونا چاہیے ۔ اس اصول کو اختیار کرکے ہم ایک قوم معرضِ وجود میں لا سکتے ہیں ۔ یہ اصول بھی ایسا ہے جسے تاریخ اور زبان و ادب کی کتب میں تو اپنایا جا سکتا ہے لیکن دیگر علوم و فنون سے متعلق کتب میں اسے اختیار کرنا ممکن نہیں ۔ البتہ کچھ اصول ایسے بھی ہیں جو ہر طرح کی کتابوں کو تالیف کرتے ہوئے اختیار کیے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً ایک اصول یہ ہے کہ کتاب خواہ کسی بھی مضمون اور موضوع سے متعلق ہو اس میں پیش کردہ معلومات جدید ترین تحقیقات و انکشافات پر مبنی ہونی چاہییں ۔ تاریخِ عالم پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زوال زیادہ تر انھی اقوام کا مقدر بنا جو بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے کی بجائے آباو اجداد کے تجربات تک محدود ہو کر رہ گئیں ۔ لہذا اگر قوم کو زندۂ جاوید رکھنا مقصود ہے تو اس کے نونہالوں کو آئینِ نو سے خوفزدگی کے رویے سے بچانا ہوگا اور ان میں یہ اہلیت و صلاحیت پیدا کرنی پڑے گی کہ وہ ہر نئی

چیز کو اپنے ملی و قومی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے قبول کرنے پر آمادہ ہو سکیں ۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ابتدائی مدارج تعلیم ہی سے نصابی کتب میں مستند اور جدید ترین علمی انکشافات اور سائنسی ترقیات کی پیش کش کے اصول کو مدِ نظر رکھا جائے ۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ کسی بھی موضوع اور مضمون پر لکھی گئی نصابی کتاب کو ایسی سادہ ، آسان اور سہل زبان میں مرتب کیا جائے جو بچوں کے لیے زیادہ نامانوس اور مشکل نہ ہو ۔ سلیس اسلوبِ تحریر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ طالب علموں کی توانائیاں اور صلاحیتیں زبان کی مشکلات حل کرنے کی بجائے پیش کردہ مواد کی تفہیم میں صرف ہوں گی ۔ یہی وہ اصول ہے جس کی بنا پر بچوں کی تعلیم و تدریس کے لیے ان کی مادری زبان کو فوقیت دینے کی بات کی جاتی ہے ۔

ان چند اصولی باتوں کے بعد مولانا مہر کی نصابی کتب کے بارے میں ایک اور امر لائقِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ مولانا مہر کی مرتب کردہ کچھ نصابی کتابیں تو ایسی ہیں جن کی ترتیب میں مولانا مہر نے براہِ راست کوئی حصہ نہیں لیا ۔ البتہ ان کے علم و فضل کی بنا پر نصاب مرتب کرنے والے کسی ادارے نے انھیں نصاب بنانے والی کمیٹی کا رکن مقرر کر دیا اور وہ اس ادارے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے نصابی کتب پر نظرثانی کا کام کرتے رہے ۔ لیکن چونکہ اس طرح کی کمیٹی میں ایک دو نہیں ، بلکہ بہت سے ارکان شامل ہوتے ہیں لہذا حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مرتبہ کتاب میں کس شخص کا کتنا کام ہوتا ہے ؟ اور اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے ؟ مثلاً کوئی ثانوی تعلیمی بورڈ یا یونیورسٹی اپنا نصاب مرتب کراتی ہے تو مختلف کتابوں کی ترتیب کا کام مختلف مرتبین کے سپرد کر دیا جاتا ہے ۔ جبکہ ان مرتبین کے علاوہ ہر مضمون کی مناسبت سے ایک مجلس ادارت بھی قائم کر دی جاتی ہے جس کے رکن مرتبہ کتاب پر نظرثانی کا کام کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور نے ایف ۔ اے کے لیے اردو کا نصاب مرتب کرایا تو سال دوم کی کتاب ''ادب پارے'' کی ترتیب کا کام ڈاکٹر وحید قریشی کے سپرد کیا ۔ جب یہ کتاب مرتب کی گئی اس زمانے میں بورڈ کی طرف سے قائم کردہ مجلس ادارت میں مولانا مہر کے علاوہ ڈاکٹر سید عبداللہ ، سید امتیاز علی تاج ، حمید احمد خاں ، ڈاکٹر محمد صادق اور مولانا

صلاح الدین احمد شامل تھے ۔ کتاب مرتب ہو جانے پر مولانا مہر کو نظرثانی کا کام سونپا گیا اور ڈاکٹر وحید قریشی کے بقول مولانا مہر نے اس کتاب میں صرف ایک مضمون کا اضافہ کیا اور اس کے تمہیدی حواشی بھی لکھے ۔

اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کتاب کے محاسن و معائب کے حقیقی ذمہ دار کتاب کے مرتب ہیں ۔ جبکہ مولانا مہر مجلس ادارت کے دیگر ارکان کی طرح صرف ان باتوں کے ذمہ دار ہیں جو نصاب کے بنیادی اصولوں اور تعلیمی پالیسی وغیرہ سے متعلق ہیں ۔ اور چونکہ اس اعتبار سے یہ کتابیں ہر طرح کے معائب سے پاک ہیں لہذا مولانا مہر اور مجلس ادارت کے دیگر ارکان کی کاوشوں کو قابل تعریف قرار دیا جائے گا ۔

مولانا مہر کی کچھ نصابی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کی ترتیب کی تمام ذمہ داری مولانا مہر پر عائد ہوتی ہے ۔ یہ کتابیں زیادہ تر اُس زمانے میں لکھی گئیں جب مولانا مہر روزنامہ انقلاب کی بندش کے باعث بے روزگار ہوگئے تھے اور انھیں سلسلۂ حیات کو برقرار رکھنے کے لیے معاشی وسیلوں کی ضرورت تھی ۔ چنانچہ مولانا مہر نصابی کتب کی ترتیب کی طرف متوجہ ہوئے اور صرف دو ہی سال میں دوسری جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک کے طالب علموں کے لیے بے شمار کتابیں مرتب کر ڈالیں ۔ ان کتابوں کی فہرست دوسرے باب میں پیش کر دی گئی ہے جس کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر کی نصابی کتب کے تین چار مخصوص موضوعات تھے ۔ مثلاً اردو ادب ، تاریخ ، دینیات اور شہریت وغیرہ ۔

بہار ادب اور مہر ادب کا تعلق اردو ادب سے ہے ۔ اول الذکر کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے ۔ یہ کتاب چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طالب علموں کے لیے لکھی گئی تھی ۔ جبکہ ''مہر ادب'' کے آٹھ حصے ہیں جو تیسری جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک کے طالب علموں کے لیے لکھے گئے تھے ۔ اسی طرح تاریخ سے متعلق کتابوں کی تعداد پانچ ہے ۔ ان میں ایک کتاب تاریخِ اسلام کا احاطہ کرتی ہے ۔ دو کتابوں کا موضوع تاریخ پاک و ہند ہے جو چھٹی سے دسویں جماعت تک کے طالب علموں کے لیے مرتب کی گئی

ہیں - ایک کتاب معاشرتی علوم حصہ تاریخ ہے - ایک اور کتاب کا نام تاریخِ ہندوستان ہے - یہ دونوں کتابیں بھی ہائی کلاسز کے لیے تالیف کی گئی ہیں - موخر الذکر کتاب واحد کتاب ہے جو قیامِ پاکستان سے قبل یعنی ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی - یہی وجہ ہے کہ اس میں اسلامی اور پاکستانی قومیت سے متعلق نظریات کی وہ برتری نظر نہیں آتی جو تاریخ کے موضوع پر تالیف کی گئی مولانا مہر کی دیگر کتابوں کی اولین خصوصیت ہے -

حضرت رسول؀ کریم ، راہ سعادت ، نصاب دینیات اور راہ ہدایت مولانا مہر کی وہ کتابیں ہیں جو دینی موضوعات پر لکھی گئی ہیں اور یہ بھی مختلف درجوں کے طالب علموں کی نصابی ضروریات کو پورا کرتی ہیں - اس کے علاوہ مولانا مہر کی دوسری کتابوں مثلاً شہریت ، پاک شہریت ، آئینۂ معلومات ، مشاہیر اور مشاہیر عالم کو شہریت سے متعلق موضوعات کے ضمن میں شمار کیا جا سکتا ہے - موخرالذکر دونوں کتابوں کو ان کے موضوع کے اعتبار سے تاریخ و سوانح میں بھی شامل کر سکتے ہیں اس لیے کہ ان میں عظیم لوگوں کے سوانحی خاکے پیش کیے گئے ہیں -

ان تفصیلات کی روشنی میں اگر مولانا مہر کی نصابی کتب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہر اعتبار سے معیاری نظر آتی ہیں - ان میں مذہبِ اسلام کی عبادات کی وضاحت و تصریح بھی کی گئی ہے اور پاکستانی قوم کے بنیادی نظریے یعنی پاکستان کی صراحت و پیش کش بھی - اس کے علاوہ ان کتابوں میں موضوعات کے اعتبار سے مستند معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں ، جبکہ اسلوب بھی اس قدر سادہ اور سلیس ہے کہ کسی مقام پر طالب علم کو الجھن یا مشکل پیش نہیں آ سکتی - دراصل مولانا مہر نے محقق و مورخ کے اعلیٰ ترین منصب کو نظر انداز کرکے نصابی کتب میں ایک عام بچے کی ضروریات اور اس کی ذہنی استعداد کو مدِنظر رکھا ہے - یہی وجہ ہے کہ مورخ ہونے کے باوجود تاریخ سے متعلق ان کی کتابوں میں حوالے نہیں ہوتے اور سوانح نگار ہونے کے باوجود سیرت و سوانح سے متعلق مضامین میں تحقیقی انداز اختیار کرنے سے گریز کیا گیا ہے -

مولانا مہر کی نصابی کتب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگرچہ وہ طالب علموں کے لیے لکھی گئی ہیں ، اس کے باوجود اپنی افادیت کے اعتبار سے ان میں سے بیشتر اتنی اہم ہیں کہ انھیں عام اردو خواں طبقے کے استفادے کے لیے

مستقل کتاب کے طور پر شائع کر دیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں "مختصر تاریخِ اسلام کامل" اور "سرورِ عالم" کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔

۵۔ مولانا مہر کا اسلوبِ نگارش :

جس طرح مولانا مہر کی ادبی شخصیت پہلودار ہے ، یعنی وہ بیک وقت صحافی ، سوانح نگار ، مورخ ، محقق ، شارح ، مترجم ، شاعر اور سفرنامہ نگار ہیں ، اسی طرح ان کے اسلوب نگارش میں بھی بہت سی خصوصیات جمع ہو گئی ہیں ۔ ان کی تحریروں میں میر امن کی سادگی بھی ہے ، غالب کا طنز و مزاح بھی ، سر سید اور حالی کی استدلالیت اور منطقیت بھی اور شبلی کا پرجوش اسلوب بھی، مولانا محمد حسین آزاد کی مرقع نگاری بھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا بات کو پھیلا کر پیش کرنے اور حسب موقع مختلف زبانوں کے اشعار کا استعمال بھی ۔ یہ بات بظاہر جتنی عجیب لگتی ہے ، غور کرنے پر اس میں اسی قدر سچائی اور صداقت نظر آتی ہے ۔ لیکن فی الحال یہ سوال زیادہ توجہ طلب ہے کہ آخر مولانا مہر کے اسلوب نگارش میں یہ مختلف عناصر جمع کیسے ہو گئے ؟ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مولانا مہر نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا ، اس وقت اردو نثر ارتقاء کے مختلف مراحل طے کرتی ہوئی اپنے تقریباً تمام امکانات ظاہر کر چکی تھی اور کسی بھی نئے ادیب کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ اسلوب نگارش کے ضمن میں اپنے لیے نیا اور جدا گانہ راستہ اختیار کر سکتا ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمیں اردو نثر کے تقریباً تمام صاحب طرز ادیب زیادہ سے زیادہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں تک ملتے ہیں ۔ مثلاً سرسید ، حالی ، شبلی ، نذیر احمد ، آزاد ، سجاد حیدر یلدرم اور ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ اس کے بعد جتنے بھی ادیب آئے ہیں وہ کسی نہ کسی کے مقلد قرار دیے جا سکتے ہیں ۔ لیکن مولانا مہر نے کسی ایک ادیب کے انداز کی تقلید اور پیروی نہیں کی ۔ بلکہ ہر ادیب کے نمایاں ترین محاسن سے خوشہ چینی کرکے اپنے لیے ایسا اسلوب متعین کیا جو اس گلدستے کی مثال پیش کرتا ہے جس میں مختلف رنگوں کے پھول چُنے گئے ہوں اور یہی مولانا مہر کے اسلوب تحریر کی انفرادیت ہے ۔

مولانا مہر کے اسلوب نگارش میں مختلف عناصر کے اجتماع کی ایک اور وجہ خود ان کی افتاد طبع میں مضمر ہے ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے اپنی نصف صدی پر محیط ادبی زندگی میں خود کو کسی ایک صنف ادب تک محدود

نہیں رکھا اور نہ کسی ایک میدان پر قناعت کی، بلکہ وہ مختلف جہتوں میں کام کرتے رہے ۔ مولانا مہر کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا تھا اور ایک زمانے میں وہ یہ خیال کرتے تھے کہ قدرت نے انھیں صرف شاعری کے لیے پیدا کیا ہے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انھوں نے خود کو صرف شعر و شاعری تک محدود رکھا ؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے ۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسلوب کی کسی ایک آدھ خصوصیت پر قناعت کر لیتے ؟ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب نگارش میں اردو نثر کے مختلف اسالیب کے تقریباً سبھی رنگ جمع ہو گئے ہیں ۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی رنگ زیادہ گہرا ہے اور کوئی کسی قدر پھیکا ۔ مثلاً مولانا مہر کی تحریروں میں طنز و مزاح کا انداز بہت کم ہے ، جبکہ وہ فارسی اور اردو کے اشعار بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں ۔ اس کی ایک وجہ تو خود مولانا مہر کی طبیعت کے تقاضے اور ان کی ذاتی پسند و ناپسند پر مبنی ہے اور دوسری وجہ وہ سیاسی و سماجی حالات ہیں جنھوں نے برعظیم کے ہر سوچنے والے ذہن پر گہرے اثرات مرتسم کیے تھے ۔ مثلاً مولانا مہر زمانۂ طالب علمی ہی میں ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کی تحریروں سے متاثر ہو گئے تھے ۔ ابوالکلام آزاد کے ان اثرات نے بھی مولانا مہر کے اسلوبِ تحریر کو متعین کرنے میں اہم کردار کیا ۔ اسی طرح جس دور میں مولانا غلام رسول مہر نے لکھنا شروع کیا اس کے پس منظر میں تنسیخِ تقسیمِ بنگال ، جنگ بلقان اور تحریکِ خلافت ایسے جذباتی واقعات موجود تھے ۔ یہ ہندی مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے واقعات ہیں جنھوں نے اردو نثر میں ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر جیسے ادیب اور مولانا ظفر علی خاں جیسے شاعر پیدا کیے اور مولانا مہر نے ان تینوں سے استفادہ کیا ہے ۔ لہٰذا ان کے ابتدائی اداریوں میں بھی صحافتی تقاضوں کے برعکس شدید جذبے کی گرفت مضبوط نظر آتی ہے ۔ ان اداریوں کے توسط سے مولانا مہر کا جو اسلوب سامنے آتا ہے وہ صحافتی اور تاریخی و تحقیقی تقاضوں کی بجائے شعری تقاضوں پر پورا اترتا ہے ۔ مولانا مہر کے اداریوں میں شعری عناصر کی یہی آمیزش انھیں صحافت کے جدید تقاضوں سے دور لے جاتی ہے ۔ بہرحال مولانا مہر کی صحافتی زندگی کے دور اول کے تقریباً تمام اداری مقالات کے علاوہ ان کی پہلی تصنیف یعنی ''سیرتِ امام ابن تیمیہ'' بھی ان کے اسلوبِ تحریر کے اسی پہلو کی نمائندگی کرتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ اسے خشک سوانحی تصنیف قرار دینے کی بجائے رومانی تخیلی ادب کا نمونہ کہتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ مہر نے یہ سوانح عمری جس جذبے سے لکھی وہ انس اور عارضی جذباتی وابستگی کا جذبہ نہ تھا (جو ایک اچھی سوانح عمری کے لیے لازمی ہے) بلکہ عشق و شیفتگی کا جذبہ تھا اور جب کوئی سوانح عمری اس منزل میں قدم رکھ دے تو اسے سوانح عمری سے زیادہ رومانی تخیلی ادب کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے ، خواہ اس کا مواد واقعاتی یا تاریخی ہی کیوں نہ ہو ۔"[1]

لیکن تنسیخِ تقسیمِ بنگال ، جنگ بلقان اور تحریک خلافت کے واقعات رفتہ رفتہ ماضی کا حصہ بن گئے اور ان کی جگہ حال کے ان مسائل نے لے لی ، جن کے حل کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ جذباتی اندازِ فکر کو ترک کرکے اپنے حقوق کے حصول کی جنگ منطق و استدلال کے ہتھیاروں سے لڑی جائے ۔ گویا ہندی مسلمانوں کے لیے اب پھر وہی حالات پیدا ہو گئے تھے جن کا سامنا وہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کر چکے تھے اور جن کے تقاضوں نے سرسید احمد خاں اور حالی کو پیدا کیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے ادوار میں مولانا مہر کی تحریروں میں جذبے کی گرفت کمزور ہوتی نظر آتی ہے اور منطق ، استدلال اور عقلی تجزیے کا انداز زیادہ نمایاں ہونے لگتا ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مولانا غلام رسول مہر ، سرسید احمد خاں اور مولانا الطاف حسین حالی کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں ۔ ان کی اس حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد لکھے گئے ادارتی کالم بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں مولانا مہر نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے اور استدلالی انداز میں ان کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن ان کے اسلوب کی اس خصوصیت کا بہترین اظہار ان کی کتاب "غالب" میں ہوتا ہے جس میں مرزا غالب کی شخصیت سے قلبی وابستگی رکھنے کے باوجود مولانا مہر نے ان کی کمزوریوں کا اعتراف بھی کیا ہے اور خالصتاً استدلالی اور تجزیاتی انداز میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔

"غالب" پہلی کتاب ہے جس کے توسط سے ایک شاعر اور صحافی ، ادب

۱۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مصنف ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، ص ۲۲ ، مجلہ فنون ۔

کی دنیا میں محقق اور سوانح نگار کی حیثیت سے متعارف ہوا ۔ مولانا مہر کی شخصیت کے وہ امکانات جو ''غالب'' جیسی تحقیقی کتاب کے حوالے سے معرض اظہار میں آئے تھے، ''سید احمد شہید'' ''سرگزشت مجاہدین'' ''جماعت مجاہدین''، ''۱۸۵۷ء'' ''تاریخِ سندھ'' اور ''رسولِ رحمت'' میں اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں ۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن میں مولانا مہر کے اسلوب کا منطقی، استدلالی اور تجزیاتی انداز اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح مولانا مہر کی صحافتی زندگی کے دوسرے اور تیسرے دور میں لکھے گئے ادارتی کالموں میں اعداد و شمار اور منطق و استدلال کی بنیاد پر اخذ کیے جانے والے نتائج کی تردید ناممکن ہوتی تھی، اسی طرح ان کتابوں میں پیش کردہ مباحث سے بھی موجود مواد کی روشنی میں اختلاف کرنا مشکل ہے ۔ اس سلسلے میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بارے میں یہ بحث قابلِ ذکر ہے کہ اسے جنگِ آزادی کہنا چاہیے یا محض چند شورش پسند فوجیوں کا برپا کیا ہوا غدر ؟ اسی طرح یہ بحث کہ سید احمد شہید کی جنگ حقیقتاً کس کے خلاف تھی ؟ انگریزوں کے یا سکھوں کے ؟ اور یہ کہ سید احمد شہید کن مقاصد کے پیشِ نظر امیر خان کے لشکر میں شامل ہوئے تھے ؟ مولانا مہر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی تائید کے لیے نہ صرف واقعات کا نئے انداز میں تجزیہ کرتے ہیں بلکہ اپنی رائے کے ثبوت میں اکثر اوقات مخالفین ہی کی تحریروں سے حوالے پیش کرتے ہیں لیکن یہاں پر ایک بات بطور خاص قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ چونکہ ''سید احمد شہید'' سے ''رسولِ رحمت'' تک تمام موضوعات ایسے تھے جن سے مولانا مہر کی جذباتی وابستگی تھی، لہذا ان خالصتاً تحقیقی اور تاریخی کتب میں بھی منطق و استدلال اور معروضی نقطۂ نگاہ کے باوجود جذبے کی پگھلا دینے والی حدت موجود ملتی ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں مولانا مہر، شبلی کے مخالف ہونے کے باوجود ان کے خانوادۂ ادب سے متعلق ہو جاتے ہیں ۔ اگرچہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ مولانا مہر کے ذوق کے اس رخ کی تعبیر آسان نہیں کہ وہ سرسید اور حالی کے پرجوش مداحوں اور شبلی کے بے درد ناقدوں میں سے تھے ۔''[۱]

مولانا مہر کی تحریروں میں جوش و جذبے کی یہ فراوانی شبلی کی طرح ان کی تحریروں کو موثر بھی بناتی ہے اور ان میں شعریت پیدا کرنے کا سبب بھی

۱۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مصنف، از ڈاکٹر عبداللہ، ص ۲۱، فنون ۔

بن جاتی ہے جس کی بنا پر تشبیہ و استعارات اور دیگر صنائع معنوی سے عبارت کی رنگینی میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ لیکن تحریر میں شعریت و رنگینی پیدا کرنے کے ذمہ دار اردو اور فارسی کے وہ اشعار بھی ہیں جو مولانا مہر کی تقریباً تمام تحریروں میں موقع محل کے مطابق لکھے جاتے ہیں ۔ مولانا مہر کے اس رجحان کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ''رسولِ رحمت'' کے نو صفحات کے حرف آغاز میں بارہ اشعار اور پانچ متفرق مصرعے ملتے ہیں ، جبکہ رسولِ رحمت کے صفحہ اول پر بھی اقبال کا ایک شعر درج ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا مہر اپنے ادارتی مقالات میں شعر نہیں لکھا کرتے تھے لیکن صحافت سے متعلق باب میں بالوضاحت بتایا گیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ادارتی مقالوں میں حسب ضرورت شعر استعمال کیا کرتے تھے بلکہ اکثر اوقات اشعار ہی سے مقالوں کے ذیلی عناوین کا کام بھی لیا کرتے تھے ۔ اسی طرح مولانا مہر اپنے خطوط میں بھی موقع محل کی مناسبت سے شعر لکھا کرتے تھے ، بلکہ ان کے بعض خط تو ایسے بھی ہیں جن میں صرف شعر لکھ دینے پر اکتفا کیا گیا ہے ۔ خطوط میں اشعار کے استعمال کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام صرف سات علمی اور کاروباری نوعیت کے خطوط میں سترہ اشعار اور مصرعے ملتے ہیں ۔

مولانا مہر اپنی تحریروں میں حسبِ موقع عربی و فارسی ضرب الامثال اور قرآنی آیات بھی استعمال کرتے ہیں ۔ مولانا مہر کے اسلوب نگارش کا یہ پہلو ابوالکلام آزاد کے اثرات کی وجہ سے ہے ، لیکن مولانا مہر کا اسلوب اس بنا پر ابوالکلام آزاد سے مختلف ہے کہ اس میں عام قارئین کے لیے وہ دشواریاں اور مشکلات نہیں ہیں جن سے ''غبار خاطر'' کے قاری کو واسطہ پڑتا ہے ۔ ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں مولانا مہر کی تحریر آسان ، سادہ اور سلیس ہوتی ہے ۔ مولانا مہر کا انداز تحریر اس قدر عام فہم ہے کہ ان کی کتب کا مطالعہ کرتے ہوئے عام اردو خوان طبقہ بھی کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں کرتا ۔ لیکن یہ سادگی سرسید کی سادگی کی طرح روکھی پھیکی اور سپاٹ نہیں ہے بلکہ اس میں میر امن کے اسلوب کی وہ بنیادی خصوصیت بھی موجود ہے جس نے ''باغ و بہار'' کو زندہ نثر کی کتاب بنا دیا ہے ۔

مولانا غلام رسول مہر اپنی عام زندگی میں بڑی حد تک سنجیدہ رہتے تھے ۔ یہی کیفیت ان کے اسلوبِ تحریر کی بھی ہے ۔ لیکن جس طرح سنجیدہ سے سنجیدہ

شخص بھی کبھی کبھار ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے اسی طرح مولانا مہر کے اسلوب تحریر میں بھی کبھی کبھی طنز و مزاح کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو عام قاری کو خندہ زیر لب اور قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتی ہیں ۔ مزاح کی بہترین مثالیں ان کے وہ اداریے ہیں جو انھوں نے سکھوں کے بعض سیاسی فیصلوں اور ''لوکل سیلف گورنمنٹ'' کے موضوع پر تحریر کیے ۔ اسی طرح سفر نامۂ حج اور سفر نامۂ یورپ میں بھی واقعاتی مزاح کی اچھی مثالیں مل جاتی ہیں ۔ مزاح کی طرح طنز کا عنصر بھی مولانا مہر کی تحریروں میں ذرا کم ہی ملتا ہے لیکن جہاں کہیں ان کی تحریر میں طنزیہ انداز شامل ہو جاتا ہے وہیں اسلوب میں نشتر کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ صحافتی کالموں میں وہ سب لوگ مولانا مہر کے طنز کا نشانہ بنے ، جنھوں نے کسی نہ کسی مرحلے پر مولانا مہر اور ''انقلاب'' کے سیاسی مسلک کی مخالفت کی ۔ اسی طرح تاریخی و تحقیقی کتب میں مولانا مہر زیادہ تر ان اہلِ قلم کو نشانۂ طنز بناتے ہیں جو تاریخی واقعات کا حقیقی تجزیہ کرنے کی بجائے اپنے تعصبات کی بنیاد پر مفروضے قائم کرکے اپنی مرضی کی تصویر پیش کرنے کے لیے تاریخی غلطیاں پھیلانے کے مرتکب ہوتے ہیں ، جبکہ خطوط و مکتوبات میں مولانا مہر کا طنزیہ اسلوب زیادہ تر ان خطوط میں نمایاں ہوتا ہے جو الیس جیلانی کے نام لکھے گئے ۔ اس لیے کہ مولانا مہر کے بقول الیس جیلانی کے ذہن میں سوالات اس طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح بارش کے بعد صحرا میں کھمبیاں اگتی ہیں اور وہ مولانا مہر ایسے مصروف شخص کو اپنے سوالات کے جواب میں صفحوں کے صفحے لکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں ۔ عبدالسلام اسلم کے نام مکاتیب میں بھی کہیں کہیں طنزیہ انداز بیان ملتا ہے لیکن صرف اُس وقت جب مولانا مہر کو انتظار بسیار کے باوجود عبدالسلام اسلم کا خط نہ ملے ۔ لیکن یہ امر قابل وضاحت ہے کہ الیس جیلانی اور عبدالسلام اسلم کے نام مکاتیب میں طنزیہ اسلوبِ بیان میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے ۔ ایک جگہ جھنجھلاہٹ اور جھلاہٹ ہے جبکہ دوسری جگہ مشفقانہ ڈانٹ ڈپٹ ، اور یہ فرق ان دنوں شخصیات سے مولانا مہر کے تعلقِ خاطر کو ظاہر کرتا ہے ۔

مولانا غلام رسول مہر کے اسلوب نگارش کی ایک اور نمایاں خصوصیت وہ داعیانہ انداز ہے جو ان کی تمام تحریروں میں پایا جاتا ہے ۔ طرزِ تحریر کی یہ خصوصیت اول تو ان حالات نے پیدا کی جن کے باعث اردو ادب میں سرسید احمد

خاں ، مولانا حالی ، نذیر احمد ، شبلی اور محمد حسین آزاد پیدا ہوئے تھے ۔ اس کے علاوہ مولانا مہر کے نظریۂ ادب نے بھی اس خصوصیت کے ضمن میں اہم کردار ادا کیا ۔ مولانا مہر ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور وہ اپنی ہر تحریر کو قوم و ملت کی بیداری کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے ۔ پھر مولانا مہر کا زمانہ بھی ایسا تھا جب قوم و ملت دوہری غلامیوں کا شکار تھی ۔ ان حالات میں دیگر بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی طرح مولانا مہر بھی ادیب سے زیادہ داعی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ بھی اکثر اوقات قارئین کی ذہانت پر اعتماد کرنے کی بجائے سرسید کی طرح اپنے مضامین و مباحث کے آخر میں واضح لفظوں میں دعوت و تبلیغ کا فرض ادا کرنے لگتے ہیں ۔

اب تک مولانا مہر کے اسلوب کی جن خوبیوں کا تذکرہ ہوا ہے وہ کسی نہ کسی صورت میں دوسرے ادیبوں کے ہاں بھی ملتی ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ دیگر ادیبوں کی مختلف اور نمایاں خصوصیات مولانا مہر کے اسلوب میں یکجا ہو گئی ہیں ۔ اس کا مولانا مہر کو یہ فائدہ ہوا ہے کہ وہ بیک وقت مختلف اصنافِ نثر مثلاً سیرت ، سوانح نگاری ، تاریخ ، تحقیق ، شرح ، ترجمہ ، سفرنامہ ، نصابی کتب اور صحافت وغیرہ میں کم و بیش یکساں کامیاب رہے اور ان اصناف کے مختلف اور بعض اوقات متضاد تقاضوں کو بڑی خوبی سے نبھا سکے ۔ لیکن اسلوب کی مذکورہ خصوصیات کے علاوہ مولانا مہر کے طرزِ تحریر میں بعض ایسی خوبیاں بھی ہیں جو صرف انھی کا حصہ ہیں ۔

ایسی خوبیوں میں سے ایک خوبی کو قطعیت کا نام دیا جا سکتا ہے ۔ مولانا مہر زیر بحث موضوع کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کے بعد اس انداز میں اپنی رائے دیتے ہیں کہ وہ آخری ، حتمی اور قطعی نظر آتی ہے ۔ تحریر میں قطعیت کا یہ انداز مولانا مہر کے تبحرِ علمی کا نتیجہ ہے ۔ چراغ حسن حسرت نے مولانا مہر کو ایک ایسا پرسکون دریا قرار دیا تھا جو بہت گہرا بھی ہے اور جس کا پاٹ بھی بہت زیادہ ہے ۔ یہ صرف تشبیہ ہی نہیں ہے بلکہ بڑے خوبصورت انداز میں مولانا مہر کے تبحر علمی کا اعتراف بھی ہے ۔ لیکن یہاں پر ایک بات بطور خاص قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ وسعت علم اور اس کا احساس عام طور پر غرور و تکبر کا سبب بن جاتا ہے ۔ لیکن مولانا مہر کے ہاں اس رویے کا کہیں بھی اظہار نہیں ہوتا بلکہ اپنی تحریروں کے حوالے سے منکسر المزاج شخص کے طور پر سامنے آتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اول تو ان کی تحریروں میں قطعیت کے ساتھ آراء

پیش کرنے کے باوجود بلند بانگ دعوے نظر نہیں آتے ۔ دوسرے جابجا اس قسم کے جملے نظر آتے ہیں ''جس حد تک معلوم ہو سکا'' اور ''معلوم نہ ہو سکا'' وغیرہ ۔ اس نوع کے جملے جہاں ان کی انکساری کے رویے کی غمازی کرتے ہیں وہیں یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ اگرچہ مولانا مہر حتی المقدور جملہ مآخذ سے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکافی حوالوں کے باعث جہاں انھیں ناکامی ہوتی ہے ، وہاں قارئین کو غلط معلومات فراہم کرنے کی بجائے اپنی کم علمی کا اعتراف کر لیتے ہیں ۔

مولانا مہر کو اردو ، فارسی ، عربی اور انگریزی زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا جبکہ پنجابی ان کی مادری زبان تھی ۔ مولانا مہر نے اپنی تحریروں اور اسلوب نگارش کو خوبصورت اور دلکش بنانے کے لیے عربی و فارسی سے تو بے حد مدد لی لیکن ان کی تحریروں میں انگریزی اور پنجابی کے لفظ نظر نہیں آتے ۔ صرف ''نوائے سروش'' میں ایک مقام ایسا آتا ہے جب مولانا مہر نے پنجابی زبان کا ایک لفظ استعمال کیا اور وہ بھی ایسے موقع پر جب اس کے بہت سے بہتر متبادل لفظ موجود تھے ۔

اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولانا مہر نے سرسید تحریک کے لکھنے والوں سے متاثر ہونے کے باوجود ان کی تقلید و پیروی میں انگریزی زبان کے لفظ استعمال نہیں کیے ۔ البتہ انھوں نے غالباً انگریزی نثر ہی کی متابعت میں اپنی تحریروں میں وہ خوبی ضرور پیدا کی جسے Prosaic quality کا نام دیا جاتا ہے ۔ یہ اسلوبِ تحریر کی ایسی خوبی ہے جس کا تجزیہ تو ممکن نہیں البتہ یہی وہ چیز ہے جو نثر کو صحیح معنوں میں نثر بناتی اور اچھے اور برے لکھنے والوں میں حدِ فاصل قائم کرنے میں مدد دیتی ہے ۔ مولانا مہر کی تحریر میں یہ خوبی پورے طور پر موجود ملتی ہے جس کی وجہ سے ان کا اسلوب زوردار اور موثر ہو جاتا ہے ۔ ایسا لگتا ہے جیسے مولانا مہر نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی حصے میں نہ صرف مختلف زبانوں کے اسالیبِ نثر کا گہرا مطالعہ کیا تھا بلکہ خود اپنی تحریروں پر بھی بہت زیادہ محنت کی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مہر کے اسلوبِ نگارش میں وہ خوبیاں جمع ہوئیں جو روایت کے گہرے شعور کا پتا دیتی ہیں اور جن میں جدت کا پہلو بھی بدرجۂ اتم موجود ہے ۔

☆ ☆ ☆

کتابیات

(الف) نگارشاتِ مولانا غلام رسول مہر (تصانیف، تالیفات، تراجم):

آزادیِ ہند کی کہانی: غیر مطبوعہ۔

۱۸۵۷ء: اشاعتِ چہارم ۱۹۷۷ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

۱۸۵۷ء کے مجاہد: اشاعتِ سوم ۱۹۷۱ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

انسائیکلو پیڈیا تاریخِ عالم، جلد اول: اشاعت سوم ۱۹۶۸ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

تاریخ ارادت خاں: اشاعت اول ۱۹۷۱ء، ادارۂ تحقیقات پاکستان پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

تاریخِ تہذیب، جلد دوم: اشاعت اول، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

تاریخِ سندھ: اشاعت اول ۱۹۵۸ء، سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔

تاریخِ شام: اشاعت دوم ۱۹۶۸ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

تبرکات آزاد: اشاعت اول، شیخ نیاز احمد پرنٹرز لاہور۔

جماعت مجاہدین: مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ: اشاعت اول، پاکستان ٹائمز پریس لاہور۔

جوزیفین: اشاعت اول ۱۹۵۰ء، کتاب منزل لاہور۔

رسولِ رحمت: اشاعت اول ۱۹۷۱ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

سرگزشتِ مجاہدین: مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

سرود رفتہ: اشاعت اول ۱۹۵۹ء، شیخ نیاز احمد پرنٹرز و پبلشرز لاہور۔

سرورِ عالم: اشاعت اول ۱۹۶۰ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

سکندر اعظم : اشاعت اول ۱۹۶۲ع ، مکتبۂ جدید چوک انار کلی لاہور ۔
سید احمد شہید : اشاعت سوم ۱۹۶۸ع ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔
سیرتِ امام ابن تیمیہ : اشاعت اول ۱۹۲۵ع ۔ الہلال بک ایجنسی لاہور ۔
طبقاتِ ناصری ، جلد اول : اشاعت اول ۱۹۷۵ع ، مرکزی اردو بورڈ لاہور ۔
عکسی دیوان غالب مکمل : اشاعت اول ۱۹۶۷ع ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔
کلیاتِ غالب فارسی : اشاعت اول ۱۹۶۵ع ، شیخ مبارک علی لاہور ۔[1]
قصائد و مثنویات فارسی : اشاعت اول ۱۹۶۹ع ۔ مجلسِ یادگارِ غالب ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔
مختصر تاریخ اسلام کامل : اشاعت دوم ۱۹۵۲ع ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔
مطالب بانگِ درا : اشاعت پنجم ۱۹۷۵ع ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔
مطالب ضربِ کلیم : اشاعت ششم ۱۹۷۶ع ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔
نقشِ آزاد : اشاعت سوم ۱۹۹۸ع ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔
نوائے سروش : اشاعت اول ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔
ہٹلر کا عروج و زوال : اشاعت اول ۱۹۶۸ع ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔

(ب) خطوط و مکتوبات :

مجموعۂ مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام ابوسلمان شاہجہانپوری ، غیر مطبوعہ ۔
مجموعۂ مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام الیس جیلانی ، غیر مطبوعہ[2] ۔
مجموعۂ مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام ایوب قادری ، غیر مطبوعہ ۔
مجموعۂ مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام حمزہ فاروق ، غیر مطبوعہ ۔
مجموعۂ مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام عاشق حسین بٹالوی ، غیر مطبوعہ ۔

۱- کلیاتِ غالب فارسی کی نسبت کے ضمن میں متعلقہ باب میں مفصل بحث ہو چکی ہے ۔

۲- یہ مجموعہ اب "خطوط" کے نام سے شائع ہو گیا ہے ۔

مجموعہ مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام عبدالسلام اسلم ، غیر مطبوعہ۔
مجموعہ مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام قدرت نقوی ، غیر مطبوعہ۔
مجموعہ مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام محمد عالم مختار حق ، غیر مطبوعہ۔
مجموعہ مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام مشفق خواجہ ، غیر مطبوعہ۔
مجموعہ مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام نادم سیتا پوری ، غیر مطبوعہ۔
مکتوبات مولانا محمد عرفان بنام غلام رسول مہر ، مطبوعہ نقوش مکاتیب نمبر ۲۔
مکتوب محمد عالم مختار حق بنام راقم ، غیر مطبوعہ۔

(ج) مولانا مہر کے غیر مطبوعہ مضامین :

علامہ اقبال پر ایک مضمون۔[1]
والدۂ ماجدہ پر ایک مضمون۔[2]

(د) دیگر کتب حوالہ :

ابوسلمان شاہجہانپوری : تحریک نظم جماعت۔ اشاعت اول ، مطبوعہ الطاف رحیم پرنٹرز لاہور۔
اعظمی ، عبداللطیف : شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ اشاعت دوم ۱۹٦۷ء ، صفیہ اکیڈمی کراچی۔
اقبال : کلیات اقبال فارسی۔ اشاعت اول ۱۹۷۳ء ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔
اکرام ، شیخ محمد : یادگار شبلی۔ طبع اول ۱۹۷۱ء ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور۔
الطاف فاطمہ : اردو ادب میں سوانح نگاری کا ارتقاء۔ اشاعت اول ، اردو اکادمی کراچی۔
حالی : حیات جاوید۔ طبع دوم اگست ۱۹۷ء ، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور۔
حالی : یادگار غالب۔ کشمیر کتاب گھر ، اردو بازار لاہور۔

---

۱ ، ۲۔ یہ دونوں مضامین عبدالسلام اسلم کے پاس محفوظ ہیں۔

حامد حسن قادری : تاریخ داستان اردو ۔ تیسرا ایڈیشن ، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۔

خورشید ، عبدالسلام : سرگزشتِ اقبال ۔ طبع اول ، مطبوعہ اقبال اکادمی لاہور ۔

خورشید ، عبدالسلام : صحافت پاکستان و ہند میں ، اشاعت دوم ، مکتبہ کاروان لاہور ۔

خورشید ، عبدالسلام : وے صورتیں الٰہی ۔ بار اول ، ۷۶ع، مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور ۔

ذوالفقار ، ڈاکٹر غلام حسین : محاسنِ خطوطِ غالب ، اشاعت اول ۶۹ع ، خیابان ادب لاہور ۔

زکریا ، خواجہ محمد : اقبال کا ادبی مقام ۔ اشاعت اول ۷۷ع ، مکتبہ عالیہ لاہور ۔

سالک ، عبدالمجید : سرگزشت ، بار اول ۱۹۶۶ع ، قومی کتب خانہ لاہور ۔

سکسینہ ، رام بابو : تاریخ ادب اردو ۔ مترجمہ محمد عسکری ، اشاعت اول ، نامی پریس لاہور ۔

شیر بہادر پنی : افاداتِ مہر ۔ بار اول ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۔

صباح الدین عبدالرحمن : غالب مدح و قدح کی روشنی میں ۔ طبع اول ۱۹۷۹ع ، معارف پریس اعظم گڑھ (بھارت) ۔

عبدالشکور احسن و سجاد باقر رضوی : غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں - اشاعت اول ۱۹۶۹ع ، مطبوعاتِ مجلسِ یادگار غالب ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔

عبداللہ ، ڈاکٹر سید : سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری و فنی جائزہ ، بار سوم ۱۹۷۹ع ، علمی کتاب خانہ لاہور ۔

فیاض محمود : تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند ۔ دسویں جلد ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔

مختار الدین احمد آرزو : احوالِ غالب ۔ اشاعت ۵۳ء ، مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی (بھارت) ۔

مسعود عالم ندوی : ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ۔ طبع دوم اگست ۱۹۴۷ء ، انوار الاسلام پریس لاہور ۔

مسکین حجازی : اداریہ نویسی ۔ طبع دوم ۷۶ء ، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور ۔

نیر سلطانہ : مولانا غلام رسول مہر بحیثیت غالب شناس ۔ مقالہ ایم ۔ اے اردو مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔

یوسف طاہر : مولانا غلام رسول مہر ۔ مقالہ ایم ۔ اے اردو ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔

(ہ) اخبارات و رسائل :

اردو ، کراچی ۔

اردو ڈائجسٹ ، لاہور ۔

اردو نامہ ، کراچی ۔

انقلاب ، لاہور ، روزنامہ ۔

جاوداں ، لاہور ۔

جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔

جنگ کراچی ، روزنامہ

چٹان لاہور ، ہفت روزہ ۔

زمیندار لاہور ، روزنامہ

فاران ، مجلہ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور ، جنوری ۱۹۶۲ء ۔

فنون ، لاہور ۔

مشرق ، لاہور ، روزنامہ ۔

میثاق ، لاہور ۔

نخلستان ، مجلہ گورنمنٹ ڈگری کالج بوسن روڈ ملتان ۔

نقوش ، لاہور ۔

نوائے وقت ، لاہور ، روزنامہ ۔

(و) انٹرویوز :

انٹرویو از مولانا حامد علی خاں ، عبدالسلام اسلم ، محمد عالم مختار حق ، شیخ نیاز احمد ، ڈاکٹر وحید قریشی ، یوسف طاہر ۔

(ژ) انگریزی کتب :

(1) Azad, Abu-l-Kalam, India Wins Freedom.

(2) Creane Brentin, John B. Kirstophere-'
A History of Civilization. Vol. II.

(3) William l' Shirer., The Rise and Fall of Third Reich.

☆ ☆ ☆

مجلس ترقی ادب کی چند مطبوعات

۱- عکس : (عربی فلسطینی شعرا کی نظموں کا منظوم ترجمہ) : مترجم امجد اسلام امجد - - - - -	۱۰/۰۰
۲- سرگزشت حیات : از ڈاکٹر احمد امین - - -	۲۶/۰۰
۳- البدیع : از پروفیسر سید عابد علی عابد - - -	۳۰/۰۰
۴- یادگار داغ : مرتبہ کلب علی خاں فائق - -	۵۰/۰۰
۵- عبدالرحمٰن چغتائی — فن اور شخصیت : مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا - - - - -	۵۵/۰۰
۶- تاریخ پنجاب : از کنھیا لال لاہوری ، مرتبہ کلب علی خاں فائق -	۹۰/۰۰
۷- قدیم اسلامی مدارس : از منور جہاں رشید - -	۳۵/۰۰
۸- نذر حمید احمد خاں : مرتبہ احمد ندیم قاسمی - -	۵۰/۰۰
۹- انتخاب غزلیات امیر خسرو : مرتبہ پروفیسر وزیر الحسن عابدی - - -	۲۷/۰۰
۱۰- ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ : از ڈاکٹر سید عبداللہ - - - - -	۳۷/۰۰
۱۱- خطبات اقبال : پنجابی ترجمہ از پروفیسر شریف کنجاہی	۳۰/۰۰
۱۲- جاوید نامہ : پنجابی ترجمہ از پروفیسر شریف کنجاہی	۱۹/۰۰
۱۳- مجرم کون : از جے - بی - پرسٹلے - - - -	۱۵/۰۰
۱۴- آر - یو - آر : از کارل چپیک - - - -	۱۲/۰۰
۱۵- تین بہنیں : از چیخوف - - - - - -	۱۳/۰۰

مجلس ترقی ادب - کلب روڈ - لاہور

زرین آرٹ پریس ، لاہور